دل دا دیس

ثمرہ بخاری



دل دا دیس

جب بھی سرما آتا ہے یہاں دھند کا راج ہوتا ہے اس سرزمین کے سینے پر آباد کینوؤں، امرودوں کے باغ دھند سے بھر جاتے ہیں اور جب گرما آتا ہے تو یہاں تیز آندھیاں اٹھتی ہیں، ہوا علاقے بھر کی مٹی کو ساتھ اٹھائے ادھر ادھر چنگھاڑتی پھرتی ہے۔ کبھی کبھی ان آندھیوں کا دورانیہ اور ان کا غصہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ پرانے، بظاہر مضبوط درخت ایک ہی ہلے میں زمین پر آ گرتے ہیں۔ گرما یہاں پورے جوش و خروش کے ساتھ آتا ہے اور لمبے عرصے تک مہمان رہتا ہے۔

یہ گیہوں کی سرزمین ہے۔ سنہری بالیوں کا زرخیز لہلہاتا ہوا علاقہ اور جب گندم کی یہ فصل کٹنے کا موسم آتا ہے، تب سورج آگ برسا رہا ہوتا ہے۔ اسی قیامت خیز گرمی میں کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے، سب مل کر فصل کاٹتے ہیں اور یہی فصل کٹ کر منڈی میں پہنچنے کا موسم، خوشحالی کا موسم بھی ہوا کرتا ہے اور پرانی دشمنیوں کے حساب کتاب کا موسم بھی یہی ہے۔ جیب میں آیا پیسہ پرانے زخموں کو کریدتا ہے۔ سامنے چلتا پھرتا دشمن لہو کو گرم کر دیتا ہے۔ نتھنے نفرت سے پھڑکنے لگتے ہیں۔ لڑائی کا آغاز کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں اور پھر کسی معمولی بات کو بنیاد بنا کر مخالف پارٹی پر حملہ کر دیا جاتا ہے اور یوں ہاتھ آئی رقم تھانے کچہری کی نذر ہونے لگتی ہے، جس کا دکھ کسی کو نہیں ہوتا کہ دشمن سے انتقام ہی تو مرد کی شان ہے۔

یہ محنت کشوں کی سرزمین ہے۔ یہاں چاول کی کاشت بھی کی جاتی ہے اور گنا تو یہاں کی سدابہار فصل ہے ہی۔

چناب کے شوریدہ پانیوں کی سرزمین۔ چناب اس دھرتی کا جھومر ہے۔ یہ اس دھرتی کا مان ہے اور یہی چناب جولائی اگست میں جب بپھرتا ہے تو پھر تباہی مچا دیتا ہے۔ کھڑی فصلیں، کچے پکے مکان، پھولوں سے

لدے باغات اور نئی پرانی بنی ہوئی سڑکیں سب اس کی لہروں کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ لہر پہ لہر اٹھتی ہے، آگے ہی آگے بڑھتی ہے، دھاڑتی ہوئی غراتی ہوئی اس کی آواز سے دل گھبرا جاتے ہیں۔

جاٹوں، راجپوتوں، سیالوں، پنواروں کے لئے جولائی، اگست، ستمبر بڑے سخت مہینے ثابت ہوتے ہیں مگر پانی اتر جانے کے بعد دوبارہ سے تعمیر ہونے لگتی ہے۔ اک نئے ولولے کے ساتھ پھر سے بچا کھچا اکٹھا کیا جاتا ہے اور زندگی زخم زخم ہونے کے باوجود مسکرانے لگتی ہے۔

چھوٹی چھوٹی اور بھی کئی ذاتیں اور قبیلے آباد ہیں۔ ان سب کے رسم و رواج تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ان کے لباس بھی ایک جیسے ہیں، زبان بھی مگر پھر بھی یہ اپنی اپنی ذات پر فخر کرنے والے اپنے قبیلے کا نام سب سے پہلے بتا کر بعد میں اپنا نام بتانے والے لوگ ہیں۔ غیرت کے نام پر بڑے آرام سے قتل تک کر گزرنے والے کھڑے نقوش، مضبوط جسم اور اچھے قد والے یہ لوگ محنتی ہیں اور موسموں کی شدت میں سخت مشقت نے ان کے رنگ میں جیسے تانبا گھول دیا ہے۔

ان کی عورتیں اکثر سیاہ لباس پہنتی ہیں۔ اگر پورا نہیں تو پہناوے میں ایک چیز تو اکثر سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ کبھی تہبند کبھی اوڑھنی کبھی کرتا۔ کنواری کو سونے کے زیورات پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں وہ چاندی پہن سکتی ہے۔ کانوں میں لو سے لے کر اوپر تک سوراخ کروائے جاتے ہیں اور ان میں چھوٹی چھوٹی بالیاں ڈالی جاتی ہیں۔ بازو میں کانچ اور چاندی کی بہت سی چوڑیاں پہننے کا رواج عام ہے۔ ناک میں سوراخ بہت چھوٹی عمر میں کروالیا جاتا ہے اور اکثر لڑکیوں کو کسی نہ کسی کے نام بھی بچپن میں ہی کر دیا جاتا ہے۔ اس میں پسند ناپسند کا تو کوئی دخل ہی نہیں ہوا کرتا۔ یہ سب برادری اپنی روایت کے تحت طے کرتی ہے اس سے انحراف کا مطلب برادری کی ناراضی ہے اور ناراضی کا مطلب بالکل اکیلا ہو جانا ہے اور جنگل کے قانون میں اکیلے کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔

یہ پہاڑی علاقہ تو نہیں ہے مگر خدا کی قدرت کہ اس خطے میں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں چناب کی لہریں طوفانی ہیں اور خشک بلند و بالا پہاڑ بھی سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ یہاں شہر سے عجیب و غریب مشینوں اور کاغذ پر بنے نقشوں کے ساتھ لوگ آتے رہتے ہیں اور پتہ نہیں ان پہاڑوں میں کیا کھوجتے رہتے ہیں۔ وہ آنے والے بتاتے ہیں بہت پیچھے کہیں ماضی میں یہاں سے ایک بہت بڑا بادشاہ اپنے عظیم لشکر کے ساتھ گزرا تھا۔ اس کا نام سکندر تھا۔ اسے سکندر اعظم کہا جاتا تھا۔ یہاں اس کی فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا اور شاید یہاں پر کوئی لڑائی بھی لڑی گئی تھی۔ لڑائی لڑی گئی تھی یا فوج گھوڑے دوڑاتی آگے ہی آگے بڑھ گئی تھی، یہاں کے باسیوں کو اس سے کوئی مطلب ہے نہ دلچسپی۔ بھئی اگر ماضی میں کوئی آیا تھا تو اب اس کو کھوجنے سے کیا حاصل؟ یہاں جو بہت پرانی قبریں ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ بیرونی حملہ آور فوجیوں کی ہیں، ہوں تو ہوں۔ یہ کہانیاں ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

وہ دن اور رات کے چکر میں اپنی روایتوں اپنے رواجوں کے ساتھ ساتھ چکرا رہے ہیں۔ چوہدریوں کے ڈیرے آباد ہیں، یہاں صبح شام سلام کے لئے آنے والوں کا رش ہے۔ پیروں، فقیروں کی خانقاہیں بھی

مرادیں مانگنے والوں سے بھری ہوئی ہیں۔ آنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے، وہ اپنے لئے کچھ نہیں مانگتیں، کسی کو سر کے سائیں کی فکر ہے تو کوئی بچوں کے لئے دعا کرانا چاہتی ہے تو گویا عورت نے خود ہی اپنی ہستی کو بے وقعت تسلیم کرلیا ہے۔ وہ خود اپنے لئے بھی اہم نہیں ہے۔

وہ گھر کی دیکھ بھال ہی نہیں کرتی۔ اس گھر کی بنیاد ڈالنے کے لئے بھی اپنا خون پسینہ ایک کرتی ہے۔ زمین کے ایک ٹکڑے کو اپنے سر کی چھت بنانے کے لئے وہ اینٹیں، پتھر، گارا سب ڈھوتی ہے۔ جنگل سے لکڑی اور گھاس پھونس اکٹھا کرتی ہے پھر اینٹوں اور پتھروں کو مٹی کے گارے سے جوڑتے ہوئے ایک ترتیب میں اٹھاتی ہے اور اس پر لکڑی اور گھاس پھونس کی چھت ڈالتی ہے۔ اس کے آنگن کے دیواریں اٹھاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مردوں چاہے وہ باپ ہو، بھائی ہو، بیٹا ہو یا شوہر (یہ سب اس کا مان بھی ہیں، اس کا غرور اور اس کے مالک بھی) ان کے ساتھ کھیتوں میں ہاتھ بٹاتی ہے اور کبھی شکوہ نہیں کرتی۔ کرے بھی کیوں؟ بھئی عورت کو اللہ سائیں نے کمتر مخلوق بنایا ہے۔ وہ عقل میں کم، قوت میں کمزور اور ذات کی کمتر ہے پھر برتر کے سامنے سر اٹھائے تو کس طرح؟

ادھر جہاں کچے پکے مکانوں کی بستیاں آباد ہیں۔ ادھر ہی رانو کا گھر بھی ہے، وہی رانو جس کے کھڑے نقوش ہیں، قد متناسب اور جسم میں بلا کی کشش ہے۔ جس کی چال مورنی کی طرح ہے اور جس کی ہنسی کی آواز راہ چلتوں کو چونکا دیتی ہے۔ وہ رانو جو رکھی کی سہیلی ہے۔ وہ رانو جسے اپنے بھائی ملکے سے بہت پیار ہے، جو ملکے کی زندگی کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتی، اس کے لئے صبح دیسی گھی میں انڈے تلتی ہے۔ بلوں والے پراٹھے بناتی ہے۔ لسی بلونے کے بعد جب مکھن کا پیڑا اتارتی ہے تو ناشتے میں سارے کا سارا بھائی کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ اب اس کا جی چاہے تو سارا کھالے چاہے تو کچھ کھا کر باقی چھوڑ دے۔

گرمیوں میں وہ بڑے چاؤ سے اس کے ململ کے سفید کرتوں پر ریشمی دھاگے سے کڑھائی کرتی ہے اور سردیوں میں اپنے ہاتھ سے اس کے لئے گرم اونی کمبل جیسی شال بنتی ہے۔

''میرے ویر جیسا گھبرو تو اس پنڈ کیا پورے علاقے میں نہیں ہوگا۔''

وہ بڑے فخر سے سہیلیوں میں بھائی کا ذکر کرتی ہے۔

''چل چل نی، بڑی آئی بھرا والی۔ تو نے اللہ داد کو نہیں دیکھا جو دیکھ لے تو بھائی کی تعریفیں کرنا بھول جائے۔''

کسی ایک نے کہا تھا۔ اس نے تپ کر کہنے والی کی طرف دیکھا اور بولی۔

''ہوگا کوئی اللہ داد۔ مجھے کسی سے کیا مطلب، میں تو بس اپنے ویر کو دیکھ کر جیتی ہوں۔ اب تو اماں کہتی ہے اگلی فصل پر ہم اس کا ویاہ بھی کر دیں گے۔ میں نے اماں سے کہہ دیا ہے اس معاملے میں برادری کی ایک نہیں چلنے دوں گی۔ اپنے ویر کے لئے وہ ووہٹی لاؤں گی جو رج کے سوہنی ہو۔ میرے بھرا کے ساتھ کھڑی ہو تو لوکی آکھیں (لوگ کہیں) چاند سورج کی جوڑی ہے۔''

''پھر ہے کوئی تیری نظر میں؟'' سب نے اس بات کو اس لئے ذرا حیرت سے سنا کہ رانو اور رکھی کی

بہت دوستی تھی۔ سب لڑکیاں خود ہی قیاس کر بیٹھی تھیں کہ رانو رکھی کو ہی اپنی بھابھی بنائے گی اور شاید رکھی کے دل میں بھی ایسا کچھ خیال تو تھا جو اس نے رانو کی یہ بات سن کر بے چینی سے پہلو بدلا تھا اور پھر اپنا پانی سے بھرا گھڑا اٹھا کر گھر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس پنڈ میں تو ایسا چن چہرہ کوئی بھی نہیں۔ ہاں پر اماں بتاتی ہے اس کے میکے والے پنڈ میں ایک سے ایک سوہنی مٹیار ہے۔ خود میرے مامے کی بیٹیاں بھی اچھے قد کاٹھ والی اور شہزادیوں جیسا ناک نقشہ رکھنے والی ہیں۔"

"اچھا تو پھر مامے کی دھی ہی بھابھی بنا کر لاؤ گی؟"

"نہیں اڑیے۔ یہ سب تو قسمتوں کے فیصلے ہیں، بس یہ تو دل میں آئی ایک بات تھی جو میں نے تم لوگوں میں کردی۔"

"چلو نی چلو، دیر ہو رہی ہے۔ سارا دن کیا چناب کے کنارے ہی گزارنے کا خیال ہے۔" رکھی کی بے زاری عروج پر تھی۔

"آ ہو نی اٹھو۔" لڑکیاں ایک ایک کر کے اٹھنے لگیں۔

جب وہ اپنے گھر آئی، اماں مونجی کی فصل سنبھال رہی تھی، اسے دیکھتے ہی بولی۔

"جلدی سے چولہا گرم کر لے۔ صبح ملکو گوبھی گوشت کے لئے کہہ کر گیا تھا، میں قصائی سے گوشت تو لے آئی ہوں۔ گوبھی بھی کھیت سے توڑ لائی تھی تو بس ہانڈی چڑھا لے۔"

"اچھا اماں!" وہ جلدی جلدی گھڑے رکھ کر چولہے کے پاس آ بیٹھی۔

ویسے تو اس علاقے میں کلہر کہار اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے آئی سردیوں کے موسم والی سبزیاں سارا سال ہی ملتی رہتیں، مگر موسم آنے پر اپنے علاقے میں اگنے والی فصل کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ تازہ تازہ کھیت سے توڑی موسم کی سبزی پکانے میں آسان (کہ بہت جلدی گل جاتی ہے) اور کھانے میں عمدہ ذائقہ رکھتی ہے۔

ابھی اس نے چولہے میں آگ جلائی ہی تھی کہ ملکو کے پالتو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"ارے رانو! اٹھ کر دیکھ تو سہی یہ کتے کیوں بھونک رہے ہیں۔"

اماں اپنے کام میں مصروف کام چھوڑ کر اٹھنے کو تیار نہیں تھی۔ رانو کو ہی اٹھنا پڑا۔ صحن کو چھوڑ کر بیرونی دروازے کے گرد ایک بڑا حصہ جانوروں کے لئے مخصوص تھا، کتے وہیں بندھے تھے اور شور کر رہے تھے۔ گاؤں کے عام رواج کے مطابق گھر کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔

آنے والا سامنے ہی کھڑا تھا اور رانو کے لئے اس گہری سانولی رنگت اور موٹے نقوش والے کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ اس گاؤں کا نہیں تھا۔

"ملکے کا گھر یہی ہے نا؟" اس نے رانو پر گہری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں، پر اس وقت ملکا گھر پر نہیں ہے۔" رانو کو اس اجنبی کی صورت اور انداز دونوں ہی پسند نہیں

آئے۔ رکھائی سے جواب دے کر پلٹ جانا چاہا۔

"کدھر گیا ہے وہ؟ کب تک آ جائے گا؟" اتنی مختصر بات نے اجنبی کی تسلی نہیں کی، وہ پھر سے سوال کرنے لگا۔

"پتہ نہیں، اس کے آنے کا کوئی وقت نہیں ہوا کرتا۔ جب جی چاہے گا آ جائے گا۔" اس نے اتنا کہہ کر دروازہ بھی بھیڑ دینا چاہا مگر اجنبی نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی دروازے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"یہ تو پتہ ہوگا وہ گیا کہاں ہے؟" ایسا کہتے ہوئے مسکرایا اور اس کے گندے بدصورت دانت نمایاں ہو کر اس کی صورت پر اور بھی برا تاثر پھیلا گئے۔

"مجھے نہیں پتا۔ جاؤ جا کر چوپال پر دیکھ لو۔" اب کے رانو کا انداز کچھ جھڑک دینے کا سا تھا۔

"وہ تو میں دیکھ ہی لوں گا۔ یہ بتاؤ تم کون ہو؟ ملکے سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ اور میں بھی یہ بتا دوں، کوئی عام بندہ نہیں ہوں۔ چوہدری اللہ بخش کو تو جانتی ہوگی، وہی جس کے بارے میں مشہور ہے علاقے میں جو بھی تھانیدار آتا ہے سب سے پہلی چوہدری اللہ بخش کے سلام کو حاضر ہوتا ہے، اگر چوہدری کو پسند آ جائے تو ٹھیک ورنہ اسے واپسی کی تیاری کرنا پڑتی ہے۔ میں اسی چوہدری اللہ بخش کا خاص آدمی ہوں۔"

"کیا تم یہیں کھڑے رہنا چاہتے ہو؟" اس نے سب سن کر بھی کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں تم چاہو تو اندر بلا لو۔" اس نے ہلکے سے قہقہہ لگایا۔

رانو کی ناگواری مزید بڑھ گئی۔ اس نے ایک نظر بندھے ہوئے کتوں کو دیکھا اور سوچا۔ "اچھا ہوتا یہ کتے کھلے ہوتے۔" اور واپس پلٹنے لگی۔

"چھوری! تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟" اس نے اس کی کھردری آواز سنی ضرور مگر رکی نہیں، جا کر اماں سے بولی۔

"باہر ایک بدصورت آدمی آیا ہے، بھرا کا پوچھتا ہے۔ میں نے کہا بھی گھر میں نہیں ہے پر وہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ تو خود ہی جا کر نبٹ۔" "ایسا کون سا آ گیا جسے تو نے پہچانا نہیں ہے رانو!"

"وہ اپنے پنڈ کا نہیں ہے۔ کہہ رہا ہے ساتھ والے پنڈ کے چوہدری اللہ بخش کا آدمی ہے۔"

"چوہدری اللہ بخش، جس کے متعلق کہا جاتا ہے مشہور رسہ گیر ہے اور پولیس میں بڑی پہنچ ہے۔"

اس کی ماں ایک دم سے سب کام چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے رانو سے بولی۔

"اچھی سی چاء بنا اور تل کے لڈو رکھے ہیں، چاء کے ساتھ وہ بھی لیتی آنا اور سن دو انڈوں میں ملائی اور چینی ڈال کر پکا کر وہ بھی ساتھ لیتی آنا۔ چوہدری اللہ بخش کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اگر اس کا بندہ ہمارے دروازے پر آیا ہے تو خاطر خدمت کے بغیر واپس نہیں جانا چاہئے۔"

"ہونہہ خاطر خدمت۔ اماں، پہلے اس نحوست مارے کی شکل دیکھ جا کر۔ میرا تو جی چاہ رہا ہے اس پر کتے چھوڑ دوں شدا لفنگا۔"

"اڑی چپ کر۔ میں جو کہتی ہوں وہی کر۔" اماں اتنا کہہ کر سامنے والے حصے میں چلی گئی۔

''یہ بھرا نے بھی عجیب عجیب لوگوں سے دوستیاں بڑھالی ہیں۔ یہ سب دو سالوں سے ہی ہوا ہے۔ پہلے یہ سب نہیں تھا۔ بھرا ابا کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتا تھا اور شام میں دوستوں کے ساتھ کبڈی کھیلتا تھا، پر اب تو وہ بدلنے لگا ہے۔ اس کے دوستوں میں نئی نئی شکلیں سامنے آ رہی ہیں اور بھرا اکثر گھر سے غائب بھی تو رہنے لگا ہے۔ پتہ نہیں اماں ابا سے پوچھتے کیوں نہیں۔ پتہ تو چلے، آخر وہ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے۔ اللہ سوہنے میرے ویر کی خیر کر۔ اسے زمانے کی تتی (گرم) ہوا سے بچائے رکھنا۔'' وہ چائے بناتے انڈے میں بالائی اور میٹھا ڈال کر پھینٹے اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اس کے خیر کی دعا بھی مانگے جا رہی تھی۔

''بڑی دیر کردی چاء بنانے میں۔'' کچھ ہی دیر کے بعد اس کی ماں دوبارہ پلٹی تھی۔

''سب تیار ہے اماں! اچھا ہوا تو آ گئی۔ یہ لے سب خود ہی لے جا۔''

''رانو! پتہ نہیں ملکا کب تک آئے گا۔ یہ آدمی کہتا ہے ملکے کو چوہدری کا کوئی خاص پیغام دینا ہے۔ اس لئے اس سے مل کر ہی جائے گا۔ تو ذرا جلدی جلدی ہانڈی روٹی کر لے، اب اسے روٹی کھلا کر ہی بھیجیں گے۔ بڑے بندے کا خاص آدمی ہے، کہیں ایسا نہ ہو اس کے روٹی کھائے بغیر جانے کا سن کر ملکا ناراض ہو۔''

''یہ بھرا نے بھی کیسے کیسے لوگوں سے دوستیاں رکھ لی ہیں۔ اب یہ چوہدری اللہ بخش سب جانتے ہیں کتنا برا آدمی ہے، اب اس کا آدمی ہمارے دروازے تک بھرا کو ملنے آیا ہے۔ اس سے یہی پتہ چلتا ہے ناں کہ بھرا کا ان لوگوں میں بھی اٹھنا بیٹھنا ہے۔''

اماں ہنس پڑی۔ ''کڑیے، تو اس طرح کی سوچیں نہ پال۔ بھلا گھر کی عورتوں کا ایسی باتوں سے کیا واسطہ۔ ملکا اگر کچھ غلط کرے گا تو پھر تیرا ابا خود ہی اسے روک لے گا۔ بھائی کے سامنے تو ایسی بات منہ سے نکالنا بھی نہیں۔ برا مانے گا۔ زیادہ غصے میں آ گیا تو تجھے دو ہاتھ بھی جڑ دے گا۔''

''ٹھیک ہے اماں! کچھ نہیں کہوں گی میں۔ بس اپنے بھائی سے پیار ہے نا۔ فکر رہتی ہے اس کی۔ اس لئے یہ سب سوچے بغیر میں رہ نہیں سکتی۔''

''بھرا سے پیار نہیں ہوگا تو پھر کس سے ہوگا۔ بھرا تو مان ہوا کرتے ہیں، ان سے بڑی دولت اور کوئی نہیں ہے۔ اپنے بھائیوں پر جان بھی وار دیں تو کم ہے، تیرا ویر تو لاکھوں میں ایک ہے۔ بہادر، سچا، کھرا، سوہنا جوان۔ ماں پیو تو دیکھ دیکھ جیتے ہیں۔ دُعائیں کرتی ہوں اس کے لئے کہ رب میرے پتر کو گرم ہوا سے بچائے۔ اسے کبھی کوئی زخم نہ لگے۔''

اماں کے لہجے میں بیٹے کی محبت ہی محبت تھی اور اس محبت پر رانو کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ بھائی میں تو اس کی بھی جان تھی۔

مہمان نے چائے پی پھر روٹی بھی کھالی۔ ملکا ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ کتوں کو پتہ چل گیا تھا اجنبی اس گھر کے رہنے والوں کا مہمان ہے اس لئے اب اُنہوں نے بھونکنے کا شغل ترک کر دیا تھا۔ اب وہ اس کی جانب دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ اجنبی کو چائے پلاتے، روٹی کھلاتے، اماں قریب ہی بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

سہ پہر میں جب رانو لحافوں میں ڈورے ڈالنے کے لئے بیٹھی تھی، اسی وقت ملکا چلا آیا۔

''مہمان آیا ہے میرا۔ اس کی کچھ خاطر تواضع بھی کی تم لوگوں نے یا نہیں۔ وہ بڑا خاص آدمی ہے اور دوسرے گاؤں سے آیا ہے۔''

''سب کچھ کیا ہے پتر! تو فکر نہ کر۔ وہ خوش ہو کر ہی جائے گا۔ تیری پسند کا گوبھی گوشت پکایا ہے۔ مکھن ڈال کر دیا ہے اسے اور اس کو پسند بھی بہت آیا۔ کہتا ہے ایسی اچھی ہانڈی کھا کر سواد آ گیا۔''

''اچھا اچھا تم عورتوں کو تو اماں بس اپنی تعریف کرنے کی عادت ہوا کرتی ہے۔ بات کوئی بھی ہو بس لے آؤ گی اپنے پر۔ رانو، جلدی سے اٹھ کر میرے لئے روٹی ڈال، سخت بھوک لگ رہی ہے اور سن سالن کو مکھن کا تڑکہ لگا دینا۔ ساتھ میں ایک مولی بھی کاٹ دے اور سن کاغذ جیسے پھلکے نہ لگا دینا۔ روٹی ذرا موٹی رکھنا۔ کھاتے ہوئے پتہ تو چلے۔''

''ٹھیک ہے بھرا، جیسے کہتے ہو ویسے ہی بنا کر دوں گی۔ تم کھانا شوق سے کھالو۔

''اور سن، دودھ پتی بھی بنا دینا۔ میں باہر مہمان کے پاس بیٹھا ہوں، سب تیار ہو جائے تو لے آنا۔''

ملکا اتنا کہہ کر باہر چلا گیا۔ رانو نے اس کی فرمائش کے مطابق سب تیار کیا اور اماں اٹھا کر باہر لے گئی۔

''اے رانو! تجھے پتہ ہے ماسی شیدی کی بیٹی کا بیاہ ہو رہا ہے۔''

پینی بھاگتی ہوئی آئی تھی اور ہاتھ میں پکڑی گڑ کی ڈلی بات کی صداقت کے طور پر رانو کو دکھائی تھی۔

''اچھا کب؟'' وہ جو ڈورے ڈالنے لگی تھی سب چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے پینی!''

''ماسی کی چھوٹی بیٹی گڑ کا تھال اٹھائے بلاوے کے پیغام کے ساتھ سب کے گھر جا رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم لوگوں کے گھر بھی آ جائے گی۔''

''بڑا مزا آئے گا۔ میں اماں سے کہہ کر اپنا گوٹے ستاروں والا سوٹ نکلوالوں گی اور مہندی والی رات پہنوں گی۔''

''چل چل رہنے دے۔ تیری اماں تیرے جہیز کے کپڑے کبھی نہیں نکال کر دے گی۔''

''میں منت کرلوں گی اماں سے۔ بس ایک بار پہن لینے دے، خراب تھوڑی کروں گی۔''

''میں کہے دیتی ہوں، تیری اماں کبھی نہیں مانے گی۔'' پینی کھلکھلائی تھی۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ ماسی کی بیٹی گڑ سے بھری پرات اٹھائے چلی آئی۔

''آؤ نھو! یہ گڑ کا تھال اٹھائے کیوں پھر رہی ہو؟'' رانو نے ہنس کر کہا تھا۔

''تم ہی بتاؤ۔ بھلا گڑ کا تھال اٹھا کر گھر گھر کب جایا کرتے ہیں؟'' لڑکی بھی تیز تھی پھر جو نظر گڑ کھاتی پینی پر پڑی تو چلّا کر بولی۔

''مجھے بے وقوف بنا رہی ہو، تم سب جانتی ہو۔ پینی تمہیں سب بتا چکی ہے۔''

اور تینوں لڑکیاں آزاد، بے فکری خوب صورت ہنسی ہنسنے لگیں۔

"جنتو میراثن تو بیمار ہے۔ اس بار ڈھولکی پر رونق کیسے لگے گی۔" جنتو کی بھابھی پار چنا (چناب) سے آئی ہوئی ہے، کیا آواز ہے اس کی۔ بچی اور گونگلی، یہاں گاتی ہے اور ساتھ کے گاؤں میں بھی پتہ چلتا کہ شادی ہو رہی ہے۔ جنتو کہہ رہی تھی نہ ویسے تو میں بھی اب ٹھیک ہوں پر میری بھابھی اس بیاہ پر گانے میں میرا ساتھ ضرور دے گی۔ ہم دونوں مل کر وہ رونق لگائیں گے کہ لوگ مدتوں یاد ہی کریں گے۔"

"پھر تو مزا آجائے گا۔ اے پنی! تیرا بھائی شہر جاتا رہتا ہے اس سے کہہ کر مجھے فیشن والے جھمکے اور ایک ہار تو منگوادے۔"

"رانو تو جانتی تو ہے میرے بھائی کے مزاج کو۔ کبھی نہ مانے گا۔ تیرا بھائی ملکا بھی تو پھرتا پھراتا رہتا ہے۔ اس سے کہہ کر دیکھ۔" "میرا ویر شہزادہ ہے شہزادہ۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں وہ بھلا کہاں خریدے گا۔"

"چل بس پھر بیٹھ جا آرام سے۔ سب کو اپنے ویر شہزادے، راجے، نواب ہی لگتے ہیں۔ تیرا بھائی اپنی بہن کے لئے نہیں لاسکتا تو میرا ابھرا بہن کی سہیلی کے لئے کہاں سے لائے گا۔"

پنی کی بات سچی تھی۔ یہاں سارے مرد ایک سے مزاج کے تو تھے، نخریلے بات بات پر بھڑک اٹھنے والے۔ گھر کی عورتوں پر بے جھجک ہاتھ اٹھادینے والے اور ساری عورتیں بھی ایک سی تھیں۔ ان کی سلامتی کی دعائیں مانگنے والی، انہیں دیکھ دیکھ کر جینے والی اور ان پر فخر کرنے والی۔

☆......☆......☆

شیدی کی بیٹی صابرہ کی شادی کی رسمیں شادی سے آٹھ روز پہلے شروع ہوگئیں۔ رانو کے لاکھ زور دینے پر بھی اماں نے وہ گوٹے ستاروں والا سوٹ نکال کر نہیں دیا۔

"اماں! بس تھوڑی دیر کے لئے پہنوں گی۔ بچی خراب نہیں کروں گی بس اسی طرح لاکر پھر سے صندوق میں ڈال دوں گی۔"

"اڑی نکمی! بے وقوف! جب سارا گاؤں تیرے تن پر وہ سوٹ دیکھ لے گا پھر اسے داج میں لگائے گی، زمانہ کیا کہے گا۔ لوگ باتیں بنائیں گے کہ دھی کو پرانے کپڑے دے کر ٹور دیا، نہ بھئی مفت کی ہنسی اڑے گی۔ میرا دماغ تیری طرح خراب نہیں جو میں داج (جہیز) کے کپڑے ابھی سے تجھے نکال کر پہنادوں۔"

وہ اور بھی ضد کرتی مگر اسی وقت ملکا گھر آگیا اور اسے منہ بند کرنا پڑا کہ ملکے کو عورتوں کا ضدی پن ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اس وقت ملکے کی ڈانٹ سننے یا اس سے ایک آدھ بھاری ہاتھ کھانے کے موڈ میں نہیں تھی اس لئے صبر کے گھونٹ پی کر اس نے اپنا گلابی جوڑا نکالا جس پر اس نے کالے دھاگے سے شیشے لگا کر کڑھائی کی تھی اور جو سوٹ وہ دو سال سے ہر بیاہ شادی پر پہن رہی تھی اور یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں تھی۔ یہاں عورتیں ایسا ہی کرتی تھیں۔ ایک دو ریشمی کپڑے بنوالئے اور سالوں اسی میں گاؤں کے ہر گھر کی تقریبات نپٹالیں۔ اسے یہ گلابی جوڑا صرف آج ہی نہیں بلکہ مہندی کی تقریب تک روزانہ پہن کر جانا تھا۔ ہاں شادی میں شامل ہونے کے لئے اس کے پاس ایک دوسرا جوڑا رکھا تھا جو دو سال پہلے اس کی مامی اسے عید پر دے کر گئی تھی۔ سنہرے تلے والے پراندے اس نے گھر میں بنائے تھے۔ ان میں سنہری گھنگھرو بھی ڈالے تھے۔

ایک پراندہ پنی کو دیا، ایک اپنے لئے رکھا۔ چاندی کے جھمکے، چوڑیاں، انگوٹھی، سب گیہوں کے چھان سے مل مل کر گرم پانی سے دھوئے تھے۔ گلے کے لئے اس کے پاس کالے سفید موتیوں کا ہار تھا جو اسے بڑا پسند تھا۔ شہر میں کیا فیشن چل رہا ہے ان لڑکیوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بس کپڑا ریشمی ہونا چاہئے۔ اس پر موتی، ستارے، شیشے وغیرہ وہ خود ٹانک لیں گی۔ ڈھیلے ڈھالے انداز میں سی لیں گی۔ جب پہنیں گی تو آنکھوں میں کاجل کی دھار اور ہونٹوں پر دس روپے میں خریدی سرخی لگالیں گی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ تیاری مکمل ہے۔

ایسی ہی تیاری شام کو رانو نے بھی کی تھی۔ آئینہ دیکھ کر وہ مطمئن ہو کر مسکرادی تھی۔ اللہ نے اسے اچھی صورت سے نوازا تھا۔ اپنی خوب صورتی کا اسے خود بھی احساس تھا اور وہ حسن پرست بھی تھی۔ رکھی کہتی۔

"تیری پسند بڑی اونچی ہے اور جو تیرے ماں پیو نے کسی کالے کلوٹے کو تیرا ہاتھ سونپ دیا پھر تو کیا کرے گی رانو؟"

"ایویں خوامخواہ، تو جانتی ہے میری ماں، میرا ابا اور میرا بھائی سب ہی اچھی صورتوں کے مالک ہیں۔ وہ بھلا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کیوں لگائیں گے؟"

"پتہ نہیں ماسی شیدی نے اپنی بیٹی کا بر کیسا چنا ہے۔ ویسے صابرہ خود بھی کچھ خاص صورت والی تو نہیں ہے۔"

وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلی۔ اماں ابھی تک اسی میلے کچیلے حلیے میں چولہے کے پاس بیٹھی آگ جلا رہی تھی۔ "یہ کیا کر رہی ہے اماں! چلنا نہیں ہے کیا؟"

"ناں بھلا میرا کیا کام۔ آج تو سب لڑکیاں ہی جمع ہوں گی۔"

"چلی چلتی اماں! اتنی تو رونق ہوگی۔"

"تو جا اور سن راستے سے پنی کو ساتھ لے لینا۔ میں گھر پر ہی رکوں گی۔ ملکا صبح سے ساتھ والے گاؤں گیا ہوا ہے۔ اب تو آتا ہی ہوگا۔ میں اس کے لئے روٹی پانی کا بندوبست کرلوں۔"

"اچھا اماں! پھر میں چلتی ہوں۔" اس نے پراندے کو آخری بل دے کر گرہ لگائی اور دوپٹہ اٹھا کر اوڑھنے لگی۔

"آج موسم بھی بے اعتبار سا ہو رہا ہے۔" اماں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

"ڈرتی کیوں ہو اماں! میں کوئی اکیلی تھوڑی جا رہی ہوں۔ سارے گاؤں کی لڑکیاں ہوں گی۔"

وہ بے فکر اور لاپرواسے انداز میں کہہ کر بیرونی دروازے کی جانب چل پڑی تھی۔

جس وقت وہ پنی کے گھر پہنچی۔ پنی اپنا سبز سوٹ پہنے تیار تھی۔ اس پر پنی نے رانو سے ہی ڈیزائن مانگ کر شیشے لگائے تھے، بس اتنا ہی فرق تھا۔ اس نے گلابی سوٹ پر کالے دھاگے سے شیشے لگائے تھے، پنی نے سبز سوٹ پر سرخ دھاگے سے لگائے تھے۔ دونوں لڑکیاں اب رکھی کے گھر جا رہی تھیں۔ اسی طرح وہ سب راستے میں آنے والے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر لڑکیوں کو بلاتیں اور اکٹھی ہو کر آگے بڑھنے لگتیں۔

جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھیں، ڈھولک کی آواز صاف اور واضح ہوتی جا رہی تھی، کچھ آگے بڑھیں تو گانے کی آواز بھی آنے لگی تو لڑکیوں کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ جلد سے جلد وہاں پہنچ کر اس رونق حصہ بن جانے کو بے تاب ہونے لگیں۔

جب لڑکیوں کا یہ گروہ شیدی کے دو کچے کمروں اور کھلے کچے آنگن والے گھر میں داخل ہوا اس وقت جتنے میراثن گا رہی تھی اور اس کی موٹی گہرے رنگ والی بھابھی کمر پر دوپٹہ باندھے ناچ رہی تھی پھر اس نے وہ گھڑا جو میراثن بجا رہی تھی۔ اپنے دانتوں میں پکڑ کر اٹھا لیا اور دانتوں میں گھڑا دبا کر جب اس نے گول گول چکر لگائے تو حاضرین اپنی حیرت اور مسرت کو دبا نہیں سکے۔ لڑکیاں تالیاں بجا رہی تھیں۔ پھر لڑکیوں نے لڈی ڈالی۔ لڑکی کی خالہ، پھپھو نے ابٹن گوندھا، رشتے کی بہنیں لڑکی کو لال گوٹے والا دوپٹہ اوڑھا کر رنگلے پیڑھے تک لائیں۔

اس موقع پر مہمانوں کو بھنی ہوئی گندم گرم گرم شکر اور اب اس شکر پر گھی کی تہہ لگ چکی تھی، کھانے کو دی گئی۔ مہمانوں نے اسے بڑی رغبت اور خوشی سے کھایا۔ ہنسی مذاق بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہوائیں تیز ہونے لگی تھیں اور بجلی بھی بار بار مگر ابھی دُور چمک رہی تھی۔ لڑکی کے سسرال والے مہندی اور تیل لگانے کی رسم کرنے آ چکے تھے۔

لڑکی کو رنگلے پیڑھے پر بٹھاتے ہی رسم اور رسم کے ساتھ ہنسی مذاق اور ایک دوسرے پر چوٹ کا آغاز ہو گیا۔ میراثن نے بھی موقع کی مناسبت سے گیت کے بول اٹھا کر مزید جوش پیدا کر دیا۔

ہواؤں میں تیزی آ گئی۔ چاند بادلوں میں چھپنے لگا اور بجلی کہیں قریب ہی چمک رہی تھی پھر ہواؤں کی اس تیزی نے آندھی کی شکل اختیار کر لی۔

رشتہ دار عورتیں موسم کے تیوروں کی پروا نہ کرتے ہوئے رسموں میں لگی ہوئی تھیں، جبکہ گاؤں سے آئی عورتوں اور لڑکیوں کو اب واپسی کی جلدی تھی۔

''تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ کڑیو! میں تمہارے ساتھ کسی کو بھجواتی ہوں۔'' آندھی میں جب سرخی آنے لگی تو سب ہی گھبرا گئیں اور ماسی لڑکیوں کو اکیلے بھیجنے کی بجائے کسی مرد کو ساتھ کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔

جب لڑکیوں نے دوپٹے اوڑھے، پاؤں میں ایڑی والے سینڈل ڈالے تب تک ماسی نے اپنے بھانجے کے ہاتھ میں لالٹین دے کر اسے ان لڑکیوں کے ساتھ ان کے گھر کے دروازے تک چھوڑ کر آنے پر راضی کر لیا تھا۔

''ہائے ربا!'' لڑکیوں نے جب اس اونچے لمبے چوڑے جوان کو دیکھا تو عمر کے لاابالی پن کے باعث دلچسپی چھپا نہیں سکیں۔ وہ چپکے چپکے کچھ کہہ کر زور سے ہنسنے لگیں۔ لڑکے نے ایک نظر ان ہنستی، مسکراتی، شوخ لڑکیوں پر ڈالی مگر قریب ہی کھڑی اپنی ماسیوں، پھپھیوں کے ڈر سے مسکراہٹ دبا لی۔

''ارے رانو! میری تو چاچی ادھر رسم پر آئی ہوئی ہے ان کا گھر قریب ہی ہے، میں رات ادھر ہی ٹھہر جاؤں گی تم میرے گھر میں پیغام دے دینا۔''

''بڑی بری ہے نی تو!'' رانو نے اسے ایک دھپ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''تجھے تو پتہ ہے مجھے ایسے موسم سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اتنی دور گھر ہے، میں نہیں جا سکتی بس تو میری اماں کو بتا دینا میں چاچی کے گھر رات گزار کر سویرے ہی گھر آ جاؤں گی۔''

پنی اتنا کہہ کر اپنی چاچی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اس نے رکھی کے پاس آ کر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''آندھی اتنی تیز ہے کہ لگتا ہے اڑا کر لے جائے گی۔''

وہ جوان مرد جسے شیدی ماسی نے اچھو کہہ کر بلایا تھا، آگے آگے تھا اور لڑکیوں کی ٹولی اس کے پیچھے پیچھے۔ آندھی کا زور اتنا تھا کہ آپس میں بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں مٹی چبھ رہی تھی اور انہیں تیز چلنے میں شدید دشواری کا سامنا تھا۔

پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بارش کے موٹے موٹے قطرے پڑنے شروع ہوئے جس نے دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے سب سے بہترین کپڑے زیب تن کرنے والی یہ غریب گھرانوں کی لڑکیاں کپڑے خراب ہونے پر سوائے دل ہی دل میں افسوس کرنے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے کیچڑ میں قدم جمانے کی کوشش کرتی اندھیرے میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ لالٹین کی کمزور زرد روشنی اس تاریکی کو کاٹنے کے لئے سخت ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔

جس لڑکی کا گھر قریب آ جاتا وہ عجلت میں ساتھ والی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دیتی تھی۔

وہ دیہات کی رہنے والی سخت موسموں کی عادی جفاکش لڑکیاں تھیں مگر تاریکی بڑی ظالم شے ہے اور ہوائیں جب بپھر کر گول گول چکراتی ہیں تو ان کی آواز خوف پیدا کرتی ہے۔ ان پڑھ دیہاتی ثقافت رات کی تاریکی اور ہواؤں کے شور پر کئی کہانیاں کہتی ہے اور یہ کہانیاں بچپن سے ہی دل کے اندر ایک خوف بٹھا دیتی ہیں۔

آج وہی کہانیوں والا موسم اور ویسا ہی شور تھا بس اسی وجہ سے لڑکیاں سہمی جاتی تھیں۔ درختوں کے جھرمٹ قریب آتے تو وہ اور بھی سمٹ جاتیں اور درختوں کے جھرمٹ سے نظر چرانے لگتیں کہ بزرگ کہتے آئے تھے ایسے موسم میں بھوت پریت انسانی صورت بنا کر ان درختوں کے نیچے آ کھڑے ہوتے ہیں اور آنے والے مسافروں کو اپنی طرف پکارتے ہیں۔ ان کی پکار سننے والا بے اختیار اُن کی جانب بڑھنے لگتا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

لڑکیاں اپنے اپنے گھر میں داخل ہوتی رہیں تعداد کم ہوتی گئی اور جب رکھی بھی اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی تو اکیلی رہ جانے والی رانو نے خوف کے مارے جھرجھری سی لی۔ پہلے سوچا کہ وہ رکھی کے ساتھ ہی اس کے گھر چلی جائے مگر پھر اپنے بھائی ملکے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ اس بات پر بہت برا مانتا اور اسے غصے میں ہاتھ بھی اُٹھاتے دیر نہ لگتی۔ رکھی منتظر نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی، اس نے مجبوراً

کہہ دیا۔''تم جاؤ میں اپنے گھر تک ہی جاؤں گی۔''
رکھی چلی گئی اور پیچھے رانو اور اچھو رہ گئے۔ اچھو جو پہلے ان سے چار قدم آگے چل رہا تھا، واپس پلٹا
اپنے کندھے پر رکھے گیلے رومال کو نچوڑ کر اس نے لالٹین کا شیشہ صاف کرنے کی کوشش کی پھر لالٹین اوپر اٹھا
کر رانو کی جانب دیکھا روشنی دھندلی تھی مگر ایک خوب صورت جوان بھیگے کپڑوں میں انگ انگ نمایاں کرتی
لڑکی کا عکس بھلا کس طرح دھندلا ہو سکتا تھا۔ وہ لالٹین والا ہاتھ نیچے کرنا بھول گیا۔ بجلی چمکی تو اس نے وہ بھی
دیکھ لیا جو لالٹین کی لرزتی روشنی نہ دکھا سکی تھی اور کڑک سے سہم کر رانو اس کے کچھ اور بھی قریب آ گئی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''رانو!'' اس نے گیلے دوپٹے کو سینے پر پھیلاتے اور پریشان نظروں سے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتے
ہوئے جواب دیا تھا۔

''میرا نام اسلم ہے۔ سب مجھے اچھو کہتے ہیں۔ میرا پنڈ یہاں سے کچھ دور ہے۔

''سنو اسلم! کان لگا کر سنو۔ کچھ غیر معمولی شور سنائی دیتا ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں میرے پاؤں
کے نیچے پانی بہت بڑھ گیا ہے۔'' اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ اسلم کو بھی خاموش ہو کر کان لگا کر سننا پڑا۔
بارش اور ہواؤں کا شور تو تھا مگر اس کے ساتھ کچھ اور بھی آوازیں تھیں اور واقعی پاؤں کے نیچے بہنے والے پانی
کی رفتار بہت بڑھ گئی تھی۔

''ہمیں راستہ بدل لینا چاہئے رانو! پانی بہت تیز ہے اور آوازیں بتا رہی ہیں کہ آثار اچھے نہیں۔ شاید نہر
میں سیلاب چڑھ گیا ہے یا کسی کھالے کا بند ٹوٹ گیا ہے۔'' اس کے لہجے میں بھی تشویش تھی۔

''ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔ تم اس گاؤں کے راستوں سے واقف نہیں ہو گے جس
طرف ہم جا رہے ہیں، ادھر سے سیلابی پانی بڑھتا جائے گا۔ ہمیں بائیں طرف ہو جانا چاہئے۔'' دونوں نے
ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور آگے بڑھنے لگے۔ ایک بار رانو کا پاؤں پھسلا مگر اسلم نے بروقت
سنبھال لیا مگر اس کوشش میں وہ اس کے بہت قریب آ گئی اور اتنے شور میں بھی اب جو شور سب سے بلند تھا وہ
ان دونوں کی دھڑکنوں کا شور تھا۔

اور جب یہ شور بلند ہوا تو ساری آوازیں گم ہو گئیں، ہر سو سکوت چھا گیا۔ رانو گھبرا کر اس کے بازوؤں
کے گھیرے سے نکل آئی۔ کچھ دیر دونوں ہی کچھ بول نہیں سکے پھر اسلم نے پہل کی۔

''ادھر تاریکی بھی ہے، مجھے لگتا ہے یہاں آبادی بھی نہیں ہے۔ اگر ریلا ادھر آ گیا تو ہم مدد کے لئے
پکارتے ہی رہ جائیں گے۔ تم بتاؤ آبادی یہاں سے کس طرف اور کتنی دور ہو گی؟''

رانو نے اس کی بات سے پورا اتفاق کیا اور وہ آبادی سے ہٹ کر ٹیلے کی جانب بڑھنے لگی۔ اس نے
محسوس کیا تھا کہ آوازیں ٹیلے کی جانب سے ہی آ رہی ہیں اور ایسے کڑے وقت میں ٹیلا ہی پناہ گاہ ثابت ہو سکتی
تھی۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا، یہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں بچوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مرد
یقیناً پانی کے اس ریلے کے آگے بند باندھنے گئے ہوئے تھے۔

برستے طوفان میں کھلے آسمان کے نیچے بے یقینی کے ساتھ بسر ہونے والی یہ رات بڑی عجیب تھی۔
پھر بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ بند بھی باندھا جا چکا اور کچھ دیر کے بعد پو پھٹنے لگی۔

''اب میں ادھر سے چلوں میرا گھر تو اونچی جگہ پر ہے وہاں تک پانی نہیں آتا۔ میں چلتی ہوں۔ میرے
گھر کے سب لوگ میرے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''تمہارے گھر میں کون کون ہے؟''

''میری اماں، میرا ابا اور میرا ویر اس کا نام ملکا ہے اور وہ بہت زور آور جوان ہے۔ سارے گاؤں میں
اس کی بہادری اور طاقت کا چرچا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر اپنے بھائی کی طرف سے ہی ہے۔ وہ بڑا اتھرا
ہے۔ میں ساری رات گھر سے باہر رہی ہوں۔ پتہ نہیں اس بات پر اس کا مزاج کیسا ہوگا۔''

''ڈرو نہیں۔ تمہارے اماں ابا تو سمجھ دار ہیں نا۔ تم ان کو سمجھا لینا پھر بیٹے سے وہ خود ہی بات
کر لیں گے۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔''

''پھر کب ملیں گے؟'' اچھو نے بے اختیار پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں پانی گاؤں میں کہاں تک اندر آ گیا ہے۔ اگر رشیدی ماسی کا گھر محفوظ رہا ہے پھر تو ملاقات
ہوتی رہے گی کہ اس کی بیٹی کی شادی تک تو تم بھی ادھر ہی رہو گے۔''

''صرف شادی تک ہی نہیں، میں تو اب تم سے ملنے اس گاؤں میں آتا رہوں گا رانو! رب کی قسم کھا کر
کہتا ہوں اب تجھے دیکھے بغیر مجھے چین ہی نہیں پڑے گا۔''

''مردوں کی بات کا کیا اعتبار۔'' وہ اعتبار تو کر چکی تھی پھر بھی کہہ رہی تھی۔

''آزما کر دیکھ لینا رانو! اچھو اب تمہارا ہے۔ اس کے دل میں تم ہو، تم ہی رہو گی۔''

''اچھا، پھر رب راکھا!'' اس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ دوڑ گئی پھر اس نے جانے کے لئے قدم
بڑھا دیئے۔ اچھو تب تک ٹیلے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا جب تک وہ موڑ مڑ کر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے غائب
نہیں ہو گئی۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی صرف اماں ہی سامنے بیٹھی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بے
تابی سے رانو کہہ کر اس کی جانب لپکی پھر اس کا حلیہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''اماں! ہم سب لڑکیاں تو طوفان کے زور سے پہلے ہی ماسی کے گھر سے نکل آئی تھیں بس راستے میں
مت پوچھو کیا حال ہوا اور پھر رات ٹیلے پر گزاری ہے جہاں ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔''

''ہاں پتر! کل کی رات بڑی خوفناک رات تھی۔ بند ٹوٹنے کا شور تھا۔ تمہارا ابا اور بھائی گاؤں کے
دوسرے مردوں کے ساتھ رات ہی سے ادھر ہیں۔''

''اوہ اچھا، وہ دونوں گھر پہ نہیں ہیں۔'' اس نے سکون سے گہرا سانس لیا تھا۔

''ہاں پر تو نے اتنا لمبا سانس کیوں کھینچا ہے؟''

''پتا ہے اماں! میں تو ساری رات ادھر ٹیلے پر اندھیرے اور طوفان میں بیٹھی بھی ڈرتی رہی کہ جب میں

اس طوفان سے بچ کر گھر پہنچوں گی تو پتہ نہیں وہاں سے کتنا بڑا طوفان بھائی کے غصے کی شکل میں میرے سامنے ہوگا۔ یہ سن کر کہ ابا اور بھائی گھر پر نہیں ہیں سمجھو میرے تو سر سے ایک جیسے بوجھ اتر گیا ہے۔''

''ہشت پگلی! ایسے نہیں کہتے۔ کبھی گھر کے مردوں کے گھر سے دور ہونے پر خوش نہیں ہوتے۔ اری تو کیا جانے عورت ذات کی اوقات ہی کیا ہے۔ اس کا مان، اس کی طاقت تو اس کے گھر کا مرد ہوتا ہے، چاہے کچھ بھی ہو، بس اپنے مان، اپنی طاقت کی ہمیشہ حیاتی کی دعا ہی مانگنی چاہیئے۔''

''اچھا اماں! میں ذرا نل سے بالٹی بھرلوں پھر نہا دھو کر کپڑے بدلتی ہوں۔ دیکھ تو ذرا میرے اتنے پیارے سوٹ اور جوتی کا کیا حال ہوا ہے۔ ادھر بارش شروع ہوئی، ادھر میں نے جوتی پیروں سے اتار کر دوپٹے کے پلو سے باندھ لی تھی مگر یہ پھر بھی بھیگ کر خراب تو ہوئی ہی ہے۔''

''اچھا چل تو پانی بھر کے نہالے پھر میں روٹی ڈالتی ہوں۔ تیرا ابا اور بھائی بھی تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے۔ اب ان کے سامنے ساری کہانی نہ کہنے بیٹھ جانا۔ میں خود ہی بات کرلوں گی۔''

''ٹھیک ہے اماں! جیسا تو کہے۔ وہ بالٹی نل کے نیچے رکھ کر پانی بھرنے لگی پھر اندر جا کر اپنے دوسرے کپڑے نکالے، بال کھولنے لگی تو پراندے پر نظر پڑی۔

''آئے ہائے کتنی محنت اور چاؤ سے بنایا تھا۔ اس طوفانی بارش کو بھی بس ان ہی دنوں میں آنا تھا۔''

اس نے تاسف سے سر جھٹکا پھر جلدی جلدی چوٹی کے بل کھولنے لگی۔

پھر اماں نے صبح کی روٹی بھی ڈال لی پر ابا اور ملکا ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ روٹی کھا کر وہ کچھ دیر نیند لینے کے ارادے سے لیٹ گئی۔ اس پر اماں نے غصہ بھی کیا کہ بے وقت سونا نحوست پھیلانے والی بات ہی ہوا کرتی ہے مگر وہ صرف سونا ہی تو نہیں چاہتی تھی وہ تو آنکھیں موند کر اچھو کو سوچنا چاہتی تھی۔ آج دل جس تال پر دھڑک رہا تھا، وہ بڑی انوکھی اور دلفریب تھی۔ اسے انتظار تھا کہ کب شام ہو اور کب وہ ایک بار پھر اچھو کو دیکھے۔

''میرا کچھ بھی تو نہیں لگتا مگر کیسا اپنا اپنا سا لگنے لگا ہے۔ پیار میں ایسا ہی ہوتا ہوگا، تو کیا مجھے پیار ہوگیا ہے۔''

وہ پہلے چونکی پھر آپ ہی آپ سٹ سی گئی۔ رات کا ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے آنے لگا اور اس پر جیسے نشہ سا طاری ہونے لگا۔

اماں کمرے میں آئی۔ اسے سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے دیکھا۔ دو بار پکارا، وہ جاگ رہی تھی پر چپ رہی۔ اماں اسے سوتا ہوا سمجھ کر واپس ہوگئی۔

باہر سے آتی آوازیں بتا رہی تھیں ابا اور بھرا گھر آچکے ہیں پر وہ نہیں اٹھی۔ سوچا اماں خود ہی انہیں روٹی پانی دے دے گی۔

وہ دونوں روٹی کھا کر باہر نکل گئے اور اسے اچھو کو سوچتے سوچتے واقعی نیند آگئی۔ دوپہر ہونے والی تھی جب اماں نے جھنجھوڑ کر جگایا اور ہانڈی تیار کرنے کو کہا۔

''اوہو، کیا ہے اماں! ابھی تو سوئی تھی۔'' وہ بے زار ہونے لگی۔

''ابھی؟ اری کام چور! نکمی! صبح سے سو رہی ہے۔ اٹھ کر چنے کی دال چڑھا لے۔ روٹی بھی لگا لینا۔ میں ذرا بجنتو کے گھر جا رہی ہوں۔''

اس کا جواب سنے بغیر اماں اپنی سنا کر چلتی بنی اور اسے [illegible] پھینک کر اٹھنا ہی پڑا۔

دال چڑھاتے ہوئے اس نے سوچا کہ شام ہونے میں کچھ دیر ہے۔ اسے دانتوں پر دنداسہ رگڑ لینا چاہیئے اور بازوؤں میں چوڑیاں بھی ابھی سے ڈال لے تو اچھا ہے۔

آج تیاری میں جو رنگ تھا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں رہا تھا۔ ایک ایک چیز کی فکر تھی۔ اس نے سب کچھ پہلے سے ہی نکال کر رکھ لیا تھا۔ دانتوں پر دنداسہ کیا پھر بیسن میں دودھ اور لیموں کا رس ملا کر اسے چہرے پر لگا لیا جب مل مل کر اتارا تو چہرے کی جلد پہلے سے بھی ملائم اور چمک دار نکل آئی۔ جانے سے پہلے جب کپڑے بدلے تو آنکھوں میں دنبالے دار سرمہ بھی لگا لیا۔ بال سنوار کر موتیوں والا کلپ لگایا، چوڑیاں پہنیں اور جب ساری سج دھج مکمل کر کے آئینہ دیکھا تو مطمئن ہو کر خود ہی مسکرا دی۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

آج شام جب لڑکیاں تیار ہو کر ماسی شیدی کی طرف جا رہی تھیں تو سب کے لبوں پر کل آنے والے طوفان کا چرچا تھا مگر وہ چپ تھی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ اچھو کا حال بھی اس سے مختلف نہیں رہا ہوگا جب ہی تو وہ کل کے مقابلے میں آج زیادہ سجا بنا دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ رانو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور ہونٹوں پر شناسائی کی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

رانو کچھ دیر لڑکیوں کے درمیان بیٹھی پھر چپکے سے کھسک گئی۔ کمروں کے پیچھے والے خالی حصے میں جہاں چولہے میں جلانے والا بالن اور جانوروں کا چارہ رکھا تھا اور وہیں اچھو اس کا منتظر تھا۔

چپکے چپکے، دھیرے دھیرے بہت سی باتیں ہوئیں۔ ڈر بھی تھا اور مزا بھی، ہر آہٹ پر وہ چونک اٹھتے۔ سن گن لینے لگتے پھر ہنس کر دوبارہ باتوں میں لگ جاتے۔

وہ تو جب کسی کام کے لئے اچھو کے نام کی پکار پڑی تب انہیں کل پھر ملنے کا وعدہ کر کے سب کے درمیان آنا پڑا۔

''تو کہاں رہ گئی تھی؟'' اس کی سہیلی رکھی نے اس کی غیر موجودگی کو محسوس کرلیا تھا سو آتے ہی پوچھنے لگی تھی۔

''ابھی نہیں پھر بتاؤں گی۔'' اس نے رکھی کو ٹالنے کے لئے کہا اور پوری توجہ سے گیت سننے لگی۔

گیت میں محبوب کا ذکر تھا جو بہادر ہے، باوفا ہے اور خوب صورت ہے، اس پر بہت سی حسینائیں جان دیتی ہیں مگر وہ صرف اور صرف اپنی محبوبہ کا ہے۔ وہ گیت سن رہی تھی اور تصور میں خود کو اور اچھو کو دیکھ رہی تھی۔

''اے نی، کیا بات ہے رانو! آپ ہی آپ کیوں مسکرائے جاتی ہے؟'' رکھی نے ٹھوکا دے کر اس کا تصور بکھیر دیا۔

''کیا ہے رکھی! ایک تو تجھے چین نہیں ہے۔'' وہ اس پر خفا ہونے لگی۔

''ہا، نی پاگل تو خد ہورہی ہے، سب میں بیٹھی ہے پر پھر بھی نہیں بیٹھی۔ آپ ہی آپ پتہ نہیں کیا کیا سوچ کر مسکرائے جارہی ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھتی کہ لڑکیاں تجھے دیکھ کر اشارے کرکے ہنس رہی ہیں۔''

''کیوں میرے چہرے پر ایسا کیا لگا ہے؟'' اس نے جھلا کر کہا تھا۔

''کیا ہے نی، تو ایسی کیوں ہورہی ہے رانو؟'' رکھی کی حیرت غلط تو نہ تھی۔

رانو چپ رہی پھر کچھ سوچ کر رکھی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''بات بڑی خاص ہے اور تو میری سب سے پکی سہیلی ہے۔ تجھ سے کبھی کچھ چھپایا ہے جو اب چھپاؤں گی۔ مگر یہ جگہ بتانے والی بھی تو نہیں ہے، موقع ملتے ہی بتادوں گی۔''

''اچھا ایسا کیا ہوگیا؟'' رکھی کو تجسس تھا۔

آج موسم ٹھیک تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ کسی کو جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب جانے کے لئے اٹھیں تو ماسی نے کہا۔

''کل اپنی اپنی ماؤں اور بڑی بھابھیوں کو لے کر آنا۔ کل میں سب کو صابرہ کا جہیز دکھاؤں گی اور کل صابرہ کا زیور بھی بن کر آجائے گا۔''

وہ سب باتیں کرتی گھر سے باہر نکل آئیں۔ رانو نے دیکھا اچھو دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اسے دیکھا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ سب سے نظر بچا کر اشارے سے اللہ حافظ بھی کہہ دیا اور یوں جاتے جاتے اس کے دل کی دھڑکن کو ایک بار پھر اتھل پتھل کر دیا۔

رکھی اور رانو راستے میں سب سے پیچھے چل رہی تھیں اور چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔

''اب بتا رانو! ایسا کیا ہوگیا ہے جو تو باؤلوں والی حرکت کرنے لگی ہے۔''

''تجھے رب دی سوں رکھی! جو کچھ میں بتاؤں گی، کسی سے کہنا نہیں۔ اگر کہا تو پھر یاد رکھنا وہ تیری میری دوستی کا آخری دن ہوگا۔''

''ہاہائے نی درفٹے منہ، تجھے مجھ پر ذرا بھی اعتبار نہیں جو ایسے قسمیں دے رہی ہے۔ اتنی پرانی دوستی ہے ہماری، کیا آج تک میں نے کوئی بات ادھر سے ادھر کی ہے؟''

''پتہ ہے مجھے جانتی ہوں میں۔ پر رکھی! جو اَب ہوگیا ہے، اس سے پہلے کبھی ہوا بھی تو نہیں ہے۔''

''بس تو پہیلیاں ہی بجھواتی رہنا۔'' رکھی نے چڑ کر کہا۔

''میں پہیلیاں نہیں بجھوا رہی۔ وہ بات یہ کہ رکھی، وہ ناں...... مجھے پیار ہوگیا ہے۔''

''ایں کیا......؟'' رکھی کو چلتے چلتے ٹھوکر سی لگی۔

''او نی شور تو نہ ڈال کہ سب پیچھے مڑ کر دیکھنے لگیں۔''

''سچی رانو! تو سچ کہہ رہی ہے؟'' وہ بے یقین تھی۔

''ہاں اس میں ایسا بھی انوکھا کیا ہے۔ کیا کبھی کسی کو پیار نہیں ہوا؟''

''وہ ہے کون؟'' رکھی کو تجسس ہونے لگا۔

''تو اسے نہیں جانتی وہ اس پنڈ کا نہیں ہے۔ صابرہ ماسی کا پتر ہے۔ دور پرے کے گاؤں سے آیا ہے۔ سچی کڑیل جوان ہے۔ کل وہی تو ہم لڑکیوں کو برستی بارش کے طوفان میں گھروں تک چھوڑنے گیا تھا۔''

''اور کل ہی تو اس پر مرمٹی لکھ لعنت، بندہ پہلے پرکھ ہی لیتا ہے۔'' رکھی نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''لو پاگل، محبت بھلا دیکھ پرکھ کے کی جاتی ہے۔ یہ تو اپنے آپ ہی ہوجاتی ہے۔''

''نی میری ماں، باز آجا اس چکر سے۔ جس دن تیرے بھائی کو پتہ چل گیا تیرے ٹوٹے ٹوٹے کردے گا اور اس کو بھی نہیں چھوڑے گا۔''

''نہیں پتہ چلتا بھرا کو، اور وہ کون سا پنڈ میں زیادہ آتا ہے، اب تو ساتھ کے گاؤں کے چوہدری سے دوستی ہوگئی ہے بھرا کی۔ بس اس کا زیادہ وقت ساتھ کے گاؤں میں ہی گزرتا ہے۔'' وہ نڈر ہورہی تھی۔

''پھر بھی سوچ بھلا اس کا انجام کیا ہوگا؟''

''آنے والے وقت کی رب جانے۔ میں نے تو اچھی امیدیں ہی لگائی ہیں۔''

''رانو! میں تیری سہیلی ہوں۔ تجھے غلط مشورہ نہیں دے سکتی۔ میں تو کہتی ہوں، ابھی کچھ نہیں بگڑا تو واپس آجا۔''

رانو ہنس پڑی۔

''تو کیسے کہہ سکتی ہے کچھ نہیں بگڑا۔ اڑی میرا چین قرار سب لٹ گیا ہے۔ میں تو بس کل سے اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ سارا وقت اس کی شکل میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں بیٹھی بس اسے ہی سوچتی رہوں۔ میں تو ایک ہی دن میں سارے سفر طے کر گئی ہوں۔''

''اچھا رانو! میری تو دعائیں تیرے ہی ساتھ ہیں۔ کبھی ملوانا مجھے بھی اس سے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، کل...... مگر کل تو ماسی نے اماں کو بھی بلوایا ہے۔ کل نہیں مل سکیں گے۔ ہاں پرسوں میں تیری بھی اس سے بات کراؤں گی اور سن، زیادہ تنگ نہ کرنا اسے۔''

''ہائی! ابھی سے اتنی ہمدردی!'' رکھی نے اسے ایک زوردار چٹکی بھری۔

''یہ تم دونوں کن باتوں میں لگی ہو۔ تیز تیز چلو۔''

ان کی ہنسی کی آواز نے پنی کو بھی متوجہ کردیا۔ وہ بھی اب ان دونوں کے برابر چلنے لگی۔ پنی کے آتے ہی انہوں نے موضوع بدل دیا اور صابرہ کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔

☆......☆......☆

جب رانو نے رکھی کو اسلم سے ملوایا وہ بھی تو اس کے بارے میں اچھی رائے دینے پر خود کو مجبور پانے لگی کہ وہ تھا بھی بہت اچھا اور اس کے لہجے سے سچائی ٹپکتی تھی، اس سے مل کر یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ شخص کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔

''تو بڑی خوش نصیب ہے رانو! جو تجھے ایسا چاہنے والا ملا ہے۔ رب کرے تمہارے ملنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔'' اس نے پورے خلوص سے کہا اور رانو نے اسے گلے لگالیا تھا۔

آنے والے دنوں میں تقریب کی رونق اور بھی بڑھتی گئی۔ اب رانو ادھر ادھر ہوتی تو کسی کو پتہ نہ چلتا اور پھر پیچھے اس کی رازداں رکھی بھی تو موجود تھی۔ اگر کوئی پوچھ بھی لیتا تو وہ بہانہ بنا کر ٹال دیتی۔

ادھر وہ دونوں ہر روز پہلے سے زیادہ بے تابی سے ملتے تھے اور باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہیں

"میں سوچتی ہوں اچھو! جب یہ بیاہ ختم ہوجائے گا پھر تم بھی چلے جاؤ گے اور تمہارے جانے کے بعد رانو کیا کرے گی؟" وہ اداس ہونے لگی۔

"فکر کیوں کرتی ہے۔ میرا حال تیرے حال سے الگ تھوڑی ہے۔ میں دنیا کے دوسرے کنارے پر بھی ہوا ناں تو پھر بھی تجھ سے ملنے کے لئے ضرور آیا کروں گا۔ بس تو میرا اعتبار رکھنا۔ کبھی کوئی بدگمانی نہ کرنا۔"

"تجھ پر تو مجھے خود سے بھی زیادہ اعتبار ہے اسلم!"

"بس پھر ڈر کیسا، اگر ہم دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں پھر بھلا کون ہمیں جدا کرسکتا ہے۔"

"اچھو! میں سوچتی ہوں یہ پیار کتنا بدل کر رکھ دیتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، میں تو میں رہی ہی نہیں ہوں۔"

"ہاں رانو! میں بھی ایسا ہی سوچتا ہوں۔ کبھی میں یار باش آدمی تھا، دوستوں میں بیٹھا رہتا۔ ان سے باتیں کرتے، ہنسی مذاق میں دن گزار دیتا تھا، پر اب تو تیرا خیال میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ مجھے کسی درختوں کے جھنڈ میں اکیلے بیٹھ کر بس تجھے سوچنا اچھا لگتا ہے۔"

"تیرے گھر والے مان تو جائیں گے اچھو؟"

"لے پاگلے! اس بات کی فکر تو کیوں کرتی ہے، یہ میرا مسئلہ ہے۔ سب سے منوا کر چھوڑوں گا۔ پوری تیاری کے ساتھ آؤں گا اور تجھے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔" وہ مسکراتے ہوئے یقین دلا رہا تھا۔

☆......☆......☆

گاؤں میں شور اٹھا تھا اور سب سے پہلے بچے اس خبر کو لے کر ملکے کے گھر کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ باقی کا مجمع بھی اسی طرف آ رہا تھا مگر سب ابھی پیچھے پیچھے تھے۔

"ماسی او ماسی! چاچا! تو کدھر ہے؟ رانو ہماری بات سنو۔" بچے گھر سے باہر ہی انہیں آوازیں دیتے اندر آ گئے تھے۔

"اے خیری صلا، کیا ہوا ہے؟" عموماً بچے جب یوں اکٹھے ہو کر ایک دوسرے پر گرتے پڑتے آیا کرتے تھے تو خبر سنسنی خیز ہوا کرتی تھی۔

"وہ تمہارا بیٹا ہے ناں، وہی ملکا......"

"ہاں ہاں آگے بھی بول۔" اماں کا دل دہل سا گیا۔

"وہ زخمی ہے۔ کسی کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے اس کا۔ پار گاؤں کے کچھ لڑکے اسے لے کر آ رہے ہیں۔"

"ہائے ربا خیر کریں۔ میرے لال کو تتی ہوا نہ لگے۔"

ابا تو گھر پہ نہیں تھا اماں اور رانو یہ خبر سن کر ننگے پاؤں ننگے سر باہر کو دوڑی تھیں۔

سامنے سے ملکا لہولہان آ رہا تھا۔ اس حالت میں بھی اس نے کسی کا سہارا لینا قبول نہیں کیا، جو سہارا

دینے کی کوشش کرتا وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر بڑھکیں مارنے لگتا۔ وہ زخمی درندے کی طرح غضب ناک ہو رہا تھا۔

"ہائے وے کس نے میرے بچے کا یہ حال کیا ہے۔ آگ لگے ان کے کھیتوں میں، ہاتھ ٹوٹیں میرے بچے کے دشمنوں کے۔ انہیں زمین پر کہیں چین نہ ملے، کیڑے پڑیں ان کی قبروں میں۔"

اماں ہاتھ اٹھا کر بددعائیں دے رہی تھی۔ ملکا نے ہاتھ اٹھا کر اماں کو ایسا کرنے سے روکا

"یہ تو کیا سیاپا ڈالنے بیٹھ گئی ہے۔ ایسا رولا کمزور لوگ ڈالا کرتے ہیں۔ ملکا مرا نہیں زندہ ہے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینا بھی خوب جانتا ہے، تو دیکھ لینا اماں! میں ان کو چھوڑوں گا نہیں۔ ایک ایک کو زندہ زمین میں نہ گاڑ دیا تو میرا نام ملکا نہیں۔"

"لے بھئی لے، تو شیر ہے شیر اور اس جھگڑے میں سارا پنڈ تیرے ساتھ ہے۔ تیرے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔" گاؤں کے جوشیلے جوان جوش میں آ کر کے لہرا لہرا کر اعلان کرنے لگے تھے۔

ملکا صحن میں آیا۔ رانو ایک برتن میں پانی اور صاف کپڑا لے کر اس کی جانب لپکی۔ وہ اس کے بہتے زخموں سے لہو صاف کرنا چاہتی تھی مگر ملکا نے اس سے پانی کا برتن لے کر پرے پھینکتے ہوئے بولا۔

"بھلا یہ اتنے سے زخم بھی ملکا کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں؟"

اتنی دیر میں ابا اور گاؤں کے بزرگ بھی اطلاع پا کر ادھر آ گئے۔ بزرگوں کے آتے ہی جوش سے نعرے لگاتے جوان خاموش ہو کر ادھر ادھر بیٹھ گئے۔

بزرگوں نے ساری بات تفصیل سے سنی اور سمجھانے لگے۔

"تو جانتا ہے ملکا! گاؤں والے ہم سے زیادہ پیسے والے بھی ہیں، طاقت بھی زیادہ رکھتے ہیں اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جوانی کا زور تجھ سے سہا نہیں جا رہا تو ادھر اپنے گاؤں میں بھی ہر وقت منہ ماری کو تیار رہتا ہے۔ اب تیری منہ زوری اور بدمعاشی کی خبریں ہمیں دوسرے گاؤں کے لوگ بھی سنا رہے ہیں۔ اپنی حرکتوں سے باز آ جا ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ یہی سوچ لے کہ تیرا باپ اتنے پیسے والا نہیں ہے کہ تیرے پیچھے تھانے کچہری والوں کو راضی کرتا پھرے۔"

"ایسا کیا کہتے ہو چوہدری جی! ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کی خاطر ہم اپنا آپ بھی بیچ سکتے ہیں۔" اماں نے بڑے جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"چپ کر جا، نور بی بی! تو بیٹے کے جوش کو اور ہوا دے رہی ہے، کوئی عقل کر، اکو اک تیرا پتر ہے خیر مانگ اس کے سر کی۔"

"او چاچا! شیرنی کا شیر پتر ہوں میں۔" ملکا کو بھی ماں کی باتیں سن کر پھر جوش چڑھنے لگا۔

"کان کھول کر سن لے اوئے ملکا! تیرے کرتوتوں سے سارا پنڈ واقف ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو ہم انصاف کا ساتھ دیں گے۔ صرف اس لئے تیرے پیچھے نہیں آئیں گے کہ تو ہمارے پنڈ کا جوان ہے۔"

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔'' ملکا کی اکڑ عروج پر تھی۔ اس کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر گاؤں کے سرکردہ افراد سے معافی مانگی اور صفائی پیش کرنے لگا کہ اس کا بیٹا اپنے حواس میں نہیں۔ ابھی ابھی لڑائی میں زخم کھا کر آیا ہے اس لئے کسی کے مرتبے کا خیال کئے بغیر ایسی بات کرتا چلا جا رہا ہے۔

''کیا مطلب ہے ابا تیرا، کیا میں مار کھا کر آ رہا ہوں؟ وہ ادھر مقابلے پر سارا گاؤں تھا اور میں ان سب کو مار لگانے کے بعد یوں نکل آیا ہوں جیسے مکھن سے بال نکلا کرتا ہے۔''

''بس ملکا! بس کر۔'' کسی بزرگ نے اس بات کو جھوٹ قرار دینے والے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''تم میری بات کو جھوٹ سمجھ رہے ہو؟'' وہ چلایا۔

اسی بزرگ نے باقی سب کو اشارہ کیا اور سب جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جاتے ہی ملکا کے باپ نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

''تو جب سے جوان ہوا ہے بجائے سہارا بننے کے میرے لئے پریشانی ہی بن رہا ہے۔''

''ابا! اس وقت تو ایسی باتیں نہ کر۔ دیکھ تو بھائی کا کتنا خون بہہ رہا ہے۔''

''مرہم لگا کر پٹی کر دے، صبح تک یہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

اتنے میں اماں گرم دودھ کا پیالہ لے آئی اور ملکا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''ظالموں نے کتنی بری طرح پھٹ (زخم) لگائے ہیں اللہ ان کے ہتھ بانہہ توڑے۔''

''اماں! تیرا بیٹا بزدل نہیں ہے، جتنے زخم میرے لگے ہیں اس سے کہیں زیادہ میں لگا کر آیا ہوں اور دیکھ لینا۔ میں ان میں سے ایک آدھ کو تو جان سے مار کر ہی چھوڑوں گا۔''

''ہائے وے، ناں ویرا، ایسا نہ کرنا۔ کیوں پولیس کو اپنے پیچھے لگاتا ہے۔''

''چل تو ادھر جا کر بیٹھ، تجھے ماں بیٹے کے درمیان بولنے کو کس نے کہا ہے۔''

ملکا کو چوٹیں زیادہ گہری نہیں آئی تھیں۔ آنے والے دو، تین روز میں اس کے زخم بھر گئے۔ اتنے دن تو ابے نے اسے گھر پر روکے رکھا مگر کتنے دن روک سکتا تھا۔ دوپہر کی روٹی کھاتے ہی وہ گھر سے نکل گیا اور اس کی واپسی رات گئے ہوئی۔ اس دن گھر میں وہ تینوں ہی جاگتے رہے۔

جب وہ آیا کسی نے اس سے کوئی سوال و جواب نہیں کیا۔ وہ سیدھا بستر پر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

صبح معمول کے مطابق ناشتا کیا مگر جب ابا نے کھیتوں میں چلنے کو کہا تو صاف منع کر دیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں گھر پر رہ کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

باپ کے جانے کے کچھ ہی دیر کے بعد ملکا بھی گھر سے نکل گیا۔

''اماں! یہ تو ابا سے کہہ رہا تھا جی اچھا نہیں، گھر پر ہی رہے گا؟''

''اری ہاں تو جوان مرد ہے۔ سارا دن تو بستر پر نہیں گزار سکتا۔ نکلا ہوگا کہیں یار دوستوں میں۔ آ جائے گا تھوڑی دیر تک، ناں تو مجھے یہ بتا تجھے بھائی کی اتنی ٹوہ کیوں رہتی ہے، ہر وقت نظروں میں ہی رکھتی ہے۔''

وہ جانتی تھی کہ ملکا اماں اور ابا دونوں کا لاڈلا ہے اس لئے چپ رہی۔

پھر اس روز ملکے کی واپسی نہیں ہوئی۔ اس کی جگہ پولیس کا سپاہی ابے کے لئے تھانیدار کا پیغام لے کر آیا۔

''تمہارا بیٹا تھانے میں ہے جلدی پہنچ جاؤ تو اچھا ہے۔''

''تھانے میں، مگر کیوں؟'' پیغام وصول کرنے والی اماں تھی، یہ سن کر ہی دہل گئی۔

''قتل کیا ہے تیرے پتر نے۔''

''ہائے ربا!'' اماں دل تھام کر وہیں بیٹھ گئی اور چلا چلا کر اس بات کو جھوٹ قرار دینے لگی۔

''مجھے کیا کہتی ہے، جو بھی بات کرنا ہے تھانے میں آ کر کرنا۔''

اسی وقت ابا بھی کھیتوں سے واپس آ گیا اور خبر اسے بھی سنا دی گئی۔ کانسٹیبل پیغام دے کر واپس چلا گیا جبکہ ابا اٹھ کر گاؤں کے سرکردہ افراد کی طرف چلا گیا۔

پورے گاؤں میں ایک ہی خبر تھی کہ ملکا نے بندہ قتل کر دیا ہے اور اب تھانے میں بند ہے اور لوگ ٹولیوں کی صورت میں تھانے کی طرف جا رہے تھے۔ ابا بھی گاؤں کے سرکردہ افراد کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا اور تھانیدار کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

''اب جو میرے سامنے مظلوم صورت بنا کر کھڑے ہو گئے ہو، پہلے ہی پتر کو سنبھال لیا ہوتا اور تیرا بیٹا کوئی بے گناہ نہیں ہے۔ شیر جیسے جوان منڈے کو قتل کیا ہے اس نے۔ مقتول کے بھائی اس کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔'' یہ سن کر ابے نے رونا شروع کر دیا۔

''کوئی صورت تو ہوگی۔ مائی باپ کوئی تو راستہ نکالیں۔'' ابا کے ساتھ آنے والے بڑے زمیندار نے کہا تھا۔

''ہاں یہی صورت ہے کہ مقتول کے لواحقین کے ساتھ آپ لوگ مل لو اور دیکھو، اگر وہ کسی طرح صلح پر راضی ہو جائیں تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''اس سلسلے میں آپ ہی کچھ کریں پھر ہی وہ صلح پر آمادہ ہو سکتے ہیں اس کے صلے میں آپ جو بھی خدمت کرنے کو کہیں، ہم تیار ہیں۔''

تھانیدار نے کچھ دیر سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، تم لوگ پرسوں آنا میں دوسری پارٹی کو بھی بلوا لوں گا پھر دیکھتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔''

''اور میرا پتر سرکار! کیا وہ اتنے دن ادھر تھانے میں بند رہے گا؟''

''لو سنو اس بابے کی۔'' تھانیدار ہنسا۔

''کام تو تمہارے پتر نے وہ کیا ہے کہ کئی سالوں تک روزانہ ادھر تھانے میں بند کر کے اس کی چھترول بھی کرتے رہو تو کم ہے اور تم ہو کہ ایک روز اس کے بند رہنے کا سن کر گھبرا رہے ہو۔''

''او چاچا! تم تھانیدار صاحب کو تنگ نہ کرو۔ جب تک مخالفوں سے صلح نہیں ہو جاتی، تب تک اس نے ادھر ہی بند رہنا ہے۔''

"سرکار! اسے مارنا نہیں۔" ابا رونے لگا۔

"نہیں نہیں چاچا! یہ تھانیدار صاحب بہت رحم دل ہیں، کچھ نہیں کہیں گے۔"

پھر ساتھ ہی جھک کر ابے کے کان میں کچھ کہا گیا اور ابے نے بات سمجھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تھانیدار سے کہا۔

"ٹھیک ہے سرکار! میں گھر جاتے ہی ایک بھوری بھینس کھولتا ہوں اور لا کر آپ کے دروازے پر باندھ دیتا ہوں۔"

"مجھے کیا بتاتے ہو، سب اپنے بیٹے کے لئے کر رہے ہو۔ اللہ ایسے نانجار بیٹے کسی دشمن کو بھی نہ دے۔"

مگر یہ سب کہتے تھانیدار کے لہجے میں پہلے والی سختی نہیں تھی۔

"میں پتر سے مل سکتا ہوں سرکار؟" ابا کو آج برابر ہاتھ جوڑنے پڑ رہے تھے۔

"ہاں تم مل لو۔ کچھ عقل مت دو اس کو۔ اپنے آپ کو ٹارزن کی اولاد سمجھتا ہے۔ کم عقل کھوتا۔"

ابا حوالات میں جا کر ملکا سے ملا اور کچھ کہنے کے بجائے بلک بلک کر رونے لگا اور آج تو ملکا کا دم خم بھی نہ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا ابا کو روتے دیکھ رہا تھا۔

"اوئے پتر! یہ تو نے کیا کر دیا، جیتے جی مار دیا بوڑھے باپ کو۔"

"ابا تو مخالف فریق سے صلح کی کوشش کر کے دیکھ۔ چوہدری صاحب اور گاؤں کے دوسرے بڑوں کو ساتھ لے اور کسی بھی قیمت پر صلح کر لینا۔ دیکھ نا ابا یہ زمینیں، جائیدادیں تو پھر بن جائیں گی لیکن جان ایک بار چلی گئی تو واپس نہیں آئے گی۔"

حوالات میں آتے ہی ملکا بھی عقل کی باتیں کرنے لگا تھا۔ ابا آنسو پونچھتے باہر آ گیا۔ گھر آیا تو سارا گاؤں یہاں اکٹھا تھا۔ رانو اور اس کی ماں کی حالت ایسی تھی جیسے ابھی ابھی ملکا کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا ہو۔

ابا نے اپنی برادری کے چند بزرگوں کو ساتھ لیا اور گاؤں کے کچھ پیسے والے عزت دار گھرانوں کی جانب چل دیا۔ دیر تک وہاں میٹنگ ہوئی، ملکا کی حرکتوں کے باعث گاؤں میں کوئی بھی اس سے راضی تو نہیں تھا پر اب معاملہ گاؤں کی عزت کا تھا۔ وہ سب دوسرے گاؤں والوں کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ ان میں آپس کے اختلافات ہیں اور وہ وقت پر ایک دوسرے کے کام نہیں آتے۔ ملکا کو سب نے سخت سست تو بہت کہا لیکن ساتھ چلنے کو سب ہی تیار ہو گئے۔ مگر یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ ایک ہی بار جانے سے حل ہو جاتا۔ آخر ان کا بیٹا قتل ہوا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس علاقے کے بڑے چوہدری کے ساتھ ملکے کے ذاتی تعلقات تھے۔ اس نے اسی لئے اچھی طرح بات سنی اور مخالف فریق کو بھی اپنے ڈیرے پر ہی بلا لیا۔ اس روز یہ مشن ناکام رہا مگر چوہدری نے تسلی دی تھی کہ بات بن جائے گی۔

پھر اگلی میٹنگ تھانے میں رکھی گئی۔ میٹنگ سے پہلے ایک بار پھر تھانیدار کو قیمت ادا کی گئی۔ دونوں فریق حاضر ہوئے، مقتول کے ورثہ کا مطالبہ صرف پھانسی تھا۔ ادھر ابے نے زمین کا ایک ٹکڑا چوہدری کے ہاتھ بیچ کر تھانے دار کی بروقت مٹھی گرم کر دی تھی۔ اسی لئے تھانیدار نے مقتول کے ورثہ کو سمجھایا تھا۔

"گواہوں کے بیانات کے مطابق تمہارے لڑکے اتھرے اور منہ زور ہیں۔ ملکے پر حملے کی پہل ہمیشہ ان کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس سے پہلے وہ اسے بری طرح زخمی کر چکے ہیں، تب اس کے گاؤں کے لڑکے بے ہوشی کی حالت میں اسے اٹھا کر علاقے کے بڑے اسپتال لے گئے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر کی گواہی موجود ہے۔ اب بھی پہل تمہارے ہی لڑکوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ ملکا تو تمہارے گاؤں میں اپنے دوست سے ملنے کے لئے گیا تھا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ تمہارے لڑکوں نے حملہ کر دیا، ملکا زخمی ہوا اور اس زخمی حالت میں اس نے تمہارے چھوٹے لڑکے سے لاٹھی چھینی اور اپنے دفاع میں اس کا استعمال کیا پھر بھی تمہارے تین لڑکے اور ادھر ایک اکیلا زخمی اسی دوران اسے مزید زخم لگے اور اس نے اپنے بچاؤ کی آخری کوشش کرتے ہوئے وار کیا جس میں حملہ آوروں کا ایک ساتھی ہلاک ہو گیا۔ لو جی بتاؤ اب، آپ سب سیانے بیانے ہو، یہ مقدمہ بھلا کتنا مضبوط ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بھی اگر قید ہوئی تو یہی ایک دو سال ہی ہوگی۔ اس عرصے میں تم لوگوں کو روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا اور ہاتھ کیا آئے گا، کچھ بھی نہیں۔"

تھانے دار صاحب نے یہ سب کچھ ایسی خوبی سے بیان کیا کہ وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"مگر تھانیدار جی! زیادتی ہمارے ساتھ ہوئی ہے۔ بندہ ہمارا مارا گیا ہے۔" آخر کوئی بول اٹھا۔

"او کے کی دم! اگر وہ نہ مارا جاتا تو اس ملکا کو مار دیتا۔ آیا کچھ عقل میں۔ مقابلہ زوروں کا تھا اور تمہاری طرف کے حملہ آور زیادہ تھے۔ پنڈ تمہارا اپنا تھا۔ اب خود ہی سوچو عدالت کس کے حق میں فیصلہ کرے گی؟"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ آخر ہم اپنے منڈے کے قاتل کو یونہی تو نہیں چھوڑ سکتے۔"

"نہیں نہیں یونہی کیوں چھوڑو گے۔ جرمانہ وصول کرو۔ وہ بھی ایسا کہ اس اتھرے منڈے کو ہمیشہ کے لئے بدمعاشی بھول جائے۔" تھانیدار نے مزید ایک گھنٹہ ان کے ساتھ محنت کی۔ وہ لوگ یہ جان کر مایوس ہو چکے تھے کہ مقدمہ کر کے بھی ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور تھانیدار اس چیز کی حوصلہ شکنی کرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ آخر اس فیصلے کے ساتھ سب اٹھ کھڑے ہوئے کہ اب مقدمہ پنچائیت میں جائے گا اور بزرگ جو بھی حل نکالیں گے وہ فریقین کو قبول کرنا ہوگا۔

ملکا حوالات سے آ چکا تھا۔ ابا نے اس کے باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی تھی کہ آخر مخالف پارٹی میں بھی جوان اور جذباتی لڑکے موجود تھے۔ ان کا بھائی قتل ہوا تھا، کسی وقت بھی وہ جوش میں آ سکتے تھے۔ ملکے کو بھی یقیناً اب حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ مزاج کی وہ تیزی و تندی مفقود ہو چکی تھی۔ وہ چپ چاپ سارا دن ایک کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔

☆......☆......☆

آخر وہ تاریخ بھی آ گئی۔ اماں نے نذر مان لی، ابا کانپتے دل اور جھکے سر کے ساتھ پنچائیت کے سامنے پیش ہوا اور یہ سارا وقت رانو اور اس کی ماں نے دعائیں کرتے آنسو بہاتے ہی گزارا۔

تقریباً تین گھنٹے ابا کو وہاں لگے اور انہوں نے یہ تین گھنٹے جیسے سولی پر گزارے، پھر ڈھول کی آواز گونجنے لگی۔ دور کہیں ڈھول بج رہا تھا۔ پھر آواز قریب آنے لگی اور قریب آتے آتے ان کے دروازے تک آ گئی۔ ماں بیٹی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور دروازے کی جانب دوڑ پڑیں۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھول کر ابا اور اس کے پیچھے مسکراتا ہوا ملکا اندر آ گئے۔

''لے بھئی ملکا کی ماں! خوش ہو جا۔ صبح میٹھے کی دیگ پکوا کر سارے گاؤں میں بانٹنے کی تیاری کر۔''

''صلح ہو گئی۔ مان گئے وہ لوگ؟'' اماں کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔

''ہاں بھئی ہو گیا فیصلہ۔ معاملہ وہیں پر ختم ہوا ہے۔ ہم لڑکی دیں گے ان کی برادری میں۔''

اور رانو کے بڑھتے قدم وہیں تھم گئے۔ لبوں پر آئی مسکراہٹ دَم توڑ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مبارک باد دینے کے لئے آنے والے گاؤں والوں کو دیکھنے لگی۔

''میرے بھائی کو زندگی میرے قتل کی شرط پر ملی ہے اور اس قتل پر سب راضی ہیں؟''

''پرسوں ان کی طرف سے کچھ لوگ آئیں گے تاریخ رکھنے کے لئے۔''

ابا کی اس بات پر اماں نے رانو کی طرف دیکھا، چپ چاپ کھڑی وہ لڑکی جو اس کا اپنا خون تھی، جسے بانہوں میں لے کر جھولے جھلائے تھے، جس کے بیاہ کے خواب دیکھے تھے، اماں کے دل پر گھونسہ سا پڑا اور وہ رانو سے آلپٹی۔

''اماں! مجھے بچالو۔'' رانو نے چلا کر التجا کی تھی اور پھر دونوں رونے لگیں۔ ابا نے اس نحوست پر ڈانٹ پلائی۔ ملکا نے برا منایا، تو اماں جھٹ آنسو پونچھنے لگی مگر رانو ضبط کے سارے بندھن توڑ بیٹھی تھی۔

''یہ ظلم ہے ملکا کے ابا! کیا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا؟'' ماں نے کمزور احتجاج کیا۔

''نہیں۔'' ابا کے لہجے میں سختی تھی۔ ''یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ یہ رواج ہے اس علاقے کا۔ عورت اپنے گھر کے مَردوں کی جان پر قربان ہوتی آئی ہے۔ پر تیری بیٹی تو سب سے نرالی انوکھی ہے۔ اسے بھائی کی زندگی عزیز نہیں۔ اسے اس صلح کی کوئی خوشی نہیں۔ کیا یہ نہیں جانتی اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر کیا ہو جاتا۔ اسے باپ کی بزرگی کا احساس نہیں۔ یہ چاہتی ہے اس بڑھاپے میں میری لاٹھی مجھ سے چھن جائے۔''

''نہیں نہیں ملکے کے ابا! یہ ایسا تو کچھ نہیں چاہتی۔ بس ابھی بچی ہے نا۔ دشمنوں میں اکیلی جانے کے خیال سے ڈر گئی تھی۔''

''دشمن کیسے، وہ صلح کے لئے مانے ہیں تب ہی تو لڑکی مانگی ہے۔'' ابا حقیقت جان کر بھی نظر چرا رہا تھا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو'' ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر بیٹی کو دیکھا پھر اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آئی۔ ذرا دیر میں یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ ملکے کے دشمنوں سے صلح لڑکی دینے کی شرط پر ہوئی ہے۔ سب ہی جانتے تھے کہ ایسی لڑکی کا انجام کیا ہوا کرتا ہے مگر یہ پرانا رواج بھی تو تھا اسی لئے کسی نے اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لوگ آتے رہے اور اسے صلح کی مبارک باد دیتے رہے۔

☆......☆......☆

''میرے خواب تو کچھ اور تھے۔ میں نے تو زندگی تیرے نام کرنے کا فیصلہ کیا تھا، پر اچانک یہ کیا ہو گیا؟''

وہ کیکروں کے جھنڈ میں اسلم سے ملی تھی۔ یہ جنگلی کیکر پر پھول آنے کا موسم تھا اور اس وقت جنگلی کیکر کے ننھے ننھے پیلے پھول ہر طرف گرے ہوئے تھے اور ان کی باس فضا میں رچی بسی تھی۔ ان ہی لمبے کانٹوں

باریک پتوں گھرے براؤن رنگ کے تنے والے درختوں کے نیچے وہ شاید آخری بار ملے تھے اور بالکل کیکر کے ان پھولوں کی طرح ان کے چہرے بھی زرد تھے۔ اسلم کے پاس دلاسے کا کوئی لفظ نہیں تھا کہ سب کچھ ختم ہو رہا تھا اور رانو کے پاس اُمید کا کوئی جگنو نہیں تھا جو اس کے سرد ہوتے بدن میں پھر سے گرم لہو دوڑا دیتا۔

وہ کتنی ہی دیر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ بے یقین تھی، سسکیاں بھرتی رہی اور وہ اس کے آنسو چننے کی ہمت نہ کر سکا۔

''رانو! ہم یہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ کہیں دُور چلے جاتے ہیں۔ اپنی نئی دُنیا بسائیں گے۔ تو میری بات مان لے ورنہ ساری عمر جلتے تنور میں گزر جائے گی۔'' اس نے اُکسایا۔

''اگر میں گھر سے بھاگ گئی تو پھر میری ماں کا گھر اجڑ جائے گا۔ باپ کے بڑھاپے کی لاٹھی ٹوٹ جائے گی پھر وہ میرے بھائی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور ایسا جرم کر کے تو میں بھی اپنے ہی بھرا کے قتل میں شامل سمجھی جاؤں گی ناں اور تم خود سوچو۔ کیا کوئی بہن ایسا ظلم کر سکتی ہے۔ بہنیں تو بھائیوں پر جان دیتی آئی ہیں۔ میں بھی جان دے دوں گی۔'' وہ پھر سے رونے لگی۔

''تم کہیں بھی چلی جاؤ، کسی کے بھی نام لگا دی جاؤ مگر اسلم تمہیں ہمیشہ اپنی ہی سمجھتا رہے گا۔ تجھے دیکھے بغیر نہ اب میری صبح ہوتی ہے نہ تب ہوگی۔ میں تیری بس ایک جھلک دیکھنے کے لئے وہاں آیا کروں گا۔''

''کیا فائدہ اسلم! تب کیا فائدہ؟ بس تو میرے پیچھے خود کو نہ برباد کر۔ مجھے بھول جا۔

''میں نے تجھ سے سچا پیار کیا ہے رانو! سچا پیار کرنے والے بھلا ایسا کر سکتے ہیں۔''

''پیار تو میرا بھی پاسے کے سونے کی طرح خالص تھا۔ پر میں عورت تھی نا کمزور عورت۔ اپنے پیار کی حفاظت نہ کر سکی۔ میں ہار گئی اور یاد رکھنا اسلم! اس ہار نے مجھے بھی چیر کر رکھ دیا ہے۔ میں زخم زخم ہوں اور ان زخموں کے لئے کوئی مرہم بھی نہیں ہے۔''

''رانو! رانو!'' رکھی جو اس کے ساتھ آئی تھی اور کچھ دُور بیٹھی تھی یکدم آوازیں دینے لگی۔ اسے اسلم کو آخری بار خدا حافظ کہہ کر ڈولتے قدموں کے ساتھ اُٹھنا ہی پڑا۔

☆......☆......☆

وہ گھر پہنچی تو اماں اس کے جہیز والا ٹرنک کھولے بیٹھی تھی۔ ایک ایک کپڑا چاؤ سے خریدا ہوا۔ کسی پر گوٹا لگایا گیا تھا، کسی پر ہاتھ کی کڑھائی اور کسی پر شیشے کا خوب صورت کام تھا۔

یہ سب کس کام کا۔ وہ کوئی چاؤ چونچلوں سے بیاہی دُلہن تو نہ ہوگی۔ وہ تو دشمنوں کے گھر بھیجی جا رہی ہے۔ وہاں کون شگن کرے گا۔ کون اسے دُلہن کہے گا۔

''اماں! اس ٹرنک کو ہمیشہ کے لئے بند کر دے۔''

''ناں خیری صلا۔ ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔ خوامخواہ بند کر دوں۔ میں نے یہ سارے کپڑے دھوپ لگوانے کے لئے نکالے ہیں۔ سوچتی ہوں دو چار جوڑے اور بھی بنوالوں۔''

''کیوں اماں! کیوں؟ سب جانتے ہوئے بھی تو آنکھیں بند کر کے خواب دیکھنے بیٹھ گئی ہے۔ تجھے پتہ

نہیں ہے ونی میں جانے والی لڑکی کی زندگی کسی ٹوٹے برتن کے ٹھیکرے کی طرح ہوا کرتی ہے۔''

''رب سے اچھی امید رکھ، ضروری تو نہیں ہے۔ سب کے ساتھ ایسا ہی ہو۔''

''ہاں، بھائی کے قاتل کی بہن ہوں گی میں، اور اپنے خون کا قتل کون بھول سکتا ہے۔ مجھے دیکھ کر انہیں اپنے بیٹے کی خون میں نہائی لاش یاد آ جائے گی اور وہ بھی یاد آئے گا جس نے ان کے جوان بیٹے کو بے جان مٹی بنا دیا تھا اور اسی ظلم کرنے والے کی بہن ان کے سامنے ہوگی۔ بس اماں! رہنے دے۔ تو اب بھول جانا کہ تیری کوئی بیٹی بھی تھی۔''

دونوں ماں بیٹی رونے لگیں۔ اماں نے ہاتھ میں پکڑا گوٹا لگا نیلا دوپٹہ بے بسی کے احساس سے چور ہو کر پرے پھینک دیا اور بیٹی کو ساتھ لپٹا لیا۔

''او یہ کیا ہو رہا ہے؟ جس وقت گھر آؤ رونا دھونا، ہر وقت کا سیاپا، ہر وقت کا رونا، لگتا ہے کہ تجھے میری زندگی کی کوئی پروا ہی نہیں۔ تجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ میں پھانسی چڑھنے سے بچ گیا ہوں۔ جا کہہ دے اسے مجھے پنچایت کا یہ فیصلہ قبول ہی نہیں۔ میں ساری حیاتی کلیجے سے لگا کر رکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں اسے۔ بیٹے کو پھانسی لگے یا دشمن اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر دے میری بلا سے، میں تو بس بیٹی کی ماں ہوں۔''

ملکا گھر میں داخل ہوا تو ان دونوں کو روتے دیکھ کر غصہ دماغ کو چڑھ گیا پھر جو منہ میں آیا بولے چلا گیا۔

رانو تو خاموش رہی مگر ماں صفائیاں دیتی رہی۔ اس کا دل اپنی اور بہن کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ ایک بھی سنے بغیر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

''اماں! تو میرے لئے نہ رو۔ تو میری صفائیاں بھرا کے سامنے نہ پیش کر۔ میں تو بس اب اس گھر میں تھوڑے دنوں کی مہمان ہوں، پھر چلی جاؤں گی اس گھر سے۔ کبھی نہ آنے کے لئے۔ تب پھر ایسا وقت بھی آئے گا جب تو میرا چہرہ ہی بھولنے لگے گی بہت سوچنے پر ہی تجھے اس بیٹی کی شکل یاد آیا کرے گی اور...... اور اماں ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کبھی میں تیرے قریب سے گزر جاؤں اور تجھے پتہ ہی نہ چلے۔''

پتہ نہیں کس دل سے وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ یہ سب کہے جا رہی تھی اور ماں کا کلیجہ پھٹ رہا تھا مگر وہ بیٹی کو حوصلہ دینے کے لئے بھی ایک لفظ کہنے سے قاصر تھی کہ ان تسلی بھرے الفاظ پر اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی، بیٹی کو زندہ قبر میں گاڑا جا رہا ہے۔

☆......☆......☆

مقتول کے گھر سے تاریخ رکھنے کے لئے بھی بس دو چار مرد آئے۔ جس کے ہاتھ میں رانو کا ہاتھ دیا جا رہا تھا، وہ ساتھ نہیں آیا اور ناں ہی یہاں سے کوئی اسے دیکھنے کے لئے گیا۔ ضرورت بھی کیا تھی۔ انہیں بیٹی تو ہر حال میں اس گھر میں دینا ہی تھی۔ صرف پندرہ روز بعد کی تاریخ طے کر دی گئی اور یہ پندرہ روز بغیر کسی ہنگامے کسی گہما گہمی کے گزر گئے۔ نہ تو گیت گانے کے لئے سہیلیاں اکٹھی ہوئیں نہ ہی نئے نئے ریشمی جوڑوں کی سلائی کٹائی کا کام ہوا۔ یہ پندرہ دن خاموش اداس اور خوف سے پر تھے۔ رانو جب کسی کام کو ہاتھ لگانے لگتی اماں بڑھ کر روک دیتی۔

''اماں! مجھے آرام کی عادت نہ ڈال تجھے پتہ ہے اب مجھے دن رات سب کی خدمت ہی تو کرنا ہے۔''

''میرے سامنے نہیں میری شادی، میرے سامنے نہیں۔''

اماں کی آنکھیں برسنے لگیں مگر اس میں اتنا حوصلہ پتہ نہیں کہاں سے آ گیا تھا وہ نہیں روتی تھی، بس سپاٹ چہرہ لئے ادھر ادھر پھرتی رہتی۔

☆......☆......☆

اماں نے اسے سویرے ہی نہانے کو کہا تھا اور ایک نیا اور ہلکے کام والا جوڑا بھی نکال کر پہننے کو دیا تھا۔ اس نے چپ چاپ ماں کی بات پر عمل کیا اور نہا کر نیا جوڑا پہن کر کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد گاؤں کی عورتیں ان کے گھر آنے لگیں۔ ہر آنے والی جھانک کر اس کمرے میں ضرور دیکھتی جہاں وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا جب دوسرے گاؤں سے تین آدمیوں کے آنے کی اطلاع ملی۔ یہی آنے والے تین آدمی اس کے باراتی تھے۔ ان میں ایک دولہا تھا جس نے سہرا نہیں باندھا تھا۔ نہ ہی اس کے کپڑے نئے تھے۔ بس اس نے دھلے ہوئے صاف کپڑے پہن رکھے تھے۔

اس کا جسم دبلا پتلا قد کچھ چھوٹا کہا جا سکتا تھا۔ اس کا رنگ خاصا گہرا، چہرہ لمبوترا تھا۔ ساتھ آنے والے چچا اور باپ کے درمیان وہ سر جھکائے خاموش اور بہت سنجیدہ بیٹھا تھا۔ یہاں پورا گاؤں اکٹھا ہو چکا تھا۔ مولوی کے آنے پر نکاح ہوا، اس کے بعد میٹھے چاول بانٹے گئے جنہیں آنے والے باراتیوں نے چکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ سارا وقت وہ خاموش اور خفا خفا سے بیٹھے رہے اور تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ دلہن کو لے کر رخصت ہو گئے اور پیچھے اب جدائی کی آگ میں ہمیشہ جلنے والی ماں رہ گئی جس کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ آج اسے شوہر کے دلاسے، بیٹے کی کڑوی کسیلی بھی خاموش ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صحن میں دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی تھی اور دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر رو رہی تھی۔

اور یہاں سے کچھ دور جہاں کیکر کے درختوں کے جھنڈ تھے اور جن پر پیلے پھول آتے تھے وہاں پر جھنڈ میں چھپ کر دوسرے گاؤں جانے والے راستے پر نظریں جمائے کوئی کھڑا تھا۔ اس نے آج اپنے سینے سے دل نکال کر دوسروں کے حوالے کیا تھا۔ وہ خود میں اتنی طاقت نہیں پاتا تھا کہ بغیر کسی سہارے کے اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کسی بے جان بت کی مانند کب سے ایک ہی راستے پر نظر جمائے کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

گھر کے باہر چارپائیاں بچھی تھیں جن پر مرد اور بچے کثیر تعداد میں بیٹھے تھے۔ گھر کے اندر جیسے سارے گاؤں کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کسی کو بھی دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی شادی والے گھر میں خاص تیاری کے ساتھ آیا ہے کہ سب کے حلیے روز کی طرح میلے اور چہرے اداس تھے۔ ہاں آنکھوں میں تجسس تھا۔ وہ آنے والی کو دیکھنے کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔

جونہی اس نے لکڑی کا پرانا ٹوٹا پھوٹا سا دروازہ پار کیا، عورتیں بین ڈالنے لگیں۔ وہ مرنے والے کا نام لے لے کر بین ڈالتیں اور اس کے قاتل کے سارے گھرانے کی بربادی کے لئے بددعائیں کرتیں۔ پھر اس

مجمع سے ایک لڑکی آگے بڑھی۔ اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر رانو کے سر سے چادر کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ اسے بالوں سے پکڑ کر نیچے گرایا اور بری طرح پیٹنے لگی پھر اس پٹائی میں دو اور عورتیں بھی شریک ہوگئیں پھر ان کی تعداد بڑھنے لگی وہ شاید رانو کو جان سے مار دینا چاہتی تھیں۔

کچھ دیر چپ چاپ کھڑے ہو کر یہ ساری کارروائی دیکھنے کے بعد آخر مردوں میں سے کچھ آگے بڑھے اور ان عورتوں کو پیچھے ہٹانے لگے۔

''بس کر پارو! کیا اسے مار ہی ڈالے گی۔'' وہ لڑکی جو سب سے پہلے اس پر حملہ آور ہوئی تھی،

''ہاں، یہ میرے ویر کی قاتل ہے۔ اس کے بدمعاش بھرا نے مارا ہے میرے گھبرو جوان بھائی کو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ لڑکی خود کو چھڑانے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔

''یہ مر جائے گی پھر ہم برادری کو کیا جواب دیں گے؟''

''تم دیکھ لینا ماں! میں اسے ایک دن مار کر ہی دم لوں گی۔ یہ اس گھر میں ووہٹی نہیں کامی (کام والی) بن کر آئی ہے۔''

''ہاں ہاں پتر! ہم نے کب کہا کہ یہ ووہٹی ہے۔ پر تو اپنی طبیعت خراب نہ کر، چل ری اُٹھ جا اب زمین سے۔ تو یہاں ہمیں نخرے دکھانے کے لئے نہیں آئی، چل وہ جو ادھر چھپر ڈلا ہے اس کے نیچے چلی جا۔ تو نے ادھر ہی رہنا ہے اب۔''

پارو سے بات کرتے کرتے وہ بزرگ صورت آدمی اس کی طرف متوجہ ہو کر گھرکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

وہ یہ کب سوچ کر آئی تھی کہ یہاں کوئی ناز نخرے اٹھائے گا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ کامی بن کر جا رہی ہے مگر اٹھے تو کیسے اٹھے۔ اتنی مار کھا کر اس میں تو ہلنے کی سکت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے کپڑے جن کا رنگ شوخ تھا اور جس پر گوٹے کا سنہری کام کیا گیا تھا مٹی مٹی ہو رہے تھے اور جگہ جگہ سے پھٹ بھی چکے تھے اس کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ ناخنوں سے اس کے جسم کو بری طرح نوچا گیا تھا۔ طمانچوں سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

مقتول کی بہنوں، خالاؤں، پھوپھیوں نے اسے مار کر مقتول سے اپنی محبت کا ثبوت دیا تھا اور اس کی ماں عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی اس کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر مسلسل گالیاں اور کوسنے دے رہی تھی۔

گاؤں کی کچھ عورتیں آگے بڑھیں، اس کی پتلی حالت محسوس کرتے ہوئے سہارا دیا اور اسے چھپر کے نیچے لے آئیں۔ یہاں برابر میں ایک چھپر کے نیچے دو بھینسیں اور تین، چار بکریاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔

''ہک ہا، کیسے ظالم ہیں تیرے گھر والے، ذرا ترس نہ آیا۔ ایسی پیاری صورت اور یہ نصیب۔ اللہ بیٹی دے تو پھر قسمت بھی اچھی دے۔ دیکھو ناں قصور بھرا کا، سزا بہن کو ملی۔ بے غیرت، ذرا بھی احساس نہیں کیا کہ بہن کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوگا۔''

عورتیں تبصرے کر رہی تھیں اور وہ تو جیسے پتھر کی بن چکی تھی۔

''بڑے صبر کے ساتھ رہنا ہوگا تجھے۔''

ایک عورت نے آگے جھک کر رازداری سے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ باقی جو کچھ کہا وہ سرگوشیوں میں تھا اور اتنے شور میں وہ سرگوشیاں نہیں سن سکتی تھی۔ اس کے اعصاب بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔

شام سے رات ہوگئی گھر میں وقفے وقفے سے آہیں، سسکیاں اور بین ابھرتے رہے۔ پوری برادری جمع تھی۔ گھر میں یوں بھی سوگ کا سماں تھا۔ کون اتنے لوگوں کا کھانا بناتا، دیگ پکالی گئی، تنور پر روٹیاں لگا دیں اور خاندان سے باہر کی عورتیں جو آس پڑوس میں رہتی تھیں، انہوں نے ہی کھانا لگا دیا۔ کسی کو گھر میں آنے والے اس نئے فرد کا خیال نہیں آیا پھر ان کے نزدیک اسے بھوکا رکھنا ہی بہتر تھا۔

ایک ایک کر کے برادری کے لوگ رخصت ہوئے۔ گاؤں والوں نے بھی رخصت چاہی، صرف قریبی رشتہ دار جو باہر کے گاؤں سے ادھر آئے تھے وہی رہ گئے پھر گھر کے بلب بجھا دیئے گئے اور وہ چھپر جہاں کوئی بلب تھا ہی نہیں، وہ بالکل ہی تاریک ہوگیا۔

ساری رات وہ سو نہ سکی۔ ہاں اونگھی ضرور رہی مگر ذرا آہٹ ہوتی تو چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ اپنے آپ میں سمٹنے لگتی مگر کسی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ ایک ہی رخ پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ شدید مار نے پورے جسم میں درد جگا دیا تھا۔ اسے نرم گرم بستر کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔

''چل نی، ادھر کیا چودھرائن بن کے بیٹھی ہے۔ اٹھ کے پٹھے کتر۔'' (چارہ کاٹ)

وہ یہاں کسی کو پہچانتی نہیں تھی، آنے والی کی عمر سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اس کی ساس ہوگی۔ حکم سنتے ہی وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب روز روز مجھے ایک ایک کام کے لئے کہنا نہ پڑے۔ تو اندھی نہیں ہے خود بھی دیکھ سکتی ہے۔ گھر کا کون کون سا کام کرنے والا پڑا ہے۔ جانوروں کا چارہ کاٹ پھر مرغیوں کو دانہ ڈال۔ اس کے بعد چولہا بھی دیکھ لے اور کان کھول کر سن لے۔ ہم تجھے یہاں چوہدرائن بنانے کے لئے نہیں لائے۔ اس گھر میں اپنی اوقات پہچان کر رہنا ہوگا۔''

ابھی ساس ہدایات جاری کر رہی تھی کہ وہی لڑکی چلی آئی جس نے کل اس پر ہاتھ اٹھانے میں پہل کی تھی۔

''یہ رانی صاحبہ ابھی تک آرام کر رہی ہے۔ میں کہتی ہوں اماں! اسے میرے حوالے کر۔ دیکھ کیسا تیر کی طرح سیدھا کرتی ہوں۔ اسے دیکھ کر میرا دماغ گرم ہونے لگتا ہے، خون کھولنے لگتا ہے۔ میرا جی کرتا ہے ٹوٹے ٹوٹے کر کے اس کے پیکے (میکے) گاؤں پھینک آؤں۔ پتہ لگے ان لوگوں کو اپنوں کی موت کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ وہ کیا سمجھتے ہیں، میرے گھبرو بھرا کے بدلے یہ نالی کا گند دے کر بات برابر کر دی ہے۔ ہائے ربا تجھے ترس نہ آیا۔''

وہ پھر چیخ چیخ کر بین ڈالنے لگی۔ اس کی آواز پر سارا گھر بلکہ ہمسائے بھی بے دار ہوگئے۔ رانو خاموشی سے اٹھی اور جا کر چارہ کترنے لگی۔

''دیکھ دیکھ اس بے حس کو اور کیوں نہ ہو یہ بے حس۔ آخر اس بزدل کمینے کی بہن ہے۔ خاندان ہی

رذیلوں کا ہے۔"

وہ سب کچھ نہ کچھ بول رہے تھے، اس کا دل کانپ رہا تھا۔ لگتا تھا ایک بار پھر یہ سب اس پر پل پڑیں گے اور کل کی طرح درگت بنا کر رکھ دیں گے۔ وہ کل کی بھوکی تھی، بھوک کا احساس تو اتنا نہیں ستا رہا تھا مگر کمزوری بہت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے جو ہدایات دی گئی، وہ ایک کے بعد ایک پر عمل کرتی رہی۔ ناشتا بنایا، سب کے سامنے رکھا، ان میں سے کسی نے نہیں کہا کہ ایک روٹی اپنے لئے بھی ڈال لے اور خود سے اپنے لئے کچھ بنانے کی جرأت وہ اپنے اندر نہیں پاتی تھی۔

سب نے روٹی کھالی، وہ برتن اٹھا کر دھونے کے لئے باہر نل کے پاس رکھنے لگی۔ روٹی کے چند ٹکڑے، کچھ ہڈیاں ان کے ساتھ لگی تھوڑی بہت بوٹی، اس کی بھوک اور بھی چمک اٹھی۔ وہ بے تابی سے یہ روٹی کے ٹکڑے جلدی جلدی منہ میں ڈالنے لگی۔

☆......☆......☆

ادھر ادھر کے کام نبٹاتی سارے گھر کی جھڑکیاں کھاتی وہ بے انتہا پر کشش لڑکی تھی اور یہ قسمت کی بات تھی وہ نذیر کی ہو چکی تھی۔ تین بھائیوں میں نذیر کا نمبر دوسرا تھا، بڑا بھی خوبرو، گٹھے ہوئے جسم کا مالک، طاقت ور اور منہ زور۔ چھوٹا بھائی بھی بالکل بڑے کے جسم اور صورت والا اور درمیان میں یہ دبلا پتلا نذیر جس کا رنگ سیاہ تھا۔ جسم دبلا اور قد چھوٹا خصوصاً دونوں بھائیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ چھوٹا لگتا تھا۔

بڑا بھی منہ زور اتھرا، چھوٹا بھی نڈر ہتھ چھٹ اور لڑاکا۔ اسے تو ان دو کے مقابلے میں بچپن سے ہی یہ احساس دلایا گیا تھا کہ وہ کسی کام جوگا نہیں ہے بات بات پہ دونوں بھائی اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے جہاں ان کے گھر میں آنے والی بہوؤں کا ذکر ہوتا تب اس کی بیوی کا ذکر آتا تو سب مذاق اڑاتے۔

"بڑے اور چھوٹے کے لئے تو چوہدری سے دھی مانگیں تو وہ بھی دینے سے انکار نہ کرے اور یہ نذیر، یہ ہر جگہ سے ہماری ہیٹی کروائے گا۔"

"ابا! وہ چنگڑوں کی آبادی ہے نا ادھر سے ہی پتہ کرنا شاید کوئی قسمت کی ماری مان ہی جائے۔" بڑا والا مذاق اڑاتا۔ سارا گھر قہقہوں سے بھر جاتا۔

"میرا نہیں خیال، وہ بھی مانیں گے۔" چھوٹا پکا سا منہ بنا کر افسوس سے سر ہلاتا۔ ایک بار [illegible]سی گونجنے لگتی۔ بظاہر وہ یوں بیٹھا رہتا جیسے کچھ سنا ہی نہیں مگر کان تو رکھتا تھا اور یہ سب سن کر اس کے دل پر جو گزرتی تھی یہ وہی جانتا تھا۔ بچپن سے ہی ان دونوں کی باتوں نے اسے یہ احساس دلا دیا تھا وہ ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کا وجود بالکل فالتو ہے۔

جوان ہوا تو حالت یہ تھی کہ وہ لڑکیوں سے بات کرتے پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی اسے دیکھ کر مسکرا دیتی تو سوچتا، ضرور مذاق ہی اڑا رہی ہوگی۔

وہ تنہائی پسند ہوتا چلا گیا اور اس نے یہ سوچ لیا کہ کبھی کوئی لڑکی اس کی زندگی میں نہیں آئے گی۔ وہ اتنا کمتر ہے کہ کوئی بھی اسے بیٹی دینا پسند نہیں کرے گا۔

بڑے کے ساتھ ملکے کی لڑائی پہلے بھی ہو چکی تھی۔ ملکا اس گاؤں میں اکثر آتا رہتا تھا۔ اس کا یارانہ

یہاں کے کچھ آوارہ جوانوں کے ساتھ تھا۔ نذیر کے بھائی بھی لڑنے بھڑنے کے شوقین تھے اور کبھی کبھار چھوٹی موٹی وارداتوں کو بھی برا نہیں سمجھتے تھے۔ ملکے والے گروپ سے ان کا جھگڑا ہی رہتا تھا۔ پہلے جب بھی جھگڑا ہوا لوگوں نے بیچ بچاؤ کروا دیا اب جو ملکا اُدھر آیا، اکیلا دیکھ کر دونوں بھائیوں نے پکڑ لیا مگر ملکا کے دوست بھی کہیں قریب ہی تھے پھر بھاری لاٹھی کی کاری ضرب بڑے کے سر پر پڑی تو وہ اٹھ نہ سکا۔

نذیر کے ساتھ اس نے کبھی بھائی والا سلوک نہیں کیا مگر پھر بھی نذیر کو اس کی موت کا بہت دکھ تھا کہ آخر کو وہ اس کا بڑا بھائی، اس کے باپ کا مضبوط بازو، ماں کی آنکھوں کا نور اور بہن کا مان تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا بھائی کی موت اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ لے کر آئے گی۔ اسے تو کہا جاتا تھا کوئی عورت اس کی بیوی بن کر آنے کو تیار نہ ہوگی، خصوصاً دو خوب صورت جی دار جوان بھائیوں کے ہوتے ہوئے اور قسمت نے جو دوہٹی اسے دی تھی ایسی تو پورے گاؤں میں کوئی نہیں تھی مگر ماں نے اس سے کہا تھا۔

"تمہیں دوہٹی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے اس کے ساتھ تمہارا نکاح ضرور پڑھایا ہے مگر تم اس بات کا کوئی دوسرا مطلب نہ نکال لینا اور فکر نہ کر، تیرے لئے میں اس سے بھی زیادہ سوہنی کڑی دلہن بنا کر لاؤں گی مگر اس ڈائن کی گود میں تیرے بچے کھیلیں، یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ چپ رہا۔ سر جھکا کر دل ہی دل میں ہنس پڑا۔

ماں کو کیا بتاتا، کیسے بتاتا۔ یہ تو وہ راز تھا جس سے وہ خود بھی گھبراتا تھا۔ گاؤں کے حکیم سے بہتیرے علاج کرائے تھے مگر اس کے اندر جو کمی تھی، حکیم کہتا تھا وہ پیدائشی ہے۔

"تم شہر تو کیا دُنیا کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس بھی چلے جاؤ، وہ تمہارا علاج نہیں کر سکتا۔" اور جب اس کی شادی کی بات رانو سے چلی تب وہ کئی دن پریشان رہا۔ رانو کو دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ وہ پسینے میں نہا گیا۔ اپنا کمتر وجود اور بھی کمتر لگنے لگا تھا۔

ماں نے کہا "اس کے پاس نہیں جانا۔" اسے اس میں اپنی بچت محسوس ہوئی مگر تین، چار روز میں ہی اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ اس لاچار، مجبور لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ اس کے قریب نہیں جاتا تھا مگر آنے بہانے سے گھر کے چکر لگانے لگا تھا اور آتے جاتے اس کی نگاہوں کا مرکز رانو ہی ہوا کرتی تھی جو ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مشغول دکھائی دیتی اور جس کے لئے نذیر کی اکلوتی بہن کے ہونٹوں پر ہمیشہ کوسنے اور غلیظ گالیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس کی بہن رانو پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی اور ساتھ ساتھ اس کے اگلے پچھلوں کو بھی بری طرح کوسا کرتی تھی۔

نذیر کی اکلوتی بہن پارو بھی دونوں بھائیوں کی طرح خوب صورت اور مزاج دار تھی۔ اسے اپنے حسن و خوب صورتی پر مان بھی بہت تھا، جتنا ناک نقشہ سوہنا تھا، مزاج اس سے بڑھ کر کڑوا تھا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور نذیر کو تو اس نے کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں تھا۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ مل کر وہ بھی اس کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

رانو پر اس کے ظلم دیکھ کر نذیر کا دل دکھتا تو تھا مگر وہ اسے تو کیا کسی سے بھی اس سلسلے میں کچھ کہہ نہیں

سکتا تھا۔ اس دن تو حد ہوگئی۔ چائے بنانے میں دیر کرنے پر پارو نے گرم گرم چائے کا بھرا پیالہ اس پر اچھال دیا جس سے رانو کا بازو اور ہاتھ بری طرح جل گیا۔

''دھیان کر پارو! وہ بھی انسان ہے۔'' تڑپ کر بے ساختہ ہی وہ کہہ بیٹھا۔

''اچھا، بڑے درد اٹھنے لگے ہیں اس ڈائن کے، میسنی ہے میسنی اور تو بھرا نذیر تو ہمیشہ سے ہی عقل سے کوسوں دور رہا ہے۔ تیرے گلے میں پٹہ ڈالا اس کے لئے کون سا مشکل کام تھا۔''

''دھیان سے، سوچ سمجھ کر بات کر۔'' نذیر کو پٹہ ڈالنے والی بات بری لگی مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر اس بات پر بہن کو ایک ہاتھ جڑ دے یا پھر بارعب لہجے میں ہی اسے ڈانٹ دے۔

''مجھے دھیان سے رہنے کو کہہ رہا ہے اور خود کیا کر رہا ہے۔ جوان بھائی کا خون کرنے والوں کی حمایت میں بول رہا ہے۔ تجھے ان کا درد ہو رہا ہے۔ میں رب کی سوں کھا کر کہتی ہوں، اسے اس گھر میں چین کا سانس نہیں لینے دوں گی۔ اسے میں اسی طرح زخم زخم کرکے ماروں گی اور اس کی لاش کو اس کے بے غیرت بھائی کے بوئے (دروازے) پر پھینک کر آؤں گی۔''

''وے نذیر! ڈوب مر کہیں گندے چھپڑ میں جا کر.....'' اب ماں بھی میدان میں اتر آئی۔ وہ جو روٹی کھانے کے لئے بیٹھا تھا، چپ چاپ وہاں سے اٹھا اور کھیتوں کی جانب چل پڑا۔

آج پھر کل کی طرح وہ گھبرو جوان اس نے اپنے گھر سے تھوڑے فاصلے پر دیکھا۔ کل بھی وہ اسے دیکھ کر رک گیا تھا کہ یہ چہرہ اس گاؤں میں اجنبی تھا اور گاؤں کے لوگ اجنبیوں سے پورا تعارف حاصل کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں مگر وہ کچھ جلدی میں بھی تھا اس لئے سوال و جواب نہیں کر سکا، آج پھر اسے درختوں کے نیچے اکیلے بیٹھے دیکھا تو وہ اپنی راہ سے اتر کر اس کے پاس چلا آیا۔

''کون ہو تم، کس کے مہمان ہو؟'' سلام دعا کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا تھا۔

''کسی کا مہمان نہیں، بس یونہی ادھر آ بیٹھتا ہوں۔''

''یونہی، کمال ہے بھئی جوان آدمی ہو اور تمہیں کوئی کام نہیں ہے۔''

اس کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ زیادہ بات کرنا بھی نہیں چاہتا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' نذیر نے پوچھا۔

''اسلم!'' نام بتا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''کچھ روٹی پانی بھی کھائی کہ نہیں؟''

اس سوال پر اسلم بری طرح چونکا۔ ''روٹی پانی تم مجھے کھلا سکتے ہو، کہاں سے؟''

اس کے انداز میں عجیب سی بے تابی ابھر آئی تھی۔ مگر نذیر نے اس پر غور نہیں کیا، بولا۔

''تھوڑی دیر تک میں گھر جاؤں گا، ابھی ابھی گھر سے ہی آ رہا ہوں ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے بھوکے ہی آنا پڑا۔ تھوڑی دیر تک سب کے غصے ٹھنڈے ہو جائیں گے پھر میں گھر جا کر روٹی کھاؤں گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔'' اور اسلم نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر یونہی بات کرنے کو بولا۔

''جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟''

''بس کیا بتاؤں۔ میری بہن زبان کی بڑی کوڑی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہونے لگتی ہے۔ بہن ہی کیا میرے سارے گھر کا یہی حال ہے۔ میری بیوی سے لڑ پڑی تھی۔ میں نے ذرا حمایت کر دی تو میری جان کو آ گئی۔''

اسلم نے سر جھکا لیا۔

''زیادہ دن نہیں گزرے میری شادی کو، اور شادی بھی کیا بس، وہ اصل میں لڑکی کے بھائی کے ہاتھوں میرا بھائی قتل ہو گیا تھا۔ پنچائیت کے فیصلے پر یہ شادی ہوئی مگر یہ شادی کوئی شادی تھوڑی ہوا کرتی ہے۔ میری ماں تو مجھے کڑی کے قریب نہیں جانے دیتی۔ اس سے بات نہیں کرنے دیتی، جس دن سے ویاہ ہوا ہے، میں ادھر کھیتوں میں سو رہا ہوں۔ بڑی کڑی نگرانی رکھتی ہے ماں اور میری بہن، پر میں کہتا ہوں کیا فیدا'' (فائدہ) پھر ذہن میں پتہ نہیں کیا آیا کہ وہ بات کرتے کرتے یکدم چپ ہو گیا۔

اسلم نے گہری سانس کھینچ کر سر اثبات میں ہلایا اور بولا۔

''کب تک گھر لے کر جاؤ گے۔ بھوک بہت لگی ہے۔''

''بس ابھی چلتے ہیں، ویسے بھی پروہنے کے سامنے وہ دونوں ٹھنڈی ہی رہیں گی۔ تمہاری وجہ سے میں بھی آرام سے روٹی کھا لوں گا۔'' اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔ اسلم نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

اور پھر اس کے گھر کے راستے پر چلتے اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ وہ بار بار نذیر سے آگے نکل جاتا۔

''کیا تم میرے گھر کا راستہ جانتے ہو؟'' جب پھر وہ آگے آگے چلنے لگا تو نذیر پوچھ ہی بیٹھا۔

اسلم نے پلٹ کر اسے دیکھا اور رک کر اس کے اپنے برابر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس گاؤں میں وہ اسی گھر کو کھوجتے ہوئے تو آیا ہے۔ سارا دن اس گھر کے آس پاس رہتا ہے کہ شاید کبھی اس کی ایک جھلک دکھائی دے جائے مگر اب تک اسے مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آج قسمت نے یاوری کر دی اور وہ خود اسے اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔

نذیر کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور نذیر نے اپنی بات دہرائی بھی نہیں، وہ بھی برابر آ چکا تھا اور گاؤں کی کوئی بات بتا رہا تھا جس کی طرف اسلم کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ اس پر ایک ہی خیال سوار تھا، رانو کا خیال۔ وہ اسے دیکھ کر کس طرح چونک جائے گی۔ اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ کیسی ہو گی اور اسے نذیر کی بہن سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گھر پہنچ چکے تھے۔ یہ کچا احاطہ تھا۔ یہاں گھر آئے مرد مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا۔ اس احاطے میں چار سایہ دار درخت لگے تھے اور ان کے نیچے موٹے پایوں والی ٹاہلی کی لکڑی سے بنائی گئی چارپائیاں بچھی تھیں جنہیں کھجور کے پتوں سے بنائی گئی پٹی سے بنا گیا تھا۔ یہیں بنے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کچے کمرے سے نذیر ایک رنگین دری اور تکیہ لے آیا نیم کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر اس نے یہ بستر لگایا اور اسے بیٹھنے کو کہہ کر اندر چلا گیا۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد سر پر کترے ہوئے چارے کا بڑا سا گٹھا اٹھائے رانو ادھر چلی آئی اور اسلم پر نظر پڑتے ہی گٹھے کو تھامے ہاتھ پہلو میں آ گرے۔ گٹھا اس کے قریب ہی گرا اور وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ اسلم بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''رانو!'' اس نے بے تابی سے اسے پکارا۔

''اچھو تو یہاں!'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''بس تیرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔''

وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ دوپٹے سے آنکھیں رگڑنے لگی تب اس نے رانو کا جلا ہوا ہاتھ اور بازو دیکھ لیا۔

''کیوں سہہ رہی ہے یہ سب، چل میرے ساتھ چلی چل۔''

وہ اس جلنے کی اذیت کو اپنے جسم پہ محسوس کرتے ہوئے تڑپ کر بولا۔

اسی وقت نذیر لسی کا گلاس لے کر چلا آیا اور ان دونوں کو اتنے قریب کھڑے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ رانو تیزی سے پیچھے ہٹی اور نیچے پڑا گٹھا اٹھانے لگی۔

نذیر نے کچھ کہے بغیر خاموشی سے لسی کا گلاس اسلم کے ہاتھ میں دے دیا اور رانو سے بولا۔

''جاؤ مہمان کا اور میرا کھانا ادھر لے آؤ۔'' وہ اثبات میں سر ہلا کر چل پڑی۔

نذیر نے پلٹ کر اسلم کی طرف دیکھا۔ وہ رانو کی پشت کو ہی تک رہا تھا اور اس کے چہرے پر ملال تھا۔ کچھ کھو دینے کا واضح دُکھ۔ نذیر نے ایک لمبی سانس کھینچی اور سر جھکا لیا۔

کچھ ہی دیر بعد رانو ناشتہ لے آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے نذیر کی ماں بھی تھی کہ وہ نذیر کے پاس اسے تنہا کیسے بھیج سکتی تھی۔

''کون ہو تم کس کے پروہنے ہو؟'' ماں کو اس کی صورت، وجاہت نے متاثر کر دیا تھا۔

''اپنا ہی پروہنا سمجھ لو اماں!'' جواب نذیر نے دیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے اس سے پہلے تو تمہیں ادھر اس پنڈ میں نہیں دیکھا، کس ذات برادری سے ہوتے ہو تم؟''

''مہمان کا ہی خیال کر لو۔ پہلے اسے کچھ کھا لینے دو۔''

اب بات اماں کی سمجھ میں آ گئی اور وہ انتظار کرنے لگی۔ کب مہمان کھانا کھا لے تو وہ اپنی بھی تسلی کر لے مگر لگتا تھا مہمان کو بھوک نہیں۔ کہاں تو وہ روٹی کا نام سن کر ہی بے تاب ہو کر اس کے گھر کی طرف چل پڑا تھا اور اب بددلی سے ایک ایک نوالہ چبائے جا رہا تھا۔

''کیا بات ہے پتر! تم کھا نہیں رہے؟'' اماں پوچھ رہی تھی۔

''بس میرا پیٹ بھر گیا۔'' اس نے ہاتھ سے چنگیر پرے کر دی۔

''لے بھلا اتنا کڑیل جوان اور اتنی سی خوراک۔ لگتا ہے تجھے ہمارے گھر کی روٹی پسند ہی نہیں آئی۔''

وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے روٹی سے ہاتھ کھینچا تو اس کے ساتھ ہی نذیر بھی چھوڑ کر اٹھ گیا۔

''لے بھلا، تجھے کیا ہوا ہے۔ تو نے کیوں ہاتھ پرے کر لیا ہے۔ اب یہ نہ کہہ دینا مجھے بھوک ہی

نہیں ہے۔''

''اماں! بھوک تھی پر اب نہیں رہی۔'' نذیر کے انداز میں عجیب سی بے چارگی تھی۔

''نی یہ برتن اٹھا۔'' اماں نے کھولی میں چارہ ڈالتی رانو کو پوری تلخی کے ساتھ پکارا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر برتن اٹھانے لگی۔

''ماسی! تجھے میری اماں بلا رہی ہے۔'' ساتھ کے گھر سے ایک لڑکی چلی آئی تو اماں کو اٹھ کر جانا پڑا۔

''اماں نی اماں!'' اندر والے احاطے سے پارو ماں کو آوازیں دیتی باہر آئی مگر اس وقت تک اماں تو پڑوس میں جا چکی تھی۔ وہ اسے نہ پا کر نذیر سے بولی۔

''بھرا بھینس کا کٹا کھل گیا ہے۔ میرے قابو میں نہیں آ رہا جلدی آ کر پکڑ ورنہ سب بیڑا غرق کر کے رکھ دے گا۔'' یہ سن کر نذیر کو اٹھ کر جانا پڑا۔

''کیسی ہو رانو؟'' اس کے جاتے ہی اسلم نے بے تاب ہو کر رانو کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم یہاں کیسے؟ کسی سے ملنے آئے تھے کیا؟''

''میں تم سے ملنے کی آس لئے ادھر آتا ہی رہتا ہوں۔ آج رب نے سن لی اور تم مجھے مل گئیں۔''

''اچھو! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میں بھی انسان ہوں۔ میرے بھی کچھ خواب تھے۔ میں بھی لاڈو رانی تھی۔ آج تم نے آ کر کیا کیا یاد دلا دیا ہے۔'' اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

''میں ادھر کینوؤں کے باغ میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔ تم ضرور آنا رانو۔''

''لیکن میں کیسے؟ مجھے تو یہ لوگ باہر جانے ہی نہیں دیتے۔''

''کوئی صورت تو نکال رانو! تجھے دیکھا ہے تو میں پھر سے جی اٹھا ہوں۔''

''میرا حال بھی تجھ سے الگ تھوڑا ہی ہے پر میں بڑی مجبور ہوں۔''

''نی ادھر بیٹھی کیا کر رہی ہے ڈنگروں کو چارہ تیرا باپ ڈالے گا۔'' پارو ایک بار پھر چلی آئی تھی اور رانو سے بات کرتے اس کے لہجے میں آگ ہی آگ تھی۔ رانو چپ چاپ پلٹ گئی۔

وہ پھر سارا دن کھوئی کھوئی سی رہی۔ ہاتھ اور بازو جلنے کی وجہ سے تکلیف بھی بہت تھی اسی لئے بھی ہر کام میں سست رہی اور پارو اس پر برابر چلاتی رہی۔

جلے ہوئے ہاتھ اور بازو کے ساتھ تنور میں روٹی لگانا کسی اذیت سے کم نہیں تھا۔ ایک روٹی لگائی تو سی کر کے پیچھے ہٹ گئی۔

''دیکھ، دیکھ ذرا اس نواب کی پتر کے نخرے۔ نی میں تجھے یہاں تخت پر بٹھانے کے لئے نہیں لائی۔ اتنی سی جل گئی تو نخرے دکھاتی ہے اور تجھے دیکھ کر جو ساڑھ میرے کلیجے میں پڑتا ہے، کچھ اس کا اندازہ ہے تجھے۔ جی چاہتا ہے زندہ جلا دوں۔ تیرے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دوں۔ میرے گھر کی خوشیوں کو نگلنے والو۔ تمہیں کبھی چین نہ پڑے۔ تمہارے گھر سے بھی جنازے اٹھیں تب تمہیں پتہ چلے جوان پتر کا دکھ کیا ہوتا ہے۔''

وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر بددعائیں دے رہی تھی۔ اسی وقت نذیر گھر میں داخل ہوا مگر خاموش تماشائی بنا یہ

سب دیکھتا رہا مگر جب پارو نے لکڑی اٹھا کر رانو پر حملہ کر دیا، تب وہ خاموش کھڑا نہیں رہ سکا۔ بھاگ کر دونوں کے درمیان آ گیا۔

"نی پاگلی! کیا کرتی ہے، چھوڑ دے اسی۔ اڑی دیکھ نہ اس سارے معاملے میں اس کا کیا قصور۔"

وہ پارو کے ہاتھ سے لکڑی چھیننے کے بعد اسے رانو سے دور دھکیلتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔

"اچھا، بڑا درد اٹھ رہا ہے تجھے اس کا۔ جورو کے غلام! تجھے بھائی کی لاش بھول گئی ہے اس کی جوانی کی موت تیرے دل کو گھونسے نہیں لگاتی۔ اماں او اماں! ادھر آ کر دیکھ یہ میسنی کیا چن چڑھا رہی ہے۔"

اماں کہیں قریب ہی تھی پہلی دہائی پر ہی چلی آئی۔ پارو نے نمک مرچ لگا کر اسے خوب بھڑکایا۔ آج اس نے رانو کے ساتھ ساتھ نذیر کو بھی خوب باتیں سنائیں اور دونوں کو لکڑی سے خوب پیٹا۔

"آ جائے آج تیرا ابا گھر میں، تجھ بے غیرت کا تو فیصلہ کرواتی ہوں۔ زنانی دیکھ کر پاگل ہو رہا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کون ہے یہ، کس کی بہن ہے اور کس طرح یہ منحوس ہمارے گھر آئی ہے۔ سچ تو یہ ہے نذیرا! تجھے اپنے بھائیوں سے کبھی پیار رہا ہی نہیں۔ تو نے تو ہمیشہ سے ہی اپنی الگ دنیا بسائی ہوئی ہے اور مَردوں والی کوئی بات تجھ میں کبھی رہی ہی نہیں۔ لڑائی بھڑائی سے تو ہمیشہ کوسوں دور بھاگتا رہا ہے۔ سر پھینک کر چلنا تیری عادت ہے۔ چار لوگوں کے سامنے بیٹھ کر تو بات نہیں کر سکتا۔ تیرے جیسے ہی ہوتے ہیں جو زنانی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔"

اماں بولتی رہی، پارو جلتی پر تیل پھینکتی رہی اور ایک لفظ بھی اپنے دفاع میں کہے بغیر وہ سر جھکائے کسی ملازم کی طرح سب کچھ سنتا رہا اور زخموں سے چور درد کو دباتے ہوئے رانو حیرت سے اس مرد کو دیکھتی رہی۔ کیا واقعی یہ اس گھر کا بیٹا ہے۔

اب تنور کے پاس بیٹھی رانو تھی اور شہتوت کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا نذیر تھا، دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ نذیر میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور رانو یہاں تھی ہی نہیں۔ پارو کی دھمکی کا اس نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔

"جس کے دل کی دُنیا اجڑ چکی ہو، اس کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ روح گھائل ہے تم مردہ تن کے ساتھ جو بھی سلوک کرو، مجھے پروا نہیں ہے اور ہاں اب مجھے اچھو سے ملنا ہے ضرور ملنا ہے۔ آگ کا دریا بھی میرے راستے میں آیا تو میں اسے بھی پار کر جاؤں گی۔"

اور واقعی اس نے آگ کا یہ دریا پار کیا۔ وہ اگلے دن اچھو سے ملنے پہنچ گئی تھی۔ اس کا زخم زخم جسم، سوجی ہوئی آنکھیں، اڑی ہوئی رنگت۔ اس کے دل پر چھری چل گئی تھی۔

"چل رانو! ہم یہاں سے کہیں دُور چلتے ہیں۔"

"نہیں اچھو! یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بدن کے سارے درد بھول کر اسے دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔

"تجھے اس حال میں دیکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے رانو!" وہ بے بسی سے بولا تھا۔

"اور مت پوچھ اس حال میں جب میں زخموں سے چور چور درد سے بے حال ہوں تو تجھے دیکھ لینا مجھے

کیسا سکھ دے گیا ہے۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا ہے۔"

"کتنے ظالم لوگ ہیں وہ لوگ۔ انہیں یوں بے دردی سے تمہیں مارتے ذرا ترس نہیں آتا۔"

"چھوڑ اس بات کو۔ جن کا جوان بیٹا میرے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، وہ بھلا مجھ پر ترس کیوں کھائیں گے۔ سب جانتے ہیں ونی میں جو لڑکی دی جاتی ہے اس کی زندگی جانوروں سے بھی بری گزرتی ہے۔ اس پر سسرال میں کوئی ترس نہیں کھاتا۔ وہ جب تک جیتی ہے اپنے بھائی کے کیے کی سزا بھگتتی ہے۔ میں بھی یہ سزا کاٹ رہی ہوں۔ جب تک زندگی ہے یہی سزا کاٹنی ہے۔ بس اب تو مجھے مرنے کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔"

وہ اچھو کے ساتھ مالٹوں کے باغ کے گرد لگی گھنی باڑھ میں گویا سب سے چھپ کر باتیں کر رہی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ دو آنکھیں مسلسل اس کی نگرانی کر رہی ہیں اور یہ آنکھیں نذیر کی تھیں۔ وہ بھی ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے یہ دونوں اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

نذیر کا ان دونوں کو ملتے دیکھ کر خون نہیں ابلا تھا نہ ہی جنون سر پر سوار ہوا تھا۔ اس کا ٹھنڈا خون آج بھی بالکل ٹھنڈا تھا۔ بس پتہ نہیں کیوں وہ ان کی جانب سے کل ہی چوکنا ہو گیا تھا اور پیچھا کرتے کرتے یہاں تک چلا آیا تھا۔

رانو زیادہ دیر نہیں رکی تھی، یوں لگتا تھا وہ اس کی جھلک دیکھ کر ہی سیراب ہو گئی ہے۔ واپسی پر اس کی بجھی بجھی آنکھیں چمک دینے لگی تھیں۔ پپڑی زدہ لب کھل سے گئے تھے اور یوں لگتا تھا پارو کی تیز چبھتی ہوئی آواز اور باتیں اسے سنائی ہی نہیں دے رہیں۔

نذیر طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر جلدی گھر واپس آ گیا۔ اسے رانو سے بات کرنے کی اجازت تو نہیں تھی۔ وہ دور سے ہی اس کا جائزہ لے رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ آج جو کچھ اس میں محسوس ہو رہا ہے وہ پہلے نہیں تھا۔

"چل ری اٹھ، ابا اور چھوٹا بھرا کھیت میں ہی ہیں۔ جا کر سبزی توڑ لا۔"

چونکہ آج نذیر گھر پر تھا اس لئے اسے باہر بھیجتے ہوئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ دھوپ میں ڈالی گئی گندم کو پھر سے بوری میں منتقل کرنے کے بعد کھیت میں جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھہر جا، تجھے بھلا ہمارے کھیت کا راستہ بھی پتہ ہے۔ بس باہر نکلنے کا سن کر ہی پیر زمین پر نہیں ٹک رہے۔ آوارہ، ڈائن۔" پارو اسے خطاب دینے کے بعد مرغیوں کے ڈربے پر چڑھ کر پڑوس میں رہنے والی لڑکی کو آوازیں دینے لگی۔ وہ آئی تو بولی۔

"ذرا ہماری طرف آ جا، تجھے اس منحوس کے ساتھ کھیتوں میں جانا ہے۔ اسے راستہ نہیں آتا ناں اس لئے تجھے ساتھ کر رہی ہوں۔"

پارو اتنا کہہ کر نیچے اتر آئی، تھوڑی ہی دیر کے بعد پڑوس کی دس، بارہ سالہ گگو چلی آئی اور رانو اس کی ساتھ کھیتوں کو ہو لی۔

جس وقت یہ دونوں کھیتوں میں پہنچیں، ابا موجود نہیں تھا۔ صرف نذیر سے چھوٹا شرفو ہی ادھر بیٹھا تھا اور

اس نے دور ہی سے رانو کو نگو کے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔

''کیا چال ہے اور کیا جسم، اگر یہ نذیر کے بجائے میرے نام لگ جاتی تو مزے ہی آ جاتے۔''

وہ خباثت آنکھوں میں لئے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں قریب آ گئیں۔

''اماں نے بھیجا ہے۔ سبزی چاہئے تھی۔'' رانو قریب آ کر نیچی نظر کئے دھیرے سے کہہ رہی تھی۔

''توڑ لو سرکار! منع کس نے کیا ہے۔''

اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا اور شرفو کی آنکھوں میں شیطانیت دیکھ کر اس کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس وقت شام ہو رہی تھی، آبادیوں سے دور ان کھیتوں میں انسان دُور دُور تک دکھائی نہیں دے رہے تھے اور وہ نذیر کا ابا، وہ بھی پتہ نہیں کہاں رہ گیا تھا۔

''میں نے کہا جی، کبھی ایک نظر ہم غریبوں پر بھی ڈال لیا کرو۔ ترستے ہیں ہم تمہاری نظر کرم کے لئے۔''

''مم...... میں تیری بھرجائی ہوں۔'' اس نے یاد دلانا چاہا۔ شرفو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''تو کیا ہے۔ یہ میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لئے دوبارہ سے یاد کروانے کی کوشش نہ کرنا اور میں نے کوئی غلط فرمائش تھوڑی کی ہے۔ تیرے جیسی اصیل عورت کے لئے کوئی اصیل مرد ہی ہونا چاہئے۔ میں نے تجھے پہلے سے دیکھا ہوتا تو کبھی نذیر کے نکاح میں نہ جانے دیتا۔''

شکر ہوا کہ ابا ادھر آ گیا اور رانو جلدی جلدی سبزی بنانے لگی لیکن اس کے ہاتھوں میں اب بھی لرزش تھی اور دل بھی کانپ رہا تھا۔ وہ کب تک بچ پائے گی۔

''ابا! کیا نذیر کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ جلدی کیوں چلا گیا ہے؟'' اب شرفو، باپ سے مخاطب تھا۔

''پتہ نہیں، کہہ رہا تھا بدن پر لرزا ہو رہا ہے۔ شاید تاپ چڑھ رہا ہے۔ مجھ سے پیسے بھی لئے کہ حکیم کے پاس پہلے دوا لوں گا پھر گھر جاؤں گا۔''

''میرے خیال میں ابا اسے تپ دپ نہیں چڑھ رہا۔ بہانہ کر کے گھر گیا تھا۔ جورو کی خاطر اور ادھر اماں کا دماغ دیکھ کیسا تیز ہے۔ وہ گھر گیا اور اماں نے اس کی جورو کو ادھر کھیت میں سبزی چننے کے لئے بھیج دیا۔'' شرفو قہقہہ لگا کر بولا۔

''آہو پتر! تیری اماں بھی پوری سیاست دان ٹھری۔ جو عورتیں ہوتی ہیں انہیں ہم کم عقل کہتے ہیں، کم عقل ہوتی نہیں ہیں، خاص کر تیری اماں، اس میں بڑی عقل ہے۔''

''ابا! یہ اماں اور پارو نے نذیر پر کڑی پابندی لگا رکھی ہے۔ اسے جورو کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ یہ اپنے ہی پتر کے ساتھ زیادتی ہوئی کہ نہیں۔''

''او تو چھڈ ان باتوں کو۔ نذیر کسی جوگا ہو تو مجال ہے کسی زنانی کی کہ وہ پابندی لگائے۔ مرد منہ زور گھوڑے کی طرح ہوا کرتا ہے۔ جوانی کا جادو سر پر چڑھ جائے تو اسے کوئی رشتہ دکھائی نہیں دیتا۔ پابندی لگانے والے کو روند ڈالتا ہے۔ رہا نذیر......'' اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''ہیں ابا!'' شرفو کچھ جاننے کے لئے باپ کی جانب جھکا۔ باپ سرگوشی میں بولا۔

''ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ کسی قابل ہے ہی نہیں۔ یہ بات کسی سے کہنا نہیں۔ اپنے تک رکھنا۔ پنڈ میں بھی کسی کے علم میں آ گئی تو سمجھو بے چارے کا جینا حرام ہو جائے گا۔''

''او نہیں ابا! میں بھلا کیوں کسی سے کہوں گا۔ آخر وہ بھرا ہے میرا، پر اس عورت کے ساتھ تو بڑا برا ہوا۔''

''اس کی فکر میں نہ گھل۔ اس کے اپنے ماں پیو نے اس کے ساتھ کیا اچھا کیا ہے۔ سب کو پتہ ہے کہ ونی میں جو کڑی دی جاتی ہے اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ جب ان کو پروا نہیں تو ہماری کون سی یہ سگی ہے۔''

''آہو ابا! کہتا تو تو ٹھیک ہے اور سچ پوچھیں نا تو مجھے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔''

رانو کو اندازہ تھا کہ وہ دونوں اسی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس پر سخت گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ لڑکی کے ساتھ مل کر جلدی جلدی سبزی توڑ رہی تھی۔ یہ وقت ان باپ بیٹوں کی بھی گھر واپسی کا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر اوزار سمیٹنے اور جانوروں کو ہنکانے لگے۔

اور جب اکٹھے کھیتوں سے نکلے تو شرفو جان بوجھ کر رانو کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے لگا۔

''مجھ سے دوستی کر لو۔ سکھی ہو جاؤ گی۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تھا۔ رانو کو گھن آنے لگی۔

''کوئی جلدی نہیں ہے۔ سوچ کر جواب دینا، ویسے یہ میری مہربانی ہے کہ تجھ سے جواب مانگ رہا ہوں ورنہ میرے لئے کیا مشکل ہے۔ تیرا وہ بغیر دروازے کا اندھیرے میں ڈوبا چھپر اور رات کو اکیلی ادھر سونے والی تو۔'' اس نے جو جتایا وہ بے حد صاف تھا۔

''رحم کر مجھ پر۔'' وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

''تو بھی مجھ پر رحم کر دے۔ لگتا ہے بڑا غرور ہے تجھے اپنے حسن پر۔ ''میں شریف عورت ہوں۔''

''اوئے شرفے! کدھر رہ گیا ہے تو؟''

ابے نے آواز لگائی اور شرفا تیز تیز قدم اٹھاتا اس سے آگے نکل گیا مگر اس پر ایک بھاری بوجھ ڈال گیا۔ کمروں سے ذرا ہٹ کر بنا اس کا بے کواڑ چھپر جہاں رات میں اندھیرا ہوتا اور وہ اکیلی، اگر کسی کو مدد کے لئے پکارے بھی تو کون اس کی فریاد سنے گا؟ اپنی سوچوں میں گم وہ ان تینوں سے خاصی پیچھے رہ گئی۔

گھر آئی تو پارو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں پہلے اسے باتیں سنائیں پھر روٹی ڈالنے کو کہا۔

''اور سن۔ سبزی چولہے کے پاس نہ رکھ۔ کھلے صحن میں رکھ تاکہ کل تک تازہ رہے۔ صبح روٹی پکانے کے بعد اسے بنا کر ہانڈی چڑھا لینا۔ دوپہر میں کام آئے گی۔ پتہ نہیں کن بھک منگوں کی اولاد ہے لا کر سبزی چولہے کے پاس رکھ دی۔ یہ نہیں پتہ سبزی کھلی جگہ پر رکھی جاتی ہے۔''

''پڑوسن ٹھیک کہتی ہے۔ کسی لڑکی کی زبان پارو کی زبان جتنی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہر وقت زہر ہی اُگلتی رہتی ہے۔'' اس نے سوچا اور پھر آٹا کے پیڑے بنانے لگی۔

نذیر، اس کی اماں اور ابا اسی ٹاہلی کے نیچے کچے پکے لمبے سے برآمدے کے ایک سرے پر بیٹھے تھے۔ پارو ان کے سامنے کھانے کے برتن لگا رہی تھی۔ شرفو ان سے ہٹ کر یوں بیٹھا تھا کہ رانو اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔

اس رات چھپر تلے لیٹتے ہوئے وہ پہلے سے کہیں زیادہ بے سکون اور خوفزدہ تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی

تھی۔ پتہ بھی کھڑکتا تو اٹھ کر بیٹھ جاتی اور اس گھاس پھونس کے نام کے کمرے کا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔

"کون ہے، میں کس سے مدد مانگوں؟" وہ سر ہاتھوں پہ گرائے اسی سوال کا جواب سوچ رہی تھی۔

"نذیرا!" بجلی کی طرح ایک خیال ذہن میں لپکا۔ نذیر سے اس کی کبھی کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ اگر وہ گھر پر ہوتا تو ماں بہن پوری نگرانی رکھتی تھی۔ اسے رات کو کھیتوں پر بنے کمرے میں سونے کے لئے بھیج دیا جاتا تھا مگر اس نے ان سب لوگوں کے درمیان نذیر کو بہت مختلف محسوس کیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں نرمی اور چال میں شرافت محسوس کی تھی۔ مجھے موقع دیکھ کر نذیر سے یہ بات کر دینی چاہئے۔ ایسا نہ ہو پانی سر سے اونچا ہو جائے اور میرے پاس چناب میں ڈوب مرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہے۔

وہ جانتی تھی نذیر سے بات کرنا آسان نہیں اور پھر خدا نے اس کے بنا بات کئے ہی سبب بنا دیا۔ نذیر کو بخار آنے لگا اور بیماری کی وجہ سے وہ کھیت میں سونے کی بجائے گھر پر سونے لگا۔ ابا نے اس کی جگہ شرفے کو کھیتوں کی نگرانی کے لئے بھیج دیا اور نذیر کی ماں نے نذیر کی رات کو گھر پر رہنے کی مجبوری کی وجہ سے رانو کو پارو کے کمرے میں سونے کے لئے کہہ دیا۔ جو بات اس کے لئے مشکل ثابت ہو رہی تھی وہ خود ہی آسان ہوتی چلی گئی۔

بیماری کی وجہ سے نذیر گھر پر ہوتا تھا تو پارو اسے باہر کے کام بھی بتانے لگی۔ وہ باہر نکلتی تو اسلم سے ملاقات بھی ہو جاتی وہ ہر ملاقات پر اسلم کو سمجھاتی۔

"اب میرا خیال دل سے نکال دے۔ کیا فائدہ میرے پیچھے خود کو برباد کرنے کا۔ تو واپس لوٹ جا اور بھول جا تیری حیاتی میں کوئی رانو نام کی بدنصیب بھی آئی تھی۔"

"کیا تو مجھے بھول سکتی ہے؟" الٹا وہ اس سے پوچھ بیٹھتا اور وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔

"تو میری بات نہ کر۔ میرے پاس تو زندگی میں تیری یادوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں، میں تو یہ سوچ کر خوش ہو جاتی ہوں کہ کوئی ایسا بھی ہے جسے میری چاہ تھی اور جو میرے دکھ کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ میری جھولی خالی نہیں ہے۔ اس میں محبت کے پھول خوشبو دے رہے ہیں۔ بس اچھو! تو یہ سمجھ لے کہ تیرا خیال تیری محبت ہی میری زندگی کا سرمایہ ہے پر تیرے لئے راستے کھلے ہیں۔ خود کو برباد نہ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ یہاں اس جھنڈ میں بیٹھ کر تیرے انتظار میں کیسا نشہ ہے۔ تو آتی ہے تو سمجھ لے میں جی اٹھتا ہوں۔ بس مجھے راستہ بدلنے پر مجبور نہ کر۔"

"اچھو! زندگی مشکل سے مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کتنا سفر باقی ہے، میں تو تھکنے لگی ہوں۔"

"تو میری مانتی بھی تو نہیں ہے، جن کی خاطر خود کو برباد کرنے پر تلی ہے، انہوں نے کبھی پلٹ کر بھی پوچھا ہے تجھے، اپنا مفاد کی خاطر جیتی جاگتی زندگی تباہ کر دی۔ کانٹوں پر رول دیا ہے تجھے۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو، پر مجھے یقین ہے۔ وہاں میرے اس گاؤں میں دو آنکھیں اب بھی مجھے یاد کر کے

آنسوؤں سے بھر جاتی ہوں گی۔ ان ہونٹوں پر میرے لئے دعائیں ہوں گی اور دل میں میرا درد کروٹیں لیتا ہوگا، مجھے پورا یقین ہے اچھو! میری ماں اس دن سے سوئی نہیں ہوگی جس دن میں سولی پر چڑھائی گئی تھی۔ عورت بڑی مجبور اور بے بس ہو جاتی ہے۔ اپنی کوکھ کی جنی کو بھی نہیں بچا سکتی مگر وہ مجھے بھولی تھوڑا ہوگی۔ اگر میں یہاں سے بھاگ گئی ناں اچھو! تو وہاں وہ لوگ میری ماں کا جینا حرام کر دیں گے۔ میرے پیروں میں میری ماں کی محبت کی بیڑیاں ہیں اچھو! میں نہیں چاہتی میرے یہاں سے بھاگ جانے کی سزا میری ماں کو ملے۔"

☆......☆......☆

اب وہ رات کو پارو کے کمرے میں سوتی تھی اور پارو رات کو کاموں سے فارغ ہو کر ایک بکس کھولتی اس میں سے مہندی رنگ کا ریشمی کپڑا نکالتی اور اس پر کڑھائی شروع کر دیتی۔ بلب جلائے وہ دیر تک اس پر ستارے، موتی ٹانکتی رہتی۔ ہر پھول کے مکمل ہونے پر وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ کپڑا بستر پر بچھاتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اسے دیکھتی۔ یقیناً وہ اپنے جہیز میں رکھنے کے لئے جوڑے تیار کر رہی تھی۔

اس بکس میں سارے ہی جوڑے اس کے جہیز کے ہوں گے۔ شوق اور لگن سے بنائے ہوئے کسی پر شیشے لگائے گئے ہوں گے، کسی پر رنگ برنگ دھاگوں سے کڑھائی کی گئی ہوگی۔ گوٹا کناری اور موتی ستاروں کے کام والے جوڑے سب سے زیادہ ہوں گے کہ ان کا سنہری اور چمک دار رنگ ہی تو جہیز کے کپڑوں میں رونق لگاتا ہے۔ ہر اچھا جوڑا اس کی ماں بھی جہیز کے لئے سنبھال دیتی ہوگی اور کسی پیٹی میں اس کے جہیز کے لئے سنبھالے برتن بھانڈے بھی موجود ہوں گے شنیل کی نرم شوخ رنگ رضائیاں کڑھائی والی خوب صورت بستر کی چادریں۔ وہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی تھی کہ اس کی ماں نے بھی اسی طرح اس کا جہیز بنا رکھا تھا۔ وہ سب ادھر ہی پڑا رہ گیا۔ اس کے ساتھ تو نقد رقم آ گئی تھی جو شاید اس کے باپ نے بیٹے کا سر بچانے کے لئے زمین کا ایک ٹکڑا بیچ کر ادا کی تھی۔ شیشوں والے سوٹ، وہ گوٹا کناری سے سجے دوپٹے، سب دھرے کے دھرے رہ گئے کہ وہ یہاں دلہن بن کر تھوڑی اتری تھی۔

جب تک پارو ان کپڑوں پر اپنے خواب ستاروں کی صورت ٹانکتی رہتی، اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے بظاہر سوتی بن کر پلکوں کی جھری میں سے اسے اور اس کے کپڑوں کو دیکھتی رہتی اور کبھی جو دیکھتے دیکھتے آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر جاتیں تو وہ چپکے سے کروٹ بدل لیتی۔

ایک کمرے میں ہونے کے باوجود پارو نے کبھی اس سے بات نہیں کی اور وہ خود تو اسے مخاطب کرنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ پارو یہاں چارپائی پر گدا ڈال کر اجلی چادر بچھا کر سوتی تھی اور اس کے لئے کمرے کے ایک کونے میں اوپر نیچے دھرے ٹرنکوں کے ساتھ دری بچھا دی گئی تھی۔ موسم بدل رہا تھا، زمین کی ٹھنڈک کو یہ باریک پرانی سی دری روک نہیں پاتی تھی اور سردی رانو کے بدن میں گھس کر اسے سونے نہیں دیتی تھی مگر وہ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اسے ساری سردیاں شاید اسی دری اور پرانے سے لحاف کے ساتھ گزارنا تھیں اور وہ کیسے گزارے گی، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

☆......☆......☆

گھر میں تیاریاں ہورہی تھیں۔ اس نے پارو اور اپنی ساس کو ہی کہتے سنا تھا۔

"پارو کی خالہ ادھر چند دن رہنے کے لئے آرہی ہے۔"

وہ منڈی ڈھاباں سنگھ کے قریب کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ ڈھاباں سنگھ (صفدر آباد) لاہور سے قریب ہے اسی لئے پارو کی خالہ خود کو بڑا فیشنی (فیشن ایبل) سمجھتی تھی۔ ہر چیز پر گہری نظر ڈال کر تنقید کرنے کی عادی تھی اور اس کی بہن اسے اپنے گھر میں تنقید کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ پیٹی کھول کر بستروں کی نئی چادریں، تکیوں کے غلاف نکالے گئے تھے۔ لحاف بھی دھوپ میں ڈالے گئے تھے اور پارو بڑے خوش گوار موڈ کے ساتھ گھر کی تفصیلی صفائی میں مصروف تھی۔

"نی پارو! یہ کام ختم کر کے رو (گنے کا رس) کی کھیر تو چولہے پر چڑھالے اور سن نذیرے سے کہہ، دو مرغیاں ذبح کردے۔ بھون بھان کر اچھی سی پکالینا اور یہ سارا کام خود کرنا۔ کہیں اس منحوس پر نہ چھوڑ دینا۔"

"نہیں اماں! تم فکر ہی کیوں کرتی ہو۔" پارو کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

"آئے ہائے مت ماری گئی میری، پتہ بھی ہے، سخاوت کو میرے ہاتھ کا بنا انڈے سوجی کا حلوہ بڑا پسند ہے۔ ذرا جلدی سے انڈے تو نکال اور بھیج اس منحوس کو ہٹی پر (دکان پر) جا کر سوجی لے آئے۔"

اماں بڑی جلدی میں تھی۔ ایک کام ختم نہیں ہوا کہ دوسرا یاد آ گیا۔ ارادہ تو یہی ظاہر کیا گیا تھا کہ سارے کام آج پارو خود کرے گی۔ اسے چولہے کے قریب نہیں آنے دیا جائے گا مگر اس کے ذمہ اتنے کام لگا دیئے گئے تھے کہ اگر چولہے کے پاس بیٹھ جاتی تو اتنی تھکن اسے نہ ہوتی۔

دو مرتبہ تو وہ ہٹی پر دوڑائی گئی پھر چارپائیاں کمرے میں لگا کر سب پر نئے بستر لگائے، جانوروں کا چارہ کاٹا، آٹا گوندھ کر رکھا، چولہے میں آگ جلائی اور اماں، پارو کام کے دوران اسے آوازیں ہی دیتی رہیں۔ کسی کو کوئی برتن چاہیے تھا، کسی نے چاول چھننے پر لگایا، رات کی بچی روٹی جو صبح اس نے کھائی تھی، کب کی ہضم ہو چکی تھی، اب تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اور روٹی اسے سب سے آخر میں بچی کھچی ہی ملنا تھی۔

چارہ کاٹتے ہوئے اس نے مکئی کے پودوں کے ساتھ کچھ بھٹے لگے دیکھے تھے۔ ابھی کچے اور بالکل نرم تھے۔ وہ اتار کر اس نے چھپا دیئے تھے۔ بھوک سے بے تاب ہوئی تو وہی ایک نکال کر سب سے آنکھ بچا کر کچا ہی کھانے لگی۔ اگر پارو یا اماں دیکھ لیتیں تو اس پر بھی بہت باتیں سناتیں۔ وہ جلدی جلدی کھا رہی تھی۔

شرفا آنے والے مہمانوں کو لینے بڑی سڑک تک گیا تھا کہ بسیں مسافروں کو اتار کر وہیں سے اگلی منزل کی طرف روانہ ہوتی تھیں۔ بڑی سڑک یہاں سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ وہ گاؤں سے ہی تانگہ تیار کروا کر گیا تھا اور ادھر گھر میں بڑی بے چینی سے مہمانوں کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مہمانوں کی آمد ہوئی۔ پارو جو اب تک پھرکی کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھی، ان کی آمد کا سنتے ہی کسی کمرے میں جا چھپی، مہمانوں میں دو عورتیں اور ایک مرد تھا۔ عورتوں نے آتے ہی بین ڈالے اور رانو کو دیکھ کر بددعائیں دیں۔ اس رسم کے بعد وہ نیم کے تلے بچھی چارپائیوں پر جا بیٹھے۔ ایک جو ذرا بڑی عمر والی عورت تھی، اس نے کمر کے پیچھے دو تکیے رکھ کر ٹیک لگائی اور سفر میں ہونے والی تھکان کو تفصیل سے بیان کرنے والی لڑکی پارو اور رانو کی ہم عمر تھی۔ اس نے گہرے فیروزی جارجٹ کے سوٹ پر سرخ دھاگے سے ڈھیروں کڑھائی کر رکھی تھی۔ سیاہی مائل سانولے بازو میں بھر بھر فیروزی اور سرخ چوڑیاں تھیں اور پاؤں میں خوب اونچی ہیل والی کالی سینڈلیں تھیں جبکہ ان کے ساتھ آنے والا جوان مرد بھی اسے شرفے کی طرح کا بدنظر اور ناقابل اعتبار ہی لگا تھا۔

"نی پارو! باہر نکل، دیکھ کون آیا ہے۔"

اماں نے پہلے اسے آواز دی پھر ماسی کو بتانے لگی۔

"صبح سے کام میں لگی ہے۔ اب تم لوگوں کی آمد کا سنا تو پتہ نہیں کہاں جا چھپی ہے۔"

"ہا، لو بھلا ہم سے کیوں چھپنا بنتا ہے بھلا اس کا؟" عورت نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"بڑی شرم والی ہے۔ ذرا مشکل سے ہی کسی کے سامنے آتی ہے۔" ماسی کے انداز پر اماں کچھ کھسیا کر وضاحت کرنے لگی۔

اتنے میں جھجکتی شرماتی پارو بھی کمرے سے نکل آئی اور دھیرے سے سب کو سلام کرنے لگی۔

"اماں! یہ تو کافی بڑی ہوگئی ہے۔" لڑکے نے اسے گھورتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔

"ہاں تو کتنے سال بھی تو گزر گئے جب دیکھا تھا۔" اس کی ماں کے انداز میں وہی بے نیازی تھی۔

"اتنے سال کہاں؟ ابھی پچھلے سال ہی تو ہم آئے تھے۔" لڑکے نے یاد دلایا۔ ماں نے اسے گھوری ڈالی پھر پارو سے بولی۔

"پانی تو پلا۔ میرا تو گلا مٹی سے خراب ہو رہا ہے۔ توبہ توبہ، راستے میں کوئی دھول ہے۔ پھر تمہارے پنڈ کا راہ، سارے کا سارا کچا پکا۔ ٹوٹی سڑکیں۔ میری تو کمر دُکھ گئی دھچکوں سے۔"

"بات اتنی ہے، بہن صغریٰ! کہ تو اب بالکل ہی شہری ہوتی جا رہی ہے ورنہ کیا جس پنڈ میں ہم جمے پلے تھے، وہاں کیا مٹی نہیں ہوا کرتی تھی۔"

اماں کی بات کا اس کی بہن صغریٰ نے برا نہیں مانا بلکہ اک فخر سے مسکرا دی کہ آخر اسے "شہرن" کہا گیا تھا۔ پارو پانی کے بجائے دودھ کا گلاس لے کر آ گئی۔

"ماسی! کبھی آپ لوگ بھی ہماری طرف کا چکر لگاؤ۔ آ کر تو دیکھو ہماری طرف تو پکی سڑکیں، پکے راستے۔ اب تو لوگوں کو ہمارے شہر اور لاہور میں کوئی فرق ہی نہیں لگتا۔ قسمے (قسم سے) بڑی ترقی کرلی ہے ہمارے علاقے نے۔ گلیاں پکی ہیں اور ہر گھر بھی پکا ہے۔ اکثر لڑکے صبح نوکری کرنے لاہور چلے جاتے ہیں۔ شام کو واپس آ جاتے ہیں، وہاں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" لڑکے نے بھی مزید تفصیل بتائی۔

"تم بھی شہر میں نوکری کرتے ہو؟" شرفے نے پوچھا۔

"اے ناں وے، ہم کیوں کرنے لگے بھلا نوکری۔ میرے گھر والے کے حصے میں اچھی خاصی زمین آئی ہے، اپنی زمینداری ہے ہماری، گاؤں میں بڑی عزت سے بڑے چھوٹے سب چوہدری صاحب کہہ کر بلاتے ہیں اور تیرے خالو کی تو نمبردار سے بھی بڑی دوستی ہے۔ اس وجہ سے بڑا ہی ٹھکا ہے ہم لوگوں کا۔"

ماں بیٹا بڑھ چڑھ کر شیخیاں بگھار رہے تھے اور سننے والے متاثر ہوئے جا رہے تھے۔ ایک دم سے ہی شرفے کو اپنی اچھی خاصی سانولی عام سے نقوش والی خالہ زاد اچھی لگنے لگی تھی اور پارو کو تو دین محمد عرف دینو ویسے بھی پسند تھا۔ دیکھا تو کبھی سال دو سال پہلے تھا۔ پر ماں آس پڑوس والیوں سے کہتی رہتی تھی اپنی پارو کا رشتہ تو میں بہن کے گھر دوں گی اور صغریٰ ایک ہی تو بہن تھی اماں کی اور یہ دینو ماسی کا اکو اک پتر، پھر پارو کے دل میں اس کی تصویر کیسے نہ بنتی۔

مہمانوں نے کھانا بڑی رغبت سے کھایا۔ اماں بتاتی رہی۔ ''یہ سب پارو نے تیار کیا ہے۔'' اس پر دینو ''بڑا سواد والا ہے۔'' کہہ کر داد دیتا رہا جبکہ دونوں ماں بیٹی خاموشی سے سب کھاتی رہیں اور تیز نظروں سے برتن رکھتی اٹھاتی رانو کو بھی دیکھتی رہیں۔

''ماسی! اب اچھی سی چائے بھی پلوا دو۔ بڑی تھکن ہو رہی ہے۔ چائے پی کر کچھ دیر آرام کریں گے۔''

''اوئے دین محمد! کیسا مرد ہے بھئی تو، دن کے وقت آرام کرے گا۔''

شرفے نے عادت کے مطابق مذاق اڑایا جو ابا اماں اور پارو کو بالکل اچھا نہیں لگا جبکہ نذیر یوں بیٹھا تھا جیسے اس نے کچھ بھی نہیں سنا۔

''اپنے شہر میں کام ہی تو کرتے ہیں۔ اب کچھ دن کے لئے ادھر آئے ہیں تو زندگی مرضی سے گزارنے کو جی چاہ رہا ہے۔''

دینو کو اس کی بات بری تو لگی تھی مگر بولا ذرا طریقے سے ہی تھا۔ مگر اس کی اماں سخت غصے میں آ گئی۔

''میں بھی ادھر ہی ہوں۔ دیکھتی ہوں تو سارا دن کون سے پہاڑ سے دودھ کی نہریں نکالتا ہے۔''

''او ماسی! کوئی ایسی ملے بھی تو دودھ کی نہریں بھی نکال لیں گے۔ وہ عاشق (فرہاد) ہم سے زیادہ مرد تھوڑی رہا تھا۔''

''آہو صغریٰ! چیلنج نہ کر میرے پتر کو، یہ جس بات پر تل جائے بس پھر کر کے ہی چھوڑا کرتا ہے۔'' اماں نے ہنس کر بڑے مان سے کہا تھا۔

''نذیر کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟ ساری حیاتی اس عورت کے ساتھ ہی گزار دے گا جو اس کے جوان چن ورگے سوہنے بھرا کے قاتل کی سگی بہن ہے۔''

صغریٰ کی بات پر ماں نے سر کو زور سے نفی میں ہلایا۔

''میرے پتروں کے گن تو سارا پنڈ گاتا ہے، ان کے لئے رشتوں کی کمی ہے ہی نہیں، جدھر اشارہ کردوں ادھر سے ہی رشتہ مل جائے۔ پر کیا کروں۔ ابھی دل گاجے واجے کو چاہتا ہی کہاں ہے۔ ابھی تو زخم ہرے ہیں۔''

''کڑی کے ساتھ سنا ہے اچھا خاصا پیسہ بھی لیا تم لوگوں نے؟'' ماسی صغریٰ کو تجسس سوال پر مجبور کر رہا تھا۔

''میرا پتر لاکھوں کروڑوں پر بھی بھاری تھا۔ اس کے بدلے میں نے کیا لینا تھا بس دل نرم پڑ گیا۔ سوچا وہ ظالم ماں کا اکو اک پتر ہے، بس میں نے سوچا چلو اس ماں کا کلیجہ تو ٹھنڈا رہے۔ بس اسی لئے معاف کر دیا

اور اس کرموں جلی کو اپنے نذیر کے پلے باندھ کر ادھر اپنے گھر میں لے آئی۔ پر بڑی غلطی ہوئی مجھ سے، یہ جب سے آئی ہے نحوست پھیلا رکھی ہے۔ پتہ نہیں کیسی آنکھیں ہیں اس جادوگرنی کی۔ پتھر بھی پھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔'' ''ہاں دیکھنے میں ہی پتہ چلتا ہے عام عورت نہیں ہے۔ نذیر کے ساتھ خوش تو ہے ناں؟'' صغریٰ سفا کی کی حد تک سچ بول جاتی تھی۔ نذیر کا ذکر اس نے یونہی نہیں کیا تھا اور نذیر کے ہاتھ سے اس وقت پانی کا گلاس چھلک گیا۔

''دھیان سے، کیا ہو گیا ہے۔'' دین محمد ہنسنے لگا تھا اور نذیر نے اتنی سردی میں بھی اپنی پیشانی عرق آلود محسوس کی تھی۔

''نذیر منہ نہیں لگاتا اسے اور ہم اسے کوئی اس گھر کی نوں بنا کر نہیں لائے۔ ہمیں کیا پروا خوش ہے یا اداس۔''

''آہو، وہ تو لگ رہا ہے۔ اس گھر میں رہتی ضرور ہے پر کوئی رشتہ نہیں بن سکا تم لوگوں کا اس سے۔ میں تو کہتی ہوں تم نے غلط ہی کمایا۔''

''اے صغریٰ، یہ تو ان سے پوچھ جن کے جوان لڑکے کو اس کے بدلے میں زندگی مل گئی۔'' اماں کچھ جلال میں آ گئی۔

''ہک ہا، پنڈ کی ظالم رسمیں۔ پتہ نہیں اب تک تم لوگ سدھرے کیوں نہیں۔ بات بات پر چاقو چھریاں نکال لیتے ہو۔ لڑائی بھڑائی کو اپنی بہادری سمجھتے ہو۔''

''ماسی! شہر میں رہنے سے تم لوگ تو بزدل ہو گئے ہو، ہمیں ایسے سبق نہ دو۔'' شرفے کو یہ انداز پسند نہیں آیا تو ناگواری سے ٹوک دیا۔

''بزدلی بہادری کی بات نہ کرو اوئے، بھرا کے بدلے دشمن کی عورت پر ظلم توڑنا کہاں کی مردانگی ہے۔'' شرفا بولا تو دینو کیوں چپ رہتا۔ ویسے بھی شرفے نے بات بزدلی کی کر دی تھی۔ ماحول میں ایک دم سے گرما گرمی پیدا ہو گئی جسے بروقت عقل سے کام لے کر شرفے کے ماں باپ نے ٹھنڈا کیا۔ نذیر، شرفے کا بازو پکڑ کر اسے وہاں سے اٹھا لے گیا۔

''میں کہتی تھی ناں یہ ہے ہی منحوس۔ دیکھ ناں اس کی وجہ سے ہم بہنیں بہنیں ہی آپس میں لڑنے لگی تھیں صغریٰ! یہ لڑکے جوان خون ہیں۔ اس کے سامنے ایسے مسئلے نہ چھیڑ، آپس میں غصہ کرنے لگتے ہیں۔'' بات صغریٰ کی سمجھ میں آ گئی تھی اس لئے اب کے چپ رہی۔

اصل میں بہت عرصہ پہلے کبھی دین محمد اور پارو کی بات محض زبانی کلامی دونوں بہنوں کے درمیان ہوئی تھی اور اسی وقت سے یہ خود کو منڈے والا تصور کرنے لگی تھی۔ آج جو بڑھ چڑھ کر تنقید کی تو صرف یہ سوچ کر کہ پتر کا سسرال ہے اور پتر کی سسرال میں ساس کے آگے کون بول سکتا ہے مگر تھوڑا بول کر احساس ہوا کہ وہ ابھی ساس نہیں بنی۔

''شاید جب تک باقاعدہ شگن نہ ڈال لوں گی تب تک یہ دینے کو داماد اور مجھے بیٹی کی ساس نہیں سمجھیں گے حالانکہ زبان سے بڑھ کر تو کچھ نہیں پر یہ بھی ہے کہ بات صرف میری اور میری بہن جنت بی بی کے

درمیان ہی ہوئی تھی۔ پارو کے باپ کو تو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کی اپنی برادری اتنی بڑی ہے۔ کیا پتہ ادھر ہی بیٹی
کے لئے کوئی رشتہ دیکھ رکھا ہو۔ خیر مجھے دل پر لینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

ماسی یہ سب سوچتی رہی اور ادھر ادھر کے کام نبٹاتی پارو کو بھی دیکھتی رہی۔ لڑکی واقعی اچھی ہے، کام میں
تیز اور زبان تو سمجھو منہ میں ہے ہی نہیں۔

''کیا سوچ رہی ہے اماں؟'' نچھو اس کے برابر آ بیٹھی۔

''پارو کو دیکھ رہی ہوں۔ اچھی لگ رہی ہے۔''

''پارو سے زیادہ اس کی بھابی رانو خوب صورت ہے۔''

''چل ہٹ مقابلہ کیوں کرنے لگی۔ پارو بھانجی ہے میری۔ دینے کے ساتھ جچتی ہے۔''

''اتنی جلدی فیصلہ نہ ڈال دیا کر اماں!''

نچھو بھی تنک چڑھی تھی حالانکہ آتے ہی پارو نے اس کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ اسے اپنے ہاتھ کا بنایا
شیشوں والا پراندہ اور رنگ برنگ دھاگوں کی کڑھائی والا دوپٹہ بھی دیا تھا، جسے اس نے فوراً قبول کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

''تجھے رب سے شکوہ تو ہوگا رانو؟'' وہ سبزی چننے کھیت کو چلی تھی جب نذیر اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

اتنے بہت سارے دنوں میں یہ پہلی تھی جو اس نے رانو سے کی تھی اور بات بھی ایسی جس کا جواب رانو
دینا نہیں چاہتی تھی۔

''مجھے معلوم ہے بہت زیادتی ہوئی ہے تیرے ساتھ۔ کہاں تو اور کہاں میں، تیرے ساتھ تو کوئی اونچا
لمبا گورا چٹا ہی سجتا ہے جس کی کھڑی ناک ہو اور بال گھنگھر کھا کر ماتھے پر پڑتے ہوں، جس کی گھنی مونچھیں
ہوں اور جو بولتا ہو تو بات اگلے کے دل میں اتر جاتی ہو۔''

رانو چونک اٹھی۔ یہ سارا نقشہ تو اچھو کا تھا۔ کیا نذیر جانتا ہے؟ گھبرا کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ڈرو نہیں، میں جانتا ہوں۔ قصور میرا ہے۔ میں ہی تم دونوں کے درمیان آ گیا ہوں۔''

وہ اب بھی بول نہیں پائی۔ ''لاؤ سبزی میں توڑ لاتا ہوں۔'' اس نے رانو کے ہاتھ سے کپڑا لیا اور کھیت
کی جانب چل پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس کے پیچھے چل پڑے یا گھر کی راہ ہو لے۔

''اے تو ادھر راستے پر کھڑی کس کی راہ تک رہی ہے؟'' موٹر سائیکل پر سوار شرفا ادھر آ نکلا اور اسے
دیکھتے ہی کڑک دار آواز میں پوچھنے لگا۔

نذیر اس آواز پر کھیتوں کی جانب جاتے ہوئے پلٹا اور بولا۔

''شرفے! تُو اپنی الگ راہ لگ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا عورتوں کی طرح ٹوہ میں رہنے کی تیری عادت
کیوں بن گئی ہے۔'' ایسا وار سن کر شرفا بھڑک گیا۔

''بس بس زبان قابو میں رکھ۔ تجھ میں مردوں والی کون کون سی باتیں ہیں، یہ میں بڑی اچھی طرح جانتا
ہوں۔'' رانو تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف چل پڑی۔

مگر شرفا اس سے پہلے پہنچ گیا اور جا کر ماں سے دو کی چار لگا دیں۔ گھر پہنچنے پر اس نے اماں اور پارو کو

تواضع کے لئے اپنا منتظر پایا۔ اس نے رحم کی درخواست لئے مہمانوں کی جانب دیکھا مگر وہ نظر چرا کر سامنے
رکھے گنوں کے ڈھیر کی جانب متوجہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

درد سے کراہتے جسم کے ساتھ صبح کی قہر زدہ ٹھنڈ میں اٹھ کر بھینس کا دودھ دوہنا اور پھر اپلوں کی آگ
سلگا کر لسی بلونے کے لئے چاٹی میں دہی ڈالنا آج اس کے لئے کسی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ سردی نے درد کو
اور بھی تیز کر دیا تھا۔ کئی بار آنکھوں میں نمی اتری اور اس نے سختی سے یہ آنسو پونچھ ڈالے۔ آج وہ سارے
جہان کا غصہ خود پر اتارنے کے درپے تھی۔

لسی بنا کر فارغ ہوئی تو چائے بنا کر بڑے کمرے میں لے آئی جہاں گھر کے افراد کے ساتھ مہمان بھی
موجود تھے۔

''میری پارو جیسی لڑکی پورے پنڈ میں دوجی نہیں ہے۔ دریاں، کھیس سب اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے
ہیں اور جو صفائی اس کے ہاتھ میں ہے کیا کسی کے ہاتھ میں ہوگی۔''

''واقعی ماسی ہاتھ کی ہی کیا، کل زبان کی صفائی بھی ہم نے دیکھ لی ہے۔'' دینے نے ہنس کر بڑی گہری
بات کہہ دی تھی۔ اس سے پہلے کہ ماں کچھ بولتی نچھی بھی کہنے لگی۔

''آہو ماسی! کل تو ہمیں اس نے حیران ہی کر دیا۔''

''میری نچھو تو بس منہ کھولے دیکھتی ہی رہی اور میں بھی حیران پریشان توبہ توبہ۔'' صغریٰ نے کانوں کو
ہاتھ لگایا۔ اسے جیسے کل کا منظر آج بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پارو نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا۔ ماں قہر بار نظروں سے چائے کے پیالے سب کے آگے رکھتی رانو
کو دیکھ رہی تھی۔

''ماسی! دل میں بھانبڑ جل رہے ہوں تو زبان زہر ہی اُگلا کرتی ہے۔'' پارو نے خود ہی صفائی پیش
کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

''ناں ری، ہمیں تو یہی سبق دیا گیا کہ عورت ذات کو صبر سے کام لینا چاہئے، تتی زبان والیاں کسی کا لحاظ
نہیں کرتیں اور کبھی گھر نہیں بسا سکتیں۔''

یہ بات اماں کو بری لگی کہ براہ راست اس کی بیٹی پر حملہ تھا اور بحث شروع ہو گئی جو ذرا دیر میں تیزی
اختیار کر گئی۔

اس کے بعد مہمان زیادہ دن نہیں رکے۔ اگلی صبح ہی خفا خفا سے گھر سے رخصت ہو گئے اور ان کے یوں
جانے کی ذمہ داری بعد میں پوری کی پوری رانو کے سر آئی۔

☆......☆......☆

پنڈ کے نمبردار کا خاص آدمی سویرے ہی سویرے ابا اور نذیر کے لئے نمبردار کا پیغام لے کر آیا تھا۔

''کیا بات ہو سکتی ہے؟ کیوں بلوایا ہے نمبردار نے؟'' اماں نے سنا تو پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

''پتہ نہیں، اب یہ تو وہاں جا کر ہی پتہ چلے گا۔'' ابا بظاہر بے نیازی سے بولا تھا مگر کھد بد اسے بھی ہو رہی
تھی۔ جلدی جلدی ناشتے کے نام پر روٹی کے بڑے بڑے نوالے پیٹ میں دھکیل کر لسی کا گلاس پیا اور بولا۔

''چل نذیرے! جلدی اٹھ، پتہ تو چلے نمبردار کو ہماری یاد کیوں ستانے لگی ہے۔''

''اہو، جلدی اٹھ جا اور سنو تم لوگ وہیں سے کھیتوں کو نہ چل پڑنا۔ گھر آ کر ہمیں بھی بتا دینا۔ معاملہ کیا ہوا ہے؟''

''او اماں! ایک تو تیرے وہم ہی ختم نہیں ہوتے۔'' شرفے کو اتنی بے چینی خوامخواہ ہی تپا گئی۔

ابا کی واپسی میں زیادہ دیر نہ لگی۔ ابا آتے ہی شرفے پر برسنے لگا۔

''آخر معاملہ کیا ہے ابا؟ نمبردار کی سن کر مجھ پر برسنے لگے ہو۔ پہلے میری بھی تو سن لو۔'' شرفا دب کر کہاں رہتا تھا۔

''تیری کیا سن لوں میں، سارا پنڈ ایک ہی بات کہتا ہے۔ شرفا ہتھ چھٹ ہے، زبان سے کم بات کرتا ہے، ہاتھ کا استعمال زیادہ کرتا ہے۔''

''اور یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔'' نذیرے نے بھی سمجھانا چاہا اور اس کے اتنا کہنے پر ہی وہ بھڑک اٹھا۔

''چپ کر اوئے بزدل! تیرا مردوں والے معاملے سے کیا تعلق۔''

''اسے سمجھا لے ابا! میں اس کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔'' نذیر اتنا کہہ کر وہاں سے چل پڑا۔

''میرے منہ لگنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔'' شرفے کے انداز میں غرور ہی غرور تھا۔

نذیر کھیتوں کو چلا گیا۔ رانو گھر کے کام سمیٹنے لگی۔ شرفا کچھ دیر ماں باپ کی نصیحتیں سنتا اور بحث کرتا رہا پھر وہ بھی باہر نکل گیا۔

اور کچھ ہی دیر بعد گاؤں کے بچے دوڑے ہوئے اس اطلاع کے ساتھ آ گئے۔

''تمہارے بیٹے شرفے کی لڑائی ہوئی ہے۔ اس نے کچھ آدمی زخمی بھی کر دیئے ہیں۔''

''یا اللہ خیر، یا اللہ رحم!'' ماں اور پارو ننگے پیر ہی باہر کو بھاگیں۔ رانو مٹر کے دانے نکال رہی تھی، وہ اسی طرح اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کچھ ہی دیر بعد شرفا یوں گھر میں داخل ہوا کہ دو جوانوں نے اسے قابو کر رکھا تھا، پیچھے پیچھے ہاتھ رگڑتی شرفے کو ٹھنڈا دماغ کرنے کی تلقین کرتی پارو اور اس کی ماں تھی مگر شرفا کسی کی کہاں سن رہا تھا۔ وہ دھمکیوں پر دھمکیاں دیئے چلا جا رہا تھا۔

''کھیتوں میں بھی اطلاع ہو چکی تھی نذیر اور ابا بھی سن کر دوڑے چلے آئے تھے۔

ذرا دیر گزری تھی کہ مخالف پارٹی والے پولیس کے ساتھ چلے آئے۔

''تھانیدار بادشاہ! یہ ظلم ہے، چوٹیں تو میرے بیٹے کو آئی ہیں۔''

''ہم نہیں جانتے پرچہ پہلے اس پارٹی نے کٹایا ہے اور پھر ان کے دو آدمی زخمی ہوئے ہیں۔ دونوں اسپتال میں داخل ہیں۔ تمہارا بدمعاش بیٹا تو بڑے آرام سے ادھر منجی (چارپائی) پر بیٹھا ہے۔''

تھانیدار نے ابے کی بات سنی نہ اماں کی فریاد۔ وہ شرفے کو ہتھ کڑی لگا کر لے گیا اور گاؤں والوں کے لئے ایک نیا موضوع چھوڑ گیا۔

''نی ڈائن، کھا گئی اس گھر کی خوشیوں کو۔ ہائے میرے شیر جوان جیسے بیٹے!'' اماں نے غصے کے عالم میں مٹر کے دانوں والا تھال صحن میں الٹ دیا۔ پھر منہ پر دوپٹہ ڈال کر رونے لگی۔

''نحوست نہ پھیلا۔ آ جائے گا ابھی شرفا، میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔'' ابا چلا تو نذیر بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

سارا دن انتظار میں گزرا۔ تینوں میں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ اماں اور پارو گھر کے دروازے پر کھڑی راہ دیکھتی رہیں۔

رات گئے نذیر اور ابا کی واپسی ہوئی دونوں تھکے ہارے بستروں پر ڈھے سے گئے۔

''کیا ہوا، کچھ بتاؤ تو۔ میرا شرفا کدھر ہے؟''

''ہم لٹ گئے، تباہ ہو گئے۔'' ابے نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

''میرا دل بیٹھا جاتا ہے، کچھ بتاؤ تو۔'' اماں اس انداز پر ڈر گئی۔ پارو بھی سہم کر قریب آ گئی۔

''ان لوگوں کے دو لڑکے زخمی ہوئے تھے، ایک مر گیا ہے۔''

''ہائے ربا! اب کیا ہوگا؟'' اماں نے دل تھام لیا۔

''ہائے میرا بھرا، میرا سوہنا شیر جیسا بہادر بھرا۔'' پارو رونے لگی۔

''چپ کر نی! اس کی بہادریوں نے ہی یہ دن دکھایا ہے۔''

ابا نے ڈانٹ کر اسے خاموش کروا دیا مگر اماں اور پارو چپکے چپکے ساری رات سسکتی رہیں۔ نذیر اور ابا دیر تک گاؤں کے سرکردہ افراد کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے اور رانو یہ سوچتی رہی اگر آج بھی سردی کل جتنی ہوئی تو سونا بڑا مشکل ہو جائے گا۔ کہیں سے پرانی بوری کا ٹکڑا مل جائے تو وہی اپنی اس دری کے نیچے بچھا لوں۔

دو دن تک گھر کی یہی حالت رہی۔ کسی نے کچھ کھایا نہ پیا، پتہ چلا تھا ''تھانے میں شرفے کو بہت مار لگائی گئی ہے۔'' یہ سنتے ہی اماں نے تو چارپائی سنبھال لی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد شرفے کو پکارتی اور رونے لگتی۔

آخر تیسرے روز ابا صبح کا نکلا شام کو واپس آیا تو اس کے قدموں میں تیزی تھی اور وہ کوئی اہم خبر سنانے کی جلدی میں تھا۔

''اب بستر چھوڑ دے شرفے کی ماں! رب نے تیری سن لی ہے۔ دشمنوں سے صلح صفائی ہو گئی ہے۔''

''ایں سچ!'' پارو، نذیر اور ماں تینوں ہی چونک گئے۔

''ہاں، ہمیں کچھ روپے بھرنے ہوں گے اور ونی میں بیٹی دینا ہوگی۔''

پارو نے بے اختیار سرد موسم میں باریک جارجٹ کا جوڑا پہنے کالی پڑتی شام میں صحن کی بکھری چیزیں سمیٹتی رانو کو دیکھا اور دیکھتی چلی گئی۔

اگلے دن اسی اکڑ کے ساتھ شرفا گھر واپس آ گیا۔ تھانے میں واقعی مار پڑی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

گھر میں لوگ مبارک باد دینے آنے لگے تھے۔ پارو نے بس اتنا کہا تھا۔

''اب سدھر جا شرفے، تیری کوئی اور بہن نہیں جسے دے کر دوبارہ اپنی جان بچا سکے۔''

''چپ کر زیادہ نہ بول۔'' ابے نے پارو کو جھڑک کر وہاں سے ہٹا دیا۔

پھر جہیز یہیں کا یہیں پڑا رہ گیا، بس اتنا ہوا کہ لال جوڑا پارو کو ضرور پہنایا گیا اور جانے سے پہلے وہ باقی سب سے تو ملی، اس نے دور کھڑی رانو کو بھی بلایا اور گلے لگانے کے بعد اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''مجھے معاف کر دینا، جو کچھ تیرے ساتھ میں نے کیا، وہ میں بھگتنے جا رہی ہوں۔ بس میں بھول گئی تھی کہ ساری عورتوں کی تقدیر ایک ہی ہوا کرتی ہے۔ وہ زمین اور روپے کی طرح ...... ہوا کرتی ہیں۔ ضرورت پڑنے پر بیٹوں کی زندگی بچانے کے لئے دے دی جاتی ہیں۔ پر میں بھول گئی تھی۔ مجھے معاف کر دینا اب میں بھی پارو نہیں رہی۔ رانو بن گئی ہوں۔''

صبح وہ معمول کے مطابق سب سے پہلے اٹھی تھی مگر آج نذیر پہلے سے جاگ رہا تھا۔ شاید وہ ساری رات سویا ہی نہیں تھا۔

''رانو! ادھر کیکروں کے جھنڈ میں کوئی تیرا انتظار کرتا ہے ناں، وہ جو اس پنڈ کا نہیں ہے، کہیں دور سے تیرے لئے ادھر آیا ہے۔ تیرا خواب تو وہ تھا۔ میں تو تقدیر کے ظالم وار کی طرح بیچ میں آ گیا۔ تو اس کے پاس چلی جا'' اس نے حیرت سے نذیر کی جانب دیکھا۔

''ہاں رانو! تُو چلی جا میں تجھے طلاق کا کاغذ دے دوں گا۔ تجھے آزاد کر دوں گا۔ تو اس کے پاس چلی جا اور میری پارو کو معاف کر دینا۔ شاید اس طرح اس کی سزا کم ہو جائے۔ اگر کوئی چیز اس گھر سے اٹھانی ہو تو اٹھا لے اور یہ لے راستے کے خرچے کے لئے۔''

اس نے جیب سے کچھ رقم نکال کر اس کی جانب بڑھائی مگر وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی رہی۔

''لے پکڑ لے نا۔ میں طلاق کا کاغذ بھی تجھے دے دوں گا۔ روتی کیوں ہے پاگلے! جا تیاری کر لے۔ ادھر کیکر کے جھنڈ میں کوئی تیری راہ دیکھ رہا ہے۔ یہ سب ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جانا۔''

اور جب وہ اچھو کے ساتھ اس کی گھوڑی پر سوار ہو کر اس گاؤں سے رخصت ہوئی تھی، تب نذیر دور تک اسے جاتا دیکھتا رہا تھا پھر آنکھ میں آنے والے پانی کی وجہ سے منظر دھندلا سا گیا۔ وہ رانو سے کہنا چاہتا تھا،

''تجھے دیکھتے ہی مجھے تجھ سے محبت ہوگئی تھی۔ تو میری تھی مگر میں تیرے قریب ہی نہیں آ سکا۔ تجھے چھو کر دیکھا تک نہیں، میں جانتا ہوں تیرے دل میں کوئی اور ہے اور اس کا ساتھ مل جانے کے بعد بھلا میں اچھی یا بری یاد کی طرح بھی کہاں تیرے ساتھ رہ سکتا تھا مگر رانو! دل کے سلسلے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ تیرے دل میں اپنا خیال میں نے اپنے اس عمل سے پکا کر دیا ہے۔ تو اب مجھے بھلا نہیں سکے گی اور جب بھی میرے لئے سوچے گی، تیرے دل سے میرے لئے دعا ہی نکلے گی اور میرے لئے یہی کافی ہے۔ مجھ جیسوں کے لئے یہی بہت ہے۔''

آنکھیں نم تھیں، سوچ منتشر مگر دل مطمئن تھا۔

کیوں؟

یہ محبت کرنے والے ہی جانتے ہیں۔

☆......☆......☆

موسم ہجر ٹھہر جائے تو

''**اماں** کے لیے چکن کا کُرتا جس کا رنگ صوفیانہ ہونا ضروری ہے۔ بانو کے لیے چوڑیاں جن کا ڈیزائن بہت پیارا اور ایسا ہونا چاہیے جو پورے گاؤں میں کسی اور کا نہ ہو، زینت کے لیے سنہری کلپ اور انگوٹھی، ماما جی کے لیے کرتوں کی نفیس ململ اور امجد بھائی کے لیے ایک عدد سوٹ کا کپڑا۔''

ساری شاپنگ کر کے رات دس بجے کے قریب واپسی ہوئی تھی۔ اب میران ایک بار پھر لسٹ نکالے بیٹھا تھا اور ایک ایک چیز چیک کر رہا تھا۔

''سونا مرنا نہیں ہے کیا؟'' شاہد نیند اور بے زاری کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

''تم مر جاؤ۔ میں سو جاؤں گا۔''

''میں پوچھتا ہوں جب اتنی دیر خوار ہو کر ایک ایک چیز خریدی ہے تو اب دوبارہ کیا دیکھنے بیٹھ گئے ہو؟''

''تمہیں پتا نہیں ہے میرے گھر والوں کا۔ کسی ایک کی بھی کوئی چیز رہ گئی تو میری شامت آ جائے گی۔''

''نہیں نہیں، تمہیں دیکھ کر تمہارے گھر والوں کی عادات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

''باتیں نہ بناؤ، سو جاؤ مجھے بھی دھیان سے کام کرنے دو۔''

''میری مان لو سب چیزیں خرید لی گئی ہیں۔ اٹھو سنبھالو یہ سب اور سو جاؤ صبح تمہیں اپنے گاؤں بھی جانا ہے۔''

''ہاں یار! پورے دو ماہ کے بعد گاؤں جا رہا ہوں۔ اماں اور بانو کے لیے بہت اداس ہوں۔ جب تک ابا زندہ تھے، تب تک میں بے فکر تھا اور مجھے صرف ناز اٹھوانا ہی آتا تھا۔ مگر اب تو لگتا ہے سارا بوجھ میرے

کندھوں پر ہے۔"

"ادھر گاؤں میں تمہاری اماں اور بہن خوش تو ہیں کسی مرد کے بغیر رہتے ہوئے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"اللہ کا شکر ہے، اُدھر گاؤں میں ماموں ہیں۔ دیکھ بھال کے لیے' ان کی ہوتے ہوئے مجھے کوئی فکر نہیں سچ تو یہ ہے کہ ماموں کا بڑا احسان ہے کہ وہ ہماری زمینوں کی دیکھ بھال نہ کریں۔ اماں اور بہن کا خیال نہ رکھیں تو میں ادھر شہر میں رہ کر پڑھائی نہیں کر سکتا۔"

"احسان کی کیا بات ہے یار؟ آخر تمہاری اماں' بہن ہیں ان کی۔"

"ارے آج کے دور میں کون بھائی تو کون بہن؟ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ ہر کسی کی کوشش یہی ہوتی ہے۔ جتنا ہاتھ لگے جہاں سے لگ اٹھالو۔ قبضہ جمالو۔ ایسے میں اگر ماموں مخلص ہیں، اتنے احساس کے ساتھ ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہیں تو مجھے ان کا شکر گزار ہونا ہی چاہیے۔ اور میری اماں بھی مجھے یہی کہتی ہیں ماموں کا احسان ہمیشہ یاد رکھنا اِن کے آگے کبھی سر اٹھا کر بات نہیں کرنا۔"

"تم صبح گاؤں جا رہے ہو۔ واپسی کب تک ہوگی؟"

"فکر نہ کرو۔ تمہارے آنے سے پہلے آ جاؤں گا۔"

میران نے لسٹ پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے یہیں بیٹھے بیٹھے ہوا میں اُچھال دیے۔

"صبح میں نے صفائی کی تھی۔" شاہد کو اس حرکت پر غصہ آ گیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ صبح پھر کر لینا۔" میران اٹھا اور جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

"تمہاری بیوی بے چاری پر ترس آتا ہے۔ تم اسی طرح چیزیں اِدھر اُدھر پھینکا کرو گے۔ وہ سمیٹتی رہا کرے گی۔"

"ہمارے ہاں یہ کام بیوی نہیں نوکر کرتے ہیں ویسے مجھے بھی تمہاری بیوی سے ہمدردی ہے۔ صفائی کا تمہارا یہ خبط اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اس گھڑی کو کوسے گی جب تم سے بیاہی گئی تھی۔"

"بکواس بند کرو اور سو جاؤ۔ صبح تمہیں سفر پر جانا ہے۔"

"ہاں یار اور میں ابھی سے بے چین ہوں۔ دل چاہتا ہے۔ بس ابھی دن چڑھ آئے اور میں گاؤں پہنچ جاؤں جہاں رانی میری منتظر ہوگی۔"

میران نے تصور میں کسی کو دیکھا تھا جو چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"سچ بتا ذلیل! دیکھ آج جھوٹ نہیں بولنا۔ کیا واقعی رانی تیری گھوڑی کا نام ہے۔"

"اگر تجھے میرے کہے پر اعتبار نہیں ہے تو میرے ساتھ گاؤں چل۔ مل لینا میری رانی سے بھی' پتا ہے اتنی سی تھی جب میرے پاس آئی تھی۔ میں نے بڑی محنت کی ہے اس کے ساتھ، بڑی محبت اور توجہ سے پالا ہے اسے۔"

"آج اس کے لیے بھی کچھ خرید لینا تھا۔"

"اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے' تم فکر نہ کرو۔" اس کے انداز پر میران نے مسکراہٹ دبا کر منہ بنا کر کہا تھا۔

"ویسے مجھے تو لگتا ہے تم رانی سے نکاح بھی کر لو گے۔ اتنی محبت جو کرتے ہو۔" اس کے گھورنے پر وضاحت بھی کر دی۔

"محبت تو میں تمہارے ساتھ بھی بہت کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم سے بھی نکاح کر لوں گا۔"

"مجھے لگتا ہے میران! آج رات تجھے نیند نہیں آئے گی جاگتا رہے گا اور فضول بکواس کرتا رہے گا۔"

"گاؤں جانے کی' اپنے لوگوں سے ملنے کی خوشی بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش بھی کرو تو لفظ نہیں ملتے۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی ہے' چلو اچھا ہے جو لفظ نہیں ملتے۔"

شاہد نے تکیہ سر کے نیچے سے نکال کر چہرے پر رکھ لیا۔

☆......☆......☆

سونا اگلتی زرخیز زمین، میری دھرتی اے میری دھرتی، تیری جوانی سدا بہار ہے، تیرا حُسن بے مثال ہے تُو میرا مان میرا فخر ہے۔ پنجاب کا زرخیز ترین خطہ دو دریاؤں کی حفاظت میں یہ رعنا جوانی یہاں کی فصلیں ایک نہیں دو نہیں۔ بہت سی ہیں یہاں کے پھل شیریں ہیں اور یہاں کے لوگ من موجی، کھیل کود کے شوقین، وعدے نبھانے والے، ریت پر جان دینے والے، عزت کرنے اور کروانے والے، اکھڑ مزاج بھی ہیں اور بات بات پر قہقہے بھی بکھرتے ہیں۔ دلبستگی کو بہت سے سامان کر رہے ہیں، میلے ٹھیلے یہاں عام ہیں' تہوار بڑی توجہ سے منائے جاتے ہیں۔ کھیل بڑے شوق سے کھیلے جاتے ہیں' جو باتیں کرنے بیٹھیں تو رات سے دن کر دیں جو کسی کی آن پر بن آئے تو جان ایک کر دیں۔

یہاں موسموں میں شدت ہے۔ سورج جب نکلتا ہے تو لگتا ہے۔ آج تو سب کو جلا کر راکھ کر دے گا مگر وہ نہیں جانتا۔ سامنا پنجاب کے ان جیالوں سے ہے' جو جان والے ہیں ڈٹ جائیں تو پہاڑ ہلا دیں۔ بارشیں برستی ہیں تو زرخیز زمین پر لہلہاتی فصلیں پانیوں کی نذر ہونے لگتی ہیں۔ دریا بپھر جاتے ہیں۔ اور زمین پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ آسمان بھی پانی برساتا ہے۔ زمین بھی پانی پانی ہے، اور مکینوں کی آنکھیں بھی برس رہی ہیں مگر حوصلہ ہارنا نہیں۔ ادھر بپھرے دریا واپس ہوئے ادھر باسیوں نے پھر سے زندہ رہنے کے جتن شروع کر دیے۔ اینٹ پر اینٹ رکھی جانے لگی اور پھر سے آبادیاں جھلک دکھانے لگیں۔ کھیت پھر سے فصلوں سے آباد ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے زندگی یوں ہر طرف چھا گئی جیسے کبھی دریاؤں نے ظلم ڈھایا ہی نہ تھا۔ جیسے اس خطے میں کبھی غم کا طوفان آیا ہی نہ تھا۔ ہنسی پھر چہرے پر ہے۔ رات کو چوپال کی رونق اب پھر پہلے کی طرح ہے اور سریلی میٹھی آواز والا کوئی جوان ہیر پڑھ رہا ہے۔ مرزا، صاحباں پڑھی جاتی ہے۔ یوسف، زلیخا کا قصہ ہے اور ان سب کے ساتھ ساتھ کھیل تماشوں کی باتیں ہیں۔

بوڑھے جو ایک عمر گزار چکے ہیں جو دنیا کو برت چکے ہیں' ان کے پاس اَب تجربات ہیں۔ ان کی

آنکھیں بہت سی کہانیاں بیک وقت کہتی ہیں' مگر افسوس جوانوں کے پاس یہ کہانیاں پڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں اوران کے پاس وہ ذہن بھی نہیں جو سن رسیدہ لوگ رکھتے ہیں۔ جب ہی تو انہوں نے بزرگوں کی ہر بات بڑی عجیب لگتی ہے اوران کی سنائی ہر سچی کہانی جھوٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ بوڑھوں سے الگ بیٹھنا پسند کرتے ہیں خون کو جوش دینے والا واقعہ، انہیں ابھی ایسی ہی باتوں سے دلچسپی ہے کہ وقت ابھی ان کی مٹھی میں ہے۔ ابھی وقت کی ریت کو انہوں نے بند مٹھیوں میں مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور یہ گمان کرتے ہیں یہ ریت ان کی مٹھی سے نہیں پھسل سکتی مگر وہ اپنی خوشیوں میں مگن ہیں' دیکھ نہیں رہے ریت پھسلی جارہی ہے وہ تب چونکیں گے جب محبوبہ کے گھٹاؤں جیسے بالوں میں چاندی کا تار آجائے گا اور وہ ٹاہلی کا درخت جس کے مضبوط تنے سے ٹیک لگائے وہ دل کی رانی کی راہ تکتے ہیں۔ تمام پتے گرادے گا تب وہ حیران ہوکر قدم آگے بڑھائیں گے اور جان جائیں گے طاقت اور توانائی باقی نہیں رہی۔ گھبرا کر بند مٹھی کی طرف دیکھیں گے دل دھک سے رہ جائے گا۔ قدموں میں ریت کی چھوٹی سی ڈھیری ہے اور مٹھی میں بہت ذرے باقی ہیں۔ وقت تو بیت گیا۔ جوانی کی سنہری چڑیاں پھر سے اُڑ گئیں اور پیچھے ہائے باقی رہ گئی۔ ہائے جو دکھ پچھتاوے اور پشیمانی میں بے اختیار لبوں سے نکلتی ہے' تو بس اَب یہی باقی رہ گئی ہے۔ کاش ہم نے جوانی کے چمکتے دنوں میں کوئی اچھا کام کیا ہوتا ہم نے سچے سائیں کی پہچان کرلی ہوتی۔ ہم تو ہنستے ہی رہے اور ہنسی ہنسی میں سب سے قیمتی دولت چھن گئی جوانی ہماری نہیں رہی، آج ہماری آنکھوں میں وقت کی دھول ہے چہرے پر ان تمام سوچوں کی لکیریں ہیں جو ہم سوچتے رہے ہیں اور ہمارے قدم اب دھرتی کا سینہ نہیں دہلاتے اَب ہم تھم تھم کر قدم رکھتے ہیں' اب ہم سر اٹھا کر نہیں چلتے غرور رخصت ہو چکا ہے اور اس کی جگہ عاجزی نے لے لی ہے۔

وہی حویلی، وہی سبزہ' وہی لوگ مگر اتنے روز کے بعد دیکھا ہے تو سب نیا نیا سا لگتا ہے یہ مئی کا اوائل ہے۔ گرمی اپنے عروج پر ہے سورج دھرتی کو دہکا رہا ہے اور زمین کا رنگ مٹیالا کم، سرخ زیادہ لگتا ہے۔ گرم ہوا جسے مقامی زبان میں لُو کہتے ہیں۔ بدن کو جلاتی ہے اور ہر سو اڑتی باریک مٹی جوتوں کپڑوں ہر شے پر اپنی تہہ بٹھا جاتی ہے۔ جہاں جہاں درختوں کے جھنڈ ہیں وہاں غریب ہاریوں نے پانی چھڑک کر دوپہر کاٹنے کا انتظام کرلیتا ہے ان کے کنبے ان درختوں کی چھاؤں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔

میران شاہ جس وقت اپنی رہائش گاہ پر پہنچا، ہر سُو ہُو کا عالم تھا۔ درختوں پر بیٹھے پرندے بھی چپ تھے اور ہوا بھی ساکن تھی گرمی میں ہر شے پریشان اور حیران سی تھی۔ سُرخ حویلی جو اس کے بابا نے بڑے شوق سے بنوائی تھی۔ اس وقت تمازت سے اور بھی سُرخ لگ رہی تھی۔ گول ستونوں والے طویل برآمدے میں دور تک چقیں ڈالی ہوئی تھیں اندر یقیناً موسم بہتر ہوگا گیٹ سے داخل ہوکر گاڑی سے اُتر کر چابی رکھے کو تھمادی تھی اور وہ اَب جلد از جلد رہائشی حصے میں داخل ہو جانا چاہتا تھا چق اٹھا کر برآمدے میں آیا تو ایسا لگا پھولوں کی سیج پر آ گیا ہے۔ وہ گرمی اور تمازت پیچھے رہ گئی ہے یہاں سکون ہے نرماہٹ ہے اور محبت ہے۔

''اماں! اماں جان!'' وہ وہیں سے پکارتا ان کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

''یہ تو میرے میران کی آواز ہے۔'' اماں جاگ رہی تھیں اور دوپٹہ کاڑھتی اس کی چھوٹی بہن بانو سے

مخاطب تھیں۔

''ہاں یہ ویر ہی ہے۔'' وہ بھی سوئی دھاگہ ایک طرف کر کے فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اتنی دیر میں میران اندر آ گیا۔ بہن سے ملا پھر ماں سے پیار لیا اور ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بانو روٹی پانی کا انتظام کرنے فوراً ہی چلی گئی۔ ''گرمی بہت زیادہ ہے اماں؟''

''ہاں پتر! یہ مہینہ تو ہے ہی گرمی کا اور دُعا ہے ابھی بارش نہ ہو۔ یہ کنک (گندم) کٹنے کا موسم ہے۔ چند روز میں ہمارے کھیتوں میں بھی کٹائی کا کام شروع ہو جائے گا۔ رب کی مہربانی سے اس سال فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔''

''ماموں کدھر ہیں؟ سلام کرلوں؟'' وہ اَب روم کولر کے سامنے آ بیٹھا تھا۔

''ماما تیرا تو اس وقت سو رہا ہوگا۔ امجد چنیوٹ گیا ہے۔ زینت بھی سوئی ہوئی ہوگی تو شام کو مل لینا۔ آپ تو روٹی کھا کے سو جا۔''

''نہیں اماں! پہلے نہاؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر جلدی نہا لے بانو تو روٹی لاتی ہی ہوگی۔''

جب وہ نہا کر کپڑے بدلے بالوں کو تولیے سے رگڑتا ہوا ادھر آیا تو بانو کھانا لگائے اس کی منتظر تھی۔

''میری رانی تو ٹھیک ہے نا!''

''لے بھلا رانی کو کیا ہونا ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہٹی کٹی ہے۔'' اماں ہنس پڑی۔

''میں ابھی مل کر آتا ہوں اس سے۔''

''بیٹھ جا آرام سے۔ سخت گرمی ہے باہر لو چل رہی ہے۔ شام کو دیکھ لینا اس کو۔''

''ویر! میری چیز تو لے آئے ہو ناں؟''

''کون سی چیز؟'' اس نے مزا لینے کو کہا۔

''کیا مطلب؟ میں نے جو لکھ کر دیا تھا بھول گئے؟''

''اصل میں وہ کاغذ مجھ سے گم ہو گیا تھا ناں!'' اس نے مسکراہٹ دبائی۔

''ہائے اللہ اتنے دنوں میں نے انتظار کیا اور تم وہ کاغذ ہی گما بیٹھے۔'' وہ پیر پٹختے ہوئے دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ منہ پھولا ہوا تھا اور بڑے غصے میں لگ رہی تھی۔

''دیکھ لو اماں اسے بھائی کی آمد کی نہ خوشی ہے اور نہ پروا بس اپنی چیزوں کا انتظار تھا نہیں آئیں تو ناراض ہو کر ادھر جا بیٹھی ہے۔''

چھاچھ کا گلاس بھر کر لبوں تک لے جانے سے پہلے اس نے ماں سے بہن کی شکایت کی تھی۔

''وے مرن جوگی! کیا ہو گیا جو تیری چیز نہیں آئی بھائی گھر آیا ہے اور تو شکل بنا کر بیٹھ گئی ہے۔''

''اماں! اسے بول یوں نہ کہا کر کیا نہیں جانتا۔ میں کتنا پیار کرتی ہوں اس سے۔'' میران کی بات پر اسے رنج ہوا تھا۔

وہ ہنس پڑا اور بولا۔

''میں تو یونہی چھیڑ رہا تھا۔ لایا ہوں تمہاری بھی اور باقی سب کی چیزیں بھی۔''

''ہاں تو کہاں ہے۔ جلدی سے دکھا ناں!''

''دیکھو اس بے صبری کو، آرام سے بیٹھ جا، اری ویر کو روٹی تو چین سے کھا لینے دے۔''

''میں نے کب اسے اٹھنے کو کہا ہے۔ مجھے بتا دے' کہاں رکھی ہے' میں خود لے لوں گی۔''

''ناں میرا سامان نہ کھولنا ابھی خود ہی نکال کر دوں گا۔''

بانو مجبوراً بیٹھ تو گئی مگر اس کی بے چینی ہر انداز سے ظاہر تھی اور میران اسے دیکھ دیکھ کر مزا لے رہا تھا۔

''ویرا! کس رنگ کی ہیں میری چوڑیاں؟''

''اماں! آج گرمی پہلے سے بھی زیادہ ہے؟''

وہ اس کی سن کر ان سنی کرتے ہوئے ماں سے بولا۔ وہ بھی سمجھ گئیں۔ بہن کو ستانے کے لیے لگا ہوا ہے ہنس پڑیں اور بانو سے بولیں۔

''جتنی تو بے صبری ہوگی۔ یہ اتنا ہی ستائے گا۔ آرام سے بیٹھ جا۔ ابھی روٹی کھا کر نکال دے گا۔ تیرے لیے چوڑیاں۔''

''زینت کے کلپ اور انگوٹھی ملی کہ نہیں؟'' وہ بہانے بہانے ابھی سب کچھ جاننے کی فکر میں تھی۔

''زینت کا کلپ اور انگوٹھی تو بہت خوب صورت ہے۔ پر تیری چوڑیاں کچھ زیادہ اچھی نہیں ملیں حالانکہ سارا بازار چھان مارا میں نے' تیرا ناپ ہی کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ ورنہ بازار میں چوڑیاں تو بڑی بڑی خوب صورت تھیں۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' مایوس نظر آ بھی رہی تھی۔ مگر کچھ امید بھی تھی شاید مذاق کر رہا ہو۔

''ہوں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' کھانا ختم کر کے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سامان رکھے نے برآمدے میں رکھ دیا تھا۔ جا کر اِدھر اُٹھا لایا اور بانو کی نظریں بس اِدھر ہی جم کر رہ گئیں۔

''اَب سر پر کیوں چڑھ گئی ہو۔ اُدھر جا کر بیٹھو تمہاری چوڑیاں تمہیں ہی ملیں گی۔ میں تو پہننے سے رہا۔''

''ویرا! تیرا کیا جاتا ہے۔ شوق ہے ناں' مجھے اس لیے کھڑی دیکھ رہی ہوں' تو دیکھنے دے۔''

''اچھا بھئی جیسے تیری خوشی۔'' بیگ کھول کر ایک پیکٹ نکالا اور اماں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ ہے آپ کی چکن دیکھ لیں۔ رنگ تو پسند ہے۔''

''بسم اللہ میرا پتر لے کر آیا ہے پسند کیوں نہیں آئے گا۔'' ماں نے ڈھیروں دُعاؤں سے نوازتے ہوئے پیکٹ کھولا اور بہت تعریف کی۔ ''ویرا! اَب میری چیز نکال۔''

''نہ یہ تو ماما جی کے کرتوں کو کپڑا ہے اور یہ بھائی امجد کا سوٹ۔''

امجد کے سوٹ کی طرف بانو نے کن انکھیوں سے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں حالانکہ جی تو چاہ رہا تھا لفافے سے نکال کر دیکھے۔ کون سا رنگ لیا ہے میران نے امجد کے لیے۔

''اور یہ زینت کا کلپ، انگوٹھی اور تیری چوڑیوں کے تین سیٹ۔''

''تین سیٹ!'' مارے خوشی کے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''ہاں مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ تیرے بازو دو ہیں یا تین بس پھر میں نے تین ہی خرید لیے۔''

بانو نے اس کی بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔ چوڑیاں نکالیں اور دیکھ دیکھ کر نثار ہونے لگی۔

☆......☆......☆

شام کو ماما جی اور زینت سے ملاقات ہوئی۔ سانولی سلونی، لمبے قد کی ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جانے والی زینت اپنی چیزیں دیکھ کر خوش تو ہوئی تھی مگر ساتھ ہی بانو کی چوڑیاں دیکھ کر یہ دُکھ بھی لگ گیا تھا کہ میں نے چوڑیاں بھی کیوں نہیں منگوائیں۔

''ہائے مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔ شہر میں اتنی اچھی چوڑیاں ملتی ہیں۔ بانو تیرے پاس اتنے سارے سیٹ ہیں۔ ایک مجھے دے دے۔''

اور میران نے دیکھا خوش خوش بیٹھی بہن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ چوڑیاں دینا نہیں چاہ رہی تھی جبکہ ماما جی بھی بیٹی کی ہاں میں ہاں ملانے لگے تھے۔ میران نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ زینت کے قریب آ کر جھک کر کلپ اٹھایا اور بانو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تم رکھ لو اور چوڑیوں کا ایک سیٹ اسے دے دو۔''

''نہیں نہیں۔ میں تو اپنی چیزیں نہیں دوں گی۔'' زینت جلدی سے بول اُٹھی۔

''کیوں بھئی جب اُس کی لے رہی ہو تو اپنی بھی دے دو، یہ تو کوئی انصاف نہیں کہ.....''

''چل زینت پتر! رہنے دو۔ میں اگلی بار شہر جاؤں گا تو تیرے لیے چوڑیاں لیتا آؤں گا'' لاڈلی بیٹی کو اداس دیکھنا ماما جی سے برداشت نہیں ہو سکا اور بانو نے متشکرانہ انداز میں بھائی کی طرف دیکھا پھر اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میران شاہ! تم کہاں جا رہے ہو بیٹھو پتر۔''

''ماما جی! میں رانی کو دیکھ لوں۔ جب سے آیا ہوں' اس سے ملا نہیں ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے اُس کو میری خوشبو پہنچ چکی ہوگی۔ وہ بہت بے چین ہوگی میرے لیے۔''

''میران لالہ! تجھے اتنا پیار انسانوں سے نہیں جتنا اپنی رانی سے ہے۔''

زینت اپنے مخصوص انداز میں لفظ چبا چبا کر بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی' جو اس کے انداز نہ پہچانتا ہو وہ تو طنز ہی سمجھے مگر میران تو اسے ایک عرصے سے جانتا تھا۔ دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ ماما جی کی یہ لاڈلی ایسے ہی لہجے میں ہر کسی سے مخاطب ہوتی تھی۔ میران بولا کچھ نہیں۔ مسکرا کر رانی سے ملنے چل دیا۔ باقی کے سارے جانور جن میں دو بھینسیں' ایک راوی نسل کی دوسری جناں نسل کی اور بکریاں، مرغیاں، تین عدد کتے حویلی سے دور جانوروں کے باڑے میں تھے مگر میران کی رانی جو مشکی تھی۔ (گھوڑوں کی نسل) اور سیاہ کالی چمکدار جلد کی مالک تھی یہیں حویلی کے پچھواڑے اس کی رہائش رکھ چھوڑی تھی۔

جب وہ چھوٹا بچہ تھی تو میران کے ساتھ سارے سارے میں آزادی سے کھیلا کودا کرتی تھی۔ اماں کے لگائے کئی

پودے اُس نے خراب کیے۔ لان تباہ کیا مگر میران کو پروا نہیں تھی اب وہ بڑی ہوگئی تھی پہلے کی طرح اُچھل کود تو نہیں مچاتی تھی مگر رہتی اَب بھی حویلی میں تھی۔ اپنے سائیں سے زیادہ اسے میران سے محبت تھی۔ کہ میران نے اس کے بچپن میں اسے پالا تھا اور اس کی شرارتیں برداشت کی تھیں۔ اَب بھی میران حویلی میں داخل ہوتا تو پچھواڑے تک ہوا اس کی خوشبو کو لے جاتی اور رانی خوشی سے ہنہناتی اور اس سے ملنے کو بے چین ہوجاتی۔

اب میران ادھر آیا تو وہ ہنہنا رہی تھی اور بے تابی سے اپنے سم فرش پر مارتی تھی۔

''رانی؟'' میران نے باہر ہی سے اسے پکارا اور پھر دوڑتا ہوا اصطبل تک آیا۔

''رانی! رانی! کیسی ہے تو؟ مجھے یاد کرتی تھی۔ بول کرتی تھی نا یاد؟''

''شاہ جی! اسے آپ کی آمد کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ صبح سے یہ خوش بھی تھی اور بے چین بھی۔''

سائیں میران کو بتا رہا تھا اور میران پیار سے رانی کی پشت سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تیار رہو۔ ہم ابھی سیر کو جائیں گے۔ خوب گھومیں پھریں گے۔ بہت باتیں کریں گے۔''

رانی آوازیں نکال کر گردن کبھی اوپر اٹھا کر کبھی جھکا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی رہی۔

رانی کو ساتھ لے کر وہ گاؤں کی سیر کو نکلا۔ پولو سپاٹ زین میں سوار بھی آرام محسوس کرتا ہے اور جانور بھی' یہ زین میران نے بنوائی تھی چمڑا سیالکوٹ سے منگوایا تھا اور کاریگر نے بڑی محنت سے اسے تیار کیا تھا۔ رانی مالک کی وفادار تھی اور مغرور بھی بہت تھی۔ میران کے علاوہ وہ کسی کو اپنی پشت پر برداشت نہیں کرتی تھی۔

ایک بار میران کی غیر موجودگی میں امجد شاہ نے اس پر بھی زین ڈال کر سواری کی کوشش کی تھی مگر جلد ہی تھک کر ہار مان لی تھی، کھسیانی سی ہنسی ہنس کر پیچھے ہٹ گیا تھا اور بولا تھا۔

''بڑی اتھری ہے' ہاتھ نہیں ڈالنے دیتی۔''

امجد نے تو خیال چھوڑ دیا۔ مگر ماماجی کو رانی کی یہ سرکشی اور غیریت اچھی نہیں لگی تھی۔

''ہم بھی تو مالک ہیں پھر ایسا غصہ اتنا نخرہ! امجد! امجد تُو پیچھے کیوں ہٹ گیا۔

''ناں ابا! یہ میران کی لاڈلی ہے اور بے زبان جانور پر ظلم بھی تو اچھی بات نہیں۔'' کدورت امجد نے دل میں نہیں پالی اور نہ ہی اسے گھوڑوں کا کوئی ایسا خاص شوق تھا' پھر وہ کبھی رانی کی طرف نہیں آیا۔

یہ علاقہ' زمینیں، حویلی سب میران کے والد مرحوم کی ملکیت تھیں۔ ماماجی کے پاس تو ایک چھوٹا سا قطعہ اراضی تھا۔ جہاں بہت محنت کرتے اور کم معاوضہ حصے میں آتا۔ ابا کی وفات ہوئی تو میران اور بانو زمانے کی سرد گرم میں آئے۔ میران پڑھتا تھا۔ پھر باپ نے جیسے لاڈ پیار میں رکھا تھا۔ وہ دنیا کی چالبازیوں سے بالکل ناواقف سادہ دل اور سچا کھرا تھا۔ ماماجی نے اماں سے کہا کہ۔

''میران کو پڑھنے دو' اسے زمینوں میں مت اُلجھاؤ۔ یہ سارے بکھیڑے تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

اماں کو اعتراض کیوں ہوسکتا تھا۔ دستگیر شاہ آخر بھائی تھے ان کے' ان سے بڑھ کر کون بھروسے کے لائق ہوسکتا تھا۔ وہ اپنی دونوں بچوں امجد اور زینت اور بیوی کے ساتھ یہیں اس حویلی میں آگئے۔ بیوی تو چند سال پہلے فوت ہوگئی اور بیٹی کو اُنہوں نے ہاتھ کا چھپھولا ہی بنالیا۔ وہ بڑی نک چڑھی بد دماغ تھی۔ یہاں تک کہ

اَب تو بانو بھی اس سے ڈرتی تھی۔ حویلی، زمین، گاؤں ان کا تھا مگر لگتا تھا مالک ماماجی اور زینت ہیں، امجد کا ذہن البتہ ایسا نہیں تھا۔ وہ دوستانہ مزاج رکھنے والا، من موجی ٹائپ کا تھا۔ گھر پر کم ہی ہوتا اور جو ہوتا تو صرف بانو کے لیے اور اس کی محبت چھلکاتی آنکھیں بانو سے پوشیدہ تھوڑی تھیں اور وہ ان محبت بھری آنکھوں کی منتظر رہتی تھی۔ اسے امجد اچھا لگتا تھا۔ اور اس کا جی چاہتا۔ امجد حویلی میں زیادہ وقت گزارا کرے۔ اس سے بہت سی باتیں کیا کرے۔ مگر ایسا موقع آتا ہی نہیں تھا۔

زینت بھائی کی پسند سے واقف تھی۔ اعتراض تھا اس پر یا نہیں مگر یہ ضرور تھا کہ وہ امجد کی حویلی میں موجودگی دیکھ کر ہی سائے کی طرح اس کے پیچھے رہتی تھی۔

میران نے رانی کو خوب بھگایا تھا مگر بڑی نرمی کے ساتھ وہ اس پر سوار تھا۔ باتیں بھی کر رہا تھا اور جواب بھی لے رہا تھا۔ رانی کو یوں سبک، ہوا کی طرح دوڑنا بتاتا تھا۔ وہ بہت خوش ہے۔ روزانہ کی ٹہلائی اس کے لیے ضروری تھی اور سائیس یہ کام بڑی باقاعدگی اور فرض کی طرح اُدا کرتا تھا مگر آج بات اور تھی آج تو اس کا سوار میران تھا اور جس وقت وہ رانی کے ساتھ اپنی لال حویلی واپس لوٹ رہا تھا۔ تب وہ اس پر سوار نہیں تھا راس پکڑ کر دو قدم آگے چل رہا تھا' رانی اَب تھکی تھکی مگر سر سے پیر تک آرام میں تھی۔ یہ راستہ کچا تھا۔ ادھر کھیتوں کے سلسلے نہیں تھے۔ یہ اس علاقے کے خودرو پودے جنگلی کیکر سے ڈھکا ہوا چھوٹا سا جنگل بن گیا تھا۔ جس کے درمیان باریک مٹی کا راستہ تھا، گرمی کی شدت نے ساری نمی چوس لی تھی۔ اَب یہ مٹی باریک پاؤڈر کی طرح تھی' پاؤں رکھو تو اندر تک دھنستا تھا اور جو تیز قدم اٹھاؤ تو اپنے گرد مٹی کا غبار سا بنالو۔ وہ رانی کی راس پکڑے آہستہ رفتار سے چلا آرہا تھا کہ اسے کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ جہاں کیکروں کے یہ جھنڈ ختم ہوئے اس سے آگے ایک جوہڑ تھا۔ جو برسات میں لبالب بھر جاتا تھا۔ مگر اب اس میں پانی بہت کم اور کیچڑ زیادہ تھی۔ یہاں چند بھینسیں کھڑی تھیں۔ اور دو تین بچے کھیل رہے تھے۔ میران نے کسی کی طرف توجہ نہیں کی۔ وہ چلتا رہا۔ پھر آموں کا باغ شروع ہوگیا یہاں کوئل کوکتی ہے اور آموں کے پکنے کی خبر دیتی ہے۔ مگر اس وقت پرندوں کے آشیاں کو لوٹنے کا وقت تھا۔ کوئل کے علاوہ ہر پرندے کی آواز آرہی تھی اور بڑا خوب صورت سا شور تھا۔

میران یہاں رُک گیا اور پھل کے لدے درختوں کو دیکھنے لگا۔ یہ اعلاقسم کے آموں کا باغ تھا۔ فصل درختوں پر نہیں پکتی۔ کچی ہی اتار لی جاتی ہے اور پھر اسے پکایا جاتا ہے۔ یہ باغ میران کی ملکیت تھا۔ اس کے بابا کا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ باغ میں جائے یا حویلی چلا جائے اور کل صبح صبح باغ کا چکر لگائے۔ اس وقت یہاں صرف پرندوں کی آوازیں اور درخت جیسے ان مکینوں کے منتظر ساکت کھڑے تھے۔ کچے راستے پر چاپ نمایاں نہیں ہوتی مگر پھر بھی کوئی احساس تھا جس نے میران کو پلٹ کر پیچھے دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ دائیں طرف سے نکل کر اس وقت اس سے چھ سات قدم کے فاصلے پر تھی۔ اور تھوڑی روشنی تھوڑے اندھیرے میں میران کو جس چیز نے چونکایا تھا اس کا دلکش بدن تھا۔ کالی قمیص، کالی شلوار سر پر پھولدار اوڑھنی اس نے سر پر گھاس کا گٹھڑا اٹھا رکھا تھا۔ اور اسے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ یوں تھامنے سے اوڑھنی بازوؤں کے حلقے میں ہی رہ گئی تھی۔ اور اس کو عیاں کرگئی تھی۔

اس کا کالا لباس بتا رہا تھا' وہ علاقے کی اس قوم سے تعلق رکھتی ہے جو یہاں جانگلی کہلاتی ہے۔ یہ غریب محنت مزدوری کرنے والی قوم ہے۔ ان کی عورتیں بھی کام کرتی ہیں اور مرد بھی۔ عام طور پر یہ لوگ گہرے سانولے رنگ کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر یہ لڑکی کھلتی ہوئی گندمی رنگت کی مالک تھی۔ بازو میں پڑی چاندی کی دو چوڑیاں اور کانوں میں چاندی کے ہی بالے یہ ظاہر کرتے تھے، وہ کنواری ہے۔ (اس قوم میں کنواری لڑکی چاندی پہنتی ہے' میران نظر باز اور عیاش نہیں تھا مگر اسے لگا تھا اس دلکش منظر سے نظر چرالینا بد ذوقی ہوگی اور ان نظروں کی چبھن کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔ مجبوری تھی۔ وہ راہ نہیں بدل سکتی تھی۔ اسے اسی راستے پر چلنا تھا۔ وہ جھجکی کچھ سوچا۔ پھر گھاس کا گٹھڑ سر سے نیچے پھینک دیا۔

''سلام شاہ جی!'' کہنے کے ساتھ ہی اوڑھنی درست کر کے پھیلائی اور اب میران کی نگاہ اس کے بازوؤں پر گئی تھی۔ کتنی گول گول اور سڈول بانہہ ہے اس کی۔

''شاہ جی! بانو بی بی بڑا یاد کرتی تھی آپ کو۔''

مرد کی نگاہ تو بے وقوف عورت بھی پہچان جاتی ہے اور یہ تو عیشاں (عائشہ) تھی۔ آنکھ سے دل کی بات جان لینے والی اور نپے تلے انداز میں بات کا جواب دینے والی۔ اپنی عمر سے کہیں سمجھ کر اور اپنی قوم میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جانی والی۔ میران شاہ کو مخاطب کر کے اس نے بڑی نرمی اور ہوشیاری سے دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی اور نام بھی اس کی بہن کا لیا تھا۔

''تم بانو کو جانتی ہو؟ حویلی آتی رہتی ہو کیا؟''

اس کی آواز بھی بہت نرم اور پُر تاثر تھی۔ میران نے سراہتی نظروں کو ہٹایا تھا نہ انداز میں سختی لا کر اسے حاکمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔

''شاہ جی اگر تھوڑا راستہ دے دو تو میں جاؤں۔ دیر ہو رہی ہے جی اور مجھے گھر جا کر یہ بالن جلا کر روٹی پکانی ہے۔''

وہی انداز تھا اس کا جس کے باعث وہ پہچانی جاتی تھی اور عزت کروائی تھی لفظ تو اجازت طلب کرتے ہوئے مگر اعتماد اور انداز بتاتا ہوا کہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ تمہیں راستہ دینا پڑے گا۔

میران نے رانی کو ایک سائیڈ پر کر لیا۔ عیشاں نے گٹھڑ ایک بار پھر اٹھایا مگر احتیاط کے ساتھ وہ ایک بار پھر نظروں کے حصار میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ اوڑھنی خوب پھیلائی تھی۔ اور وہ بہت تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر آگے گئی تھی۔ مگر پشت پر نگاہ جمی ہے۔ یہ احساس برابر ہو رہا تھا۔

میران گھر آ کر بھی اس کو سوچتا رہا اور اسے خیال آیا۔ نام تک نہیں پوچھا اس لڑکی کا۔

''پوچھ لیتے تو کیا کرتے؟'' یہ آواز بھی اندر سے ابھری مگر خواہش اور افسوس کی شدت زیادہ تھی۔ وہ واضح طور پر اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ کہ اندھیرا تھا۔ پہلے سر پر اتنا بڑا گھاس کا گٹھڑ تھا۔ جو صرف سر پر ہی نہیں اس میں سے باہر نکلی گھاس کافی حد تک اس کے چہرے کو چھپا گئی تھی اور پھر اس نے اوڑھنی کچھ یوں اوڑھی کہ صاف دکھائی ہی نہ دے سکی۔

''اتنی خوب صورت لڑکی اور جانگلیوں میں۔'' وہ حیران تھا۔ یہاں اس کے گاؤں میں اس حویلی میں اس

قوم کی بہت سی عورتیں دیکھی تھیں۔ وہ ان کے گھر میں کام کرتی تھیں۔ بلاشبہ ان میں سے کئی ایک اچھی شکل و صورت اور قد کاٹھ کی مالک ہوتی تھیں۔ مگر وہ بات جو اس لڑکی میں تھی۔ یہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا دلکش سراپا پہلے کبھی نہیں دیکھا نہ شہر میں نہ گاؤں میں۔

وہ رات سونے سے پہلے بھی غیر ارادی طور پر اسے سوچتا رہا تھا اور اس وقت اسے یاد آیا تھا۔ وہ جس راستے پر رانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہوا کا رخ سامنے سے پیچھے کی طرف تھا تبھی تو اس کا سراپا اتنا نمایاں ہوا تھا۔ ہوا سامنے سے آ کر اس کے کپڑوں کو پیچھے کی جانب اڑا رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس روز وہ کافی دیر سے اٹھا۔ گھر کے سبھی افراد ناشتا کر چکے تھے۔ اس وقت سورج کی کرنیں آگ نہیں برسا رہی تھیں۔ ہوا میں جلا دینے کی صفت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے اماں اور بانو رہائشی حصے کے سامنے والے برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ اماں کے قدموں کے قریب ذرا فاصلے پر دو ملازمائیں تھیں' ان میں سے ایک دوپہر کو پکانے کے لیے کریلے بنا رہی تھی۔ جبکہ دوسری اجوائن صاف کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ میران نہا کر سفید کرتا شلوار پہنے ادھر ہی آ گیا۔

''چل اُٹھ رحمی! چھوٹے شاہ جی کے لیے ناشتا بنا۔'' اماں جی نے اجوائن صاف کرنے والی کو اٹھا دیا۔

''آج کریلے پکیں گے؟'' اس نے بانو سے پوچھا اور ساتھ ہی اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں قیمہ بھرے کریلے اور ساتھ میں تنور کی روٹی، تنور کی روٹی عیشاں بہت اچھی لگاتی ہے۔ اماں نے بلوایا ہے اسے۔''

''یہ عیشاں کون ہے؟'' وہ سمجھا نہیں جبکہ بانو نے تو اس طرح نام لیا تھا جیسے وہ اچھی طرح جانتا ہوگا اسے۔

''ہاں تمہیں بھلا عیشاں کا کیا پتا سال چھ مہینے میں تو چکر لگاتے ہو گاؤں کا۔ ابھی آتی ہوگی دیکھ لینا۔''

''میں نے کیا کرنا ہے دیکھ کے۔'' اس نے منہ بنایا پھر اماں سے بولا۔

''میرے بستر کی چادر بدلوائیں۔ یہ ریشمی چادر ہے۔ گرمی میں تو اس پر سونا کسی عذاب سے کم نہیں۔''

''واقعی گرمی میں بھلا ریشمی چادر پر کہاں سویا جا سکتا ہے۔ کل بستر زینت نے لگوایا تھا اگر میں خود لگواتی تو ضرور اس چیز کا خیال رکھتی۔''

''یہ زینت' ماما جی اور امجد بھرا دکھائی نہیں دے رہے سویرے سویرے کہاں نکل گئے ہیں تینوں؟''

اس سے پہلے کہ ماں کا جواب سنتا نظر اٹھی اور جھکنا بھول گئی۔ یہ تو وہی تھی جسے جب سے دیکھا تھا بہت سوچا تھا' وہ دودھ کی گاگر اٹھائے چلی آ رہی تھی۔

''یہ عیشاں ہے۔'' بانو کے کہنے پر محویت ٹوٹ گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی نگاہ کا زاویہ بدلنا پڑا۔

''سلام بی بی جی!'' عیشاں نے قریب آ کر کہا اور گاگر فرش پر رکھ دی۔

''آج دیر نہیں کر دی۔ دودھ لے کر آنے میں۔''

”بی بی! میں کیا کرتی۔ ابا کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ میں تو ڈر رہی تھی۔ دُعا کر رہی تھی۔ حویلی جاؤں تو آپ یا بانو بی بی ہی ملیں، زینت بی بی کا سامنا نہ ہو جائے۔ وہ تو بڑا ہی غصہ کرتی ہیں۔“

”ہاں لاڈلی ہے باپ کی، تم یہ دودھ کا برتن باورچی خانے میں دے دو اور سنو۔ آج دوپہر کو تم نے تنور میں روٹی لگانی ہے۔“ ”ٹھیک ہے، بی بی! لگادوں گی۔“ وہ اس کے قریب سے گزر کر چلی گئی اور میران نے سوچا۔

کل کا نظارہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے جیسا میں نے اسے سمجھا تھا اس کی چال اور بات کا انداز بتاتا تھا۔ وہ کتنی با اعتماد ہے اور کتنی دلیر بھی‘ وہ اماں جی سے مخاطب تھی تو بھی اس کے انداز کی نرمی اور دھیما پن صرف ایسا لگتا تھا جیسے بزرگ سے بات کرتے جوانوں کے لہجے میں آ جاتا ہے۔ عاجزی نہیں تھی۔ نہ ہی خوف تھا۔ زینت کا ذکر بھی مذاق کے رنگ میں کر گئی تھی۔

وہ بڑے اعتماد سے قدم اٹھاتی تھی اور اس کا گندمی رنگ اپنے اندر بڑا ہی خوب صورت سنہرا پن لیے ہوئے تھا۔ کالے لباس میں وہ سونے کی طرح چمکتی تھی اور اس کا بدن آنچ دیتا تھا۔ وہ اسے ایک مرتبہ پھر دیکھنا چاہتا تھا مگر ماں اور بہن سے کیا کہے۔ وہ تو ناشتے کے لیے بیٹھا ہے۔ اب کیونکر اٹھے۔ کیسے ایک بار پھر اسے دیکھے اور کوئی بات کر کے اُس کی خوبصورت آواز سنے۔

”ہے تو جانگلیوں کی لڑکی، پر ہے بہت سیانی اور مائی جندو تو کہتی ہے۔ کوئی طاقت ہے اس کے پاس جیسے رانی بنی سر اٹھا کر چلتی ہے تو وجہ بھی تو ہوتی ہے اور وہ وجہ ہے اس کا علم اور اس کے قبضے کی طاقت۔“

”یہ مائی جندو کون ہے؟“ اس نے ماں سے پوچھا۔

”ہے ایک جھوکی (واہیات) اپنے زمانے کی بڑی شے ہے وہ۔ جب ہی تو عیشاں کا بے داغ کردار اسے حیران کرتا ہے کہتی ہے ایسا سن اور ابھی تک یوں بچی ہوئی ہے۔ اور ہاتھ نہیں دیتی کسی کو ضرور کوئی وجہ ہے ورنہ یہ عمر اور ایسی پارسائی۔“

اماں عیشاں کی بات کرتے کرتے ایسے جوش میں آ گئیں کہ بھول ہی گئیں۔ مخاطب بیٹے ہیں اور بیٹا جوان ہو جائے تو ماں ڈھکے چھپے انداز میں بات کرنے لگتی ہے اور اماں نے مائی جندو کی کہانی صاف بتا دی تھی۔

”تُو نہیں جانتا ہوگا اسے۔ اُس کا کردار تو شروع ہی سے سب کے سامنے رہا ہے۔ تیرے ابا نے اُسے حویلی کی طرف آنے سے منع کر رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے ایسی عورتوں سے ہم شریفوں کو دور ہی رہنا چاہیے۔ بس میں گاؤں کی ان جانگلی عورتوں کی زبانی ہی اس کے قصے سنا کرتی تھی یا پھر کبھی کسی غمی، خوشی میں کسی کے گھر گئی تو وہاں نظر پڑ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی سلام کیا کرتی تھی اور مجھے خوش نصیب عورت کہتی تھی۔ ایک بار میں نے پوچھا بھی تو صرف مجھے ہی خوش نصیب کیوں کہتی ہے۔ گاؤں میں کتنی ہی دوسری عورتیں بھی تو ہیں جو اپنے گھروں میں خوش ہیں۔“ ہنس پڑی اور بولی۔

”ہوں گی مگر شاہنی میں تو اُسے خوش نصیب سمجھتی ہوں جس کا مرد اُس کے ساتھ مخلص ہو، اپنی عورت کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور تجھے ایسا ہی مرد ملا ہے تیرا شاہ دل کا بھی تیرا ہے اور آنکھ پر بھی شرم کا پردہ رکھتا ہے۔ سچ پتر میران اس کی یہ بات میرا اندر تک سرشار کر گئی تھی۔ ایک گرے ہوئے کردار

کی عورت سے زیادہ کون بتا سکتا ہے کسی مرد کی شرافت کے بارے میں۔ اس دن میں نے بھی جانا تھا۔ واقعی سب سے بڑی خوش نصیبی یہی ہے کہ مرد نام ہی نہ دے‘ اپنے آپ کو بھی امانت سمجھے صرف عورت پر ہی پہرے نہ بٹھائے خود کو بھی صرف بیوی کے لیے رکھ لے۔ پھر تیرے ابا دنیا میں نہ رہے مگر یہ مان‘ یہ خوش نصیبی کا احساس تو ہمیشہ کے لیے میرے ساتھ رہ گیا کہ میرا مرد امانت کا امین تھا۔ وہ سچے دل سے میرا تھا اور میں اُس کے لیے دعائیں کرتے نہیں تھکتی۔ تیرے ابا کی زندگی میں جندو کبھی ہماری حویلی نہیں آئی۔ نہ ہی بعد میں کبھی اس نے ادھر آنے کی ضرورت محسوس کی مگر اب کچھ عرصے سے بھائی دستگیر اسے یہاں بلانے لگا ہے۔ میں نے ایک دوبار اعتراض کیا تھا، کہا تھا۔ جس عورت کا داخلہ اس حویلی کے مالک نے یہاں پسند نہیں کیا۔ اسے یہاں آنے کی اجازت کیوں دے رہے ہو۔ تو کہنے لگا۔

”مرحوم تو سیدھا سادا بندہ تھا۔ اُسے دنیا کے بکھیڑوں کا پتا ہی نہ تھا۔ اگر آج زندہ بھی ہوتا تو یہ جائیداد آدھی سے زیادہ ہاتھ سے نکل چکی ہوتی کہ یہ دور ہے طاقت اور سیاست کا اور سیاست میں جندو جیسی عورتیں بڑی کام آتی ہیں۔ بس پھر میں چپ کر گئی۔“ ”اور اماں! یہ عیشاں یہ کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟“

”ابھی بتایا تو ہے‘ یہ بھی جانگلیوں کی ہی بیٹی ہے پر سیانی اور دھن دولت کی حفاظت کرنے والی ہے۔ اس نے یہاں آ کر مجھ سے قرآن پڑھا ہے اور کہتی ہے اگر کوئی ترجمہ پڑھانے والا ہو تو مجھے ان لفظوں کا ترجمہ بھی پڑھ کر سنا دے۔ میں سیکھنے کی پوری کوشش کروں گی۔“

”تو اماں! بانو اُردو پڑھ سکتی ہے‘ اسے ترجمہ پڑھ کر کیوں نہیں سنا دیتی۔“

”ایک دوبار بانو نے سنایا ہے اُسے مگر کہتی ہے عیشاں درمیان میں سوال بڑے کرتی ہے‘ ہر بات کا مطلب پوچھتی ہے‘ وضاحت چاہتی ہے جو میں نہیں کر سکتی۔ تو اُسے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔“

”ہاں ویرا! اس کی عقل بڑی تیز ہے۔ ایسے ایسے سوال اٹھاتی ہے کہ میں تو بس چکرا کر ہی رہ جاتی ہوں۔“ بانو نے ہنس کر بتایا تھا۔

رحمی ناشتا لے آئی۔ ٹرے میران کے سامنے رکھتے ہوئے اماں سے بولی۔

”عیشاں کہتی ہے‘ بھوری کی طبیعت کچھ اچھی نہیں لگ رہی۔ گاؤں سے سیانے کو بلا کر اسے دکھا لو۔“

”ہاں! دیکھ تو رحمی وہ کل کی لڑکی اُس نے بھینس کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا اور تم اتنی اتنی پکی عمروں کی تمہیں پتا نہیں چلا۔“ اماں اپنے مخصوص نرم انداز میں رحمی کو ڈانٹ رہی تھیں۔

جواب میں رحمی نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور بڑے اطمینان سے بولی۔

”عیشاں کی نظر ہی بڑی تیز ہے جی۔ ہم بھلا اُس بات تک پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں وہ پہنچ جاتی ہے۔“ پھر دوبارہ اجوائن کا برتن اٹھانے لگی تو اماں نے روک دیا۔

”پہلے باہر جا کر کسی سے کہہ سیانے کو بلا لائے اور بھوری کو دکھا دے۔“

کریلے بنانے والی بھی کام مکمل کر رہی تھی۔ اٹھ کر چلی گئی۔ بانو نے جگ سے لسی کا گلاس بھرا اور بولی۔

”ویرا! اتنی ساری تم تو نہیں پی سکتے۔ اس لیے یہ گلاس میرا ہے۔“

''اے بانو! ادھر بیٹھی ہے۔ میں تجھے تیرے کمرے میں تلاش کر رہی تھی۔'' زینت چلی آئی۔

''دیکھ تو میں نے کلپ لگایا ہے۔'' رُخ پھیر کر اس نے بانو کو دکھایا، میران کو ہنسی آ گئی۔ خوب تیل لگے بے رونق سے اس کے بال اور ان میں اتنا خوب صورت کلپ۔

''ہائے بے چارے کلپ کی قسمت۔'' اس نے ہولے سے کہا۔ دور کھڑی زینت نہیں سن سکی۔ بانو کو ہنسی آ گئی اماں بھی منہ پھیر کر مسکرانے لگیں۔ زینت چونکہ رُخ پھیرے کھڑی کلپ دکھا رہی تھی تو یہ مسکراہٹ دیکھ نہیں سکی۔ ''اچھا لگ رہا ہے نا؟'' اس نے شوق سے پوچھا۔

''بہت ہی اچھا۔ یوں لگتا ہے جھاڑیوں پر تتلی بیٹھی ہے۔'' جواب میران کی طرف سے آیا۔

''کون سی جھاڑیاں؟'' اسے سخت برا لگا اور یونہی بے تکی سی بات منہ سے نکل گئی۔

''کون سی جھاڑیں بھئی کوئی بھی خشک کانٹے دار جھاڑیاں۔''

''دیکھ لو پھوپھی! یہ لالہ کیا بول رہا ہے میرے بالوں کو۔'' باپ کی لاڈلی تھی۔ ذرا سے مذاق پر منہ بسورنے لگی۔

''ارے اسے کیا پتا کون سے بال خوبصورت ہوتے ہیں۔'' پھوپھی نے بہلایا۔

''جی ہاں میں تو نہیں جانتا۔ بس ان ہی کو خوبصورت کہہ دیتا ہوں۔ جو دیکھنے میں بھی اچھے لگتے ہیں۔''

''پھر وہی بات۔'' اس نے شکایتاً پھپھو کی طرف دیکھا۔

''چل تو چھوڑ اسے، یہ بتا بھرا دستگیر چلے گئے؟''

''ہاں کب کے نکل گئے۔ وہ تو انہیں دو تین گاؤں میں جانا تھا۔ کہتے تھے' واپسی پر بہت دیر ہو جائے گی۔''

''امجد بھائی کچھ بتا کر گئے تھے ان کی واپسی کب تک ہو گی؟'' میران نے پوچھا۔

''پتا نہیں' مجھے تو خود شام کو انتظار رہا۔ صبح اُٹھی تو بھی میرا خیال تھا۔ بھائی گھر آ گیا ہو گا۔ پر ابھی تک واپسی ہوئی نہیں ہے اس کی اور تمہیں بھی اب خیال آ رہا۔ شام میں پوچھا تک نہیں۔ واہ بھئی واہ یہ اچھی محبت ہے تمہاری۔'' زینت ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں بولی تھی۔

''میں نے محبت کا دعویٰ کیا ہی کب ہے؟'' میران کا لاپروا انداز اور بات دونوں ہی اُسے لاجواب کر گئے۔

''بی بی! کوئی کام ہو تو بتا دو ورنہ پھر میں دوپہر میں روٹی لگانے ہی آ جاؤں گی۔''

عیشاں کی آواز نے پہلے چونکایا پھر وہ سامنے آ گئی اور میران کھانا بھول کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا۔ ماں اور زینت کی موجودگی میں کیسے اُسے دیکھتا رہتا مگر دھیان پر تو کوئی پہرا نہیں لگ سکتا۔

''ابھی سے اتنی گرمی ہو رہی ہے، جب دوپہر ہو گی تب تو آگ برسے گی اور تو برستی آگ میں ادھر آئے گی، رہنے دے۔ کہیں مت جا آج دوپہر یہیں کاٹ لے۔''

''اچھا بی بی! جیسے تمہاری مرضی۔ پر میں فارغ نہیں بیٹھوں گی۔ کوئی کام دے دو مجھے۔''

''تھوڑی دیر کے بعد دوپہر ہو جائے گی آٹا گوندھنا' روٹی بنانا۔''

''اور اس سے پہلے کیا کروں؟''

''کہہ تو رہی ہوں تھوڑی سی دیر کی بات ہے۔''

''بی بی! اپنے گھر ہوتی تو ضرور اس فارغ وقت میں کہیں ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی پر آپ کی حویلی میں ایسا نہیں کر سکتی۔ یہاں مجھے کام ہی کرتے رہنا چاہیے۔ میں برآمدے میں کپڑا لگا دیتی ہوں۔''

''دیکھا تم نے اسے، سنیں اس کی باتیں، پتا نہیں کیسا ذہن ملا ہے اسے' کیا کیا سوچتی رہتی ہے۔''

اماں کے انداز میں ستائش تھی۔ جبکہ زینت اپنے مخصوص متکبرانہ انداز میں عیشاں کا جائزہ لے رہی تھی۔

''تم نے یہ کیوں کہا کہ یہاں فارغ نہیں بیٹھ سکتیں؟'' میران پوچھ ہی بیٹھا۔

''چھوٹے شاہ! ہم یہاں کام کے لیے آتے ہیں۔ تمہاری یہ دور تک لہلہاتی فصلیں، باغ اور یہ اونچی حویلی، اس کی سجاوٹ' اس کی خوشیاں' سچا سائیں سب سلامت رکھے۔ ہم حرص رکھنے والے نہیں ہیں۔ پر سائیں! انسان ہیں اور انسان بڑی بے اعتباری شے ہے۔ ڈرتی ہوں کب دل میں کچھ پانے کی تمنا جاگ اُٹھے اور میں رب کی شکر گزار بندی سے ناشکری بن جاؤں۔ بس اس لیے جب حویلی آتی ہوں تو دعا کرتی ہوں۔ یہ اونچے کوٹھے سلامت رہیں اور نظر نیچی رکھتی ہوں کہ جو میرے پاس نہیں ہے کہیں اُسے پانے کی تمنا میرے دل میں نہ جاگ اٹھے اور میری حیاتی کے سارے سکھ رخصت ہو جائیں۔''

اس کی گندمی سنہرے پن والی رنگت میں ہلکی سرخی تھی اور اس کی آنکھیں سیاہ کالی تھیں' اتنا اعتماد تھا ان آنکھوں میں اور لہجے میں کہ سب متوجہ ہو جاتے تھے، اس کی بات سننے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

''تمنا کرنا بری بات تو نہیں۔ اسی سے انسان آگے بڑھتا ہے۔'' میران بھول گیا تھا وہ جانگلیوں کی ایک ان پڑھ لڑکی سے مخاطب ہے۔

''چاند کو چھونے کی تمنا مجھ جیسا کرے تو پاگل پن ہے۔''

پھر وہ مدھری ہنسی ہنس پڑی اور بولی۔

''خیر' میں ایسی کچی نہیں ہوں۔ اتنی جلدی لالچ میں آ نہیں سکتی۔ اتنا یقین ہے۔ پر ضرورت سے زیادہ یقین غرور میں بدل جاتا ہے۔ اور میں ڈرتی ہوں۔''

''عیشاں! میرے کپڑے دھونے والے رکھے ہیں۔ وہ دھو دینا۔'' زینت کو اس کی اتنی اہمیت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ''اچھا بی بی! دھو دیتی ہوں۔''

وہ اُٹھی اور کالی چادر اس کے سر سے سرک گئی۔ تب زینت کو اپنے بال اور کلپ یاد آیا بولی۔

''دیکھ عیشاں! لالہ میرے لیے شہر سے کلپ لایا ہے۔'' انداز میں شوخی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی کے کہے کو آزمانا چاہتی تھی۔ عیشاں نے ذرا کی ذرا نگاہ ڈالی بولی۔

''بہت اچھا ہے۔ لانے والے بھی جیتے رہیں اور تم بھی سلامت رہو۔''

''عجیب لڑکی ہے یہ۔'' اس کے جانے کے بعد زینت نے کچھ اکتاہٹ سے کہا۔

''کیا عجیب بات ہے اس میں؟'' میران اس کا ذکر سننا چاہتا تھا اور بس۔

''دیکھا نہیں کیسی ہے یہ اور باتیں بھی اپنی عمر سے کہیں بڑی کرتی ہے اور کبھی کبھی تو مجھے یہ سودائی لگنے لگتی ہے۔''

''نہ ایسے تو نہ بول۔ اتنی عقل والی لڑکی ہے۔'' اماں نے جھٹ اس کی سائیڈ لی۔

''زیادہ عقل بھی تو مصیبت ہے کہ نہیں' کیوں لالہ؟'' اس نے میران کی رائے چاہی۔

''اب تم سے اختلاف کی جرأت کون کرے؟''

''کیوں لالہ! بھلا ایسے کیوں کہتے ہو تم؟''

''اس لیے کہ عقلمند تم بھی بڑی ہو۔'' وہ ہنسا تھا۔

''مذاق کی کیا بات ہے۔ اب ضروری تو نہیں جو عیشاں کی طرح الٹی سیدھی باتیں کرے۔ اسے ہی عقل والا سمجھا جائے۔'' وہ اس کی ہنسی کا بے حد برا مان گئی تھی۔

''نہیں نہیں وہ بالکل ضروری نہیں ہے۔''

''شاہ بی بی! ادھر پچھواڑے جو آم کے درخت ہیں' وہاں سے تھوڑی کیریاں لے لوں۔''

یہ بھی جانگلیوں کی لڑکی تھی (اندازہ اس کے سیاہ لباس سے ہوتا تھا) عیشاں ہی کی ہم عمر تھی اور اماں سے بڑی عاجزی سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

''لے لو مگر زیادہ نہیں توڑنا اور باقی کی ٹہنیاں بھی نہ توڑنا۔''

''آپ فکر ہی نہ کرو۔ میں بس دو تین ہی لوں گی۔'' وہ جانے کو مڑی تو زینت نے پکارا۔

''صبو دیکھ تو لالہ میرے لیے شہر سے کلپ لے کر آیا ہے۔''

لڑکی نے پلٹ کر دیکھا' آنکھیں بھی کھلی تھیں۔ اور منہ بھی۔

''ہائے میں مرجاؤں۔ کتنا پیارا ہے یہ چھی بی بی! اتنا اچھا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ جب پرانا ہو جائے تو مجھے دے دینا۔''

''چل دفع ہو! ابھی سے نظر لگا رہی ہے۔'' زینت نے جھٹ دوپٹہ سر پر رکھ لیا۔

''یہ فرق ہے عیشاں اور باقی لڑکیوں میں۔'' اماں، میران سے مخاطب تھیں اور میران شاہ تو پہلے ہی یہ بات سوچ رہا تھا۔

☆......☆......☆

گرمی اس دوپہر بھی بڑی شدت کی پڑی تھی۔ مگر میران کو بند کمرے میں چین نہیں ملا۔ یہاں کی خنکی پاؤں نہیں پکڑ سکی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور لمبے برآمدوں میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ اس وقت یہاں کتنی خاموشی تھی ورنہ صبح ملازم لڑکیاں یہاں سے وہاں ہنستی پھر رہی تھیں۔ اس وقت برآمدے بھی ویران خاموش تھے اور ان کے سامنے صحن بھی اور لان کی گھاس درخت پودے سب کیسے مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ گرمی سے کملائے ہوئے اور اداس۔ جب وہ سامنے کے برآمدے سے دائیں طرف مڑا تھا تو اس نے کسی لڑکی کو بیٹھے دیکھا پہچاننے میں دیر کیسے لگ سکتی تھی۔ وہ تو ہزاروں میں اپنی پہچان رکھتی تھی۔ یہاں برآمدے میں جائے

نماز بچھائے وہ ظہر کی نماز ادا کر رہی تھی۔ اور قریب ہی کشیدہ کاری کا سامان رکھا تھا۔ ''یہاں اتنی سخت گرمی میں، یہ اندر کمرے میں نماز پڑھ لیتی'، میران نے ہمدردی سے سوچا اور رُک گیا۔ وہ نفل ادا کر کے جائے نماز تہ کرنے لگی پھر اس نے نگاہ اٹھا کر میران کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کیا بات ہے چھوٹے شاہ جی! کوئی کام ہے کیا؟''

''نہیں عیشاں کام تو کوئی نہیں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں تو یونہی ادھر نکل آیا تھا۔ یہاں اتنی گرمی میں تم نماز پڑھ رہی تھیں۔ اتنے کمرے خالی ہیں۔ کہیں بھی پنکھا لگا کر پڑھ لیتیں۔''

وہ مسکرائی اور بولی۔ ''مہربانی سائیں! پر ہم لوگ تو عادی ہیں۔ میرے گھر تو کوئی پنکھا نہیں ہے۔'' پھر اس نے وہ دوپٹہ اور سوئی دھاگہ اٹھا لیا جسے نماز سے پہلے کاڑھ رہی تھی۔

''یہ کس کا ہے؟'' میران نے صرف بات کرنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

''کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔''

بظاہر نرمی اور مسکراہٹ سے کی گئی بات مگر یہ کہتی ہوئی۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں اور بات بے کار ہے۔

''عیشاں! جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا میں تب بھی چونک گیا تھا۔''

''یہاں بہت گرمی ہے شاہ جی! اور آپ تو اس گرمی کے عادی نہیں ہو۔''

''یقین کرو، مجھے گرمی کا ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا ہے۔'' اس کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

''میرا کام تو ختم ہو گیا ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔'' وہ اچانک چیزیں سمیٹنے لگی۔

''پلیز عیشاں! ایسے مت کرو' مجھے غلط مت سمجھو۔ تمہاری عقل کی تو ہر کوئی بات کرتا ہے

وہ یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک غریب جانگلی لڑکی سے یہ کہنے کے بارے میں تو میران شاہ نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بس یہ لفظ خود بخود ہی ادا ہو گئے اور اتنے جذب سے ادا ہوئے کہ عیشاں ٹھٹک گئی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''یوں مت دیکھو۔ میری بات کا یقین کرو۔'' میران جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ کتنا بے بس اور پگھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا اب اس کی زندگی کا انحصار عیشاں کی ہاں' اور ناں پر ہے۔

''سائیں!'' عیشاں کی آواز کہیں دور سے آئی تھی اور وہ اس وقت کہیں دور دیکھ رہی تھی۔

''عیشاں! میں نہیں جانتا۔ محبت کیا ہوتی ہے اور یہ محبت ہے تو میں کہوں گا بڑی ظالم شے ہے آن کی آن میں، میں جل کر راکھ ہو گیا ہوں۔ میری ہستی فنا ہو گئی ہے اور یہ عمل بڑا دردانگیز ہے۔''

''شاہ جی! میں نے آپ کی آنکھ کی محبت دیکھی ہے۔ میں پہچان گئی ہوں دھوکا نہیں کر رہے جو کہہ رہے ہو زبان سے نہیں دل سے کہہ رہے ہو' اور تمہارے سچے صاف دل کا عکس آنکھ میں بھی آ گیا ہے مگر میرے اچھے شاہ جی ایک بات میری بھی سن لو تم ایک بار ہی فنا نہیں ہوئے بار بار فنا ہو گے اور ہر بار اذیت پہلے سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ سائیں زمانہ دشمن ہو جائے گا، یہ آسائشیں خواب ہو جائیں گی۔ عزت رہے گی نہ نام اور کس کی خاطر ایک عیشاں کی خاطر جو خود بھی کچھ نہیں ہے' تو اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ اسے میرا مشورہ سمجھ لو،

مان جاؤ واپس لوٹ جاؤ۔ زندگی بڑی لمبی ہے اور راستے اونچے نیچے۔ تم پیروں تلے مخمل کے فرش کے عادی ہو' عیشاں تو تپتی بلتی دھرتی کے سینے پر ننگے پیر چلتی ہے' تم اس کے پیچھے آؤ گے تو مخمل کے فرش کو چھوڑنا پڑے گا۔'' ''چھوڑ دوں گا عیشاں! چھوڑ دوں گا مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اس جذبے کو مار نہیں سکتا' یہ جذبہ جتنا ظالم ہے اتنا ہی پیارا ہے مجھے۔''

''چھوٹے سائیں! میں پھر کہتی ہوں۔ ابھی وقت ہے پلٹ جاؤ۔'' عیشاں کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ پہلی بار ایسی کیفیت کا شکار ہوئی تھی۔ یہاں آ کر اس کی عقل نے بھی جواب دے دیا تھا اور وہ بھی دل کی سننے لگی تھی۔ اسے بھی دل کی آواز اچھی لگ رہی تھی اور میران کے اصرار پر وہ زیادہ دیر انکار نہیں کر سکی۔ اور پھر دونوں نے دیکھا۔ تپتی جلتی دوپہر ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ ہوا میں ہلکی ہلکی نمی ہے اور بس وہی دونوں ہیں دنیا ان سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو جاتی ہے' دوپہر کے شام ہوئی کمروں کے دروازے کھلنے لگے' ملازماؤں کی آوازیں جاگنے لگیں اور وہ دونوں بھی اک سرشاری کیفیت ساتھ ہے ایک دوسرے سے جدا ہوئے اس وعدے پر کہ کل پھر ملیں گے۔

''تم نے رانی کو دیکھا ہے۔ وہ مشکی ہے' میں کل اس کے ساتھ آموں کے باغ کی طرف آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔''

''انتظار تو اب زندگی بھر ہوگا اور تم جہاں کہو گے۔ میں آؤں گی اس یقین کے ساتھ کہ میری چادر میرے سر پر ہی رہے گی' تم اسے کبھی پیروں میں نہیں رولو گے۔''

''یہ یقین بے جا نہیں ہے۔ تمہارے دل نے سچی گواہی دی ہے میرے بارے میں۔''

میران نے محبتوں کے چڑھے دریا کی سی سرشاری اور جولانی میں کہا تھا۔

اگلے روز وہ حویلی نہیں آئی اور میران کو لگا صبح ہی نہیں ہوئی آج گرمی بھی کل سے زیادہ ہے اور ہوا میں کاٹ ہے گرم گرم ہوا کسی سیال کی طرح بہتی ہوئی آئی ہے' جہاں بدن سے ٹکرائی ہے آبلہ ڈال دیتی ہے۔ کب شام اترے گی اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ امجد کے کمرے میں چلا آیا ادھر ادھر کی باتیں چھیڑیں وہ بس ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔'' میں دیکھ رہا ہوں تیرا دھیان کہیں اور ہے۔''

''نہیں بھرا ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا۔

''ہم سے بھی چھپاؤ گے' سچ سچ بتا شہر میں دل تو نہیں چھوڑ آیا کہیں۔'' وہ ہنسا تھا۔

''دل تو میرے پاس ہے یقین نہیں تو سینے پر ہاتھ رکھ کے دیکھ لو صاف آواز آ رہی ہے۔''

''میران میں کوئی تجھ سے پہلی بار تو نہیں مل رہا بچپن سے جانتا ہوں تجھے' جو تو آج دکھائی دیتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اف بھرا ایسا کچھ نہیں ہے بس گرمی نے مت ماری ہے نہ کچھ کھانے کو جی کرتا ہے نہ بولنے کو۔''

''مگر اس بند کمرے میں تو گرمی نہیں ہے۔''

''اب سارا دن بند کمرے میں بھی تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔''

ابھی امجد مزید جرح کرتا کہ بانو اور زینت چلی آئیں۔ امجد کو یہاں موجود پا کر بانو نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے بھائی کی نگاہ اس کے چہرے پر نہ پڑ سکے کہ امجد کی موجودگی میں وہ آپ ہی آپ شرمانے لگتی ہے۔ انداز کچھ بدل جاتے ہیں اور جو بھائی پہچان لے' اس خیال سے ہی وہ کترا گئی تھی۔

''بھرا! یہ میران لالہ' بانو کے لیے چوڑیاں لے کر آیا ہے۔ بڑی ہی پیاری ہیں اب میں نے بھی تجھ سے ویسی ہی منگوانی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے منگوا لینا۔ تجھے تو جو بھی پسند آ جائے' خریدنے کی جلدی پڑ جاتی ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے ناں جو چیز اچھی لگے حاصل کرنے کی طاقت بھی ہو تو پھر حاصل کر کے رہنا چاہیے۔''

''سنی ہیں اس کی باتیں۔'' امجد نے مسکرا کر میران سے کہا پھر زینت سے بولا۔ ''یہ بانو سارا دن گھر میں تیرے ساتھ ہوتی ہے زیادہ نہیں تو تھوڑی سی ہی عقل کی بات اس سے ہی سیکھ لیا کر۔''

''ہونہہ تجھے تو سارے جہان میں صرف بانو ہی عقل مند دکھائی دیتی ہے۔'' زینت نے بنا کسی لحاظ کے میران کے سامنے ایسی بات کہہ دی۔ مارے شرم کے بانو تو سرخ پڑ گئی جبکہ امجد نے بات بدل دی اور اس کے ساتھ عرس اور میلے پر جانے کا پروگرام بنانے لگا۔ ادھر میران نے بھی اپنی ہی سوچ میں ڈوبتے ابھرتے زینت کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ امجد نے عرس اور میلے کی بات کی تو وہ اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔'' اس مرتبہ میلے پر پہلے سے زیادہ رونق ہوگی، سنا ہے لکی ایرانی والے اپنے سرکس کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی پروگرام ہیں۔'' وہ لڑکیوں کے سامنے تفصیل بتا نہیں سکا۔

''اچھا ابھی تو کافی دن ہیں۔ سوچیں گے، دیکھیں گے۔''

''سوچنا دیکھنا کچھ نہیں بس چلنا ہے۔ اس مرتبہ تو بابا جان ان دنوں میں گاؤں سے باہر ہوں گے۔ ہم آزادی سے سب دیکھ سکیں گے۔''

''ہیں تو کیا میرے بابا منع کرتے ہیں تمہیں' بس وہ آ جائیں گھر۔ بھرا میں تمہاری شکایت تو ضرور لگاؤں گی۔ سامنے دیکھو کیسا سعادت مند پتر ہے اور پیچھے سے یہ منصوبے بن رہے ہیں۔''

''اوہو زینت تم ہر بات کی شکایت لگانے مت چل پڑا کرو۔ یہ ہمارا بھائیوں کا پروگرام ہے۔ تمہیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں اگر بتاؤ گی تو پھر چوڑیاں نہیں آئیں گی۔'' میران نے دھمکی دی اور امجد نے تائید کی بانو بس بیٹھی مسکراتی رہی۔ ''بی بی بڑی بی بی کدھر ہیں؟'' رحمی نے آ کر پوچھا۔

''کیوں کیا کام ہے پھوپھی جی سے۔'' امجد پوچھنے لگا۔

''وہ جندو آئی بیٹھی ہے' کہتی ہے دستگیر شاہ جی نے مجھے کہا تھا۔ حویلی جانا اور ایک کٹوری مکھن کی لے لینا۔ بڑی چٹوری ہے یہ اور ماما جی پتا نہیں کیوں اس پر اتنے مہربان ہیں۔'' بانو نے ناگواری سے اظہار کیا۔

''میرے بابا جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں' وہ دوسرے لوگوں کو ذرا کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ اگر مائی جندو کا اتنا

خیال رکھتے ہیں تو یقیناً کوئی وجہ ہوگی۔'' زینت کو باپ کے بارے میں بانو کا یوں کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔
''اماں کہتی ہیں جندو اچھی عورت نہیں' میرے اباجی اسے حویلی گھسنے بھی نہیں دیتے تھے۔''
''پھوپھا جی تو سیدھے سادھے بندے تھے انہیں دنیا کا بھلا پتا ہی کیا تھا۔'' زینت کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو وہ تو بے وقوف تھے۔

میران اور بانو کو باپ کے بارے میں اس کا یوں کہنا اچھا نہیں لگا مگر خاموش رہے۔ امجد یہ کہتے ہوئے اٹھا۔

''ٹھہرو! میں جندو سے خود بات کرتا ہوں۔'' پھر رحمی سے کہنے لگا۔ ''وہ جو مانگتی ہے اسے دے دو آخر وہ بابا جان کے کہنے پر ہی آئی ہے۔'' کل اماں نے جندو کے بارے میں کافی باتیں کی تھیں میران اس خیال کے تحت اٹھا' آخر دیکھو تو سہی یہ مائی جندو آخر ہے کیا چیز۔ وہ رہائشی گیٹ کے سامنے برآمدے میں لگی کرسیوں کے قریب نیچے فرش پر بیٹھی تھی اور ہاتھ میں پکڑا خربوزہ ہوتے ہوئے ہوا میں اچھال رہی تھی۔ سب اسے مائی جندو کہتے تھے تو میران کا خیال تھا۔ کوئی ضعیف بڈھی کھوسٹ بڑھیا ہوگی۔ جس کی کمر جھکی ہوئی اور بال جادو گرنیوں کی طرح ہوا میں اُڑتے ہوئے گھونسلا نما سے ہوں گے۔ مگر یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا اس کی عمر پینتالیس پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ جسم بھاری، قد لمبا، رنگ صاف تھا اس نے بھی اپنے قبیلے کے رواج کے مطابق کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کالی قمیص اور کالی تہبند۔ اس نے جب میران کی طرف دیکھا تو میران کو احساس ہوا اس کی آنکھوں میں، اس کے چہرے پر عیاری اور کچھ بے رحمی کا تاثر ٹپکتا ہے وہ ہرگز قابل اعتبار دکھائی نہیں دیتی۔ دوسری طرف میران کو دیکھتے ہی جندو اُٹھ کھڑی ہوئی مسکرائی اور بڑے انداز میں بولی۔

''جیو حویلی کے مالک جوانیاں ماڑنوں عیش کرو، موج کرو ہم تو حکم کے غلام ہیں سوہنا تم بھی کوئی حکم کر دیکھو۔ جو پوری نہ اتروں تو گردن دبا دینا جندو کی۔'' اس عمر میں اس کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ متوجہ کر لیتا تھا۔ مخاطب کو کھینچتا اور مسکرانے پر مجبور کرتا تھا۔ ''تم مائی جندو کہلاتی ہو حالانکہ مائی تو کہیں سے بھی نہیں لگتیں۔'' یہ اُس کی گفتگو کا اعجاز ہی تھا کہ میران بات کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''ہائے سوہنا آج سے دس سال پہلے تم اس عمر کو پہنچے ہوتے تب دیکھتے جندو کی جوانی، دیکھتے ہی کیا تو مل بھی سکتے تھے۔'' انداز اور بات میران کو جھٹکا لگا وہ ہنس پڑی اور بولی۔ ''باپ کی طرح ہو تم بھی قناعت پسند' پابند اور سادہ تمہارا ماموں دستگیر شاہ بڑا اچھا آدمی ہے' تم اس کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا کرو۔ یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ گر میرا مشورہ پسند آیا ہے تو اچھی بات اگر پسند نہیں آیا تو کوئی بات نہیں۔''
''تم باتیں اچھی کرتی ہو۔'' میران مسکرایا۔

''ہاں اب تو باتیں ہی رہ گئی ہیں میرے پاس' کبھی سر سے پاؤں تک اچھی تھی جدھر سے گزر جاتی تھی تیرے جیسے گبرو دل تھام کے رہ جاتے تھے۔ بڑے بڑوں کے سر میں نے ان قدموں میں جھکائے ہیں۔ بڑے بڑوں کی ضد توڑی ہے' اکھڑ اور خود سر موم کیے ہیں۔ پتھروں کو مٹی کا مادھو بنایا ہے جندو صرف عورت کا نام نہیں تھا بلکہ اصیل عورت کا نام تھا۔ دور دور تک دھوم تھی بڑے چرچے تھے میرے۔'' وہ ماضی میں اتری تو اترتی

چلی گئی اور میران نے ٹوکا نہیں۔ وہ اپنی سوچ میں گم ہوئی تھی۔ نگاہ سامنے لان میں جمی تھی اور ماضی کا سفر جاری تھا۔ اس کی غفلت میں میران نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا تھا۔ کھنڈر تیار تھے عمارت یقیناً شاندار ہوگی ایک ایک نقش جیسے کھڑا ہوا مگر یہاں پاکیزگی نہیں تھی عمر نے اس چہرے کو نرمی اور وقار عطا نہیں کیا وہاں تو ایک شیطانیت ناچتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے کرتوت چہرے پر لکھے گئے تھے۔
''چند سال پہلے تمہارا حسن مشہور تھا تم دلوں پر راج کرتی تھیں کیا اب بھی اس علاقے میں ہے۔ کوئی ایسا نار؟''
''ہاں ہے ایک پر جو میں تھی وہ وہ نہیں ہے اُسے ٹڈھی (نئی نویلی) رہنے کا شوق ہے صورت ہے پر ہیز سے عاری ہے وہ بودلی (احمق) ہے اور میں تو یقین سے کہتی ہوں کوئی علم ہے اس کے پاس' وہ کچھ پڑھ کر حصار بنائے ہوئے ہے۔ اپنے گرد جبھی تو اناکھڑی (کنواری) ہے ورنہ غریب کی عزت کبھی عزت رہتی ہے۔ اڑتی مٹی اوڑھتی ہوا میں سفر ہو اور راستے میں ایک گلاب کھلا نظر آ جائے تو بتاؤ نظر کے ساتھ ساتھ ہاتھ نہیں بڑھیں گے اس کی طرف۔
نہ میں نہیں مانتی ضرور کوئی علم ہیں اس کے قبضے میں۔''
''کون ہے وہ نام تو لو۔'' میران سمجھ گیا تھا پھر بھی پوچھ رہا تھا۔
''کیا کرو گے پوچھ کر' ملو گے کھلا گلاب توڑنے کی کوشش کرو گے' سچ جو ایسا ہو جائے تو جندو کا دل باغ باغ ہو جائے۔'' سفاکی اور بدی اس کے چہرے مہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ میران کو اس کی بات اچھی نہیں لگی بولا۔

''میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ ورنہ میں جس باپ کا بیٹا ہوں تم اچھی طرح جانتی ہو۔''
''ہاں پر تیرے باپ جیسا ضبط اور دھن جگرا ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ مرد کی ذات تو بالکل اس پانی کی طرح ہے جو نشیب کی طرف بہے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔''
''جندو تیری باتیں اچھی نہ لگنے کے باوجود پتا نہیں کیوں اچھی لگ رہی ہیں' میں تو یہ کہوں گا کوئی جادو ہے تیرے پاس بھی۔'' اس کے چہرے کی خباثت اس کے لفظوں کا ننگا پن کچھ بھی تو میران کو اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ وہ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اور یہ واقعی جندو کا ہنر تھا۔ وہ لفظ بڑے ناپ تول کر ادا کرتی تھی۔ اور اس کا لہجہ بڑا منفرد تھا۔ آواز میں اب تک لوچ اور کھنک تھی۔ اور وہ مخاطب کو بڑے پیار سے مخاطب کرتی تھی۔
''تم جندو کو نہیں جانتے۔ ہائے جوانی، ہائے اوئے۔ بیتے دن، میران شاہ! میں تو دھرتی پر پیر رکھتی تھی تو اسے سونا بنا دیتی تھی۔ تیرے جیسے جوان چہرے تو سر میرے پیروں میں رکھنے کو تیار ہو جاتے تھے۔''
''شادی کی تم نے؟'' میران نے پوچھا۔
''شادی!'' وہ ہنس پڑی پھر سر جھکا لیا۔ اٹھایا تو سنجیدہ تھی اور بولی۔
''ضرور کرتی میں شادی مگر میران جسے میں نے چاہا' وہ عمر بڑی ہی کم لکھوا کر لایا تھا۔ وعدے تو بڑے کیے تھے اس نے اور مجھے یقین ہے پورے بھی کرتا مگر عمر نے ہی وفا نہیں کی، اور وفا تو میں نے بھی نہیں کی تب

تک میں اس کی محبت کو سمجھی ہی نہیں تھی۔ وہ مرا تو میں بھی بس ایسے ہی گاؤں کی دوسری جانگلیوں کی طرح اونچے گھر میں پرسہ دینے گئی وہاں مہمان اکٹھے ہوئے تھے کام بہت تھا اس کی ماں نے مجھے روک لیا اور کہا ۔''گھر میں بڑا کام ہے اور ہمیں ہوش کہاں ہے۔ ہم تو سب لٹائے بیٹھے ہیں تم کام دیکھتی رہو۔'' میں نے دو دن وہاں کام کیا۔ اس کی ماں بہنوں کی بین سنے تب بھی یہی.....سوچا' جندو کو عاشقوں کی کیا کمی وہ نہیں تو اور مل جائے گا مگر تیسرے روز پتا نہیں کیا ہوا۔ میں اُس کے کمرے میں گئی تو لگا دل کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا ہے۔ میں نے وہ درد نہ پہلے کبھی محسوس کیا اور نہ بعد میں اس شدت کے درد نے کبھی مجھے یوں رونے بلکنے پر مجبور کیا۔ ہاں کسک اب بھی باقی ہے۔ کبھی کبھی تیز ہو جاتا ہے' مگر میں یہ بھی کہوں گی جندو ہے واقعی ایک پتھر کا نام' مجھ جیسی عورتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ ہائے میران شاہ کاش تو چند سال پہلے پیدا ہو گیا ہوتا اور پھر تجھے پتا چلتا فتنہ کہتے کیسے ہیں۔''

''اگر تو شادی کر لیتی تو شاید تیری بیٹی بھی تیرے جیسی ہوتی۔'' میران نے مسکرا کر کہا تھا کہ جوانی کو یاد کر کے آہیں بھرنا اسے کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔

''ناں' میں نے کہا تو ہے مجھ جیسی عورت روز روز پیدا نہیں ہوتی۔ اور میران ہم جیسی عورتیں مطمئن بھی کبھی نہیں ہوئیں۔ ہم ہر سر کو اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں۔ اور یہ خواہش ہمیں کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گناہ ثواب کا احساس ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے تو میں کہتی ہوں وہ مجھ جیسی نہیں ہے۔''

کون؟ میران اس کے منہ سے عیشاں کا نام سننا چاہتا تھا۔ '' ہے وہ بھی غریب کی بیٹی اس کا باپ اندھا ہے' ماں نہیں ہے ایک ہی ایک اولاد ہے وہ کا ہے کی' نہ آسرا نہ ٹھکانا پر علم ہے ناں اس کے پاس۔''

''تو بار بار علم کی بات کر رہی ہے علم تو میرے پاس بھی بڑا ہے۔ آخر اتنے سال میں شہر میں پڑھا ہوں۔'' اس نے بظاہر بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''میں اس علم کی بات نہیں کر رہی وہ تو چیز ہی اور ہوتی ہے اور ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔''

''اس نے کہاں سے سیکھا ہوگا یہ علم کیا گاؤں میں کسی اور کے پاس بھی ہے؟''

''سکھانے والے بہت مگر وہ اس دنیا کے باسی نہیں ہیں کسی کسی خوبصورت چہرے پر عاشق ہو جاتے ہیں اور راز کی بہت سی باتیں اسے بتا دیتے ہیں اس کی مانتے بھی ہیں' حفاظت بھی کرتے ہیں اور کسی کو اپنی من پسند ہستی کے قریب نہیں آنے دیتے۔''

''اچھا پھر اس کی شادی کیسے ہوگی؟''

''جن لڑکیوں پر وہ عاشق ہو جائیں ان کی پھر شادی کہاں ہوتی ہے۔ ایسی لڑکیوں کے عاشق ہم نے بڑی بری حالت میں دیکھے ہیں۔ کوئی معذور ہوا۔ کسی کو بھیانک موت دیکھنی پڑی۔''

''اچھا تو اور لڑکیوں کے پاس بھی جن آتے رہے ہیں اور انہیں علم دیتے رہے ہیں۔'' میران نے دلچسپی کے ساتھ پوچھا تھا۔

''نہیں' ایسا بہت ہی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے اپنی حیاتی میں تو صرف ایک عورت کا دیکھا تھا ایسا

عاشق اور وہ عورت کوئی بہت سوہنی بھی نہیں تھی۔ ہاں بڑے خوب صورت تھے اس کے' میری ماں بہت قصے سنایا کرتی تھی۔ ایسی عورتوں کے۔''

ابھی ان دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ رحمی مکھن کا کٹورا لیے چلی آئی اور بولی۔

''تو روز روز کچھ نہ کچھ مانگنے کو چلی آتی ہے۔ مائی جندو' یہ کوئی گل تو نہیں بنتی۔''

''چل ری چل' تو کون ہوتی ہے مجھے سمجھانے والی۔'' اس نے کٹورا جھپٹا اور چلی گئی۔

''سنو رحمی۔'' میران نے جندو کی باتیں سوچتے ہوئے رحمی کو پکارا' وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کیا واقعی عیشاں کے قبضے میں کوئی طاقت ہے۔ رحمی سوالیہ انداز لیے کھڑی ہو گئی مگر میران کو احساس ہوا ایسا پوچھنا مناسب نہیں ہے۔ ''کچھ نہیں۔ تم جاؤ' ایک گلاس پانی کا لے آؤ۔''

''ابھی لائی سرکار۔'' وہ مڑی تو پھر پکارا۔

''نہیں رہنے دو' ابھی مجھے پانی نہیں چاہیے۔'' وہ اٹھا اور رانی کو دیکھنے چل پڑا۔ آج رانی کو عیشاں سے ملوانا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنی پڑھی ہوئی کئی کہانیاں یاد آ گئیں۔

''جانوروں کی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ اگر واقعی یہ کہانیاں سچی ہیں تو رانی' عیشاں میں وہ وجود دیکھ لے گی' وہ پہچان جائے گی۔'' اس خیال سے ہی سنسنی سی دوڑ گئی اسے شام کا انتظار پہلے سے بھی زیادہ شدت سے ہونے لگا۔

☆......☆......☆

سورج بڑی آہستہ روی کے ساتھ واپسی کی تیاریوں میں تھا۔ حدت ابھی زمین کو ہانپنے پر مجبور کر رہی تھی۔ لال حویلی کی بیرونی دیواروں سے جیسے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ابھی بیگمن اپنے کمرے میں تھے' چند ملازمائیں برآمدے میں اکٹھی تھیں' انہیں صحن کے اس حصے میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے اسے ٹھنڈا کرنا تھا۔ جہاں ہر شام گھر کے افراد کے لیے پلنگ لگا کر ان پر بستر بچھائے جاتے تھے ہر دو پلنگوں کے درمیان ایک میز رکھی جاتی تھی کہ شام کو شربت انار' لیموں کا شربت اور باداموں کی سردائی اماں بیگم ضرور بنواتی تھیں۔ ایک ایک گلاس کسی نہ کسی شربت کا لیکن لیتے باقی کا سب ان ملازموں کے حصے آتا اور وہ موج اڑاتے۔

شام ٹھنڈی ہوئی اور میران شاہ رانی کو لے کر آم کے باغ کی طرف نکلا' وہ رانی سے باتیں کر رہا تھا اور یہ ساری باتیں عیشاں کے متعلق تھیں' وہ اسے بتا رہا تھا۔ 'عیشاں بہت اچھی لڑکی ہے اور یہ کہ میں اس میں عجیب سی کشش محسوس کرتا ہوں۔'' آموں کے باغ کا سلسلہ شروع ہوا' اب رانی کچے دھول اڑاتے راستے پر دلکی چال چل رہی تھی۔ دائیں ہاتھ موڑ کاٹتے ہی میران نے کچھ ہی فاصلے پر موجود عیشاں کو دیکھ لیا۔ اور اس کی نگاہ ادھر جم کر رہ گئی اس نے چند منٹ کے فاصلے پر درخت کے تنے سے لپٹے سانپ کو نہیں دیکھا مگر جانور سانپ سے بہت ڈرتا ہے خاص کر گھوڑا سانپ دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ رانی کی نظر سانپ پر پڑ چکی تھی۔ اس کا بدن زور سے کانپا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور میران سنبھلنے میں چند سیکنڈ کی دیر بھی کر دیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ سانپ درختوں میں کہیں غائب ہو گیا۔ رانی نے اٹھائی ہوئی ٹانگیں پھر زمین پر

رکھ لیں مگر اس کا کانپنا ابھی جاری تھا' میران نیچے اتر آیا اسی وقت کچھ لوگ اس راستے پر آئے' یقیناً یہ عیشاں کے قبیلے سے تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا۔ ''نی عیشاں تو یہاں کیا کر رہی ہے۔''

''میں وہ سانپ۔'' اور پھر اسے دیکھ کر گھوڑے کا بدکنا دیکھ چکی تھی۔ اور سوچ رہی تھی اگر سانپ واپس نہ جاتا تو پھر رانی بے قابو ہو جاتی وہ میران کو گرا بھی سکتی تھی۔

''بول ری کیا کر رہی ہے۔ اپنی بستی سے اتنی دور اگر یہاں اور ٹھہری تو شام ہو جائے گی۔''

''میں یہاں بالن اکٹھا کرنے آئی تھی۔ مگر ابھی ابھی اتنا بڑا ناگ نکل آیا۔''

''چل اب کل جمع کر لینا' بہت دیر ہو گئی ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ انکار نہیں کر سکی۔ جب میران کے قریب سے گزری تو بے بسی سے اس کی طرف دیکھا مگر میران کی نگاہ میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ اسے دیکھتے ہوئے بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا اور حقیقت بھی یہی تھی' اسے مائی جندو کی کہی بات یاد آ گئی تھی۔

عیشاں کے پاس کوئی علم ہے' کوئی طاقت ہے اور گھوڑی کا یوں بدک جانا اس بات کی تائید کرتا تھا۔

میران ایسی باتوں کو نہیں مانتا تھا۔

وہ بڑے مضبوط دل گردے کا مالک تھا۔ مگر گھوڑی کا یوں بدک جانا اور سوار کا خیال نہ کرتے ہوئے اگلے پیر زمین سے اٹھا لینا۔ یونہی نہیں ہو سکتا' جانوروں کی حس بڑی تیز ہوتی ہے جو کچھ ہم انسان نہیں دیکھ سکتے' یہ دیکھ لیتے ہیں۔ عیشاں عورتوں کے ساتھ جا چکی تھی۔ اور اس کی سوچ اور دل دونوں پر بوجھ تھا۔ رانی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ اور بے چینی سے سر ادھر ادھر مارتی تھی۔ میران اس کے ساتھ پیدل ہی چل پڑا۔

رات کھلے آسمان کے نیچے لگے صاف ستھرے نرم بستر پر جس کے سرہانے اماں نے موتیے کی بہت سی کلیاں رکھ دی تھیں۔ اور ان کی خوشبو ہر سو پھیلتی اور تقدس پھیلاتی محسوس ہوتی تھی' وہ صرف اور صرف شام کے اس حادثے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ یہ بات ایسی تھی کہ کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا' کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا اور یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اس کا دل اس واقعے کے بعد عیشاں سے پھرا نہیں بلکہ وہ اس میں اور بھی کشش محسوس کرنے لگا تھا' وہ اس سے ملنا چاہتا تھا اور یہ بھی سوچا تھا۔ عیشاں سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ اس نے آنکھوں پر رکھا دایاں ہاتھ ہٹا کر آسمان کی طرف دیکھا' آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اور چاند کی شاید بارہ رہی ہو گی۔ منظر بہت خوب صورت تھا اور اس نے یہاں بھی عیشاں کو دیکھا تھا۔ اس کو نیند کافی دیر سے آئی مگر صبح اذان کی آواز پر آنکھ کھل گئی۔ نماز پڑھ کر وہ سویا نہیں رانی کے پاس چلا گیا اور اس سے باتیں کرتا رہا' عیشاں کے بارے میں جو بات وہ کسی اور سے نہیں کر سکتا تھا۔ رانی سے بلا جھجک کہہ سـ اور اس نے کہا بھی جب وہ رانی کے پاس واپس آ رہا تھا۔ تب عیشاں ایک چھوٹی سی گٹھڑی اٹھائے گیٹ سے ا ر داخل ہوئی تھی۔ وہ برآمدے کی چار سیڑھیوں میں سے پہلی پر ہی پاؤں رکھ کر رک گیا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ عیشاں قریب آئی تو دوستانہ مسکراہٹ میران کے چہرے پر آ گئی۔ ''آؤ عیشاں کل تو تم ملے بغیر ہی چلی گئیں۔''

''کیا کرتی سائیں وہ میری بوا اور دوسری عورتیں آ گئی تھیں۔''

''پتا ہے میں ساری رات تمہیں سوچتا رہا جب تک جاگتا رہا تب بھی اور سو گیا تو بھی۔''

اس نے کہا کچھ نہیں مگر چہرہ کہہ رہا تھا حال میرا بھی یہی رہا ہے کالے کپڑوں میں۔ اس کے چہرے کی رنگت کا سنہرا پن اور شرم دونوں ابھر کر سامنے تھے۔ اس کی بھنویں کمان سی تھیں۔ پلکیں گھنی اور مڑی ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرتی رہتی تھی۔ وہ مسکراتی تھی' ہنستی تھی تو بھی یہ نمی یونہی رہتی تھی۔ اور گلابی ڈوروں والی ان آنکھوں میں ٹھہرا پانی بڑا ہی اچھا لگتا تھا۔ اس کی ناک میں چاندی کا کوکا تھا۔ جس میں سرخ اور سبز نگ لگے ہوئے تھے۔ اس کی ناک پتلی اور کھڑی تھی۔ چہرہ بیضوی اور ہونٹ بھرے بھرے' میران نے جائزہ لیتے لیتے تب نگاہوں کو ایکدم سے جھکا لیا تھا۔ جب عیشاں نے جھکی پلکیں اٹھائی تھیں۔

''سائیں! یہ دل بھی کیا عجیب چیز ہے۔'' وہ کتنی بے بس دکھائی دی تھی اور اس وقت اس کا بے بسی کے عالم میں یہ کہنا میران کو کیسا سرشار کر گیا تھا۔ اس کا جی چاہا زور کا قہقہہ لگا کر سامنے کھڑی اس ملوک سی لڑکی کو بازوؤں میں بھرے اور اس سے پوچھے بتاؤ کیا محبت سے بڑی بھی کوئی طاقت ہے۔ بولو اب کون رہتا ہے تمہارے آس پاس۔ تم کیسے سوچ کر سوتی ہو کس کے چہرے سے تمہارے خواب سجتے ہیں۔ وہ کون ہے جس کے خیال سے ہی تمہارے گالوں پر لالی اتر آتی ہے اور تم اپنے آپ میں سمٹنے لگتی ہو۔

''سائیں رانی کیسی ہے کیا حال ہے اس کا۔'' عیشاں کو کل دیکھا جانے والا سانپ یاد آ گیا تھا۔ اس نے رانی کے بارے میں کیوں پوچھا۔

''بھلا رانی کو کیا ہوا تھا؟'' میران نے اب کے کھوجتی نگاہ اس پر ڈالی پھر بولا۔

''آج پھر آؤ گی ملنے؟''

''ہاں سائیں میں آ جاؤں گی مگر آموں کے باغ میں نہیں۔'' وہ سانپ سے خوفزدہ تھی۔

میران نے وجہ نہیں پوچھی۔ فوراً بولا۔

''ٹھیک ہے پھر میرے باغیچے میں بنی کوٹھی پر آ جانا۔'' اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

''کوٹھی پر نہیں' بس باغیچے میں آ جاؤں گی۔''

'چلو ٹھیک ہے۔'' وہ مان گیا۔

''میں چلتی ہوں' یہ بانو بی بی نے دوپٹہ بنوایا تھا میں وہی لے کر آئی تھی۔'' وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔

☆......☆......☆

اس شام وہ رانی کو ساتھ لے کر نہیں گیا۔ دل نہیں مانتا تھا یا اس حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتا تھا کہ عیشاں کچھ ایسا ویسا علم رکھتی ہے۔ وہ اس سوچ کو جھٹک دینا چاہتا تھا۔ آسمان لال تھا اور ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ جب وہ تیار ہو کر گھر سے نکلا تو بانو نے روکا۔ ''ویرا اس وقت کہیں مت جاؤ تھوڑی دیر میں بہت تیز آندھی آئے گی۔''

''اگر آندھی آ بھی گئی تو میں اُڑ نہیں جاؤں گا۔ ادھر اپنے باغیچے تک ہی جا رہا ہوں' آ جاتا ہوں رات

ہونے سے پہلے پہلے۔''
''باغیچہ تو یہاں سے کافی دور ہے' اتنی دیر میں آندھی آجائے گی۔''
''کالے کوسوں پر تو نہیں ہے باغیچہ اور سنو تم اماں جی کو نہیں بتانا' میں بس یوں گیا اور یوں آیا تم خود بھی پریشان نہ ہونا۔''
''مگر دیر۔'' اس نے پھر روکنا چاہا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ بانو سر جھٹک کر کچھ دیر ناراضی کے ساتھ جاتے ہوئے بھائی کو دیکھتی رہی پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور واپس اندر آکر بیٹھ گئی۔
وہ پیدل ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ باغیچہ یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا مگر اس تھمی ہوئی ہوا اور حبس میں چلنا کچھ آسان نہیں تھا اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تھا یہ موسم پیدل چلنے کا نہیں۔ میں نے غلطی کی مگر اب واپس پلٹ جانا بھی مشکل لگا' وہ چلتا رہا اور جب باغیچے سے تھوڑے فاصلے پر تھا تو ہوا چلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں تیزی آگئی۔ اس نے ترتیب سے بنی گلابوں کی کیاریوں کے پاس عیشاں کو کھڑے دیکھا تو تقریباً دوڑتا ہوا اس تک آیا اور بولا۔
''ہوا بہت تیز ہے اور گرم بھی' آؤ ادھر برآمدے میں ہی آجاؤ۔'' عیشاں کو اس کی بات ماننا پڑی کہ اڑتی مٹی اور ہوا کا شور پریشان کر رہا تھا۔ آنکھیں کھولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اور میران ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے برآمدے تک آئے اور یہاں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آندھی کی شدت بہت زیادہ تھی کہ یہ مٹی کی آندھی تھی۔ پنجاب کی یہ زمین جہاں مٹی زرخیز ہے اور لوگ محنتی، موسموں کی سختی ایسی ہی ہوتی ہے جو بارشیں برسیں تو بھی لوگ پناہ مانگیں، گرمی پڑے تو کچھ نہ سوجھ سکے۔ اور جو آندھیاں چلیں تو بھیانک آوازوں والی کہ دل ہی دہل جائیں۔
''بہت مٹی ہے۔'' تھوڑی دیر بعد میران گھبرا کر اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھولنے لگا عیشاں بھی سر کی اوڑھنی سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میران نے دروازہ کھولا۔ دروازے کے قریب کارنس پر پڑی لالٹین اور ماچس اٹھائی اور ذرا دیر میں کمرے میں زرد روشنی ناچنے لگی۔
''صبح ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شام کو ایسا موسم ہو جائے گا۔'' وہ دروازے کے قریب کھڑا ہوا کے زور سے ہلتے درختوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''ہوں۔'' عیشاں نے ڈوپٹے میں اپنا وجود چھپاتے ہوئے جھکے ہوئے سر کے ساتھ ہنکارا بھرا۔
''بادل آرہے ہیں میرا خیال ہے تھوڑی دیر تک بارش شروع ہو جائے گی۔''
''چلو اچھا ہے پھر یہ مٹی تو نہیں اڑے گی ہے نا۔''
''کتنی گرم ہوا تھی مگر اب ٹھنڈی ہو رہی ہے آؤ نا' ادھر آکر دروازے کے سامنے کھڑی ہو جاؤ، کمرہ تو کب سے بند تھا اندر حبس ہے۔'' وہ خاموشی سے اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے قریب دروازے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
''دیکھو بادل آرہے ہیں۔'' وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔ عیشاں نے بڑی خاموشی کے ساتھ آسمان کی طرف

دیکھا اور پھر ہوا میں جھولتی درختوں کی شاخوں کو دیکھنے لگی تھی۔
''تمہیں بارش اچھی لگتی ہے؟'' میران نے پوچھا۔
''ہوں۔'' وہ نظر کا زاویہ بدلے بغیر بولی۔ تب میران کو احساس ہوا' اتنی دیر سے وہ اکیلا ہی بول رہا ہے۔ ''کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو؟''
''چھوٹے شاہ جی! آپ بول رہے ہو' میں سن رہی ہوں۔'' اس کی آواز دھیمی تھی اور اس اعتماد سے یکسر خالی جو اس کی ذات کا حصہ لگتا تھا۔
''میں صرف اپنی سنانے کے لیے تمہیں یہاں نہیں لایا تھا۔ تمہاری بھی تو سننا چاہتا ہوں۔'' انداز پرشوق تھا۔
''میرا خیال ہے' ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' عیشاں گہری سانس کھینچ کر بولی۔
''کیوں' کیا ہم روز اسی لیے آتے ہیں کہ دور سے ایک دوسرے کو دیکھیں اور بس۔ ایسی ملاقات تو وہاں میری حویلی میں بھی ہو سکتی ہے عیشاں۔''
''تو پھر کس لیے بلایا ہے مجھے۔'' وہ بری طرح چونکی تھی، اسی وقت بجلی زور سے کڑکی میران کی توجہ ادھر ہوگئی' اس کی بات کا جواب کچھ دیر کے بعد آیا وہ کہہ رہا تھا ''میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی کہنا چاہتا ہوں اور تمہاری سننا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارا بولنا ہنسنا اچھا لگتا ہے۔''
''اوہ!'' عیشاں نے گہری سانس کھینچی اور تھوڑی مطمئن دکھائی دینے لگی۔
''بارش شروع ہوگئی ہے۔ اس موسم کی بارش تو فصل کے لیے بھی اچھی نہیں ہے۔''
''ہاں چھوٹے شاہ جی! یہ بارش اچھی نہیں ہے گرمی سے تپتی دھرتی تو پرسکون ہو جائے گی۔ مگر گندم مہنگی ہو جائے گی۔ اور پیٹ کا دوزخ بھڑک اٹھے گا۔'' وہ بڑی اداسی سے بارش کے موٹے موٹے قطروں کو دیکھ رہی تھی۔ ادھر کڑکتی بجلی میں میران اس پر نگاہ جمائے کھڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بارش نے طوفانی صورت اختیار کرلی۔ ہوا کی تندی، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ ہر سو برستا پانی اتنی سخت گرمی کے بعد ٹھنڈی ہوا اور برستا پانی میران کے جوان بدن سے جب یہ مستی بھری ہوا ٹکراتی تو اسے لگتا' یہی مستی اس کے بدن میں بھی سرایت کرگئی ہے۔ یہاں سے وہاں تک نشہ ہی نشہ، اس نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ عیشاں کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اور ہوا کے زور سے اڑتی اوڑھنی کئی راز افشاں کر رہی تھی۔
کوئی طاقت تھی جو میران کو قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی اور اس کے ہاتھوں میں عجیب سی بے چینی تھی وہ عیشاں کے شانوں کو بڑی ہی سختی سے دبوچ لینے کو بے تاب ہو گئے تھے۔ اس نے چاہا، وہ عیشاں کو آواز دے اس کا نام لے کر کچھ کہے مگر لفظ اور آواز اس کے قابو میں نہیں رہی۔
عیشاں نے سر اوپر اٹھایا اس کی طرف دیکھا تو خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں پیچھے ہٹی اور اس کے لبوں سے بس اتنا نکلا۔ ''چھوٹے شاہ جی!'' اس نے اتنے سے جملے میں ہی اپنے خوف حیرت اور ایک دم سے عود کر آنے والی نفرت کو ظاہر کر دیا تھا۔ وہ اک افسوس کی کیفیت میں کھڑی تھی کیوں اعتبار کیا کس لیے یہاں تک

چلی آئی۔ بڑا بھروسا تھا اپنی عقل پر اسے تو دعوٰی تھا میران کی سچی اور پاک محبت کا مگر یہ کیا ہوا یقین کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔ میران نے قدم اس کی طرف بڑھائے مگر پھر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ٹھٹھکا جیسے ایک دم سے بے دار ہوا اس کے اندر نیکی اور بدی کی کشمکش شروع ہوگئی۔

''میں نے اسے اپنانے کا عہد کیا ہے' میں وعدے کا کھرا سچا ہوں تو جب یہ میری ہے پھر' پھر یہ دوری کیوں مگر کوئی تھا جو اس دلیل کو جھٹلا رہا تھا۔ اس کے بڑھتے قدموں میں زنجیر ڈال رہا تھا۔ عیشاں اب تھوڑی اور دور چلی گئی تھی اور سسک رہی تھی۔ میران جیسے تھک کر بیٹھ گیا' اس نے دونوں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیے۔ اور نظر جھکالی۔ اس کا ٹھہر جانا عیشاں کو حیران کر گیا مگر مطمئن نہیں وہ اب بھی خوفزدہ تھی۔

''یہ عیشاں ہے جس سے محبت کا مجھے دعوٰی ہے اور یہ میرے ہی خوف سے پیلی پڑ گئی ہے، وہ رو رہی ہے۔ اور مجھ سے پناہ مانگ رہی ہے۔'' افسوس شرمندگی دکھ آخر نیکی کی طاقت بدی پر غالب آ گئی تھی مگر نفس پر قابو اتنا آسان بھی نہیں' آگ تھی کہ اسے دہکا رہی تھی۔ وہ بری طرح جل رہا تھا۔ اور سخت بے چین تھا۔ ایک بار پھر اٹھا عیشاں کے لبوں سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اس نے عیشاں کی طرف نہیں دیکھا۔ تیزی سے اٹھا اور باہر آئے طوفان کی پروا نہ کرتے ہوئے نکل گیا۔ پانی جسم پر پڑا جیسے کانٹے لگا کر مگر وہ ضبط کی انتہا کے ساتھ یہیں نیچے بیٹھ گیا۔ اور بارش کی موٹی موٹی بوندیں مسلسل اس کے جسم پر گرتی رہیں۔ کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی عیشاں نے یہ منظر دیکھا شکر کے احساس سے ساتھ کا سر اور دل رب کے حضور جھک گیا اور اس یقین نے اسے پرسکون کر دیا کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔ ہواؤں کی چیخیں' بجلی کا تڑپ تڑپ کر کڑکنا اور بارش کا شور مچا مچا کر دلوں کو دہلاتا ہر سو شور ہی شور تھا مگر پھر بھی خاموشی تھی کہ یہاں موجود یہ دو انسان چپ تھے۔

عیشاں اب دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے کانپ رہی تھی اور اسے پتا نہیں چلا اوڑھنی سر سے اتر چکی تھی اسے ان قدموں کی آہٹ کا احساس بھی نہیں ہوا جو اس کی طرف بڑھے اور قریب آ کر رک گئے پھر کسی نے سر ڈھانپ دیا اور ہولے سے سر کو تھپک کر کہا۔

''ابھی بارش بہت تیز ہے۔ ذرا رک جائے تو میں خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔'' اور عیشاں نے ایکدم سے ہاتھ چہرے سے ہٹا دیے، میران سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور اس کے قریب تھا۔ مگر اب عیشاں ڈری نہیں کہ جو طوفان میران کے اندر چڑھا تھا اب اتر چکا تھا اور ان دونوں کو اب طوفان باد و باراں کے تھمنے کا انتظار تھا۔ وہ آزاد تھا طاقتور تھا اسے کون روک سکتا تھا۔ مگر اس نے قدموں کو زنجیر ڈال لی تھی۔ اس نے خود پر پہرا بٹھا لیا اس نے میری گرتی اوڑھنی پھر سے سر پر رکھ دی۔ رات جب وہ اپنے بستر پر لیٹی تھی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی' بار بار آنسو بہنے لگتے تھے اور وہ میران کو مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ محبت ہی نہیں عزت بھی دی ہے اس نے اور عزت دینے والے سر آنکھوں پر بٹھانے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ ''میرا روم روم تمہیں دعا دیتا ہے۔ چھوٹے شاہ! میں تمہارے سکھ کی خواہش کرتی ہوں اور میں اپنی ہستی کو تمہاری محبت میں فنا کرتی ہوں۔ آج سے عیشاں ختم ہوگئی ہے اب میرا کوئی نام نہیں' میں تمہاری لال حویلی کے اونچے سے کیت کے سامنے بیٹھ کر تمہارے قدموں کی دھول سر میں ڈال کر چومنے کو تیار ہوں، میں تمہارے نام کی بھکارن ہوں۔ چھوٹے شاہ جی میرے چھوٹے شاہ جی۔'' وہ تواتر سے رو رہی تھی۔

اور اُدھر لال حویلی میں اتری ٹھنڈی میٹھی رات میں میران شاہ کا وجود شرمندگی کے احساس سے جلتا رہا۔ ''کیا سوچتی ہوگی عیشاں ان لمحوں کے بارے میں کیوں میں نے اتنی گری ہوئی نظر کے ساتھ اسے دیکھا تھا' میں اپنی ہی نظر میں گر گیا ہوں۔'' وہ شرمندہ تھا اور نیند اس سے کوسوں دور تھی۔'' میں اتنا ہی کمزور تھا تو میں عیشاں کو وہاں اس خاموش جگہ پر بلایا ہی کیوں اگر بے قابو نہ پالیتا تو؟'' یہاں آ کر ہر سوچ کا رابطہ ٹوٹ جاتا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا اور پھر یہ درد سارے جسم میں پھیل گیا جس وقت بادل رخصت ہو رہے تھے اور چاند نے اپنا درشن کروایا تھا تو آدھی رات کا عمل تھا تب میران کا سارا جسم بخار میں جل رہا تھا اور درد ایسا شدید کہ بے اختیار لبوں سے آہ نکل جاتی تھی۔ مگر آج وہ کمرے میں سویا تھا۔ یہاں تنہا تھا اور ان آہوں کو کوئی سن نہیں سکا تھا۔ وہ بہت پیاس محسوس کر رہا تھا۔ مگر اتنی ہمت نہیں تھی پلنگ کے سرہانے۔

''عیشاں! میں ان گزرے ہوئے لمحوں کی تم سے معافی مانگتا ہوں' میں کمزور تھا تو نہیں مگر پتا نہیں کیا ہوا میں بہک گیا مگر پھر سنبھل گیا مگر وہ دکھ اور حیرت جو میں ان لمحوں میں تمہاری آنکھوں میں دیکھی وہ میرے ذہن پر نقش ہوگئی ہے اور شرمندگی مجھے مارے ڈالتی ہے۔''

صبح جب بانو ناشتے کے لیے بلانے کمرے میں آئی تو وہ بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ بانو تو بھائی کی یہ حالت دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔ جلدی سے اماں کو بلا کر لائی انہوں نے آ کر اس کی جلتی پیشانی کو چھوا تو دل بیٹھ گیا۔

''بانو جلدی سے جا کر اپنے ماموں کو بلا انہیں کہو ڈاکٹر کو لائیں شہر سے۔'' دستگیر شاہ بانو کے بلانے پر فوراً ہی چلے آئے۔ بہن کو اس قدر فکرمند دیکھ کر تسلی دی۔

''بس بھرا جلدی سے ڈاکٹر کو بلواؤ میرا دل ہولتا ہے۔''

''اتنی ذرا سی بات پر نہیں گھبراتے' جوان لڑکا ہے۔ ایسا ذرا سا بخار بھلا کیا بگاڑے گا اس کا' میں ابھی حکیم صاحب کو بلواتا ہوں آ کر نسخہ لکھ کر دوا بنا دیں گے۔ اور رب نے چاہا تو شام تک میران بالکل چنگا بھلا ہوگا۔''

''یہ کل تک تو ٹھیک تھے' صبح اچانک ہی بخار کیوں ہوگیا۔'' زینت بھی فکرمند تھی۔

''بخار کوئی بتا کر تھوڑی آتا ہے۔ پھر موسم بھی بڑا گرم رہا ہے لگ گئی ہوگی گرمی اور اب بخار ہوگیا تم لوگ خوامخواہ نہ تو خود پریشان ہو اور نہ مجھے پریشان کرو میں ابھی بلواتا ہوں حکیم صاحب کو۔''

حکیم صاحب نے آ کر نبض چیک کی دوا تجویز کی۔ اماں دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ زینت اور بانو سرہانے ہی بیٹھی رہیں۔ امجد صبح ہی نکل گیا تھا۔ دوپہر کو گھر آیا، میران کی بیماری کی اطلاع ملی تو فوراً..... اسے دیکھنے آیا تب تک میران کا بخار کافی کم ہو چکا تھا مگر اس کی چپ اور بے چینی اب بھی صبح جیسی ہی تھی۔

''میں نے تو سوچا تھا موسم اچھا ہے آج ہم دونوں بھائی کہیں سیر کو نکلیں گے مگر تم بستر سنبھال کر لیٹ گئے ہو' اٹھو یار' باہر نکلو دیکھو کیسے بادل چھائے ہوئے ہیں۔''

''اور تو خوش ہو رہا ہے بارش سے امجد۔ ارے زمیندار کا بیٹا ہے۔ خود زمیندار ہے پھر بھی اس موسم کے بادلوں پر خوشی منا رہا ہے۔'' اماں نے افسوس کا اظہار کیا' بانو اور زینت کے چہرے بھی یہی کہہ رہے تھے۔ وہ ہنس پڑا اور بولا۔
''ہماری فصل تو ٹھکانے لگ چکی ہے۔ اب ہم کس بات کی فکر کریں۔''
''جن کی ابھی کھلے آسمان کے نیچے پڑی ہے وہ بھی تو ہمارے اپنے ہیں اور فصل کا نقصان ملک کا نقصان ہے اور ملک تو سب کا سانجھا ہے۔''
''واہ بوا کیسا دردمند دل پایا ہے آپ نے۔'' وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔
شام تک میران کا بخار اتر گیا وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں کرسی پر آ بیٹھا۔ اماں نے سکنجبین بنوا کر دی' وہ ہاتھ میں گلاس پکڑے بیٹھا تھا اور آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ خوش باش آزاد خوش آواز پرندے، موسم کا مزا لے رہے تھے۔ آسمان کی جانب نظر کر کے ان پرندوں کو دیکھتے دیکھتے اچانک ہی کسی احساس کے تحت اس نے نگاہ کا زاویہ بدلا تھا اور دیکھا تھا' وہ چلی آ رہی تھی کالا لباس اور سونے جیسا رنگ لیے اس کا بے ریا چہرہ' میران شرمندہ تھا اس سے سر جھکائے رہا۔ شاید وہ رکے گی یا شاید رکے بغیر اندر چلی جائے گی۔ وہ ضرور کسی کام سے ہی آئی ہوگی۔
وہ برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے آئی اور اس کے سامنے آ کر رک گئی!
''مجھے پتا چلا تھا' آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے شاہ جی۔'' آواز میں وہی ملائمت، اپنائیت اور اس کے لیے فکرمندی۔ میران نے سر اوپر اٹھایا اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔
''کیا بات ہے شاہ جی۔'' وہ اس کے یوں دیکھنے پر پوچھ رہی تھی۔
''عیشاں! تم یہاں مجھے دیکھنے کے لیے آئیں تم نے میرا اتنا احساس کیا بس اب میری تکلیف بالکل دور ہوگئی ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے میں کبھی بیمار تھا ہی نہیں۔''
''او شاہا (شاہ) مجھے پتا ہوتا تو میں پہلے آ جاتی۔'' وہ ہنس پڑی۔
وہ اسے دیکھنے آئی تھی۔ اتنی دردمندی سے حال پوچھا تھا اور اس کے چہرے پر کل کے واقعے کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی میران کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔
''آؤ عیشاں، رانی کے پاس چلتے ہیں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا' میران بھول رہا تھا رانی اسے دیکھ کر بدک گئی تھی۔ وہ دونوں رانی کے پاس پہنچے میران نے اسے پکارا۔
''رانی!'' اور آواز سنتے ہی رانی بے تاب ہوگئی۔ میران تیز قدموں سے اس کے قریب پہنچا اور اسے تھپکنے لگا۔ عیشاں بھی قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ اور رانی کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
''ارے آج یہ ڈری نہیں۔'' میران چونک کر بولا۔
''کیا مطلب؟'' عیشاں سمجھی نہیں۔
''اس روز جب باغ میں' میں رانی کے ساتھ آیا تھا تو یہ بدک گئی تھی۔ اس کا جسم کتنی دیر کانپتا رہا تھا۔''

''ہاں' اس نے سانپ کو دیکھ لیا تھا۔'' عیشاں بھلا وہ کیسے سوچ سکتی تھی۔ جو میران نے سمجھ لیا تھا۔
''کون سا سانپ؟''
''تو کیا تم نے نہیں دیکھا تھا شاہا' وہاں راستے کے قریب ہی درخت کے تنے سے اتنا موٹا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ رانی اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ مگر وہ سانپ راستے کی طرف نہیں آیا واپس پیچھے کو چلا گیا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ تمہارے لیے رانی کو قابو میں رکھنا بڑا مشکل ہو جاتا۔ گھوڑا سانپ سے بہت ڈرتا ہے۔''
''ہاں یقیناً یہی بات ہوگی۔'' ایک اور بوجھ اتر گیا تھا میران کے سر سے۔
''تو تم نے کیا سمجھا تھا۔''
''کچھ نہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔

☆......☆......☆

امجد کو بانو پسند تھی کہ دستگیر شاہ نے شروع سے ہی یہ بات اس کے دل میں ڈالی تھی۔
''بانو اچھی لڑکی ہے۔ اور تمہیں بانو ہی سے بیاہ کرنا ہے۔'' اور اب دستگیر شاہ کے خیال میں وہ وقت آ گیا تھا۔ انہوں نے بیٹے کو بلا کر بات کی۔
''ٹھیک ہے بابا۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔'' دل کی خوشی چھپاتے ہوئے اس نے بڑی سعادت مندی کے ساتھ کہا تھا۔
''ہوں، اور میرا خیال ہے تمہاری پھوپی بھی اس رشتے کو بخوشی قبول کرے گی، یوں بھی بانو کا کوئی تایا چاچا تو ہے نہیں کہ پہلا حق ان کے لڑکوں کا بنے' تم ہی سب سے قریبی عزیز ہو اور تمہارا ہی حق بنتا ہے بانو اور اس کی جائیداد پر۔''
''جی بابا یہ تو سچ کہا ہے آپ نے۔''
''میں اس رشتے کو پکا کرنا چاہتا ہوں، تمہاری پھوپھی سے بات کر کے فوراً ہی بانو کو تمہارے نام کی انگوٹھی پہنا دوں گا۔ میں نے تو انگوٹھی بھی بنوا رکھی ہے۔'' وہ الماری کی جانب بڑھے اور چھوٹی سی مخملی ڈبیا نکال کر امجد کی طرف بڑھائی۔ اس نے کھول کر انگوٹھی دیکھی اور بہت پسند کی۔
''بانو تمہیں اچھی تو لگتی ہے نا؟'' کسی سوچ میں ڈوبتے ابھرتے دستگیر شاہ نے بغور بیٹے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
وہ مسکرا دیا اور بولا' ''جی بابا۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔ مجھے پسند ہے۔''
''کتنی پسند ہے۔'' وہ کریدتے ہوئے بولے۔
''بابا! میں نے جب بھی شادی کے بارے میں سوچا مجھے بانو ہی کا خیال آیا ہے۔''
دستگیر شاہ نے بڑے طریقے سلیقے کے ساتھ بانو کا رشتہ بہن سے مانگا انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ امجد بھانجا تو تھا' اس کے ساتھ ساتھ بیٹی کی پسند سے واقف تھیں۔ انہوں نے فوراً بھائی کو ہاں کر دی۔
''چلو پھر نیک کام میں دیر کیسی، کل ہی ہم باقاعدہ رسم ادا کر دیتے ہیں' بانو کو انگوٹھی پہنا کر امجد کا پابند کر دیں گے۔''

"مگر بھرا اتنی جلدی تقریب۔" وہ حیران ہو کر بولیں۔

"خوشی جتنی جلدی مل جائے اچھا ہے، اور پھر دیر کی بھی کیوں جائے۔"

"میں میران شاہ سے مشورہ کرلوں۔"

"کیسا مشورہ، جب رشتہ قبول ہو گیا تو پھر رسم کی تاریخ اور وقت بھی ہم خود طے کر سکتے ہیں۔"

"میرا مطلب یہ تھا بھرا کہ خوشی کی خبر سے سب مل بیٹھ کر بات کریں پھر یہ خوشیاں تو بچوں کی ہوتی ہیں' وہ جو بھی وقت کہیں گے ہمیں قبول ہوگا۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے' تم میران کو بلالو ابھی بات ہو جائے۔"

میران کو یہ رشتہ طے ہو جانے کی خبر سن کر جہاں خوشی ہوئی وہاں حیرت بھی ہوئی۔

"اماں! جب میں حویلی ہی میں موجود تھا تو مجھ سے بھی رائے لے لی ہوتی۔"

"کیوں پتر تمہیں کوئی اعتراض ہے اس رشتے پر۔"

"نہیں ماما جی اعتراض تو کوئی نہیں میں نے تو بس ایک بات کی ہے۔"

"جب بڑے موجود ہوں تو اس طرح کے کاموں میں بچوں سے مشورے نہیں لیے جاتے تم بس یہ بتاؤ رسم ادا کرنے کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا۔"

"ٹھیک ہے ماما جی' پھر کل شام ہی مناسب ہے۔" کچھ خیال آیا تو ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ نے بانو سے بھی پوچھا ہے یا نہیں؟"

"تم فکر نہ کرو۔ بیٹیاں ماؤں سے بہت قریب ہوتی ہیں۔" انہوں نے دھیمے سے کہا۔

اچانک ہی بانو بی بی کا رشتہ طے ہوا اور اطلاع تو جیسے جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی اور اس رشتے کے بارے میں سب کی رائے یہی تھی بانو بی بی بہت اچھی ہے' امجد شاہ اتنا اچھا نہیں اور دستگیر شاہ تو بالکل بھی اچھا نہیں مگر پھر بھی سب خوش تھے۔ لال حویلی میں بہت چہل پہل تھی' کل کے لیے انتظامات کا آغاز آج ہی سے ہو گیا تھا۔ میران نے رجی سے کہا تھا۔

"سنو وہ ایک لڑکی ہے شاید عیشاں نام ہے اس کا' وہ کام میں ہوشیار ہے' اماں نے کہا ہے اسے بھی بلوالو۔"

"جی ٹھیک ہے میں بلوالیتی ہوں۔ مگر اب تھوڑی دیر میں شام اور پھر رات ہو جائے گی۔ بڑی بی بی جانتی تو ہیں اس وقت وہ کسی کے گھر نہیں آتی۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے صبح بلوالینا۔ اماں اتنی مصروف ہیں' بھول رہی ہوں گی یہ بات۔"

صبح عیشاں نے آتے ہی سب سے پہلے بانو کو یہ رشتہ طے ہو جانے پر مبارکباد دی اور بولی۔

"بی بی! دل کی آرزو مل جانا بڑی خوش نصیبی کی بات ہوتی ہے تم رب کے حضور سجدہ شکر ضرور ادا کرنا۔"

"تم کب آئیں عیشاں؟"

میران کسی کام کی غرض سے ادھر بانو کے کمرے میں آیا تھا۔ عیشاں کو دیکھا تو کام ہی بھول گیا۔

"میں ابھی ابھی آئی ہوں' بی بی کو مبارکباد دینے ان کے کمرے میں آ گئی۔"

"چھوٹے شاہ جی! آپ کو بھی بہت بہت مبارک ہو۔"

"تمہیں بھی مبارک ہو عیشاں' اور دعا کرنا میری بہن ہمیشہ خوش رہے۔ یہ میری ایک ہی بہن ہے اور یہ مجھے بہت پیاری ہے۔ اس کی خوشیاں مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

"خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے اور آپ کو کسی آزمائش میں نہ ڈالے شاہ جی۔"

"ارے تم یہاں کھڑے ہو لالہ' بابا تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔" زینت آج زرق برق لباس میں سجی بنی خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"دیکھو امجد بھرا نے مجھے چوڑیاں بھی لا کر دی ہیں۔" اس نے چمکتی دمکتی چوڑیوں والی کلائیاں اس کے سامنے کر دیں۔ پھر عیشاں پر نگاہ پڑی تو ڈانٹ کر بولی۔

"تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، اتنے کام پڑے ہیں جاؤ باہر نکلو۔"

"یہ ہماری ملازمہ تو نہیں ہے۔" اس کا لہجہ میران کو سخت برا لگا وہ کہہ بیٹھا۔

"اس گاؤں کے سب لوگ ہمارے ملازم ہی ہیں۔" زینت کے انداز میں غرور اور اکڑ تھی۔

"ایسے مت کہو' اور یہ زمین' یہ جائیداد تو ہماری ہے جب ہم نے اس پر غرور نہیں کیا ہم نے سب کو برابر کا انسان سمجھا ہے تو پھر تم ایسی بات کیوں کر رہی ہو۔" زینت کا چہرہ ایکدم سے رنگ بدل گیا وہ رکی نہیں' باہر آ کر رجی کو پکارا' وہ آئی تو بولی۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں۔ جلدی سے بابا جان کو بلا کر لاؤ۔" جب دستگیر شاہ بیٹی کا پیغام ملنے پر اس کے کمرے میں آئے تو وہ بستر پر اوندھی پڑی تھی' ایک جوتا پاؤں میں دوسرا کمرے کے عین درمیان میں پڑا تھا۔

"زینت میری دھی رانی کیا بات ایسے کیوں پڑی ہو۔" وہ پریشان ہوئے۔ زینت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دستگیر قریب آئے۔ اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"زینت رانی' آج تو تیرے بھرا کی خوشی ہے پھر تو ایسے کیوں پڑی ہوئی ہے۔"

"بابا میران نے جو کچھ کہا ہے' وہ سنیں گے تو آپ کو بھی اتنا ہی برا لگے گا جتنا مجھے لگا ہے۔" وہ اٹھ بیٹھی اور بگڑے موڈ کے ساتھ بولی۔

"آخر پتا تو چلے کیا کہا ہے میران نے۔" ان کے پوچھنے پر اس نے ساری بات بتا دی اور پھر میران کو برا بھلا کہنے لگی۔

"تم اس کی بات کا برا نہ مانو وہ بے وقوف ہے۔ احمق ہے' اسے ہماری طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہے میری پگلی بیٹی میران کے باپ کی وفات کے بعد یہ سارا کاروبار ہم نے سنبھالا ہے کس طرح مزارعوں کو قابو میں رکھنا ہے اور زمینوں کی دیکھ بھال کیا ہوتی ہے یہ سب کچھ میران نہیں جانتا۔ اگر آج ہم باپ بیٹا پیچھے ہٹ جائیں تو یہ ساری جائیداد سب دولت اس کے ہاتھ سے نکلتے دیر نہ لگے۔ اور ہم جو خیال رکھ رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ ہمارا اپنا ہے۔"

"مگر وہ ہمیں اپنا نہیں سمجھتا۔"

"ضرور سمجھے گا۔ پتر میں نے تمہیں باپ کا ہی نہیں ماں کا بھی پیار دیا ہے۔ اور اب بھی میں وہی کروں گا جس میں تمہاری بہتری ہے۔"

"کیا کریں گے بابا آپ!"

"میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کیا تھا۔ بس مجھے وقت کا انتظار تھا۔ زینت پتر بانو کے نام تو کچھ ہی جائیداد ہے۔ اصل مالک تو میران ہے اور اصل مالک تم ہو۔"

"میں؟" وہ کچھ نہیں مگر سمجھنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ حیا سے سر جھک گیا

"میں نے امجد اور بانو کی بات پکی ہی نہیں کی باقاعدہ رسم بھی کروا ڈالی ہے۔ اور اب اگر یہ رشتہ ٹوٹے گا تو پھر بانو کو کوئی دوسرا قبول نہیں کرے گا۔ اسے ساری عمر اسی دہلیز پر گزارنا ہوگی اور ایسا کوئی بھائی نہیں چاہے گا میران تو ویسے بھی صلح جو لڑکا ہے اور پھر میری بیٹی میں کمی بھی کیا ہے؟"

میران اچھا لگتا تھا مگر آج تو بہت اچھا لگنے لگا تھا وہ بھول ہی گئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس سے ناراض تھی۔ جب کمرے سے باہر آئی تو بالکل بدلے ہوئے مزاج والی زینت بی بی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کسی ملازمہ کو نہیں ڈانٹا نہ ہی بات بے بات اپنے لباس اور زیورات کی قیمت بتائی اور ادھر سے ادھر اتراتی سی پھری۔ سب نے یہی سمجھا زینت بی بی کو بھائی کی رسم کی بہت زیادہ خوشی ہو رہی ہے۔

زینت کی نگاہ میران کے تعاقب میں ہی رہی وہ کہاں کھڑا ہے کس سے بات کر رہا ہے اور پھر اس نے میران کی چوری بھی پکڑ لی اس کی نگاہ تو جانگلیوں کی معمولی سی لڑکی عیشاں پر تھی اور عیشاں نے بھی سب سے چھپ کر چوری چوری اس کی طرف دیکھا تھا۔ زینت کے سینے میں آگ بھڑک اٹھی۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا وہ پوری طرح تسلی چاہتی تھی۔ رجی کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا اور پھر اس کی کہے کے مطابق رجی سارا وقت ان دونوں کی ٹوہ میں ہی لگی رہی اور رجی سے کہہ دینے کے بعد زینت خود ان دونوں کی طرف سے غافل ہرگز نہیں ہوئی۔ جب بانو کو انگوٹھی پہنانے کی رسم ادا ہو چکی تو اس نے میران کو لوگوں کی درمیان سے اٹھ کر جاتے دیکھا کچھ دیر کے بعد برتن سمیٹتی۔ عیشاں بھی اسی طرف کو دبے قدموں کے ساتھ چل پڑی۔ زینت نے دیکھا رجی اس وقت پھوپھی جی کی کوئی بات سن رہی تھی۔ اور اس کی توجہ ان دونوں کی جانب سے ہٹ چکی تھی۔ زینت تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی اور عیشاں کے پیچھے ہولی۔ لال حویلی کا بایاں حصہ جدھر چنبیلی کی گھنی جھاڑیاں اور بیلیں تھیں یہیں میران، عیشاں کا منتظر تھا زینت کچھ فاصلے پر رک گئی۔ اور ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ وہ فاصلے سے ان کی باتیں نہیں سن سکتی تھی مگر انداز بتا رہا تھے وہ ایک دوسرے کی محبت میں کتنے گہرے ہیں اور یہ دیکھ کر اس کا سینہ جلنے لگا تھا۔

"میران! لعنت ہے تم پر جانگلیوں کی لڑکی کے عشق میں پاگل ہو رہے ہو، تم نے شاہوں کے خاندان کی ناک کٹوا دی ہے مگر میں تمہارے اس عشق کو زیادہ دیر پروان نہیں چڑھنے دوں گی۔ آج ہی بات کروں گی بابا سے! کریں تمہارا بندوبست، انہیں تو یہی غلط فہمی رہی ہے تمہارے بارے میں، بڑے فرمانبردار سیدھے سادے سے لڑکے ہو وہ جدھر مڑنے کو کہیں گے مڑ جاؤ گے یہ نہیں پتا تم تو کچھ اور ہی چن چڑھانے لگے ہو۔ اور یہ

عیشاں اسے تو میں کہیں کا نہیں چھوڑوں گی، اوقات بھول گئی ہے یہ اپنی، اسے یاد ہی نہیں رہا کمیوں کی بیٹی ہے۔ ہم اگر اسے حویلی میں گھسنے دیتے ہیں تو یہ بھی ہمارا احسان ہے ورنہ یہ گندے لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ ہماری کسی چیز کو ہاتھ بھی لگائیں۔"

وہ دونوں تو کچھ دیر کے بعد چلے گئے، زینت کتنی دیر ادھر ہی کھڑی غصے سے بل کھاتی رہی یہاں تک کہ رجی اسے تلاش کرتی ہوئی ادھر آ گئی۔

"بی بی! ادھر سب آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ حیران ہیں کہ آپ کدھر ہیں۔"

"ہاں میں آ رہی ہوں۔" وہ اس ساتھ ہولی۔

محفل میں آتے ہی اس کی نگاہ نے سب سے پہلے میران کو تلاش کیا وہ امجد کے پاس موجود تھا پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر عیشاں کو دیکھا وہ کہیں دکھائی نہیں دی تو نیتی سے اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"وہ تو چلی گئی ہے۔ ہاں بی بی، عیشاں تو کچھ بھی کھائے بغیر ہی چلی گئی ہے۔ بڑی بی بی نے کہا بھی تو کہنے لگی دیر ہو رہی ہے۔ میرا ابا میری راہ دیکھ رہا ہوگا پھر انہوں نے کہا ایسا کرو اپنے حصے کی روٹی ساتھ لے جاؤ تو بولی میں تو اپنی روٹی پکا کر ہی آئی تھی ابے نے کھالی ہوگی میں بھی جا کر کھالوں گی۔" نیتی کے انداز میں عیشاں کے لیے تعریف تھی۔

"پتا نہیں کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو اور سمجھے بھی کیوں نا اسے حویلی والوں نے ہی سر چڑھا رکھا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ زینت بی بی نک چڑھی اور خود پسند ہے۔ یہ بات تو سبھی جانتے تھے اس لیے نیتی نے اس بات کو کچھ اہمیت نہیں دی۔

ساری رات زینت انگاروں پر لوٹتی رہی اگر رات کو بابا کے مہمان نہ آ جاتے تو وہ رات کو ہی ان سے بات کر لیتی۔ صبح ناشتے کے بعد موقع ملا وہ باپ کے کمرے میں آ گئی۔

"آؤ دھی رانی خیر تو ہے اتنی سویرے سویرے میرے کمرے میں۔"

"خیر ہی تو نہیں ہے بابا مجھے تو حیرت ہو رہی ہے پتا نہیں آپ رہتے کہاں ہو، سارے گاؤں کی خبر ہے"

"اوہو کچھ پتا تو چلے۔" اب کے وہ بھی پریشان ہوئے۔

"کچھ خبر بھی ہے یہ میران شاہ کیا گل کھلا رہا ہے۔ وہ قابو سے باہر ہو رہا ہے۔ بابا اگر اسے یہاں پر روک نہ لیا گیا تو بہت برا ہوگا۔"

"تم کھل کر بات کرو۔" وہ کہیں جانے کو تیار تھے۔ اب بیٹھ گئے اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارا کیا۔

زینت نے ساری بات بتا دی اور گواہی کے طور پر رجی کا نام بھی لیا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میران جیسا لڑکا گاؤں کی ایک ایسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے جو جانگلیوں کی بیٹی ہے جس کے پاس حسن دولت بھی کوئی نہیں۔"

"میں خود بھی حیران ہوں مگر یہ غلط نہیں ہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو میرے اپنے ذرائع ہیں میں خود پتا کرواؤں گا۔ اور فکر کی ضرورت نہیں جوانی میں لڑکے

''ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں' یہ وقتی جوش ہوتا ہے۔ بڑی جلدی اتر جاتا ہے۔ تم اب جاؤ اور دیکھو میں کرتا کیا ہوں۔ میری بچی جب تک تیرا باپ زندہ ہے تجھے کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں، میں وہی کروں گا۔ جو تیرے دل کی خوشی ہوگی۔''

وہ اٹھے اور کمرے سے چلے گئے' باہر جا کر ملازم سے کہا۔ ''مائی جندو کو بلا لاؤ۔ اسے کہنا ضروری کام ہے جلدی آ جائے۔''

تین روز کے بعد جندو اپنی رپورٹ کے ساتھ حاضر تھی کہہ رہی تھی۔'' دستگیر شاہ تم نے جو کہا تھا۔ وہ درست ہے۔ اور مجھے تو رونا اپنے آپ پر ہے۔ بھلا میں کیوں نہ جان پائی میں تو سمجھتی تھی اڑتی مکھی کے پر گن سکتی ہیں۔ مگر یہاں میری نظر کے سامنے اتنی بڑی کھیڈ (کھیل) ہوگئی اور مجھے خبر ہی نہ ہوسکی۔ اب اس بات کا پتا لگنے کے بعد ملی ہوں میں عیشاں سے' پروں پر پانی تو وہ پہلے بھی نہیں ڈالنے دیتی تھی اب تو اور بھی نڈر لگی وہ مجھے۔ میں نے کہا اڑی عیشاں کن ہواؤں میں اڑ رہی ہو تو بولی۔

''یہ معاملہ تیری سمجھ کا نہیں ہے' ساری عمر جو تو کرتی رہی ہے' میں وہ نہیں کر رہی، دیکھو ہے نا دلیری۔''

''صاف بات کہ دنیا جائے جہنم میں دل کے علاوہ کسی کی پروا نہیں۔ میں یہ دل ہی نہیں رہنے دوں گا۔'' دستگیر نے غصے کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر کہا تھا۔

''کچھ سوچا ہے تم نے؟'' جندو کی آنکھیں تجسس سے چمکنے لگیں۔

''ہاں بہت پہلے سے سوچ لیا تھا اگر میرا اندیشہ درست نکلا پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''کچھ پتا بھی چلے۔''

''ابھی نہیں جب منصوبہ پورا ہوگا تو دنیا دیکھے گی۔''

☆......☆......☆

دستگیر شاہ اور جانگلیوں کے کچے پکے مکانوں کے قریب جیپ سے اتر کر۔ کالے کا گھر پوچھ رہے تھے۔ لوگ حیران تھے۔ آخر دستگیر شاہ جیسے مغرور اور اکھڑ زمیندار کو غریب معذور کالے سے کیا کام پڑ گیا ہے۔ جو خود ان کچے پکے مکانوں تک آیا ہے۔ کالے کا گھر پوچھ کر وہ ساتھ آئے دونوں ملازموں کو یہیں چھوڑ کر خود بغیر دستک دیے گھر میں داخل ہوگئے۔ سامنے ہی چھپر کے نیچے مٹی کے چولہے پر عیشاں ہنڈیا پکا رہی تھی۔ انہیں دیکھا تو حیران ہوئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ نہیں سکی بس ان کی صورت دیکھے گئی پھر وہ کھنکارے تو اس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر رکھا اور بولی۔

''سلام شاہ جی۔''

''مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے کڑیے۔ تم شام کو میرے ڈیرے پر آ جانا۔'' ان کا انداز اسے سمجھا گیا' بات کیا ہوسکتی ہے اور کس انداز میں ہوسکتی ہے۔ بولی۔

''آپ نے جو کچھ کہنا ہے۔ یہیں کہہ دیں' میں ڈیرے پر نہیں آ سکوں گی۔''

''بلے بلے اندھے جانگلی کی بیٹی اور نخرا تو دیکھو بات تو تُو ایسے کر رہی ہے جیسے اس سارے پنڈ (گاؤں) کی مالکن ہے۔''

''مالک تو سچے رب کی ذات ہے سائیں' باقی اپنے بارے میں تو ہم خود فیصلہ دے سکتے ہیں۔'' ہمیشہ کی طرح اس کا انداز نڈر، لہجہ سچا تھا۔

''کس پر اکڑ رہی ہے تو' یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کس کے برتے پر بات کرتی ہے۔'' ان کے لہجے میں شعلے لپکنے لگے۔

''شاہ جی محنت کی کمائی کھاتی ہوں کسی کے آگے ہاتھ تو نہیں پھیلاتی پھر ڈر کر بات کیوں کروں۔''

''میں تجھے گھوڑے کے پیچھے باندھ کر سارے گاؤں میں گھسیٹوں گا پھر تجھے اپنی اوقات یاد آئے گی۔''

''مجھے اپنی اوقات بڑی اچھی طرح یاد ہے۔''

''نہیں تو بھول چکی ہے۔ اس لیے تو میران شاہ سے دل لگا بیٹھی ہے۔''

''یہ جرم تو نہیں۔'' ''یہ جرم ہی ہے اور اس کی سزا موت ہے۔''

''مرنا تو ایک دن ہے ہی' موت سے کیوں ڈراتے ہو مجھے۔''

''تو سوچ نہیں سکتی۔ یہ موت بڑی بھیانک ہوگی۔ ابھی وقت ہے اس راستے سے ہٹ جا، چھوڑ دے میران کا پیچھا تو جتنی دولت کہے گی میں تجھے دوں گا۔'' اس کا انداز دیکھ کر انہیں دھمکی کے بجائے لالچ دینا پڑا۔

''دھن دولت کی میں پجاری نہیں ہوں شاہ جی مجھے صرف محبت چاہیے۔''

''تو بھول رہی ہے جانگلیوں کی اولاد ہے کی کمین اور ہم تجھے بیاہ لائیں یہ قیامت تک نہیں ہوسکتا۔ ہاں رکھیل بننا ہے تو اعتراض نہیں۔''

''شاہ جی!'' ایسی گالی پر وہ تڑپ اٹھی اور چیخ کر انہیں شعلہ بار نظروں سے دیکھا۔

''ایسے مت دیکھ پہچان خود کو اور ہٹ جا اس کے راستے سے۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' ان کی بات اسے اندر باہر سے بری طرح جلا گئی تھی۔

''ناممکن کو ممکن بنانا دستگیر شاہ بہت اچھی طرح جانتا ہے۔''

''محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے' یہ موت سے بھی نہیں ڈرتی' تم ہمارا امتحان لینے کی مت سوچو۔''

''مجھے امتحان نہیں انتقام لینا ہی تم سے' تم نے میری بیٹی کی خوشیاں چھینی ہیں اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں جو میری بیٹی کو نہیں مل سکا وہ تیرا بھی نہیں بن سکے گا میں خود اپنے ہاتھوں سے میران کو گولی مار دوں گا۔''

''شاہ جی!'' اب کے وہ تڑپ اٹھی تھی مگر یقین پوری طرح نہیں تھا۔

''ہاں میں سچ کہتا ہوں' میں اسے تیرے لیے زندہ ہی نہیں چھوڑوں گا۔'' دستگیر شاہ کا لہجہ خون ٹپکاتا ہوا تھا اور عیشاں کا دل آن کی آن میں گھبراہٹوں سے بھر گیا تھا۔ ایک دہشت سی طاری ہوگئی تھی۔ اس پر میران جیسا کڑیل جوان مار دیا جائے گا۔

''تم بھی بیٹے والے ہو اور پھر میران تمہارا بھانجا ہے، تمہاری بہن کا ایک ہی بیٹا ہے۔''

وہ روتے ہوئے عیشاں دستگیر شاہ کو اس منصوبے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میرے سامنے میری بیٹی زینت ہے اور بس مجھے اور کسی کا خیال نہیں، میں میران کا قتل یہیں تمہاری

اس جھگی کے قریب کرواؤں گا تا کہ تم اور تمہارے جیسی دوسری کمیوں کی لڑکیاں دیکھ سکیں اور پھر کسی زمیندار سے محبت کا نہ سوچیں۔''

''محبت اختیار میں تھوڑا ہی ہوتی ہے شاہ جی۔'' آنسو چہرہ بھگو رہے تھے اور عیشاں سراپا منت تھی۔

''پھر اس محبت کا انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا تم۔''

''نہیں' نہیں شاہ جی آپ اسے کچھ نہ کہو' مجھے گولی مار دو۔''

''مرجانا بہت آسان ہے مگر مر مر کے جینا بڑا ہی مشکل' میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا موت میران کا ہی مقدر بنے گی۔ کل اسی وقت وہ ایک لاش کی صورت تمہاری جھگی کے سامنے خاک پر پڑا ہوگا۔''

''نہیں شاہ جی! آپ ایسا نہیں کرو گے آپ ظالم ہو' پتھر کا دل ہے سینے میں مگر عیشاں پتھر نہیں ہو سکتی' میں میران شاہ کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی' میں اس کی زندگی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ وہ تمہاری بیٹی کو مبارک ہو عیشاں درمیان میں نہیں آئے گی۔'' لہو بہاتی آنکھیں اور سینے میں تڑپتا دل عیشاں کی حالت اس وقت قابل رحم تھی۔

''ٹھیک ہے اگر تو اس پر راضی ہے تو پھر اپنا ضروری سامان اکٹھا کرنے تجھے اور تیرے باپ کو آج یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا ہے۔ میری جیپ باہر موجود ہے۔ کہاں ہے تیرا باپ اسے لاکر بٹھا جیپ میں اور خود بھی آجا۔''

میران شاہ نے بہت تلاش کیا تھا عیشاں کو مگر وہ نہیں ملی دیوانہ سا ہو رہا تھا وہ اس کے لیے اور ایسے میں ہی اماں نے اسے بتایا تھا ماماجی زینت کی شادی تم سے کرنا چاہتے ہیں۔

''مجھے عیشاں کے علاوہ اور کسی سے شادی نہیں کرنا۔''

''کیسی بات کرتے ہو تم بھلا ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے کمیوں کی بیٹی سے شادی کی ہے۔''

''پتا نہیں کی ہے یا نہیں مجھے اس سے شادی کرنا ہے۔''

''فضول کی ضد نہ لگا پتر' پتا نہیں وہ کہاں گئی زندہ ہے یا مر گئی۔ تیرے ماماجی نے پتا کروایا تھا سنا ہے اسے ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے اور ڈاکوؤں کے قبضے میں گئی عورت بھی بھلا کبھی ملی ہے۔''

''اماں! یہ بات ماماجی بھی کہہ چکے ہیں مجھ سے' اور مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے یہ سن کر، یہ میرا دل ہی جانتا ہے اللہ کے لیے ایسا مت بولیں۔''

''تم روگ نہ لگاؤ دل کو ہمیں تمہارے ماماجی کی بات ہر حال میں ماننا ہوگی کہ ہم نے بانو دی ہے ان کے امجد کو ایسا نہ ہو یہ بات نہ بنے تو وہ بات بھی ٹوٹ جائے گا داغ لگ جائے گا میری اتنی گنوں والی بیٹی کو۔''

''اماں! میرے انکار سے بانو اور امجد کا بھلا کیا تعلق ان کی بات تو پکی ہو ہی چکی ہے۔''

''ہاں پر تیرے ماما نے اشاروں میں کچھ ایسی بات کی ہے مجھ سے۔''

''یہ بڑی زیادتی ہے۔ زبردستی کر رہے ہیں وہ ہم سے ان سے کہہ دیں زبردستی کے رشتے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔''

''ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہم بیٹی کے لیے ہاں جو کر بیٹھے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں تو بھی ہاں کر دے تا کہ ہم

بھی برابری کی سطح پر بات کر سکیں۔''

''مجھے کوئی لڑائی جھگڑا مقابلہ تو کرنا نہیں جو برابری کا سوچوں۔''

''میران بوڑھی بیوی ماں اور یتیم بہن کی آزمائش میں نہ ڈالو۔''

میران نہیں مان رہا اس بات کی خبر دستگیر شاہ اور امجد کو ہو گئی تھی۔ امجد کو غصہ آیا تھا۔ آخر کیا کمی ہے میری بہن میں جبکہ دستگیر شاہ کا انداز بڑا مطمئن سا تھا کہہ دیا تھا' یہ تو آج کہہ رہا ہے کل خود ہی زینت کو مانگے گا۔ چند روز کے لیے انہوں نے رشتے کی بات جیسے بھلا دی' انہیں دنوں گاؤں میں شور اٹھا جنگل کی طرف ایک عورت کی لاش ملی تھی اس کے کپڑوں سے لوگوں نے پہچانا' وہ عیشاں تھی۔ لاش کی حالت اتنی خراب تھی کہ اسے فوراً...... دفنا دیا گیا۔

میران نے سنا تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس کی قبر پر گیا' وہاں اب مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا بھلا رکھا ہی کیا تھا۔ کئی روز تک وہ سنبھل نہیں سکا۔ کمرے میں بند رہتا اماں اور بانو منت سماجت کر کے ہی دروازہ کھلواتیں اور کھانا کھانے پر اصرار کرتیں۔ وہ ایک ہفتے بعد ان سب کے روکنے کے باوجود شہر جانے کے لیے روزانہ ہو گیا۔ راستے میں عیشاں کی قبر پر گیا اور کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے اسے بار بار ایسا محسوس ہوا جیسے عیشاں اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے دھیان پلٹتا رہا اور وہ گاڑی روڈ کے کنارے کھڑے درخت سے ٹکرا بیٹھا۔ حادثہ شدید تھا' وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب ہوش میں آیا تو ہاسپٹل کے بیڈ پر تھا اور اسے لگتا تھا' درد بدن میں ہی نہیں روح میں اتر رہا ہے۔ اس کے گاؤں اطلاع ہو چکی تھی اماں، امجد اور دستگیر شاہ تینوں یہاں موجود تھے۔ کئی روز تک وہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ہی کیفیت میں رہا اور پھر ایک ہفتے کے بعد اس پر انکشاف ہوا اس حادثے نے اسے ہمیشہ کے لیے معذور بنا دیا ہے۔ اب وہ کبھی چل نہیں سکے گا۔

اوہ تو اسی لیے اماں کو اس نے ہوش میں آنے کے بعد جب بھی دیکھا روتے ہی دیکھا۔ اسے دکھ ہے یا نہیں' خود بھی اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کے لیے تو زندگی کی ہر خوشی عیشاں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔

ہاں دستگیر شاہ کے چہرے پر رنج و ملال اور اداسی دیکھ کر اس نے ایک سکون سا محسوس کیا تھا۔ عیشاں سے چھین کر مجھے کسی کھلونے کی طرح اپنی بیٹی کو سونپ رہے ہو۔ ضد اتنی شدید ہے کہ میری معصوم بہن کی زندگی بھی داؤ پر لگانے کو تیار ہو اب مجھے اپنی معذوری کا کوئی دکھ نہیں ہوگا کہ یہ میری معذوری نہیں۔ تمہاری شکست ہے دستگیر شاہ، کبھی میں تمہیں ماماجی کہتا تھا۔ مگر اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ مجھے شک ہے عیشاں کو بھی تم نے قتل کروایا ہے جو اپنی بھانجی کی تقدیر کا مالک بن سکتا ہے۔ جو بھانجے کو اپنی چالوں میں الجھا کر اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کر سکتا ہے۔ اس کے لیے بھلا غریب عیشاں کیا اہمیت رکھتی ہوگی تم ظالم، خود غرض، سنگدل شخص ہو' تمہارا چہرہ مکروہ ہے۔ تم مردار کھانے والے گدھ کی طرح دکھائی دیتے ہو۔

☆......☆......☆

میران شاہ جب بھی گاؤں آیا کرتا تھا گاؤں بھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی، وہ شریف نیک دل باپ کا ایسی ہی خوبیاں رکھنے والا بیٹا تھا، لوگ دل سے عزت کرتے تھے اس کی اور آج جب وہ وہیل چیئر کو مستقل ساتھ لے کر آیا تھا تو ہر دل اس کے لیے اداس تھا اماں اور بانو کے ساتھ ساتھ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی رو رہے تھے۔ امجد کے چہرے پر افسوس اور دکھ تھا جبکہ دستگیر شاہ کے چہرے کا اطمینان جو چند روز پہلے رخصت ہوا تھا۔ اب پھر ان کے چہرے پر واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ زینت ذرا کی ذرا ہی باہر آئی تھی پھر دوبارہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور دستگیر شاہ نے اماں سے کہا۔

''بہت دکھ ہے زینت کو وہ میران کو اس حالت میں دیکھنا برداشت ہی نہیں کرسکتی۔''

''اماں! میں رانی سے مل لوں۔'' حویلی آتے ہی میران کو اپنی وہ دوست یاد آگئی۔

دل کی بات تو دوست سے ہی کہی جاسکتی ہے۔ وہ بھی رانی سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس ظلم کی داستان اسے سنانا چاہتا تھا جو اس پر اس کی ماں اور بہن پر توڑا گیا تھا اور خود کو ملامت بھی اسی کے سامنے کرنا چاہتا تھا۔ احساس جو تھا اپنی بے وقوفی کا' کیوں اعتبار کیا اس شخص پر' اتنی بڑی جائیداد اسے سونپ دی' سیاہ و سفید کا مالک بنادیا کبھی پلٹ کر حساب ہی نہیں لیا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے ہی بے بس کر کے رکھ دیا اب میں ایک معذور شخص ہوں اور مجھے ان معاملات کی کوئی سوجھ بوجھ بھی نہیں' دستگیر شاہ حکومت کرے گا اور میں مالک ہو کر بھی اس کے رحم و کرم پر ہوں گا۔ یہ احساس اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا اور وہ بہت اداس تھا۔

''بابا کیا اب بھی آپ زینت کی شادی میران سے کریں گے۔'' امجد رات باپ کے کمرے میں تھا اور ان سے پوچھ رہا تھا۔

''کیوں اب کیا ہوا ہے۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

''بابا اب وہ ایک معذور شخص ہے اور آپ نے دیکھا' زینت کے رویے کو میرا خیال ہے' وہ اس معذوری کے ساتھ میران کو قبول نہیں کرے گی۔''

''تم اپنے اس خیال کو اپنے تک ہی رکھو' مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ کیا تم اپنے باپ کو نہیں جانتے تمہیں ابھی تک اس کی سمجھ بوجھ کا اندازہ نہیں ہے۔''

''مگر بابا'' امجد نے پھر کچھ کہنا چاہا' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور بولے۔

''جانتے ہو کتنی زمین تھی تمہارے باپ کے پاس اور کیسے گزارہ ہوتا تھا اس ایک ٹکڑے پر ہونے والی فصل سے' بڑی محنت کی ہے میں نے' میران جوان لڑکا تھا۔ شہر کا پڑھا لکھا اور مضبوط دل گردے والا اگر اسے شک بھی پڑ جاتا تو وہ سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا مگر میں نے بڑی احتیاط سے ہر قدم رکھا ہے اب بھی جو میں سوچ رہا ہوں وہ تم نہیں سوچ سکتے۔

امجد پتر میران کی معذوری تو ہمارے لیے بڑی ہی اطمینان کی بات ہے، اب ہم ہر طرح سے۔ خود مختار ہیں۔ ہمیں کسی کا کوئی ڈر نہیں' یوں سمجھو اس معذوری نے ساری جائیداد ہمارے نام لکھوادی ہے۔''

''آ..... ہاں بابا میں نے واقعی اس طرح نہیں سوچا تھا مگر مجھے میران کی معذوری پر بہت دکھ ہے' وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس نے ہمیشہ میری عزت کی ہے۔''

''عزت اس نے نہیں کی تم نے کروائی ہے۔ اگر تم اوچھی حرکتیں کرتے تو بتاؤ کیا تب بھی وہ تمہاری عزت کرتا۔ بس میں نے طے کرلیا ہے۔ زینت بیٹی کی شادی میران سے ہوگی اور ضرور ہوگی۔''

''زینت ہمیشہ سے آپ کی لاڈلی رہی ہے اور اس لاڈ پیار نے اسے کچھ ضدی اور خودسر بنادیا ہے۔ پتا نہیں وہ مانے گی یا نہیں۔''

''میں خود بات کروں گا اور اسے کیسے راضی کرنا ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

انہوں نے امجد کے اس اعتراض پر توجہ دی۔

☆......☆......☆

لال حویلی پر ان دنوں سوگ کی کیفیت ٹھہر گئی تھی۔ بانو، اماں جان اور ملازمائیں خاموش اداس اور دبے قدموں سے ادھر اودھر آتی جاتیں اور آہیں بھرتی تھیں۔

میران اپنے کمرے میں رہتا دستگیر شاہ اور امجد دن بھر زمینوں پر ہوتے شام کو گھر آتے تو دونوں اس کے کمرے میں ضرور آتے' امجد کے انداز میں اس کے لیے ہمدردی اور خلوص ہوتا تھا جبکہ دستگیر شاہ کو دیکھتے ہی میران کا لہو گرم ہوجاتا تھا۔ ان کی صورت سے نفرت محسوس ہوتی مگر اسے اپنی بے بسی کا احساس تھا' بہن کی قسمت کی ڈوری انہی ہاتھوں میں تھی' وہ ان سے بگاڑ نہیں سکتا تھا۔

دستگیر شاہ نے ٹھیک پندرہ دن کے بعد زینت سے بات کی تھی، اتنے دن تک وہ میران کے رویوں پر غور کرتے رہے تھے' اور انہیں اطمینان تھا کہ اس نے معذوری کو خود پر طاری کرلیا تھا' وہ دنیا سے بالکل کٹ گیا تھا' وہ یہ نہیں سمجھ سکے۔ عیشاں کی موت اور ان کی عیاری نے اسے دنیا سے توڑا ہے' وہ اب زندگی میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا زینت کو اپنے کمرے میں بلا کر زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی تھی، اسے بتایا تھا تم کتنے سال سے پھوپھی کے گھر میں رہ رہی ہو اور تمہاری پھوپھی کا ایک بیٹا بھی ہے۔ سب لوگ ہمارے نہ کہنے کے باوجود یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تمہاری شادی میران کے ساتھ ہوگی۔ اور یہ تمہاری خوش نصیبی ہے زینت۔ کیونکہ میران لمبی زمینداری رکھتا ہے اس کے پاس دولت ہے عزت ہے اور وہ تمہیں راج کرواسکتا ہے۔''

انہوں نے اس کی رائے لینے سے پہلے اسے میران کی دولت اور اس دولت کے بہت سے فائدے سمجھادیے تھے، پھر جب ایک گھنٹے تک یہ سمجھانے کے بعد رائے طلب کی تو وہ ہاں میں ہی تھی۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی' زینت دھی رانی ہمارے ہاں بیٹیوں سے رائے لینے کا کوئی رواج نہیں مگر دیکھ لے تیرا بابا تجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔''

''ہاں بابا آپ کی محبت پر مجھے فخر ہے۔''

''رانی بن کر باپ کو بھول نہ جانا۔'' اور وہ ابھی سے رانی بن گئی۔ مغرور تو وہ بہت تھی اب گردن میں اکڑاؤ بھی پیدا ہوگیا۔

دستگیر شاہ نے بہن سے اس رشتے کی بات کچھ یوں کی۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے ایک ماہ کے بعد زینت اور میران کی شادی کردی جائے۔''

بہن ممنون تھی معذوری کے باوجود وہ بھانجے کو اپنی پیاری بیٹی دے رہے تھے۔ انہوں نے انکار نہیں کیا۔

یہی کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی۔''

میں شکرگزار ہوں آپ کی اور ہمیشہ رہوں گی۔''

''کیا بات ہے تمہارے لہجے میں خوشی نہیں۔ جو ماؤں کے انداز میں بیٹے کا رشتہ طے ہونے پر آجاتی ہے۔''

''کیا کہوں بھاجی۔ ہائے کیسی بدنصیب ماں ہوں میں' جوان بیٹے کو معذور دیکھ رہی ہوں۔ کتنا دل تڑپتا ہے میرا' میں نے میران کے باپ کی موت پر صبر کرلیا تھا مگر اس کی معذوری یہ میری برداشت سے باہر ہے' میں تو ریت کی طرح بیٹھی جارہی ہوں۔ زمین پر اپنی پکڑ چھوڑ رہی ہوں بھاجی مجھے تو لگتا ہے میں زیادہ دیر جی نہیں سکوں گی میرے بعد میرے بچوں کا خیال رکھنا۔''

''او ہو زینت اس خوشی کے موقع پر یہ کیسی باتیں لے بیٹھی ہو' کچھ نہیں ہوتا تمہیں اور پھر بچوں کی کیا بات کرتی ہو' مجھے یہ بتاؤ ان کے باپ کے مرنے کے بعد کس نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا، کس نے تمہیں خاوند کے مرجانے کے بعد بھی گاؤں کی بڑی بی بی بنائے رکھا، میں نے صرف میں نے، ہمیشہ تمہارا خیال رکھا مزارعوں کو دبانا ان سے ایمانداری سے کام کروانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تمہارا میران تو شہزادہ ہے اسے صرف اپنے جیب خرچ سے مطلب رہا ہے اور کیوں نہ ہوتا' پتا ہے ماموں ہے دیکھ بھال کے لیے' اپنا سمجھا ہے' امجد اور زینت کی طرح ان دونوں سے محبت کی ہے' جبھی تو ایسا ہوا ہے اور اب تو یہ میری بہو اور داماد ہیں میری ساری محبت انہی دونوں کے لیے ہے۔''

''اللہ آپ کو اجر دے گا' میں تو بس دعا ہی دے سکتی ہوں۔''

''تم میران کو بھی بتا دینا' وہ اپنی معذوری کی وجہ سے ہر شے سے اکتاہٹ ظاہر کرتا ہے۔ اسے اب کسی خوشی سے کوئی مطلب نہیں مگر تم اسے سمجھاؤ اور بتاؤ یہ ضروری ہے اسے شادی تو ہر حال میں کرنا ہے۔'' انہیں میران کی طرف سے تھوڑا دھڑکا تھا اس لیے ساتھ یہ سب بھی کہہ گئے تھے۔

اماں نے میران کو جاکر ماموں کا فیصلہ سنا دیا تھا وہ سن کر چپ رہا۔

''کیا بات ہے' تمہیں خوشی نہیں ہوئی پتر۔'' ان کی بات پر اس نے گہری سانس کھینچی اور بولا۔

''ہاں اصولاً تو مجھے خوشی ہونی چاہیے کہ ایک معذور ناکارہ شخص کو دستگیر شاہ اپنی بیٹی کا ہاتھ دے رہا ہے۔ مجھے تو مارے خوشی کے مرجانا چاہیے۔ اماں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو پتر! آخر زینت سے شادی پر اعتراض کیوں ہے، اب تو عیشاں بھی دنیا میں نہیں ہے' تمہیں یہ بھی سوچنا چاہیے تمہاری بہن بانو امجد کی منگ ہے۔ اور یہ رشتہ بانو کی خوشی بھی ہے۔ میری بیٹی نے کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا تم تو لڑکے تھے مضبوط

دل کے مالک تھے پھر پڑھنے شہر چلے گئے' وہاں پڑھائی میں اور دوستوں میں دل لگ گیا۔ مگر بانو بڑی اکیلی سی رہی ہے' اب تم اس کی یہ خوشی نہ چھینو۔''

''اماں! میں بھی اس کی وجہ سے چپ ہوں مجھے بھی بانو بہت عزیز ہے' اس کی خوشیاں میں کس طرح برباد کرسکتا ہوں۔'' میران کی آواز بھیگ رہی تھی۔

''تو پھر تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' ماں کے پوچھنے پر اس نے لبوں سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی چپ کہہ رہی تھی میں نے اس موڑ پر بھی دستگیر شاہ سے شکست قبول کرلی ہے۔

''جیتے رہو' زینت اچھی لڑکی ہے مجھے پورا یقین ہے پتر شادی کے بعد تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے، تمہاری یہ چپ اور بے زاری تو میرا دل کاٹتی ہے، میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں خوش ہوں اماں! آپ میری فکر نہ کریں۔'' وہ گہری سانس کھینچ کر لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر بمشکل بولا تھا۔

دونوں شادیاں ایک ساتھ انجام دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اماں بڑی مصروف تھیں۔

☆......☆......☆

اس شام میران وہیل چیئر لے کر برآمدے میں آ بیٹھا تھا۔ اس نے مائی جندو کو ادھر آتے دیکھا پتا نہیں اب یہ کیا کہے گی مذاق اڑائے گی ہنسے گی تجھ پر یا سلام کرکے اندر دستگیر شاہ کے پاس چلی جائے گی۔ اسے جندو کو دیکھ کر الجھن محسوس ہوتی تھی۔ جندو اس کی طرف آئی، آج بڑی سنجیدگی سے سلام کیا پھر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اس کی چپ بھی میران کو عجیب سی لگی۔

''کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے مائی جندو!'' وہ پوچھ بیٹھا

''ہائے شاہا تیری معذوری نے جندو کو مار دیا ہے۔ سچ بڑا دکھ ہوتا ہے مجھے' تجھ جیسے محبتوں میں دیوانے دھن دولت والے بڑے ہی کمیاب ہیں اس دنیا میں، عیشاں خوش نصیب تھی اسے تیرے جیسا چاہنے والا ملا تھا۔ مگر بدنصیب بھی تھی کہ تمہارے اور اس کے بیچ آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ تم دونوں ہی جل گئے ہو۔''

''تم بھی کسی کے درد کو محسوس کرسکتی ہو جندو۔''

''ہاں میران میں بھی محسوس کرسکتی ہوں ان لوگوں کے درد کو جو اپنے پیار میں سچے اور کھرے ہوتے ہیں' سچ کہتی ہوں کردار کے پکے مرد کو تو رنڈی بھی سراہے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں کردار کا پکا ہوں اس روز تو تم اور ہی انداز میں بات کرگئی تھیں۔''

''ہاں میں سمجھنے میں غلطی کرگئی تھی مگر پھر عیشاں کی موت پر تیرا رونا اور تڑپنا مجھے بتا گیا تو دل کو دیکھنے والا ہے' تو جسم سے نہیں روح سے محبت کرنے والوں میں سے ہے' زینت بی بی خوش نصیب ہے کہ اسے تیرے جیسا سچا مرد مل رہا ہے اور وہ بدنصیب بھی ہے کہ تیرے سینے میں تیرا دل نہیں رہا' وہ عیشاں کے پاس قبر میں چلا گیا ہے۔''

''ہاں تم سچ کہتی ہو جندو اب میرے پاس دل نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ بس ایک درد ہے اور یہ درد مجھے بہت بے چین کرتا ہے۔''

''میران شاہ دیکھ تو ذرا سوچ تو میری بات پڑ یہ عورت ازلی بدنصیب ہے کہ نہیں، جس سے پیار کرتی ہے وہ وفا نہیں کرتا جیسے دستگیر شاہ اور اس کی بیوی زاہدہ، زاہدہ نے ٹوٹ کر چاہا دستگیر شاہ کو مگر اس نے پاؤں کی جوتی ہی سمجھا اسے۔ اور جو کسی کو پیار کرنے والا نصیب ہو جائے تو یہ پیار عورت کے پاس بس اتنی ہی دیر کو ٹھہرتا ہے جیسے بند مٹھی میں پانی' تیرے باپ اور ماں کی مثال سامنے ہے' تیری ماں کو فخر بھی تھا اپنے سر کے سائیں پر اور محبت بھی مگر وہی عورت کی بدنصیبی ساتھ بڑا مختصر تھا، وہ چلا گیا۔ یہ اب تک رو رہی ہے' تمہاری اور عیشاں کی داستان، میں سوچتی ہوں عیشاں کا دل اس محبت کو پا کر کیسے ہلکورے لیتا ہوگا مگر ازل بدنصیبی۔'' جندہ آہ بھر کر خاموش ہوگئی اور میران کے آس پاس جیسے ہر شے دھواں دھواں ہوگئی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور دل کہہ رہا تھا، جندو سچ کہہ رہی ہے واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔

کچھ دیر بعد جندو نے سر اوپر اٹھایا اسے روتا ہوا دیکھ کر بولی۔ ''تجھ جیسے محبتوں کے بچھڑ جانے پر ماتم کرنے والے مرد بڑے کم ہوتے ہیں اور مجھ جیسی بے پروا، بے دل کی عورتیں بھی شاید کم ہی ہوتی ہیں، میں تو جھوکی ہوں۔ (برے کردار والی) میں ٹونے ہاری (بے رحم) ہوں، مگر میران شاہ! تیری اور عیشاں کی سچی کھری محبت کی قسم اب میرا دل بدل گیا ہے۔ اب میں ٹونے ہاری نہیں رہی۔ میران شاہ میرا دل تیرے لیے بڑا روتا ہے۔ ہائے تیری جوانی کی یہ بربادی میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے۔''

''اور میں سوچتا ہوں مائی جندو کاش میرے دل میں عیشاں کا خیال نہ آتا، میں پہلے بھی تو گاؤں آیا کرتا تھا تب وہ کبھی مجھے دکھائی نہیں دی اب بھی راستے میں نہ ملتی اور پھر میری حویلی میں نہ آتی اور زندگی سے ہاتھ نہ دھوتی۔''

''کیا مطلب شاہ اس میں بھلا تیرا کیا دوش؟''

''وہ اپنی موت نہیں مری اسے قتل کیا گیا ہے۔ اور یہ قتل میری وجہ سے ہوا ہے میری خاطر ہوا ہے کہ میرے اپنے میرے ہمدرد میرا رشتہ کہیں اور کرنا چاہتے تھے مگر درمیان میں عیشاں تھی' انہوں نے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا مگر وہ یہ نہیں جانتے عیشاں روح بن کر میرے وجود میں آ بسی ہے اور وہ روح کو ختم نہیں کر سکتے۔ عیشاں تب تک میرے ساتھ رہے گی۔ جب تک میں زندہ رہوں گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ دستگیر شاہ نے اسے ختم کروادیا ہے۔'' مائی جندو کا اندر دکھ سے بھر گیا وہ سوچ رہی تھی اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس ظلم میں میرا بھی ہاتھ ہے' میں نے بھی یہ تصدیق دستگیر شاہ کے سامنے کی تھی کہ عیشاں اور میران میں کوئی تعلق ہے۔

''ہاں اسے دستگیر شاہ نے مجھ سے دور کر دیا ہے۔'' میران نے بڑی نفرت سے یہ نام لیا اور پھر جندو سے یہاں بیٹھا نہیں گیا' وہ دستگیر سے ملنے آئی تھی مگر اب یہیں سے واپس ہوگئی۔ اور بے بس میران سر ہاتھوں میں تھامے یہیں بیٹھا رہ گیا۔

☆......☆......☆

اے وقت تیری جھولی میں میرے لیے ایک بھی خوشی نہیں تھی، میں ہمیشہ ترستا ہی رہا اور تو میرے ہر دکھ درد سے بے نیاز اپنی رفتار سے بڑھتا چلا گیا۔ کیا کیا گھاؤ نہیں لگائے تو نے مجھے۔ میں بار بار اپنے ہاتھوں کی

لکیروں کو دیکھتا ہوں اور نمی میری آنکھوں میں اتر آتی ہے یہاں اس ہتھیلی پر زندگی کی لکیر بڑی ہی لمبی ہے یعنی میری سزا ابھی بہت دیر تک باقی ہے۔

لال حویلی اب بھی گاؤں کے مکینوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ حویلی کا لال رنگ بالکل پھیکا پڑ چکا ہے۔ مرمت نہ ہونے کی وجہ سے عمارت بوسیدہ دکھائی دیتی ہے مگر گاؤں کے غریب لوگ مدد لینے کے لیے اب پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ آتے ہیں کہ یہاں جو بیٹھا ہے' وہ ہمدرد ہے دل میں درد رکھتا ہے اور آنسو پونچھتا ہے۔ کتنا اکیلا ہے میران شاہ، پندرہ سال پہلے حادثے میں معذوری مقدر بنی تھی بس اس روز سے اک خاموشی اس کی ذات میں آ کر ٹھہر گئی ہے۔ زینت سے شادی دستگیر شاہ کی سازش کا نتیجہ تھی۔ وہ راج گدی ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا زیادہ مہلت نہیں ہے اس کے پاس۔ زینت اور میران کی شادی کے چھ ماہ بعد دستگیر شاہ بظاہر معمولی سی بیماری کا شکار ہو کر دنیا سے اٹھ گیا امجد دستگیر شاہ کا بیٹا ضرور تھا مگر باپ سے مختلف تھا میران نے جائیداد میں سے بانو کا حصہ دے دیا تو وہ بیوی کو لے کر اس حویلی سے چلا گیا۔

اب امجد اور بانو کے تین بچے تھے' وہ لوگ اکثر میران سے ملنے آ جاتے تھے کہ ماموں ان سے پیار بھی تو بہت کرتے تھے۔ زینت اور میران کو اللہ نے اولاد نہیں دی اور زینت جو پہلے ہی مزاج کی سخت اور زبان کی کڑوی تھی اس کمی نے اسے پاگل ہی کر دیا تھا، وہ سارا دن ملازماؤں پر برستی رہتی تھی۔

میران نے اپنی زمینوں اور ان کے مسائل میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی اسے احساس ہو رہا تھا دستگیر شاہ نے یہاں کے لوگوں پر کسی جابر حکمران کی طرح حکومت کی ہے۔ یہاں کے لوگ کتنے غریب اور مجبور ہیں۔ رانی کچھ دنوں سے بیمار تھی، اسے ''خوب'' کی بیماری ہوگئی تھی اور یہ اس کے لیے بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی، میران دن میں کئی بار اسے دیکھنے کے لیے جاتا، شہر سے اس کے لیے ڈاکٹر بھی منگوائے دیسی علاج بھی جاری رکھا مگر حالت کچھ بہتر نہیں تھی۔ کیا یہ دوست بھی باقی نہیں رہے گا' رانی بھی مجھے چھوڑ جائے گی۔ اداسیوں اور مایوسیوں کی دھند چھٹنے کے بجائے گہری مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔

زندگی کیا تھی اور کیا ہوگئی۔ دستگیر شاہ تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا اور کیا ملا تمہیں یہ ظلم توڑ کر، وہ ٹانگوں پر چادر ڈالے وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ سامنے لان تھا۔ اور یہاں ملازموں کے کچھ بچے کھیل رہے تھے وہ شور مچا رہے تھے مگر میران اتنی گہری اور اداس سوچ میں تھا کہ کوئی آواز اسے ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ کھلے گیٹ سے دو نسوانی وجود لال حویلی میں داخل ہوئے تھے، میران کا چہرہ اس وقت گیٹ کی جانب نہیں تھا۔ وہ تو سر کو تھوڑا دائیں طرف کیے الجھا ہوا تھا مگر ادھر وہ داخل ہوئیں، ادھر اس کی ساری توجہ خود بخود ہی گیٹ کی طرف ہوگئی یوں لگا جیسے خوشبو اسے پیغام دے گئی ہے' وہ ابھی دور تھیں ایک نے تو ہلکی چادر اوڑھ رکھی تھی چہرہ بھی کھلا تھا۔ مگر دوسری نے بڑی چادر میں اپنے وجود کو اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا اور میران اسی کو دیکھ کر چونکا تھا بے اختیار پکارا تھا۔

''عیشاں! تم یہاں اتنے عرصے کے بعد۔'' اور عیشاں تقریباً دوڑتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے اس کے پاس آ گئی تھی جبکہ لڑکی، ادھر ہی رک گئی اور ان میں کھیلنے والے بچوں کو دیکھنے لگی۔

''تم نے تو مجھے یوں بھلا دیا شاہا جیسے درمیان میں سال تو کیا ایک پل بھی نہیں آیا۔'' وہ نیچے فرش پر بیٹھ

گئی اور ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

''چھوڑو شاہا اب بات بہت پرانی ہے مگر ایسی پُر درد کہ چھیڑ دو تو دل آج بھی لہولہو ہو جاتا ہے۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''عیشاں میں نے تمہیں ہر پل اپنے ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ میرے دل میں تم ہی آباد ہو اور تم ہی رہو گی' تم اتنے برسوں بعد بھی مجھے بالکل پہلے جیسی ہی دکھائی دے رہی ہو۔''

''شاہا محبت تو اپنی جگہ ہے مگر میرے ذہن میں تو بس وہ ایک رات جم کر رہ گئی ہے۔ وہ طوفانی رات جب ہوائیں چیخ چیخ کر بین کرتی تھیں اور بادل کی گرج دل دہلاتی تھی اس اندھیری رات میں بڑا ہی جادو تھا اور ہم دونوں اکیلے تھے۔ تم کچھ بہکے تھے اور میں سمجھ لیا تھا آج عیشاں لٹ گئی ہے۔ مگر شاہا تم نے مجھے لوٹا نہیں' تم نے میری چادر کو پھر سے سر پر ڈال دیا تھا۔ تم نے طوفانی رات میں وہ کمرہ چھوڑ دیا تھا اور بارش میں بھیگتے رہے تھے، تب میں اتنا نہیں جانتی تھی میں کچی کلی تھی۔ احسان مند تو ہوئی تھی، تمہاری عزت تو دل میں بڑھ گئی تھی مگر اب جب عمر پکی ہے میں نے مرد کو برتا ہے، میں نے دل کو دیکھا ہے تو شاہا میں نے جب بھی تمہارے بارے میں سوچا یہی کہا۔ وہ انسان نہیں فرشتہ ہے اور یہ عیشاں کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسے ایسا چاہنے والا ملا تھا۔ میں نے تو ایک عمر اسی فخر کے سہارے گزار دی ہے شاہا اور یہی اعتبار یہی فخر، مجھے یہاں تمہارے پاس لایا ہے، میں ایک کام سے آئی ہوں اور مجھے پتا ہے اور تم انکار نہیں کرو گے۔'' ''تم حکم کرو عیشاں!''

''نہ سائیں نہ میرے شاہا! میں تو تیری غلام ہوں۔ میں حکم نہیں کرتی ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہوں' غریب آدمی کی بیوی ہوں بڑی مجبور بڑی ہی لاچار ہوں اور میری بیٹی کی چادر اتارنے کو دنیا بڑی بے چین ہے۔ شاہا میں اس رات کے یقین پر اسے یہاں لائی ہوں اسے اپنی حویلی میں رکھ لو اس کے سر کی چادر کی حفاظت اسی طرح کرنا جیسے میری چادر کی کی تھی میں بڑی دور سے آئی ہوں اب تم بال بچوں والے ہو گے مگن ہو گے اپنے گھر میں میں بھی اپنے مرد کے ساتھ نبھا رہی ہوں کہ رب کا حکم ہے، مرد کا سائیں ہو تو اس کا ماننا ہی بات ہے پر سائیں دل۔'' اس نے کچھ کہتے کہتے زبان دانتوں تلے دبالی۔ اور بیٹی کی طرف دیکھ کر آوازیں دینے لگی۔ ''رانی او رانی ادھر آ شاہ جی کو سلام کر۔''

''یہ میری نہیں مگر تمہاری بیٹی تو ہے نا اور یہ مجھے اتنی ہی عزیز رہے گی جتنی کہ تمہیں ہے اس لیے عیشاں تم سے بڑھ کر کوئی نہیں، پتا نہیں کیا نصیب تھے ہمارے' ہم تپتے موسموں میں ملے تھے مگر یہ نہیں سوچا تھا یہ تپش تازندگی رہے گی' ہم مل نہیں پائیں گے۔ ہو سکتے رہیں گے ساری زندگی جلتے جلتے موسم کی طرح ہو جائے گی۔

برسات کی رات تمہیں بھی یاد ہے اور مجھے بھی کہ پھر برسات کبھی نہیں آئی، میں جلتے آسمان کے نیچے کھڑا ہوں اور میں نے تمہاری آنکھوں کی عبارت پڑھ لی ہے تم بھی موسموں کے جبر میں ہو پتا نہیں کیا نصیب تھے

عیشاں تھکے قدموں کے ساتھ بار بار پلٹ کر دیکھتی گیٹ پار کر گئی تھی اور میران ایک بت کی طرح ساکت ابھی تک گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہوا جیسے چلتے چلتے ٹھہر گئی تھی ہجر موسم کی طرح۔

☆ ☆ ☆

خالی دل خالی ہاتھ

بہت ہنگامہ' بڑی رونق تھی اس روز چوہدریوں کی حویلی میں۔ ہر چہرے پر خوشی اور جگمگاہٹ رشتے دار اور ملنے والے سب اپنے برابر کے تھے۔ اس لیے کپڑے اور زیورات کی شان دیکھنے والی تھی۔ ملازم بھی اپنی حیثیت کے مطابق صاف، ستھرے اور اپنے سب سے بہتر لباس میں آئے تھے۔ چوہدری صاحب کی بڑی بیٹی ناہید کی مہندی ہے۔ گھر کی پہلی شادی ہے اس لیے چوہدری صاحب نے جیسے پورے گاؤں کو ہی مدعو کر ڈالا تھا۔ ان کے ملنے والوں میں گاؤں سے باہر کے لوگ بڑے بڑے آفیسر بھی شامل تھے اور چونکہ آج پر تکلف کھانے کا بھی اہتمام تھا۔ تو سب ہی یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ چوہدری صاحب کی بھانجی زینت آج ہی ساتھ کے گاؤں سے اپنے بھائی انور کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔ ایک تو اس کا بجلی گراتا حسن اور اس پر جگر جگ کرتا نیلا سوٹ بس اس کی طرف جو نگاہ اٹھتی جھکنا بھول جاتی۔

کئی عورتیں چوہدرانی کو مشورہ دے چکی تھیں۔ زینت کو اپنے جمال کے لیے مانگ لو مگر چوہدرانی کو اپنے شوہر کی بھتیجی سے زیادہ اپنی بھانجی عشرت عزیز تھی۔ دل میں پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس حویلی میں دلہن بن کر صرف عشو ہی آئے گی۔

''زینی! او زینی! سن یہ چوڑیاں کہاں سے لی ہیں تو نے۔'' ایک لڑکی اس کی بازوؤں میں بجی خوب صورت چوڑیوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''میرا بھائی لاہور شہر سے لے آیا ہے۔'' اس نے چوڑیوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

''اصلی چیز تو اس بانہہ کی خوب صورتی ہے۔'' کوئی اور بولی تھی اور تب ہی ٹینٹ لگاتے نادر نے چپکے سے ایک نگاہ مالکوں کی اس مہمان پر ڈالی تھی۔ واقعی کہنے والی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سنگھار نے اسے نہیں سجایا تھا

بلکہ اس لباس اور زیور کی قسمت جاگ اٹھی تھی جو اس کے تن پر تھا۔ وہ اپنا کام بھول گیا اور پرشوق انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

''نادر! او نادر!'' کوئی پکار رہا تھا اور نادر چونک کر پھر سے اپنے کام میں لگ گیا مگر دل اب کچھ اور ہی چاہ رہا تھا۔ ''دیکھتا رہوں بس اس حسین صورت کو یہاں تک کہ اس کی شبیہہ میرے ہر احساس پر چھا جائے۔''

شادی والے گھر میں وہ اتنا غیر اہم نہیں تھا کہ کسی کونے میں بیٹھا زینی کو دیکھتا رہے اور سراہتا رہے۔ وہ چوہدری صاحب کا منشی تھا۔ زمینوں سے لے کر گھر آئے گئے مہمان کی آؤ بھگت کا تمام حساب اسی کے پاس ہوتا تھا۔ اونچا' لمبا' گبھرو جوان۔ وہ تھا تو گاؤں کے ایک غریب گھر کا بیٹا مگر دس جماعتیں پڑھ کر چوہدریوں کے لیے بڑا اہم ہو گیا تھا اگر پیسے ہوتے تو مزید تعلیم بھی حاصل کرتا۔ بچپن سے شہر جا کر پڑھنا اس کا خواب تھا مگر خواب اگر پورے ہونے لگیں تو شاید دنیا میں کوئی اداس نہ رہے۔

چوہدری صاحب اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس کی دیانت اور ذہانت سے متاثر تھے۔ ہر جگہ اسے ساتھ ساتھ رکھتے۔ تین سال سے وہ ان کے ساتھ تھا۔ گویا یہ تین سال اس نے چوہدری کے خاص آدمی کی حیثیت سے گاؤں پر حکومت کرتے گزارے تھے۔ وہ ظالم اور ناجائز فائدہ اٹھانے والوں میں سے نہیں تھا۔ ہاں مگر پھر بھی یہ ضرور تھا کہ طبیعت میں تحکم پیدا ہو گیا تھا۔ ہر کسی سے رعب سے بات کرتا تھا۔ ظاہری قد بت اور خوبروئی پر یہ رعب سجتا بھی بہت تھا۔ گاؤں والے اس کی شخصیت سے مرعوب تھے اور جو جلتے تھے وہ بار بار کہتے دس جماعتیں پڑھ کر چوہدریوں کا منشی لگ گیا ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو اسی عبداللہ کا بیٹا جس کی تھوڑی سی زمین تھی اور جن کے گھروں میں ایک بار روٹی پکا کرتی تھی۔

کوئی اس کے بارے میں کیا کہتا ہے اسے پروا نہیں تھی۔ اسے تو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ کسی کی بھی پروا نہیں ہے مگر آج زینی کے حسن نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چوہدریوں کی عورتیں عام طور پر پردہ کرتی تھیں۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے چادر کا گھونگھٹ نکالا کرتی تھیں' یہ تو شادی یا مرگ کے موقعے ہی ہوتے تھے جب ملازم مرد کام کے سلسلے میں اندر' باہر آتے اور پردہ برقرار نہ رہتا ویسے اندر آنے کی اجازت ہر ملازم کو نہیں ہوتی تھی۔ ''کون ہے یہ لڑکی' چوہدری صاحب سے اس کا کیا رشتہ ہے۔'' وہ یہ جاننے کو بے تاب تھا۔ آنے بہانے ادھر کے چکر لگانے لگا جہاں لڑکیاں بیٹھی تھیں اور میراثن ڈھولک کے گیت گا رہی تھی۔

''زینی! او زینی! تمہاری اماں بلا رہی ہے۔''

کسی لڑکی نے کہا تھا۔ زینی اپنی جگہ سے اٹھی اور ادھر کو چل پڑی جہاں نادر سے تھوڑے ہی فاصلے پر چوہدری صاحب کے چھوٹے بھائی کی بیوی کھڑی تھی۔

''اماں! کیا بات ہے۔'' اس نے آ کر پوچھا تھا۔

''اوہ اچھا تو یہ چھوٹے چوہدری صاحب کی بیٹی ہے۔'' اس نے گہری سی سانس لے کر جیسے اس کی خوشبو کو سمیٹنا چاہا تھا۔ ماں سے باتیں کرتے کرتے زینی نے اس کی جانب دیکھا۔ اسے یوں توجہ سے خود کو دیکھتے

پا کر پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں ابھریں اور اس نے نادر کی جانب سے تھوڑا رخ موڑ لیا۔ یہ ادا بھی نادر کو بھا گئی اگر وسایا نادر کو آواز نہ دے دیتا تو شاید وہ تب تک وہیں کھڑا رہتا جب تک زینی اتنے نزدیک موجود رہتی - وسایا اسے مردانے میں جانے کو کہہ رہا تھا۔ چوہدری صاحب کے کچھ خاص مہمان آئے تھے اور ان کی خاطر تواضع کے لیے نادر کو ہی بلایا جاتا تھا۔ رات بارہ بجے تک وہ ادھر ادھر مصروف رہا۔ اور زنانے میں رسمیں ادا ہوتی رہیں۔ وہ خواہش کے باوجود ایک بار بھی اندر نہیں جھانک سکا۔ بارہ کے بعد دوسرا پروگرام تھا۔ شہر سے ناچنے والی بلوائی گئی تھیں اور چوہدری صاحب کے سب ہی مرد مہمان اسی پروگرام کے انتظار میں تھے۔

اب زنان خانے کی رسمیں اختتام کو پہنچ رہی تھیں۔ بچے اور بوڑھی خواتین سو چکی تھیں۔ لڑکیاں اس کوشش میں تھیں کہ کسی طرح باہر ہونے والے پروگرام کو وہ بھی دیکھ لیں۔ کچھ چھت پر چڑھی جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کچھ کمرے کی کھڑکیوں کے پاس کھڑی تھیں۔

نادر کھانے کے برتن اٹھوانے میں مصروف تھا۔ وہ اندر بھی اسی سلسلے میں آیا اور آتے ہی وہ ٹکرا گئی۔

''سنو'' اس نے نادر کو پکارا اور وہ کچھ بھی کہے بغیر بس اسے دیکھنے لگا۔

''کیا ہم کسی طرح یہ ناچ گانا دیکھ سکتے ہیں؟'' اس کے انداز میں تھوڑی سی لجاجت تھی۔

''آپ!'' وہ اتنا کہہ کر رکا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''کیا کرو گی بی بی یہ سب دیکھ کر۔ کسی کا تماشا دیکھنا کوئی اچھا عمل تو نہیں ہے۔''

''ہم نے تو انہیں تماشا نہیں بنایا۔'' وہ اس کی بات پر تھوڑی تیزی سے بولی تھی۔

''ان کی مجبوری ہے' حالات کی خرابی ہے جو انہیں اس موڑ پر لے آئی ہے۔ مجبور کی مجبوری پر خوش نہیں ہونا چاہیے' پناہ طلب کرنی چاہیے خدا سے۔''

''ہونہہ ذرا سا کام کیا کہہ دیا۔ باتیں بنانے لگے۔ صاف کہہ دو نہیں کر سکتے یہ کام۔'' وہ اپنے پیچھے کھڑی دو تین سہیلیوں کی طرف مڑی۔

''نہیں' میرا یہ مطلب تو نہیں ہے بی بی! اگر آپ دیکھنا چاہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں انتظام کر دیتا ہوں۔'' وہ اسے ناراض نہیں کر سکا۔

زینی نے مسکرا کر اپنی سہیلیوں کو دیکھا پھر اس کی جانب رخ موڑ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ گویا اس کی خطا معاف کر دی۔

کام ختم کر کے وہ تو واپس آ گیا کہ صبح کا سارا دن تو پھرکی بن کر گزرنا تھا۔ ناہید بی بی کی بارات تھی اور سمجھو سارا کام اسی کے سر تھا۔ اپنے دو کمروں اور بڑے سے آنگن والے گھر آ کر وہ بستر پر لیٹتے ہی سو جایا کرتا تھا مگر آج ایسا نہیں ہو سکا۔ بہت تھکا ہوا ہونے کے باوجود نیند اس سے روٹھی رہی۔ وہ بستر پر چت لیٹا ایک بازو ماتھے پر ٹکائے بس زینی بی بی کے بارے میں سوچتا رہا۔

''میں نے بہت سنا تھا اس کے بارے میں' اب دیکھا تو یہ جانا' جتنا سن رکھا تھا وہ تو اس کے حسن کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ مجھے اعتراف ہے' زینت جیسی حسین لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ آج کی رات

تو اسی کے بارے میں سوچنے کو جی چاہتا ہے۔ کاش مجھے شاعری آتی تو میں اس پر شعر کہتا۔ میں نہیں مانتا تھا کہ محبت اچانک بس آپوں آپ ہو جاتی ہے۔ مگر آج یقین آ گیا ہے' محبت بس اچانک سر اٹھاتی ہے اور سارا وجود اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔''

☆......☆......☆

صبح وہ ناشتا کرنے کو بھی تیار نہیں تھا اسے بس چوہدریوں کی حویلی پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس کی ماں فاطمہ چولہے کے پاس بیٹھی لکڑیاں جلانے کے بعد توا رکھ چکی تھی اور بار بار اس سے کہہ رہی تھی خالی پیٹ' سوکھے منہ گھر سے قدم نہ نکالنا۔ کچھ کھا کر جانا۔

''اماں! وہاں بہت کام ہے' سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''تو اگر روٹی کھا کر جائے گا تو کام الٹ نہیں جائیں گے۔'' آخر جل کر فاطمہ نے کہہ دیا۔

''ماسی! او ماسی!'' آواز امیرن کی تھی۔

''لو ایک مصیبت اور آ گئی۔ اماں اسے بھی ہم نوا بنا لے گی۔ اب یہ بھی ضد کرے گی۔ ناشتا کر کے جاؤ۔'' نادر کو اس کی آواز سن کر کوفت ہونے لگی۔

''ماسی یہ ہے مکھن اور یہ ہے کجریلا۔ رات بنا کر نعمت خانے رکھا تھا۔ اب ٹھنڈا ہو کر اور بھی مزے دار لگنے لگا ہے۔''

''اچھا کجریلا لائی ہو۔ چلو اب تو نادر کو کھانا ہی پڑے گا۔'' فاطمہ کو جیسے اطمینان ہوا۔ جانتی تھیں کہ نادر کو کجریلا بہت پسند ہے۔

''کہاں ہے یہ نادر؟'' امیرن کی آواز اس نے سنی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

امیرن اسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''جانتی ہوں چوہدریوں کی بیٹی کی شادی ہے۔ کام سارا تمہارے سر ہو گا۔ صبح سے شام تک جتے رہو گے اور پھر چوہدری کی زبان سے تمہاری تعریف میں نکلا ایک جملہ تمہیں خوش کر دے گا۔ یوں جیسے سارے دن کی محنت وصول ہو جائے گی۔''

''تم اتنے برے لہجے میں چوہدریوں کا ذکر کیوں کرتی ہو؟ کیا بگاڑا ہے ان بے چاروں نے تمہارا؟'' وہ امیرن کے لہجے کا برا نہیں مانتا تھا۔ ہنس کر جواب دیتا تھا۔

''یہ امیر لوگ غریبوں کو انسان نہیں سمجھتے۔ خود تو بستر پر دراز بھی تھک جاتے ہیں اور اپنے ہی جیسے انسانوں سے سارا دن مشقت کرواتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے ماسی نے تجھے تعلیم دلوا کر بڑی غلطی کی ہے۔'' نادر نے گہری سانس کھینچ کر بظاہر بڑی ہمدردی سے اسے دیکھا تھا۔

''تم تعلیم حاصل کر لو تو تمہارا اور سارے خاندان کا فخر اور میں پڑھ لکھ جاؤں تو یہ میرے ماں' باپ کی غلطی۔ تم ہی جیسے لوگ عورت کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔''

''اچھا' اچھا۔ دس جماعتیں پڑھ کر تم یا میں کون سا تیر مار سکتے ہیں۔'' نادر نے ذرا مایوسی سے کہا تھا۔

''اگر میرے بھائی اور باپ کے پاس پیسہ ہوتا تو میں شہر جا کر آگے ضرور پڑھتی۔'' امیرن نے ہاتھ میں

پکڑا کجریلے کا برتن چارپائی پر رکھ دیا تھا۔

''اچھا ہے جو آگے نہیں پڑھ سکی پھر تیرا جوڑ ملنا مشکل ہو جاتا۔''

نادر نے بس یوں ہی مذاق میں یہ بات کہہ دی تھی مگر امیرن نے اسے کچھ اور طرح لیا۔ (پھر تیرا جوڑ ملنا مشکل ہو جاتا) تو گویا اب مشکل نہیں ہے۔ وہ نظر جھکا کر اب صرف اس کے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ سر سے پیر تک نکھرا دھلا دھلایا نادر کب سے اس کے دل کی مسند پر براجمان تھا۔ یہ تو وہ بھی نہیں جانتی تھی بس جیسے ہوش سنبھالتے ہی اس نے نادر کو اپنے دل میں پایا تھا۔

''پتا ہے امیرن! چوہدری صاحب کی بھتیجی زینب بھی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہوئی ہے۔''

''ہاں تو جب باقی سب رشتے دار آ رہے ہیں تو اس پر کوئی پابندی ہے کیا؟''

''یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ میں تو یہ بتانے لگا تھا کہ اس لڑکی کے حسن کے بڑے چرچے سن رکھے تھے میں نے اور کل اسے دیکھ کر پلک جھپکنا بھول گیا۔''

''ایسے مت کہو نادر! خوب صورت چہرے تو بس دھوکا ہوتے ہیں اور دھوکے کو دیکھ کر راہ چھوڑ بیٹھنے والے عقل مند نہیں کہلا سکتے۔''

''حسن جادو ہوتا ہے امیرن! اور جادو سے کون بچ سکا ہے۔ سچ کہتا ہوں تھکن کے باوجود میں تو رات کو سو نہیں سکا۔''

امیرن کچھ نہیں بولی۔ سر جھکا لیا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' نادر کی وہ خالہ زاد تو تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں دوست بھی تھے۔

''میں سوچ رہی ہوں۔ خوب صورت قد بت والے تو خدا کا کمال ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا تو کوئی دخل نہیں مگر پھر بھی یہ کتنا اتراتے ہیں اور ایک ایسی چیز پر جس میں ان کا کوئی کمال نہیں۔ اس پر غرور کرتے ہیں۔'' ''اچھا میں تیرا فلسفہ سننے رک نہیں سکتا۔ دیر ہو رہی ہے مجھے بس یہ کجریلا کھانا پڑے گا اور پھر نکل کھڑا ہوں گا۔''

بارات شام کو آنا تھی۔ اتنی سویرے تو ابھی کل رات کی تقریب کی افراتفری ہی ہر سو نظر آ رہی تھی۔ گھر کے سب افراد سو رہے تھے۔ ملازم البتہ سونے جاگنے کی درمیانی کیفیت میں تھے اور شاید بلاوے کے منتظر۔ نادر نے جس جس کو آواز دی فوراً چلا آیا۔

''دیکھا ہے۔ گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے تم لوگوں میں احساس ذمہ داری بالکل نہیں ہے' اگر مالک لوگ سو گئے تھے تمہیں تو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے تھا۔ اب یہ کرسیاں' برتن اٹھانا بھی کیا میری ذمہ داری ہے۔'' وہ سب کو ڈانٹ رہا تھا اور تیزی سے ہاتھ چلانے کی تلقین کر رہا تھا۔ ''مالکوں کے اٹھنے سے پہلے گھر چاندی کی طرح چمکتا ہونا چاہیے۔ کیا سوچیں گے مہمان چوہدری صاحب کے کامے اتنے سست اور غیر ذمہ دار ہیں۔''

''او ذمہ دار جی!'' نسوانی آواز اس کی پشت سے ابھری تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ سامنے تھی۔ رات ہی کے لباس میں مٹا مٹا سا سنگھار اور نیند لے کر بھی بوجھل پپوٹے۔ وہ اس وقت بھی حسین تھی اور اس حالت میں

بھی حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ نادر کچھ بول نہیں سکا۔ بس دیکھے گیا۔

''سب سو رہے ہیں۔ نہ کوئی گھر کا آدمی ہے' نہ ملازم موجود ہے اور مجھے بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے۔ کوئی انتظام تو کرواؤ۔''

اس نے نادر کی محویت کا نوٹس نہیں لیا۔ شاید وہ اس انداز کی عادی تھی اور سمجھتی تھی۔ اسے یوں دیکھنا لوگوں کی مجبوری ہے کہ اس کا سراپا ہے ہی فتنہ انگیز۔

''میں ابھی انتظام کروا دیتا ہوں۔ آپ کیا کھانا چاہیں گی۔'' وہ بھوکی ہے اور نادر کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس کی پسند کی ہر چیز اس کے سامنے چن دے۔

''کچھ بھی مل جائے۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی واپس چلی گئی اور نادر کچھ دیر ایسے ہی کھڑا رہا۔ گویا سامنے سے ہٹ کر بھی وہ نگاہ میں تھی۔

''منشی جی! کرسیاں اکٹھی کر کے دیں یا صحن میں لگانی ہیں؟'' دسایا کی آواز اس کے خیالات کا تسلسل توڑ گئی۔ ''تم جا کر عنایتی کو بلاؤ۔ اس سے کہو فوراً اچھا سا ناشتا تیار کرے اور اندر زینت بی بی کو دے کر آئے۔''

''وہ کرسیاں!'' وہ سامنے کہنا چاہا۔

''دفع کرو کرسیوں کو۔ پہلے وہ جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''آج صبح ہی صبح یہاں آتے ہی یہ صورت دیکھ لی ہے۔ دن اچھا کٹے گا۔ خدا کرے۔ بار بار وہ میرے سامنے آئے۔'' اس کے روم روم نے یہ دعا کی تھی اور گھڑی قبولیت کی تھی۔

''کاش میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے خدا سے مانگ لیا ہوتا۔'' جب وہ تیسری بار اپنے بھائی کی تلاش میں باہر آئی تھی تو نادر کو یہ افسوس لگ گیا تھا۔

''زینی بی بی! آپ مجھے بتائیں۔ کوئی کام ہے آپ کو؟'' وہ بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ حالانکہ یہ وہ نادر تھا جس کے غرور کی باتیں گاؤں کی مٹیارنیں بڑے افسوس اور حسرت سے کیا کرتی تھیں۔

''نہیں تم جاؤ کوئی کام نہیں ہے۔'' زینت نے اس پر توجہ نہیں دی۔

''صبح ناشتا تو ٹھیک تھا ناں؟'' وہ پھر پوچھنے لگا۔

''کیوں تم نے بنایا تھا؟'' تیکھے ابرو چڑھا کر وہ مخاطب ہوئی تھی۔

''بنوایا تو میں نے ہی تھا۔'' وہ مسکرانے لگا۔

''اچھا اچھا جاؤ۔ اپنا کام کرو۔'' اس کے لہجے میں مالکوں والا تحکم تھا۔

''کام تو میں کرتا ہی رہتا ہوں' چوہدری صاحب کا خاص آدمی ہوں' دس جماعت تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے میں نے۔'' وہ اسے متوجہ کرنے کو اپنی خوبیاں بتانے لگا تھا۔

''خاک کام کرتے ہو۔'' پھر اسے اپنا بھائی نظر آ گیا اور وہ جملہ پورا کیے بغیر ہی چلی گئی۔

مگر دس پندرہ منٹ کے بعد پھر سامنے تھی۔ ساتھ میں اس کا چھوٹا بھائی تھا اور وہ نادر سے کہہ رہی تھی۔

''اسے شکار کا بہت شوق ہے۔ اب بھی کہہ رہا ہے یہاں قریب ہی جنگل میں خرگوشوں کی بہتات ہے

اور میں انہیں شکار کروں گا۔ تم دھیان رکھنا یہ کہیں نہ جائے۔ ابا جی کو پتا چل گیا تو مار پڑے گی اسے۔''

''جی ٹھیک ہے آپ نے میرے سپرد کر دیا۔ اب بے فکر رہیں۔'' اس نے کام بتایا تھا۔ نادر خوش ہو گیا۔

''نادر! او نادرے! کہاں گم ہو۔ تمہیں پتا ہے' شام کو بارات ہے اور اتنا کام باقی ہے۔ آخر یہ کب ختم ہوگا۔'' آج چوہدری صاحب بات بات پر جھلا رہے تھے۔

''آپ فکر نہ کریں۔ سب مکمل ہو جائے گا۔ بارات کے آنے تک ہر چیز اپنی جگہ پر ہوگی۔ آپ کو کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میں موجود ہوں۔ سب سنبھال لوں گا۔''

اور واقعی اس نے بارات کی آمد سے پہلے سب سیٹ کر لیا تھا۔

ہر طرف سے مطمئن تھا اور اپنی حالت یہ تھی کہ صبح جو دھلے صاف ستھرے کپڑے پہن کر آیا تھا۔ اب دھول مٹی میں اٹ گئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور چہرے پر تھکن تھی۔ کام میں مصروف اسے تو دوپہر کو کھانا کھانے کا خیال ہی نہیں رہا۔ پانی تک نہیں پیا تھا اس نے۔ بس ایک ہی دھن تھی چوہدری صاحب اعتماد کرتے ہیں، اسی لیے سب کچھ میرے سپرد کیا ہے۔ مجھے ان کے اعتماد پر پورا اترنا چاہیے۔ شادی زمینوں جائیدادوں والوں کی تھی اور اپنے ہم پلہ لوگوں میں تھی۔ دولت کا اظہار دونوں جانب سے خوب ہو رہا تھا۔ ادھر جہیز میں دنیا کی ہر نعمت اکٹھی کرنے کی کوشش کی گئی تھی تو ادھر سے بری کے نام پر سونا چڑھایا گیا تھا۔ گاؤں کی کم حیثیت عورتیں اتنا زیور' اتنے قیمتی کپڑے پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبا لیتی تھیں اور دل میں یہ حسرت ابھرتی تھی۔ کاش یہ سب کچھ ہمارے پاس بھی ہو۔

ناہید کو آج اس کی بھابھیاں دلہن بنا رہی تھیں۔ وہ کچھ ایسی خوب صورت تو نہیں تھی مگر جگر جگر کرتے زیور نے اسے حسین بنا دیا تھا۔ وہ شہزادی لگ رہی تھی۔

''تمہارا بیاہ کب ہوگا زینت؟'' اس کی رشتے کی بھابھی مسکرا کر چھیڑ رہی تھی۔

''میرے جوڑ کا کوئی ہوگا تو بیاہنے آئے گا ناں۔'' وہ جانتی تھی' بھابھی اپنے چھوٹے بھائی کے لیے اسے چاہتی ہے' اسی لیے جلانے کو ابرو چڑھا کر ایسا جواب دیا تھا۔

''اتنے بڑے بول نہیں بولتے۔ لڑکیوں کا نصیب تو پانی پر لکھا جاتا ہے۔ بیٹی چاہے امیر کی ہو یا غریب کی۔ گھر کے مردوں کی عزت' آبرو اور ضرورت پر قربان ہونا ہی اس کا نصیب ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہوگا۔'' زینی نے کندھے اچکا کر گویا اس کی بات کو مٹی میں رول دیا۔

''اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا زینت۔'' اس کے اس انداز پر بھابی جل اٹھی تھی۔ زینت نے پروا نہیں کی۔

خاندان میں کتنے ہی گھر تھے جو اسے اپنانا چاہتے تھے مگر کوئی بھی مرد اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کس کا سپنا ہے' وہ کیا چاہتی ہے۔ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اپنی خواہش اس نے کسی قریبی سہیلی سے بھی نہیں کہی تھی۔ مگر اسے یہ یقین ضرور تھا وہ اپنے خواب کی تعبیر پا لے گی۔

آج بری میں ناہید کے لیے بہت زیور آیا تھا۔ عورتیں رشک بھی کر رہی تھیں۔ ناہید کی قسمت پر اور کچھ حسد میں مبتلا بھی ہو رہی تھیں جبکہ زینت نے یہ بڑے آرام سے دیکھا اور پھر منہ بنا کر بولی تھی۔

''اونہہ! سب کا سب پرانے فیشن کا ہے اگر ایسا زیور پہن کر تم شہر جاؤ گی تو لوگ تمہیں دیکھ کر ہنسیں گے۔''

''مجھے گاؤں میں گاؤں کے لوگوں کے درمیان رہنا ہے، وہاں تو ایسا ہی پسند کیا جاتا ہے۔'' ناہید کو اس کی بات کچھ بری محسوس ہوئی تھی۔

زینت نے جھمکا اٹھا کر ہاتھ پر رکھا پھر ہنس کر اور سر جھٹک کر واپس رکھ دیا۔ گویا صاف ناپسند کیا اور مذاق اڑایا تھا۔

کچھ دیر بعد دولہا کی اندر زنانے میں آمد کا شور اٹھا اور سب لڑکیاں دلہن کو چھوڑ چھاڑ دولہا دیکھنے کو بھاگیں۔

''اچھا ہے صحت مند' قد آور۔ مرد میں یہی دو خوبیاں دیکھی جاتی ہیں۔''

''تمہیں دولہا کیسا لگا زینی؟'' اس کی رائے کی بڑی اہمیت تھی۔ جب بھی کوئی لڑکی اس سے یہ سوال کرتی کہ فلاں چیز تمہیں کیسی لگی تو پیچھے ایک ہی جذبہ ہوتا۔ کاش اب کے وہ تعریف کر دے کچھ تو اس کے معیار پر پورا اترے۔

''تم بتاؤ تم لوگوں کو کیسا لگا؟'' وہ الٹا لڑکیوں کی اس ٹولی سے پوچھنے لگی۔

''اچھا ہے' صحت مند ہے' قد آور اور زمینوں والا ہے۔'' سب نے یہی جواب دیا۔

''ہونہہ شکل دیکھی ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چپٹی ناک۔ اس پر رنگ بھی صاف نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ شہر جائے تو لوگ دیکھتے ہی پہچان جائیں' خالص دیہاتی ہے۔ شہر کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی اس نے۔ پکا پینڈو' ان پڑھ' سب ہی مذاق اڑائیں۔''

''کیوں اس میں مذاق اڑانے والی کون سی بات ہے۔ پینڈو ہونا ہمارا فخر ہے۔ ہم شہر والوں کی طرح چالباز اور جھوٹے نہیں ہیں۔''

سب کو زینت کا یہ تبصرہ برا لگا تھا۔ وہ اس سے دور ہٹ گئیں۔ زینت نے پروا نہیں کی۔ سب دولہا کے گرد جمع تھیں ۔ وہ ذرا الگ تھلگ جگہ پر کرسی رکھ کر بیٹھ گئی اور اپنی ہی کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

''آپ ادھر بیٹھی ہیں بی بی۔!'' نادر کی آواز پر اس کی سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بڑی نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

زینت نے پہلی بار سے پاؤں تک اسے بغور دیکھا ۔ دھول' مٹی کپڑے' گھنے بال بکھرے ہوئے، چہرے پر شدید تھکن مگر اس کی چمکتی آنکھوں میں اور قد و قامت میں ایک کشش اب بھی نمایاں تھی۔

''یہاں بیٹھنے پر پابندی ہے کیا؟'' وہ اپنا لہجہ بدل نہیں سکی۔

''نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ سب لڑکیاں دولہا کے گرد جمع ہیں مگر آپ ادھر بیٹھی ہیں۔''

''میں وہی چیز دیکھا کرتی ہوں جو دیکھنے کے قابل ہو اور یہ دولہا۔'' وہ تمسخر سے ہنسی اور فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''امیر آدمی ہے اور دولت سو عیبوں کو بھی ڈھانپ دیتی ہے۔'' نادر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔'' زینی نے اتنا کہہ کر بات مکمل کی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی گویا اب مزید اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو اور نہ سننا چاہتی ہو۔

''آپ کی سوچ کیا ہے؟'' وہ تو جی جان سے یہ سننے کا منتظر تھا۔

''ایک گلاس پانی تو پلاؤ۔'' زینت نے یہ کہہ کر گویا اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔

اور وہ بھی اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ واقعی بھول ہوئی تھی۔ اسے یاد نہیں رہا تھا زینت چوہدری صاحب کی بھتیجی ہے اور وہ ان کا ملازم۔

اسے پانی لا کر دینا اس کا کام نہیں تھا۔ وہ تو خاص ملازم تھا۔ سب کاموں پر نگران اور چوہدری صاحب کے شہر سے آنے والے پڑھے لکھے مہمانوں کی خاطر مدارات اپنی نگرانی میں کروانے کے علاوہ وہ ان سے بات چیت بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ مگر زینت نے اس سے پانی مانگ کر جیسے اسے اعزاز بخشا تھا۔ وہ فوراً گیا اور ذرا دیر کے بعد پانی لے کر اس کی خدمت میں خاصر ہو گیا۔

گلاس تھامتے ہوئے زینت کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نادانستگی میں ٹکرا گیا اور نادر کے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی اگر وہ فوراً گلاس تھام نہ لیتی تو ضرور گر جاتا۔

وہ پانی پی رہی تھی اور نادر بت بنا اپنے اس ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس سے زینت کا ہاتھ ٹکرا گیا تھا۔

''تم نے بتایا تھا۔ چچا کے خاص آدمی ہو۔'' گلاس دوبارہ اسے تھمانے کے بجائے اس نے ساتھ کی کرسی پر رکھ دیا۔

نادر نے کسی خیال سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

''ہاں اچھی بات ہے۔ چچا میرے ابا جی سے زیادہ عقل مند ہیں اس لیے تم جیسے آدمی کو ملازم رکھ لیا ہے۔''

''مجھ میں ایسی کیا بات ہے بی بی؟'' زینت کے منہ سے اپنی یہ تعریف اس کا دل خوش کر گئی تھی۔

جواب میں کچھ کہنے کے بجائے وہ اٹھی اور ادھر کو چل دی جدھر عورتیں اور لڑکیاں جمع تھیں۔ نادر اس کی نپی تلی چال دیکھنے لگا۔

رات کے آٹھ بجے بارات کی واپسی ہوئی تھی اور نادر کا کام دس بجے ختم ہوا۔ جب وہ اپنے گھر جا رہا تھا تو سارا گاؤں گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ چاند کی شروع کی تاریخیں تھیں۔ ہر سو تاریکی کا راج تھا۔ نادر کا جسم بری طرح تھکا ہوا تھا اگر ساتھ زینت کا خیال نہ ہوتا تو شاید ایک قدم اٹھانا بھی دشوار ہوتا۔

اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی اور پہلی ہی دستک کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ ہاتھ میں لالٹین پکڑے امیرن اس کے سامنے تھی۔

''تم' آج اپنے گھر نہیں گئیں؟'' نادر نے یہ جملہ کہا اور جواب سننے کے لئے رکا نہیں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''میں تمہارے لئے رک گئی تھی۔ مجھے پتا تھا۔ اپنا ہوش بھلا کر تن من سے کام میں جتے رہو گے اور تمہیں

کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا ہوگا۔ صبح کس حلیے میں گئے تھے اور اب کیسے بھوت بنے واپس آئے ہو۔ پانی گرم کرتی ہوں۔ نہالو پھر روٹی کھا کر سو جانا۔''

''پانی گرم نہ کرو۔ میں اتنی دیر انتظار نہیں کرسکتا۔ سخت نیند آ رہی ہے۔ نہا کر فوراً سو جاؤں گا۔''

''تمہارے کپڑے غسل خانے میں ٹنگے ہوئے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں پانی گرم کر لینے دو۔ موسم ٹھنڈا ہے۔ سرد پانی سے مت نہاؤ۔''

مگر نادر نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر کے غسل خانے میں گھس گیا۔

امیرن نے چولہے میں ساری لکڑیاں نہیں بجھائی تھیں۔ کھانا پکانے کے بعد ایک لکڑی جلتی رہنے دی تھی اسے معلوم تھا۔ نادر کو کام کے دوران کھانے پینے کا ہوش بالکل نہیں رہتا اور وہ یہ بھی جانتی تھی۔ نہانے کے فوراً بعد وہ سو جائے گا۔ اس لیے جلدی سے لکڑیاں چولہے میں ڈالیں اور روٹی پکانے لگی۔

جب تک وہ نہا کر آیا یہ روٹیاں پکا چکی تھی۔ ساتھ میں ماش کی دال گوشت تھا اور اب وہ چائے کا پانی چولہے پر رکھ رہی تھی۔ نادر پیڑھی کھینچ کر یہیں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ جب گھر میں داخل ہوا تو صرف تھکن کا احساس تھا مگر اب نہا دھو کر بیٹھا تو بھوک چمک اٹھی تھی۔

''سردی کافی بڑھ گئی تھی۔'' روٹی کی چنگیر اپنی طرف کھینچتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''ہاں اور اسی لیے تم ٹھنڈے پانی سے نہا کر آئے ہو۔''

''چلو اب آگ کے پاس بھی تو بیٹھا ہوں ناں۔''

''شکر ہے آج چوہدری کے ہاں شادی کا ہنگامہ تو ختم ہوا۔ اب تم بھی چین کی نیند سوؤ گے۔''

''ابھی کہاں ختم ہوا ہے کل ساری برادری دولہا کے گاؤں جائے گی۔''

''مگر تم تو برادری میں شامل نہیں ہو۔''

''گاڑی میں ہی چلاؤں گا۔ صبح جائیں گے۔ شام تک واپسی ہوگی۔ وہاں کام تو نہیں ہوں گے مگر امیرن نئے نئے لوگوں سے ملاقات۔ ان میں جو چوہدری صاحب کو پسند آ جائیں اور ان کے کام کے ہوں ان سے بات چیت' یہ بھی کوئی آسان نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ناہید بی بی مکلاوے آئے گی تب بھی بہت کام ہوگا۔''

''یعنی تم ابھی فارغ نہیں ہو؟''

''یہی زندگی ہے امیرن! فارغ رہ کر کیا کرنا ہے۔''

''میں تو جب بھی تمہارے گھر آتی ہوں۔ ماسی یہی کہتی ہے۔ صبح کا نکلا اب تک واپس نہیں پلٹا۔ تھوڑا وقت تو اپنے لیے ہونا چاہیے۔ چوہدری نے تو جیسے تمہیں خرید ہی لیا ہے۔''

''چوہدری نے کیا خریدنا ہے' ہاں مگر اب تو میں بے مول بک گیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اس کا نام زینت ہے۔'' اور چائے کپ کے بجائے امیرن کے ہاتھ پر گر گئی۔ ''سی'' کر کے اس نے

کیتلی چھوڑ دی۔

''کیا کرتی ہو؟ دھیان کدھر تھا۔ ہاتھ جلا لیا ہے۔'' نادر نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ تکلیف کی شدت سے امیرن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پتا نہیں یہ تکلیف گرم چائے نے پہنچائی تھی یا دکھ نادر کی بات کا تھا۔

''نیل لگا لو ورنہ چھالے پڑ جائیں گے۔'' وہ اس کے لیے فکرمند تھا۔

امیرن خاموش تھی۔

''کیا ہوا درد زیادہ ہے؟''

''ہوں۔'' اس نے دھیرے سے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیا۔ ''ابھی انڈے کی سفیدی لگا لیتی ہوں۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہوگا۔''

''تم اتنی لاپروا کب سے ہوگئیں؟ چائے کپ میں ڈالنے کے بجائے ہاتھ پر گرا لی' اب یہ ہاتھ کچھ دنوں کے لیے پانی میں مت ڈالنا۔''

''تم زینت کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' بظاہر وہ بڑے آرام سے یاد دلا رہی تھی۔

''ہاں امیرن! زینت کی بات شروع کروں گا تو ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ وہ کیا ہے' کیسی ہے' میں ساری رات بھی اس کی تعریف کرتا رہوں تو صبح یہی خیال کروں گا کہ کمی رہ گئی ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی میں نے پوری رات اس کی تعریف کی ہے۔''

''کیا حسن ہی سب کچھ ہوتا ہے؟'' امیرن کا دکھ چھلک پڑا تھا مگر زینی کے خیال میں کھوئے ہوئے نادر نے محسوس نہیں کیا' بولا۔

''حسن سب سے بڑی حقیقت ہے' سب سے بڑا سحر ہے اور میں اس سحر میں جکڑا گیا ہوں۔''

''نہیں نادر! سب سے بڑی حقیقت محبت ہے' سب سے بڑا سحر عشق ہے اور عشق و محبت ظاہری حسن کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔ یہ دل ونظر کے قصے ہیں۔ کوئی عام سی صورت' کسی کی ایک ادا ہی اسیر بنا لیتی ہے اور ساری عمر رہائی نہیں ملتی۔''

''تمہاری بات اور ہے امیرن! تم بہت ذہین اور سمجھدار لڑکی ہو۔ تم زندگی کو جس نظر سے دیکھتی ہو وہاں میری رسائی ممکن نہیں ہے۔''

''میں صرف اپنی بات نہیں کر رہی نادر...... ! میں تو ساری دنیا کا چلن بتا رہی ہوں۔ صورت سے پیار' حسن سے محبت' وقتی جذبہ ہوتا ہے مگر جب محبت کسی خوبی سے کی جائے یا دل کسی عام سی صورت کی طرف بھی یوں کھنچنے لگے کہ ہم بے بس ہو جائیں تو پھر یہ جذبہ وقتی نہیں ہوتا۔ سرکشی طوفان کی طرح اٹھتی ہے۔''

''کیا تم نے کبھی محبت کی ہے امیرن؟'' وہ دونوں بچپن سے ایک ساتھ تھے اور بہت بے تکلف تھے ورنہ تو ایسا سوال اس ماحول میں کسی لڑکی سے بھلا ممکن ہی کہاں تھا۔

اس کے سوال پر ایک زخمی سی مسکراہٹ امیرن کے لبوں پر دوڑ گئی۔

''واہ میرے بھولے محبوب! کس معصومیت سے مجھ سے یہ سوال پوچھ رہے ہو۔''

''بتاؤ ناں تم نے کسی کو چاہا ہے؟''

''بھلا میرے آس پاس ہے کوئی اس قابل۔'' وہ ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش میں بولی تھی۔

''اچھا جی۔ تمہیں کوئی اپنے قابل نظر ہی نہیں آتا۔'' نادر نے جیسے برا منایا تھا۔

''میں بڑی خوددار ہوں نادر! اور عشق سب سے پہلے اپنی ذات کو مٹی میں رلنے کا حکم دیتا ہے۔ میں خود کو رول نہیں سکتی۔ مجھے اپنی خودداری بڑی عزیز ہے۔ اگر میں محبت کروں گی تو سب سے چھپاؤں گی۔ اپنی ذات میں جل مروں گی مگر یہ آن اور عزت اس کے قدموں میں نہیں رکھوں گی۔ میں خود کو نہیں رلنے دوں گی نادر! چاہے دل آگ میں جل جل کر راکھ ہو جائے۔''

''ہاں مجھے یقین ہے۔ تم ایسا کر سکتی ہو۔ تم بہت انوکھی عورت ہو' بہت تیکھی' بہت سمجھ دار اور کسی پہیلی کی طرح بھی جسے بوجھنے کی کوشش کرو تو عمر گنوا دو مگر سمجھ نہ سکو۔''

امیرن ہنس دی اور بولی۔ ''اگر کوئی سمجھنے کو آئے گا تو وہ وہی ہوگا جسے مجھ سے بہت دلچسپی ہوگی۔ جو میری خاطر عمر گنوانے کا ارادہ رکھتا ہوگا اور میں اس کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے سارے بھید خود ہی اس پر کھول دوں گی۔''

نادر نے سر دائیں بائیں ہلایا پھر بڑی اپنائیت سے بولا۔ ''تم دوست ہو تم سے ہر بات کہتا ہوں مگر تمہیں سمجھتا نہیں ہوں۔ مگر یقین کرو تمہاری دوستی پر فخر ہے۔'' پھر جیسے کچھ خیال آیا اس کے ہاتھ کو دیکھ کر بولا۔

''تم نے ابھی تک کچھ لگایا نہیں ہے۔ چھالے بن گئے تو بہت مسئلہ ہوگا۔ جاؤ پہلے اس پر کچھ لگالو۔''

''تم بھی سو جاؤ۔ دن بھر کے تھکے ہوئے ہو اب آرام کرو۔''

''اور تم بھی' اتنی رات گئے میرے لیے جاگتی رہی ہو۔ جاؤ اب سو جاؤ۔ صبح تمہیں اپنے گھر بھی جانا ہوگا۔ نیند پوری نہ ہوئی تو تھکی ہوئی رہو گی اور ماسی کہے گی۔ سارا دن میری بیٹی سے کام کرواتے رہے ہیں۔''

''اچھا ایسی ہے تمہاری ماسی۔'' وہ ہنس کر چھیڑنے لگی۔

''نہیں یار! میری ماسی بہت اچھی ہے اور اس کی بیٹی بھی بالکل ماں پر گئی ہے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو اس کی یہ بات امیرن کو خوش کر دیتی مگر آج وہ خوش نہیں ہو سکی۔ دل پر اتنا بوجھ تھا کہ بات کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بس نادر کے بستر پر جانے کی منتظر تھی۔ اس کے بعد اسے یہ برتن سمیٹنے تھے اور پھر اپنے کمرے میں جا کر نصیب کی اس چال پر رونا تھا جو میرے دل میں ہے۔ اس کا دل کہیں اور ہے۔ ربا! تیرے لیے کیا مشکل تھی۔ تو اسے میرا بنا سکتا تھا پھر میرے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیلا؟ ہائے میں تو سب کچھ چپ چپاتے ہار گئی اور لٹنے کے بعد کوئی کس طرح جیتا ہے۔ میرے رب سائیں تو جانتا ہے۔ تو نے امیرن کو کیسا دل دیا ہے۔ تو جانتا ہے تو نے مجھے کیسا بنایا ہے۔ عزت کو جان پر اولیت دینے والی' اپنی رکھوالی کرنے والی اور پتا ہی نہیں چلا کب ذات پاؤں کی دھول بن گئی جسے مجھ جیسی نے چاہا۔ اس نے اپنے قابل ہی نہیں سمجھا۔ کیسا دل ہے اس کا۔ سیرت کو نہیں دیکھا۔ صورت پر مر مٹا۔ محبت کو نہیں سمجھا۔ قدر نہیں کر سکا۔ مول نہیں ڈال سکا۔ اب مجھے ساری عمر اس راز کی حفاظت کرنا ہے کہ میں نے کبھی نادر کو چاہا تھا اور راز کی حفاظت

کتنا مشکل کام ہے۔ کتابیں کہتی ہیں قدیم خزانوں کی حفاظت خطرناک کالے ناگ کرتے ہیں مگر میرا یہ راز سونے چاندی کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے یہ کنواری عورت کا دل ہے جسے کبھی کسی مرد کا اسیر نہیں ہونا چاہیے۔ مگر بات بس کی تھوڑا ہی ہے۔ مجھ جیسی عورت بھی یہ غلطی کر بیٹھی ہے اور اب۔

افسوس اور صدمے کی شدید کیفیت اس پر حاوی تھی۔ نادر سونے کے لیے جا چکا تھا اور وہ سر ہاتھوں میں گرائے ابھی تک یہیں بیٹھی تھی۔ چولہے میں آگ روشن تھی۔ لکڑیوں کے جلنے چٹخنے کی آواز اس کے دل سے مشابہ تھی۔ دل بھی ایسے ہی جل اور چیخ رہا تھا۔ ہاتھ کی تکلیف وہ بھول چکی تھی۔ اس نے ابھی تک کوئی دوا دارو نہیں کیا تھا۔ بار بار یہی سوال سامنے آتا' کیا ہوگا اس دل کا.....؟

☆.....☆.....☆

صبح نادر اپنے معمول کے مطابق بے دار ہوا تھا۔ اسے آج بھی سویرے ہی چوہدری کی حویلی پہنچنا تھا۔ تیار ہو کر چولہے کے پاس آیا تو ماں بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔

''امیرن کہاں ہے اماں؟''

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ لیٹی ہوئی ہے۔ رات ہاتھ بھی جل گیا اس کا اور تم سے اتنا نہ ہوا کہ نیل ہی لگا دیتے۔''

''میں نے کہا تھا اس سے نیل لگالو۔ کہنے لگی فکر نہ کرو لگالوں گی۔''

''وہ اپنا خیال خود کہاں رکھتی ہے۔ تم لگا دیتے تو اچھا تھا۔''

''جاگ رہی ہے؟''

''نہیں کہہ رہی تھی رات نیند نہیں آئی اب تھوڑی دیر نیند لوں گی۔ تم آؤ روٹی کھالو اور سنو۔ کام میں خود کو اس طرح نہ کھپایا کرو کہ خود اپنا ہوش ہی نہ رہے' روٹی وقت پر کھالیا کرو۔''

''ٹھیک ہے اماں.....!'' اس نے ہمیشہ کی طرح اس بات سے مکمل اتفاق کرلیا۔

آج بھی وہ حویلی پہنچا تو وہاں ابھی دن طلوع نہیں ہوا تھا۔ رات بہت کچھ تو وہ سمیٹ کر گیا تھا' جو باقی تھا وہ اپنی نگرانی میں اب ٹھکانے پر رکھوانے لگا۔ شاید آج بھی وہ سب سے پہلے بے دار ہو جائے اور ادھر آ کر مجھے ناشتے کے لیے کہے۔ بار بار نادر کا دھیان اسی کی طرف جاتا تھا۔ ذرا ذرا سی آہٹ پر بھی چونک جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا مگر آج وقت مہربان نہیں ہوا۔ وہ باہر نہیں آئی اور نادر کا انتظار ہی رہا۔

تقریباً سات بجے کے قریب حویلی میں چہل پہل شروع ہوئی۔ بوڑھوں کی کھانسی اور بچوں کے رونے کی آواز نے نیند کا سکوت توڑ دیا اور نادر نے بھی اس سکوت کے ٹوٹنے پر شکر ادا کیا۔ شادی کے گھر سے اس کا تعلق تھا تو صرف ایک ملازم کا مگر ذمہ داری جیسے وہ صرف اور صرف اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ ان سب کو اتنے بجے تک تیار ہو جانا چاہیے پھر روانگی اور پھر واپسی۔ سب ہی کچھ اس نے طے کر رکھا تھا۔

چوہدری صاحب کا بیٹا جمال ادھر سے گزرا تو نادر نے بلا کر سارا پروگرام بتایا۔ وہ شہر میں پڑھتا تھا۔ نادر کا ہم عمر تھا۔ گاؤں میں میٹرک کیا تھا اور دونوں کلاس فیلو رہے تھے۔ اچھے مزاج کا لڑکا تھا۔ سادہ اور سچا۔ نادر

سے دوستی بھی تھی اور اس کی ایمان داری کی قدر بھی کرتا تھا۔ اس کی بات سن کر بولا۔
''تم ٹھیک کہتے ہو نادر! مگر یہاں کسی کو کچھ سمجھانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ برادری کا معاملہ ہے۔ زیادہ زور لگا کر بات کروں گا تو چاچیاں' ماسیاں برا مان جائیں گی۔ بہتر ہے خاموشی سے سب دیکھتے رہو۔ ادھر لڑکے والے بھی ہماری ہی طرح کے وقت کی قدر نہ کرنے والے لوگ ہیں۔
''ہاں یہ بات تو ہے۔'' نادر نے اس سے اتفاق کیا پھر بولا۔ ''لیکن دیر ہوئی تو چوہدری صاحب خفا بھی بہت ہوں گے اور پھر معاملہ مجھ پر آ جائے گا کہ تمہیں ناشتا اپنی نگرانی میں جلدی تیار کروا کر لگوا دینا چاہیے تھا۔''
''ابا جی کی چھوڑ دو۔ وقتی طور پر غصے میں ضرور آ جاتے ہیں مگر وہ تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔''
''یہ تو مہربانی ہے آپ لوگوں کی۔''
''نہیں یہ تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف ہے ورنہ ہمارے ہاں اور بھی تو بہت سے ملازم موجود ہیں۔''
''چھوٹی چوہدری جی! آپ کی اماں جی کہہ رہی ہیں۔ دولہا کے گھر جو مٹھائی لے کر جانی ہے۔ وہ تو منگوالی تھی ناں آپ نے؟''
جمال نے گھبرا کر کر نادر کی طرف دیکھا اور بولا۔
''ایک ہی کام اماں نے میرے سپرد کیا تھا کہ شہر سے مٹھائی کے ٹوکرے منگوالینا۔ مٹھائی ایسی ہو کہ کھانے والے مدتوں یاد رکھیں اور میں بھول گیا۔ اب کیا کریں؟ میں نے تو ابھی ناشتا بھی نہیں کیا۔''
''آپ رہنے دو۔ چھوٹے چوہدری! میں دوکان بتا کر اللہ وسایا کو شہر بھیجتا ہوں۔ اپنی گاڑی لے کر جائے گا اور دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ سب کچھ پسند کے مطابق آ جائے گا۔''
''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم ڈرائیور (اللہ وسایا) کو بھیج دو اور سنو۔ اسے دوکان کا نام اچھی طرح یاد کروا دینا۔ مٹھائی خراب آئی تو اماں بہت بگڑیں گی۔'' ''آپ فکر ہی نہ کرو!''
نادر وسائے کی تلاش میں چل پڑا۔ شکر ہوا کہ وہ اپنے گھر سے آ چکا تھا اور باڑھے کے پاس بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ نادر کی بات سنتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔
''دیکھو۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں یہ مٹھائی لے کر دولہا والوں کے گھر جانا ہے۔'' وہ مزید تاکید کر کے واپس اندر آیا تو چوہدرانی اس کی منتظر کھڑی تھیں۔
''نادر تم سے ضروری بات کرنا تھی۔ گھر میں ایسی افراتفری مچی ہے کہ کسی کام کا ہوش نہیں۔ خیال ہوا تم کہیں نظر آ جاؤ تو یہ کام تمہیں سونپ دوں۔''
''آپ حکم کریں چوہدرانی صاحبہ۔'' اس نے ادب سے کہا۔
''کل اتنے مہمان آئے' ناہید کے لیے تحفے بھی بہت سے لائے۔ وہ سب میں ادھر ناہید کے کمرے میں یوں ہی رکھتی رہی۔ اب آج شام واپسی پر ہم ناہید کو ساتھ لے کر آئیں گے اس کے آنے سے پہلے تم ذرا یہ پیکٹ کھول کر دیکھ لو اور دوسرے کمرے میں رکھوا دو۔ اس کا دولہا بھی ساتھ ہوگا۔ اب ہر شے تو دامادوں کے سامنے نہیں دی جاتی۔ ہم مناسب موقعوں پر ان تحفوں میں سے ناہید کو دیتے رہیں گے۔''

اس نے حیرت سے چوہدرانی کی طرف دیکھا۔ بھلا یہ کام بھی اس کے کرنے والا ہے۔ وہ اس کی حیرت پڑھ کر بولیں۔
''کیا کروں' لڑکیاں بالیاں ہاتھ نہیں لگتیں اور برادری کی عورت کو کہنا ویسے بھی مناسب نہیں۔ ہیں تو سب رشتے کی بہنیں مگر موقع کی متلاشی اگر خدانہ کرے ناہید کو سسرال ایسی ویسی ملی اور ان میں سے جا کر کسی نے کبھی کہہ دیا کہ تحفے اس کے ماں' باپ نے رکھ لیے تھے بعد میں اپنی طرف سے وہی دیتے رہے تو بڑی بدنامی ہوگی۔''
وہ جیسے ان کی بات سمجھ گیا اور سر ہلا کر ناہید بی بی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
گیارہ بجے تک سب لوگوں کا ناشتا مکمل ہوا اور ایک بجے تک بمشکل لوگوں کی تیاری مکمل ہوئی۔ مٹھائی آ چکی تھی اور نادر تسلی بھی کر چکا تھا۔ اس نے گاڑی میں رکھوا دی۔ مہمانوں کی گاڑیاں آہستہ آہستہ حویلی سے نکلنے لگیں۔ آخری گاڑی میں چوہدری صاحب اور ان کی بیوی' چھوٹی بیٹی ثمینہ سوار تھے جبکہ جمال پہلے ہی جا چکا تھا۔
یہ گاڑی نادر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ان کی گاڑی باقی گاڑیوں سے پندرہ بیس منٹ بعد میں روانہ ہوئی تھی۔ راستہ کچا اور گرد آلود تھا۔ کوئی باقاعدہ روڈ دونوں گاؤں کے درمیان نہیں تھی۔ چوہدرانی کو اڑتی گرد آج زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ باقی سب رشتہ داروں سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دولہا والوں کے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے اپنی گاڑیوں کو اچھی طرح صاف کر لیں۔
''وہ بھی اسی ماحول کے رہنے والے ہیں۔ تمہاری گاڑیوں پر مٹی دیکھ کر کچھ خیال نہیں کریں گے۔'' چوہدری صاحب نے ہنستے ہوئے یاد دلایا تھا۔
اس سے پہلے کہ جواب میں وہ کچھ کہتیں گاڑی کو جھٹکا لگا اور وہ بسم اللہ اور رب خیر کہہ کر رہ گئیں۔
''بہت ہی خراب راستہ ہے۔ دھیان سے نادر! آگے نہر کا پل ہے اور اس کے آس پاس کی زمین بڑی نرم ہے۔'' چوہدری صاحب سمجھا رہے تھے۔
''ابا وہ ادھر۔'' ثمینہ نے چیخ کر اشارہ کیا تھا اور سب ہی نے ادھر دیکھا۔
پل کے قریب نیچے ایک کھڈ میں گاڑی الٹی ہوئی تھی۔ یہاں لمبی گھاس اور جنگل بیلوں کی بہتات تھی مگر وہ گاڑی واضح دکھائی دے رہی تھی۔
''یہ تو بھائی فیض رسول کی گاڑی ہے۔''
چوہدری صاحب کا یہ کہنا تھا کہ نادر کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کسی کے کچھ کہنے سے پہلے جھٹکے سے دروازہ کھول کر وہ اترا اور اس راستے پر دوڑنے لگا۔ راستے میں آئی بیلوں اور گھاس کی رکاوٹ کو ہٹاتا وہ جلد ہی اس گاڑی تک پہنچ گیا اور فیض صاحب کو آوازیں دیں۔ گاڑی میں موجود چاروں افراد بے ہوش تھے۔

☆......☆......☆

ہسپتال کے مخصوص سرد اور جامد ماحول میں وہ سب بھی جیسے اپنی اپنی جگہ وسوسوں میں گھرے پتھر کے بت تھے۔ دل کی دھڑکنیں منتشر' خیالات پریشان، جب وسواس زیادہ ستاتے تو بے اختیار لب کراہ اٹھتے۔

فیض صاحب اور ان کی بیوی کو جلد ہی ہوش آ گیا۔ ڈرائیور بے ہوش تھا مگر ڈاکٹر اس کی حالت تسلی بخش قرار دیتے تھے جبکہ زینت کو زیادہ چوٹیں لگی تھیں اور سب سے زیادہ فکر اسی کی طرف سے تھی۔

اور آج نادر کو اپنی محبت کی گہرائی کا اندازہ ہوا تھا۔ چوٹ اسے آئی اور بدن پھوڑا بن کر اس کا دکھ رہا تھا۔ بے چینی اور گھبراہٹ نے اسے بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور بند ہونٹوں سے دعا کرتے کرتے وہ بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔

''زینت' زینت......!'' اس کے چاروں طرف اس کا ہی نام اور اسی کی صورت تھی۔

''ہائے یہ کیا ہوگیا۔ ہم تو خوشیوں کے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ کیا پتا تھا تقدیر میں یہ بھی لکھا ہے۔''

چوہدرانی آنسو صاف کرتیں اور دل کی بات خود کو کہہ ڈالتیں مگر آواز اتنی آہستہ اور لفظ ٹوٹے پھوٹے۔

''وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں فون کر دیتا ہوں۔'' چوہدری صاحب کو اچانک خیال آیا تھا۔

''اماں! زینت باجی ٹھیک تو ہو جائے گی ناں؟'' پروین نے دل میں آتے وہم سے گھبرا کر ماں سے سوال کیا تھا۔

''ہاں وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' اس کی بات پر نادر ایکدم سے بول اٹھا تھا۔ اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی' ایسا چہرہ اتنی جلدی ڈوب نہیں سکتا۔ ابھی اسے فنا نہیں ہونا چاند بن کر چمکنا ہے اور دلوں پر حکومت کرنا ہے۔

چوہدری صاحب نے فون کیا اور کچھ ہی دیر بعد یہاں ہسپتال میں برادری والوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ وہ سب زینت کے اپنے تھے مگر شاید اس کے لیے اتنا فکر مند کوئی نہیں ہوگا جتنا نادر تھا۔ وہ خاموش اداس سب سے ذرا ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ نہ تو انہیں دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا پھر قریب آ کر کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''تم پروین اور چوہدرانی کو لے کر گاؤں چلے جاؤ۔''

''جی' مگر چوہدری صاحب......!'' وہ انہیں کیسے بتاتا اس کی تو جان سولی پر ٹنگی ہے۔

''یہاں بہت سے لوگ ہیں اور ویسے بھی خدا کا شکر ہے۔ بھائی' بھابھی' ڈرائیور سب کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ رب نے چاہا تو زینت بھی جلد ہی ہوش میں آ جائے گی۔ تم ان دونوں کو لے جاؤ چوہدرانی ایسے ماحول میں گھبرا جاتی ہے۔ پروین بھی ابھی بچی ہے۔''

وہ زیادہ اصرار نہیں کر سکا۔ چپ چاپ اپنی مرضی کے خلاف وہاں سے چلا آیا۔ دھیان اور دل وہیں چھوڑ آیا۔ راستے میں چوہدرائن پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتی رہیں۔ بار بار دعا کرتی رہیں اور اس سے بھی تسلی کے لفظ چاہتی رہیں مگر وہ اپنے آپ میں ہوتا تو کچھ سنتا۔

گاؤں آ کر وہ اپنے گھر جانے کے بجائے امیرن کے گھر آیا۔ وہ سامنے ہی آنگن میں لگے نل پر کپڑے دھو رہی تھی۔

''ہیں' تم اتنی جلدی واپس آ گئے؟'' اس نے حیرت کا اظہار کیا اور دھلے کپڑوں کی بالٹی اٹھانے کو جھکی۔

''امیرن! اگر کام ختم ہو گیا ہے تو اندر آ کر میری بات سنو۔'' وہ کہتا ہوا سامنے بنے تین کمروں میں سے ایک کی جانب بڑھا۔

''خیر تو ہے ناں؟ پہلے تو آتے ہی ماسی کے بارے میں پوچھا کرتے ہو بلکہ اسے آوازیں دیتے ہی گھر میں داخل ہوتے ہو۔''

''آ' ہاں کہاں ہے ماسی؟'' وہ رک گیا اور پلٹ کر اس سے پوچھنے لگا۔

''اماں گھر پر نہیں ہے' ابا کے ساتھ میرے چاچا کے گھر گئی ہے۔''

''اچھا تم آؤ۔ میری بات سنو۔'' وہ پھر کمرے کی جانب چل پڑا۔

اس کی حالت' گہری سنجیدگی' اترا چہرہ۔ امیرن کو پریشان کر گیا۔ کپڑے تو وہ دھو چکی تھی انہیں پھیلانا باقی تھا۔ یہ کام یوں ہی چھوڑ کر وہ کمرے میں آ گئی۔ دیکھا تو نادر دونوں بازو چہرے پر رکھے چت لیٹا تھا۔ پیر سے جوتے بھی نہیں اتارے تھے اور بے چینی کے عالم میں ایک پیر ہلا رہا تھا۔

''ہاں کہو خیریت؟'' وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی برابر لگے بستر پر آ بیٹھی۔

''امیرن! اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' نادر نے بازو چہرے سے ہٹا دیے اور ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ ''کس کا؟'' وہ سمجھی نہیں۔

''زینت کا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ ابھی تک بے ہوش ہے۔''

''حادثے تو ہوتے رہتے ہیں تم اتنے پریشان کیوں ہو۔'' نادر کی صورت پر نظر پڑی تو دل کو دھکا سا لگا۔ کاش تمہیں اتنی پروا میری ہوتی۔

''میں اس سے محبت کرتا ہوں امیرن! اگر اسے کچھ ہوا تو۔'' نادر نے سر جھٹک کر جیسے اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

''پیسے والے ماں باپ کی بیٹی ہے۔ اس کے علاج پر پانی کی طرح بہائیں گے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔'' دھیرے سے وہ بولی تھی۔

''تم دعا کرو اس کے لیے۔'' فرمائش بڑی مشکل تھی۔ امیرن جھوٹا وعدہ نہیں کر سکی بولی۔

''تم بہت تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں تمہارے لیے۔''

''نہیں تم یہیں میرے سامنے بیٹھی رہو۔ مجھے تسلی دو۔ کوئی دلاسے والی بات کرو امیرن......! میں گھر نہیں گیا۔ شہر سے سیدھا تمہاری طرف آیا ہوں۔ مجھے پتا ہے جیسے تم مجھے تسلی دے سکتی ہو۔ میرا حوصلہ بڑھا سکتی ہو' ایسا اور کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تم سے بات کر کے بہت سکون ملتا ہے۔ تم میری بچپن کی ساتھی ہو۔ میرے مزاج کو سمجھتی ہو۔''

''ہاں میں تمہارے مزاج کو سمجھتی ہوں اور تم......'' وہ رکی پھر سر نفی میں ہلا کر بولی۔

''کوئی کسی کو سمجھنے کا دعوا نہیں کر سکتا۔ دل بڑا گہرا ہے اور ہر چہرہ نقاب میں چھپا ہوا ہے۔ تم زینت سے محبت کرتے ہو۔ تمہارے دل میں اس کے لیے کتنا پیار ہے اور......''

''اور کیا؟'' اور اس کی کیفیت سے بے خبر پوچھ رہا تھا۔

''اور یہ کہ اپنا خیال رکھو۔ خود کو سنبھالو۔ خواب اتنے اونچے مت دیکھو۔''

''یہ بس کی بات نہیں ہوا کرتی امیرن......!'' اس نے اسے سمجھایا جو خود بھی یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

''اتنا اچھا' اتنا بھرپور جوان اس عشق کے پیچھے خوار ہو گیا۔ رل گیا۔'' امیرن نے آہ بھر کر اسے سر سے پیر تلک انتہائی دکھ سے دیکھتے ہوئے جیسے بین کیا تھا۔

''ایسے مت کہو' مجھے بددعا مت دو۔'' وہ اس کے انداز پر تڑپ کر منت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

''یقین کرو نادر! مجھے تمہارے مٹ جانے پر' یوں رل جانے پر بڑا دکھ ہے۔ تم اور ہم اس ذات برادری سے تعلق رکھتے ہیں جسے یہ چوہدری لوگ نیچ ذات کہتے ہیں۔ تم نے نیچ ذات ہونے کے باوجود اپنی تعلیم کی وجہ سے' اپنی ذہانت کی وجہ سے عزت بنائی تھی اور میں اس پر بڑا فخر کرتی تھی مگر زینت سے محبت کر کے جو ذلت تم نے مول لی ہے۔ یہ میرے لیے بڑی تکلیف کی بات ہے۔ نادر! کاش تم اس محبت میں گرفتار نہ ہوتے۔''

''میں نے کہا ہے ناں' مجھے بددعا مت دو۔ دعا کرو وہ میری اس محبت کی قدر کرے اور مجھے اپنی محبت دے دے۔ باقی دنیا پھر کچھ بھی کہے۔ چوہدری صاحب کتنا ہی ذلیل کریں مجھے پروا نہیں۔ میں تو صرف اس کی آنکھ میں اترنا چاہتا ہوں۔ اس کے دل میں بسنا چاہتا ہوں۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ امیرن! تمہارا کیا خیال ہے یہ بات سچ ہے؟''

''نہیں یہ بالکل جھوٹ ہے' غلط ہے' بکواس ہے۔'' امیرن کا دکھ بول اٹھا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی جسے نادر نے توڑا۔

''وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی تھی۔ میں وہاں سے آنا نہیں چاہتا تھا مگر نوکر ہوں۔ مالک کے حکم پر عمل میری مجبوری ہے۔ میں وہاں سے آ تو گیا ہوں مگر تڑپ رہا ہوں اس کے لیے پتا نہیں اب وہ کس حال میں ہوگی۔''

''تم چائے پی لو پھر حویلی چلے جانا۔ اچھی بری جو بھی خبر ہوئی۔ وہاں آ جائے گی۔''

واقعی اس نے عقل کی بات کی تھی۔ نادر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

امیرن چائے بنانے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک پیالے میں بھاپ اڑاتی چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو نادر اٹھ بیٹھا اور بولا۔

''تم نہیں پیو گی؟''

''نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' ''میرا ساتھ دینے کے لیے ہی پی لو۔''

''تمہارا ساتھ دینے کو تو میں ہر وقت تیار ہوں۔'' اس کا انداز بالکل سادہ سا تھا جس کے دوسرے معنی نکالے ہی نہیں جا سکتے تھے۔

''امیرن! یہ کتابیں کس کی ہیں؟'' اس نے چھوٹی سی میز پر رکھی کتابوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میری ہیں۔ میں نے سوچا فارغ بیٹھ کر کیا کرنا' آگے پڑھ لیتی ہوں پھر شہر جا کر امتحان دے دوں گی۔''

''پہلے ہی اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی ہو اور پڑھ گئیں تو مصیبت بن جاؤ گی سب کے لیے۔''

''نہیں جس کا دل خود مصیبت زدہ ہو' وہ دوسروں کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔''

''برا مانا ہے میری بات کا؟ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا پھر تم یہاں کے ماحول سے باغی ہو جاؤ گی۔ شہر جانا چاہو گی کوئی کم عقل دیہاتی تمہیں خاوند کے روپ میں قبول نہیں ہوگا۔ تم خود بھی خوش نہیں رہ سکو گی۔''

''میں اب بھی خوش۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی اور بات بدل کر بولی۔ ''تعلیم کی زیادتی' کمی سے غم' خوشی کا کیا تعلق؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے میں پڑھنا چھوڑ دوں مگر کسی اونچی جگہ عشق کر لوں اور دن رات روؤں' چیخوں' چلاؤں' نہ مروں' نہ جیوں۔''

نادر نے ایک نظر اس پر ڈالی بولا کچھ نہیں۔

چائے پیتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ کہتا چلا گیا۔ ''سلیم آئے تو میرے گھر پیغام بھیج دینا۔ میں حویلی جا رہا ہوں۔ رات کو بھی گھر نہیں جاؤں گا۔''

اس کے جانے کے بعد امیرن اس بستر پر بیٹھ گئی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے وہ لیٹا اور پھر چائے پینے بیٹھا تھا۔ اس کے بدن کی گرمی ابھی یہاں موجود تھی اور چائے کا وہ پیالہ جس میں نادر نے چائے پی تھی۔ ہاتھ میں لے لیا۔ اس میں ابھی تھوڑی سی چائے باقی تھی۔ امیرن نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور کسی تبرک کی طرح وہ گھونٹ اپنے اندر اتار لیا۔

''واہ رے دل تیری کارستانیاں۔ تباہ کر کے رکھ دیا امیرن کو' رول رہا ہے نادر کو' کیا ملے گا۔ بول تجھے کیا ملے گا۔'' وہ آنسوؤں کے ساتھ رونے لگی۔

محبوب کا دل اس کی یاد سے آباد نہیں۔ اس کی سوچ میں امیرن کا کہیں کوئی دخل نہیں۔ وہ تو آج جتنے بھی آنسو بہا لیتی کم تھا پھر یہیں بیٹھے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک پندار کی حفاظت کی تھی۔ وہ بڑی ہی حساس اور انا پرست لڑکی رہی تھی۔ دو بھائی تھے اور اس نے ہمیشہ دونوں کی برابری کی تھی۔ ماں' باپ کو کبھی کسی معاملے میں دھاندلی نہیں کرنے دی۔ بھائیوں کے مقابلے میں اپنے حقوق کی حفاظت کرتی آئی تھی اور اب تو گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ گاؤں کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی۔ بس یہ طے ہے چاہت دل میں ہی رہے گی۔ نادر کو کبھی نہیں بتاؤں گی۔ میں تم پر مرمٹی تھی۔ میں لکھ سے لکھ ہوئی تھی۔ بس میں نے قسم کھائی یہ راز اب راز ہی رہے گا۔ تمہیں زینت نہیں ملے گی اگر وہ تم سے محبت بھی کرنے لگے تب بھی چوہدری ذات برادری سے باہر شادی نہیں کریں گے۔ بیٹی کو قتل کر دیں گے۔ ناکام لوٹو گے تم مگر میرا راز' راز ہی رہے گا' تم پر کبھی نہیں کھولوں گی۔ امیرن کا دل اتنا بے قیمت' ایسا بے مول نہیں ہے نادر! اور میں نے ہمیشہ اپنی آن کی حفاظت کی ہے۔

وہ رات اگر نادر کے لیے بڑی لمبی' سیاہ اور ڈنگ مارتی ہوئی تھی کہ زینت کی خبر نہیں ملی تھی تو امیرن کے

لیے بھی کسی ہوک کی طرح تھی۔ ایک مسلسل عذاب' ایک نہ سہی جانے والی دکھن کی طرح۔ وہ ساری رات جاگی تھی اور اس کا تکیہ بار بار آنسوؤں سے بھیگا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے رب سے شکوہ کیا تھا۔

''تو نے حسن بانٹتے ہوئے نا انصافی سے کام کیوں لیا؟ اور یہ بھی کہ تو نے مرد کو اتنا حسن پرست کیوں بنایا۔''

امیرن بدصورت نہیں تھی۔ وہ گندمی رنگت والی بھرپور جوان لڑکی بالکل گندم کی پکی فصل کی طرح سنہری اور خوشبو دیتی ہوئی' مگر زینت تو گلاب کا پھول تھی۔ تر و تازہ' نرم و نازک' مہکتا' مسکراتا ہوا شوخ پھول۔ فرصت میں بنایا گیا شاہکار۔

آخر یہ لمبی رات ختم ہوئی۔ صبح نادر شہر پہنچا تو پتا چلا زینت کو رات ہی ہوش آ گیا تھا۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی مگر اسے بہت دن ہسپتال میں رہنا تھا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ میں ادھر شہر میں ہی رہوں گا۔ دن رات ہسپتال میں بی بی کی خدمت کروں گا۔''

''نہیں ہمارے اپنے ملازم کیا کم ہیں۔'' زینت کے باپ نے رعونت سے کہا تھا اور اسے سر جھکا کر خاموشی سے یہ بات سننا پڑی تھی۔

''نادر ٹھیک کہتا ہے۔ فیض! تمہاری اپنی حالت اچھی نہیں۔ تم گھر جا کر آرام کرو۔ ادھر ہسپتال میں زینت بیٹی کے پاس میں اور میرے ملازم رہیں گے۔ ہر طرح سے بچی کی دیکھ بھال کریں گے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔'' چوہدری صاحب کی بات پر گہرا اطمینان نادر کے دل میں اتر گیا اور بے اختیار انہیں دعا دی۔

زینی کے لیے پرائیویٹ روم لیا گیا تھا۔ اس کی خاص ملازمہ زوہری یہاں اس کی دیکھ بھال کے لیے گاؤں سے آ گئی تھی۔ خاصی تیز طرار' دبلی پتلی اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ نادر کے قدبت کو اس نے بڑی ستائشی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر دھیرے سے بولی تھی۔

''سچ کہوں' تم چوہدری اور جمال چوہدری تمہارا منشی لگتا ہے۔'' منہ پر ہاتھ رکھا اور کھی کھی ہنس پڑی۔

''بی بی کا خیال رکھنا۔'' نادر بہت فکر مند تھا۔ اس کی بات مکمل طور پر نظر انداز کر کے کہا تھا۔

''ظاہر ہے یہاں خیال رکھنے کے لیے ہی آئی ہوں۔'' وہ دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کر ایک بار پھر اسے نظروں میں رکھ کر بولی تھی۔ ''وہ ٹھیک تو ہیں۔ باتیں کرتی ہیں تم سے؟''

''مجھ سے کون باتیں کر سکتا ہے۔ جہاں میں موجود ہوں وہاں پھر میں ہی بولتی ہوں۔''

''اتنا بولنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔'' نادر کو اس سے الجھن ہونے لگی تھی۔

''اچھی بری سے تمہیں کیا لینا دینا۔ بس یہ میری عادت ہے تم نے کون سا میری ڈولی لے کر جانی ہے جو تمہارے لیے خود کو بدلوں۔''

زوہری ان لڑکیوں میں سے تھی جو غریب کے گھر میں بنا کسی خواہش کے آ جاتی ہیں۔ بچپن ہی سے چوہدریوں' ملکوں' وڈیروں کی حویلیوں میں پہنچ جاتی ہیں اور ان پیسوں والوں کے جوان' نوجوان اور بوڑھے سب ہی ان سے چھیڑ چھاڑ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ انہیں وقت سے پہلے جوان اور بے باک بنا دیتے ہیں۔ ایسی

ملازمائیں نادر کے گاؤں میں بھی تھیں مگر وہ اس کے مزاج کو سمجھتی تھیں۔ اس لیے ایسی کوئی بات کرنے سے گریز کرتی تھیں یا شاید مزاجاً زوہری کچھ زیادہ ہی شوخ و بے باک تھی۔

''تمہاری کوئی بات نہیں ہوئی بی بی سے؟''

''تم بڑے پریشان ہو میری بی بی کے لیے۔''

''چوہدرائن نے کہا تھا اچھی طرح معلوم کر کے آنا۔''

''او اچھا' میں سمجھی دوسروں کی طرح تم بھی ہماری بی بی کا حسن دیکھ کر پھسل گئے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''تم اگر کم ہنسو' بولو تو اچھی لڑکی ہو سکتی ہو۔''

''مجھے اچھی لڑکی بن کر بھلا کیا کرنا ہے۔ میں جیسی ہوں ٹھیک ہوں۔ مست ملنگ بلکہ ملنگی۔'' اپنی ہر بات کا مزا بھرپور لیتی تھی۔ منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا تو قریب سے گزرتے اسٹاف نے اسے بغور دیکھا۔

''تم مجھے بھی باتیں سنواؤ گی۔ خبردار اب جو ہنسیں۔''

''اچھا میں اندر ہوں بی بی کے پاس ویسے اگر چاہو تو تم بھی حال پوچھنے اندر آ سکتے ہو۔''

''ہاں ٹھیک ہے میں خود بات کر لیتا ہوں۔'' اس کی دلی مراد بر آئی۔

''ٹھہرو۔ پہلے میں دیکھ لوں وہ جاگ تو رہی ہے۔''

زوہری اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے بھی آنے کا اشارہ کیا۔

وہ کمرے میں آیا سامنے بیڈ پر زینی لیٹی ہوئی تھی۔ خاصی کمزور اور تھکی ہوئی اداس۔

''کیا حال ہے بی بی؟'' اس کی حالت پر نادر کا دل کٹ کے رہ گیا۔

''ٹھیک ہوں۔ ان لوگوں سے پوچھو مجھے گھر کب جانے دیں گے؟''

''آپ ٹھیک تو ہو لو پھر گھر بھی چلی جانا۔''

''یہی تو کہہ رہی ہوں۔ ان سے پوچھو۔ میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' اب کے اس نے کچھ جھلا کر کہا تھا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں جلد ہی چھٹی مل جائے گی۔''

''بس میں ٹھیک ہو کر گھر پہنچ جاؤں اس ڈرائیور کی تو چھٹی کرواتی ہوں۔ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت ڈال دی ہے اس نے۔''

''بی بی سیب کھاؤ گی؟'' زوہری نے بغیر کسی جذبے کے بس یوں ہی ادھر ادھر دیکھتے پوچھ لیا تھا۔

''بکواس مت کرو' جب میں نے کھانا ہوگا۔ خود بتا دوں گی۔'' وہ اس پر الٹ پڑی تھی۔

''توبہ جی توبہ۔'' زوہری نے اپنے گال پیٹتے ہوئے کہا تھا۔

''کمرہ خالی کر دیں ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔'' اسٹاف نے آ کر کہا نادر اٹھنے لگا تو زینت نے روک دیا۔

''نہیں تم ادھر ہی رہو' کھل کر بات تو کرو ان ڈاکٹروں سے۔ آخر کب تک میں یہاں پڑی رہوں گی۔

زوہری! تم باہر چلی جاؤ۔''

''ٹھیک ہے جی' زوہری کی تو قسمت میں ہی دربدری ہے۔ تھوڑا پڑھ لکھ لیتی۔ صورت شکل کی طرح سوہنی ہوتی تو کوئی بات بھی بنتی۔'' وہ اپنی بے قابو زبان کے جوہر دکھاتی باہر چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر کمرے میں آ گیا۔ جوان بالکل فریش اور ڈیسنٹ سا بندہ۔ زینت نے بہت غور اور دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''جی اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟'' چہرے کی طرح انداز میں بھی اپنائیت اور نرمی تھی۔ آواز میں شائستگی اور خوبصورتی تھی۔

زینت تو اتنی متاثر ہوئی کہ اپنی تکلیف بتانا بھول گئی۔ کیا خواب حقیقت بن سکتے ہیں وہ حیران ہو کر ایک ٹک ڈاکٹر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''یہ جلد ہی گھر جانا چاہتی ہیں ڈاکٹر صاحب......!'' نادر نے بتایا تب زینت بول اٹھی۔

''نہیں ایسی بھی جلدی نہیں بس میں چاہتی ہوں۔ جسم کے کسی بھی حصے پر زخم کا کوئی نشان رہ نہ جائے۔''

''فکر نہ کریں آپ کے علاج پر ہم پوری توجہ دیں گے۔ یہی ہمارا فرض ہے اور رہی نشان کی بات تو انشاءاللہ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ کوئی نشان باقی نہیں رہے گا۔ اپنا خیال آپ خود بھی رکھیں۔ خوش رہیں' کھائیں پئیں اور اچھی باتیں سوچیں۔''

وہ چیک کر چکا تھا واپس پلٹنے لگا تو زینت نے پکارا۔

''آپ پھر کب آئیں گے ڈاکٹر؟''

''آپ کیوں اتنا گھبرا رہی ہیں۔ یہاں چوبیس گھنٹے ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں۔ آپ جب ضرورت پڑے بلوا سکتی ہیں۔'' ''ڈاکٹر صاحب یہ صحت یاب تو ہو رہی ہیں ناں؟'' نادر نے پوچھا تھا۔

''آپ ان کے کون ہیں؟'' ڈاکٹر نے کچھ شوخی سے سوال کیا۔

''یہ میرا ملازم ہے۔'' زینت نے جواب دینے میں بہت جلدی کی۔ ڈاکٹر نے حیرت سے ایک بار پھر نادر کو دیکھا وہ ملازم تو نہیں لگتا تھا اور پھر مریضہ کے لیے اس کا اضطراب' ڈاکٹر تو کچھ اور ہی سمجھا تھا۔

''ہم کھاتے پیتے زمیندار ہیں ڈاکٹر صاحب! ہمارے ملازموں میں پڑھے لکھے' ان پڑھ ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔'' زینت نے اپنا رعب جمانے کو بظاہر بڑی بے نیازی سے بتایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کچھ نہیں کہا' وہ جلدی میں تھا اسے ابھی اور بھی بہت سے مریضوں کو چیک کرنا تھا۔

''تم اب باہر جاؤ۔ زوہری کو بھیج دو۔ اس سے کہو مجھے جوس کا ایک گلاس دے دے۔'' ڈاکٹر کے آنے کے بعد زینت کا مزاج خاصا بدل گیا تھا۔ پہلے والی بے زاری اور بے چینی اب مفقود تھی۔

چوہدری صاحب تو ہسپتال میں کوئی دوسرا ملازم چھوڑنا چاہتے تھے مگر نادر نے سمجھا لیا تھا۔ ''معاملہ شریکے کا ہے۔ آپ کے بھائی اور بھابی گھر جا چکے ہیں مگر ایکسیڈنٹ کے اثرات ابھی موجود ہیں۔ وہ بیٹی کو

دیکھنے ہسپتال نہیں آ سکتے۔ زینت کے بڑے اور اکلوتے بھائی کو اور بھی کئی مصروفیات تھیں پھر گاؤں میں ماں باپ کی دیکھ بھال اسے اور اس کی بیوی کو ہی کرنا تھیں۔ زینت کی تیمارداری کا سارا بوجھ چوہدری صاحب پر تھا۔ اب اگر یہاں کوئی جاہل ملازمہ بھیج دی جائے وہ غفلت برتے تو بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ ساری برادری یہی کہے گی چوہدری صاحب نے بھتیجی کا خیال نہیں رکھا۔''

نادر کی بات انہیں خاصی معقول لگی تھی اور اب اس کے نتیجے میں وہ دن رات یہیں پر گزار رہا تھا۔ ڈاکٹر ساجد روزانہ ہی چیک اپ کے لیے آتا تھا اور ایسے میں زینی زوہری کو باہر بھیج دیا کرتی نادر تو رہتا ہی اس کے کمرے کے آس پاس تھا۔ اندر جانے کے لیے تو کسی بہانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

زینت کی صحت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا تین چار روز تک وہ گھر جا سکے گی پھر اسے ہر دوسرے تیسرے دن صرف چیک اپ کے لیے آنا پڑے گا۔ یہ خبر زینت کے لیے کچھ خوش کن نہیں تھی۔ اب اسے ہسپتال کے ماحول میں گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی کہ دل جو یہاں پر لگ گیا تھا اور نادر بھی یہ سوچ رہا تھا' وہ صحت یاب ہو کر اپنے گاؤں واپس چلی جائے گی پھر ملنے کی' اسے دیکھنے اور دل کو سکون پہنچانے کی کیا صورت ہو گی۔

اس کی چاہت اب زینت اور زوہری سے ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی اور زینت نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ ایسا تو وہ کئی سالوں سے دیکھتی آ رہی تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک جاتے اور کتنے ہی جوان اس کے عشق میں مبتلا تھے' چلو ایک اور بھی سہی مگر یہ بھی نہیں کہ وہ ان عاشقوں سے مکمل طور پر بے نیاز تھی۔ انہیں حسن اپنی بارگاہ میں جھکے سر دیکھ کر ہی خوشی اور طمانیت محسوس کرتا ہے اور نادر جیسا عاشق تو اس کے عاشقوں میں سے اور کوئی بھی نہیں تھا۔

''نادر! تم ادھر ہمارے گاؤں بھی آیا کرنا۔'' زینت نے خود یہ بات کر کے اس کی مشکل تو آسان کی ہی اس کے دل کو ایک خوش فہمی بھی بخش دی تھی۔

دواؤں کا پیکٹ اسے تھما کر وہ سرشاری کے عالم میں کمرے سے باہر نکلا تھا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہو گا جب زوہری کی آواز نے اسے روک لیا۔ وہ رک گیا اور یہیں کھڑا پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

زوہری تیز قدم اٹھاتی اس کے قریب آ گئی۔

''نادر! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم کو میں بڑا عقل والا سمجھی تھی مگر تم بھی ویسے ہی نکلے جیسے دوسرے مرد ہوتے ہیں۔'' ''کیا مطلب؟'' اسے زوہری بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔

''اب بھی قدم پیچھے ہٹا لو ورنہ رونا پڑے گا۔ زینت بی بی اپنے حسن پر مغرور' بڑی سخت مزاج کی عورت ہے۔''

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' نادر نے سختی سے کہا تھا۔

''میں اپنے کام سے ہی کام رکھتی آئی ہوں۔ آج سے پہلے بھی میں نے کسی سے ایسی بات نہیں کی ہے۔ تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔'' وہ کندھے اچکا کر واپس ہو گئی۔

نادر نے اس کی بات پر سوچنا گوارا نہیں کیا وہ تو اس وقت سرشاری کے عالم میں تھا۔ زینت نے اس سے کہا تھا تم مجھ سے ملنے میرے گاؤں' میرے گھر بھی آ سکتے ہو۔ یہ معمولی بات تو نہ تھی وہ بظاہر انجان بنتی ہے مگر اس کی چاہت کی پہچان اسے بھی ہے اور یقیناً وہ بھی اپنے دل میں اس کے لیے جگہ رکھتی ہے ورنہ اسے اپنے گھر آنے کو کیوں کہتی۔ شاید یہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ ایسی ترنگ کب محسوس کی تھی۔ دل کی دھڑکن آج کیسی خوشگوار تھی اور وہ سب سے پہلے یہ خوش خبری امیرن کو سنانا چاہتا تھا۔ آج شام اسے گاؤں جانا تھا اور شام ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اب جب گاؤں جاؤں گا تو امیرن کو زینت کے بارے میں کیا کچھ بتاؤں گا اور کن لفظوں میں اس کی تعریف کروں گا۔

☆......☆......☆

وہ جس وقت اپنے ابا اور اماں سے مل کر ماسی کے گھر کی طرف جارہا تھا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ماسی کے گھر سے دھواں اٹھتا اور پتا دیتا تھا کہ امیرن اس وقت شام کی روٹی پکا رہی ہے۔ چلو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ وہ باورچی خانے میں چولہے کے پاس اکیلی بیٹھی ہوگی۔ میں بھی وہیں بیٹھ جاؤں گا اور ساری باتیں وہیں چولہے کے پاس بیٹھے ہوں گی۔

"نادر پتر! بڑے دنوں کے بعد شکل دکھائی ہے تم نے' جب بھی تمہاری ماں کی طرف گئی۔ اس بے چاری کو تمہارے لیے پریشان ہی دیکھا۔ کہتی ہے پہلے چوہدری کا ملازم تھا اب اس کا سارا خاندان ہی اپنے کام لینے لگا ہے اور غلط تو نہیں کہتی فاطمہ۔ اتنے ملازم ہیں ان لوگوں کے اور اس لڑکی کی خبر گیری کو رہ گئے صرف تم۔ نہ رات کا پتا نہ دن کی خبر۔ ہسپتالوں میں تو ویسے بھی بندہ صحت مند ہو تب بھی بیمار پڑ جاتا ہے۔ تم نے کیسے اتنے دن گزار لیے۔ اب چوہدری سے کہو کسی اور کو بھیجے وہاں پر ویسے بھی تیرا کام ان لوگوں کی خاطر خدمت تھوڑا ہی ہے۔ تجھے تو چوہدری نے زمینوں کے حساب کتاب کے لیے رکھا تھا۔ تنخواہ دیتی ہے اتنی ہی اور کام سارے جہان کا لیتا ہے۔" خالہ تو بھری بیٹھی تھی اس کی نہیں سنی اپنی کہتی چلی گئی۔

"تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں ماسی! مگر بات کچھ ایسی ہوئی کہ مجھے ہی جانا پڑا۔ چوہدری صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ انہیں میں نے خود ہی کہا تھا۔"

"ہاں تمہاری ہی مت ماری جاتی ہے۔ دوسروں کے پیچھے جان کھپاتے ہو۔ کتنے کمزور ہو رہے ہو۔ وہاں اس کی خاطر داریوں میں لگے رہے ہوگے۔ خود تو روٹی بھی وقت پر نہیں کھائی ہوگی۔ ماں صدقے اتنا ظلم نہ کر اپنی ذات پر اور یہ بات پلے باندھ لے یہ پیسے والے کبھی کسی کا احسان نہیں مانا کرتے۔ شکر گزار نہیں ہوتے۔ بس یہی کہیں گے۔ خدمت کی تو کیا ہوا۔ اس کے بدلے پیسے بھی تو لیتا ہے۔"

"میں نے کسی کو احسان مند کرنے کے لیے تو یہ سب نہیں کیا ماسی .....!"

"تو بھولا ہے۔ پڑھ لکھ کے بھی دنیا کو سمجھ نہیں سکتا۔ نہ خوار کر ان کے پیچھے خود کو بس اتنا ہی کام کیا کر جتنی تجھے تنخواہ ملتی ہے۔" "اچھا ماسی! میری توبہ آئندہ بس زمینوں کا حساب کتاب اور بس۔" وہ ہنس پڑا تھا۔

"چل رہنے دے۔ بھلا میں جانتی نہیں ہوں تجھے۔ پہلے بھی تو سمجھاتی رہی ہوں۔ تیری ماں بھی اتنا سر

کھپاتی ہے۔ پر کرتا تو وہی ہے جو تیرے دل میں سماتی ہے۔ ہم بول بول کے خود ہی تھک جاتی ہیں اور صبر کر کے بیٹھ جاتی ہیں اور تمہارا ابا وہ بھی تمہیں کچھ نہیں کہتا وہ سمجھائے تو تمہیں ماننی ہی پڑے۔ ماں اور ماسی کی بات تو تمہیں عقل کی لگتی ہی نہیں۔"

"او نہیں ماسی! تم ناراض نہ ہو' یہ بتاؤ امیرن کہاں ہے؟ میری آواز سن کر اب تک تو اسے سامنے آ جانا چاہیے تھا۔ لگتا ہے گھر پر نہیں ہے۔ میں تو اس سے بہت سی باتیں کرنے آیا تھا۔"

"گھر ہی ہے اس نے کہاں جانا ہے۔ بھائی شہر گیا تو کتابیں منگوالی ہیں۔ اب یا تو گھر کے کام کرتی ہے یا پڑھتی رہتی ہے۔ کہیں آنا جانا تو سمجھو ختم ہی کر دیا ہے اس نے۔ لاکھ سمجھاتی ہوں کیا کرے گی اتنا پڑھ کر۔ عورت کے لیے زیادہ تعلیم اچھی نہیں ہوتی مگر یہ لڑکی بھی تیری طرح خود کو بڑا اعقل مند سمجھتی ہے۔ نہ میری مانتی ہے' نہ اپنے بھائی اور بھائیوں کی سنتی ہے بلکہ میں تو کہوں گی باپ نے ہی سر چڑھا رکھا ہے۔ لاکھ مرتبہ کہا لڑکی ذات کو اتنا پیار نہیں دیتے مگر اس کا باپ میری کوئی سنے تب ناں۔"

"او ماسی! آج تو تم بہت دکھی لگ رہی ہو۔"

"ارے نہیں پتر دکھ کیسا' بس یہ تو میری گھر گرہستی کی باتیں ہیں جو لے کر بیٹھ گئی۔ باقی بڑا شکر ہے رب سائیں کا۔ ہر طرح سے سکھ' چین ہے۔ وقت بڑے آرام سے کٹ رہا ہے۔"

"کدھر ہے امیرن؟" اس نے سامنے والے کمرے میں جھانکا۔

"ادھر چولہے کے پاس ہے۔ آج پالک گوشت پکا رہی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ ماسی کے گھر دے کر آؤں گی۔ اب تم جاتے ہوئے اپنے گھر لے جانا۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر کچے پکے باورچی خانے کی طرف آ گیا۔ امیرن اس وقت چولہے میں لکڑیاں سیٹ کر رہی تھی۔ ہانڈی پک رہی تھی اور پالک گوشت کی خوشبو بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" نادر نے بڑے خوش کن انداز میں سلام کیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا' سنجیدگی سے سلام کا جواب دیا پھر بولی۔

"تم شہر سے کب آئے ہم تو سمجھے تھے اب زینت کے ساتھ ہی رہو گے۔ وہ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے گاؤں جائے گی تو تم بھی اس کے ساتھ گاؤں چلے جاؤ گے۔"

"اچھا بس' ابھی ابھی ماسی سے ڈانٹ کھا کر آرہا ہوں' اب تم نہ شروع ہو جانا۔ میرے پاس تم سے کرنے کو بہت سی باتیں ہیں اور میں گاؤں آتے ہی تم سے ملنے کو بے چین تھا۔"

"کیا ہوا زینت نے بھی تم سے محبت کر لی ہوگی؟" امیرن اب بھی سنجیدہ تھی۔

"خدا وہ دن بھی لائے اور ایک بات بتا دوں۔ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ یہ کیسا جذبہ ہے میں وضاحت نہیں کر سکتا۔ تم کیا جانو امیرن جب محبت ہو جاتی ہے تو پھر حال کیسا ہوتا ہے' دل کیا چاہتا ہے اور سوچ خود بخود ہی محبوب کی ہو جاتی ہے۔"

"ہاں میں کیا جانوں۔" وہ دھیرے سے مسکرائی اور پھر ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر اس میں جھانکنے لگی۔

''اماں کہہ رہی تھی روٹی کھا کر ماسی کی طرف جانا۔ میں نے کہا روٹی کا کیا ہے وہ میں اپنی ماسی کے گھر ہی کھالوں گا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ آج تم میری پسند کی چیز پکا رہی ہو مگر یہ ضرور جانتا ہوں جو بھی پکاتی ہو اچھا ہی پکاتی ہو۔''

کبھی اس طرح کی باتیں امیرن کو سرشار کر دیا کرتی تھیں مگر اب یہ تعریف اسے سلگا گئی تھی۔

''پالک گوشت بنایا ہے ناں۔'' اپنی دانست میں اس نے امیرن کو حیران کیا تھا۔ خیال تھا سر اٹھا کر وہ حیران نظروں سے اسے دیکھے گی اور کہے گی۔ ''تجھے کیسے پتا چلا؟'' مگر اس کا جھکا سر جھکا ہی رہا۔

''کیا بات ہے امیرن' کس سوچ میں گم ہو؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ نادر!'' گہری سانس کھینچ کر اس نے سارے حواس بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔

''سچ بتاؤ تم نے اتنے دنوں میں مجھے یاد کیا تھا۔ پتا ہے۔ میں وہاں ہسپتال میں تھا تو بار بار تمہارا خیال آتا تھا۔'' ''مگر کیوں نادر؟'' وہ واقعی حیران ہوئی تھی۔

''اس لیے کہ تم میری دوست ہو اور میں زینت کی باتیں تم سے کرنا چاہتا تھا۔''

''ہاں یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ پتا نہیں میں نے تم سے یہ سوال کیوں کر دیا۔''

''تم بہت بجھی بجھی سی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔ بس کبھی کبھی زندگی میں ایسا موڑ آتا ہے جب ہر دم ہنسنے مسکرانے والے بھی چپ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''ایک تو تمہاری پڑھائی سے میں بڑا تنگ ہوں۔ پتا نہیں کیسی کیسی کتابیں تمہارے پاس ہیں اور کیا فلسفہ تم بولنے لگی ہو امیرن! تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں ایسی زندگی میں مت جاؤ ورنہ حقیقت کی دنیا تمہارے لئے بہت مشکل ہو جائے گی۔''

''تم سچ کہتے ہو مگر اب وقت گزر چکا ہے۔ زندگی میرے لئے واقعی ایک امتحان بن گئی ہے۔''

''وجہ نہیں بتاؤ گی؟''

''جب خود جان جاؤں گی تو تمہیں بھی بتادوں گی۔'' اس نے ٹال دیا۔

پھر نادر زینی کی باتیں کرنے لگا۔ یہ بھی بتایا۔ ''اس نے کہا ہے تم میرے گاؤں بھی آیا کرنا۔ امیرن میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا بظاہر اتنی مغرور اکھڑ دکھائی دینے والی اس خوبصورت لڑکی کے دل میں بھی میرے لیے کوئی جذبہ بے دار ہو چکا ہے۔''

''اکثر کام ہماری سوچ سے الٹ ہی ہوتے ہیں۔ ہم سوچتے کچھ ہیں' چاہتے کچھ ہیں اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔'' امیرن نے گہری سانس کھینچی تھی۔

''زوہری کہتی ہے۔ میں غلطی پر ہوں مجھے پچھتانا پڑے گا۔''

''وہ ٹھیک کہتی ہے نادر۔'' ''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے' چوہدری لوگ اپنی نازوں کی پالی بیٹی کو کم ذات میں بیاہ دیں گے۔''

''محبت کسی چوہدری' کسی ملک کی تابعدار نہیں ہوتی۔''

''نادر!'' امیرن نے ترحم بھری نظروں سے دیکھ کر بس اتنا ہی کہا۔

''تم دیکھ لینا امیرن میں اسے جیت لوں گا۔''

''چاہے اس کے لئے تمہیں کچھ بھی ہارنا پڑے۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔ کیسی دوست ہو' حوصلہ بڑھانے کے بجائے مایوس کر رہی ہو۔''

''ویسے تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ میں تمہاری دوست ہوں۔''

''اچھا باتیں نہ بناؤ۔ یہ بتاؤ کھانا بننے میں کتنی دیر ہے۔'' اور اس کے بعد موضوع بدل گیا۔

☆......☆......☆

زینت ہسپتال سے گھر منتقل ہو گئی۔ اس کی صحت یابی' چوہدری اور چوہدرائن کی صحت یابی کی خوشی ایک ساتھ ہی منائی گئی۔ صدقہ اتارا گیا اور دیگیں چڑھائی گئیں۔ نادر اور چوہدری صاحب کے گھر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ چوہدری فیض تھے تو ان کے چھوٹے بھائی اور دونوں میں برابر زمین کی تقسیم ہوئی تھی مگر انہوں نے اس زمین پر اکتفا نہیں کیا۔ ساتھ کے گاؤں میں وسیع زمین خریدی اور اس کے علاوہ دوسرے کاروبار میں بھی پیسے لگائے ان کی شان وشوکت بڑے بھائی کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔

''تم نادر ہو؟'' جب وہ چوہدری فیض صاحب کے ہمراہ ان کی حویلی آیا تھا تو چوہدری فیض نے پوچھا تھا۔ یقیناً زینی نے ذکر کیا ہوگا۔ اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

''بڑی خدمت کی ہے تم نے ہماری بیٹی کی۔ زینی تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔ آؤ اندر آجاؤ۔'' اور وہ جیسے ہواؤں میں اڑتا ہوا اندر زنان خانے تک آیا تھا۔

یہاں سے وہاں تک سجاوٹ تھی۔ رنگین قمقمے ماحول کو بہت خوبصورت بنا رہے تھے۔ وسیع لان میں قناتیں لگی ہوئی تھیں اور یہیں صوفے پر اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ زینت بی بی بیٹھی تھی۔ نارنجی رنگ کا سوٹ جس پر دبکے کا بھاری کام تھا۔ قمیص کا گلا خاصا گہرا تھا اور اس کا حسن چھلکا پڑتا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین دکھائی دیتی تھی۔ نادر تو ایسا طلسم میں گرفتار ہوا کہ سلام کرنا بھی بھول گیا۔

''بھابھی! اس نے بڑی خدمت کی ہے میری۔'' زینی کی آواز اسے واپس لے آئی۔

''ہاں یہ بڑے کام کا آدمی ہے'' چوہدری فیض بھی پیچھے ہی موجود تھے اور یہاں موجود بہت سی خواتین اس جوان کو دیکھ رہی تھیں جو اتنے دن زینت بی بی کی خدمت کرتا رہا تھا۔

''کچھ انعام تو دیں! بھاجی اسے۔'' زینی کی بھابھی نے اپنے سسر سے کہا تھا۔

''ہاں' ہاں کیوں نہیں۔''

''یہ لو سو روپے۔ یہ تمہارا انعام ہے'' انہوں نے بڑی بے نیازی سے روپے نکال کر اسے تھما دیے اور یہ کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ انکار نہیں کر سکا۔ زینت کی ماں نے سو کا نوٹ زینت کے سر پر وار کر ہاتھ

میں دیا اور بولی۔
''لو بیٹی تم اپنے ہاتھ سے دے دو۔'' زینت نے یہ روپے ہاتھ میں لئے اور نادر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
''لو یہ رکھ لو۔ بھائی جی اپنے ملازموں میں کپڑے بھی تقسیم کر رہے ہیں۔
''ڈاکٹر ساجد اور ان کی اماں جی آ گئی ہیں زینی بی بی۔!'' زوہری نے آ کر اطلاع دی اور زینی سب کچھ بھول کر اپنی جگہ سے اٹھ کر ساجد کے استقبال کو لپکی۔ دیگر افرادِ خانہ میں بھی ہلچل مچی۔
''کون ہے یہ؟'' کسی عورت نے بھابھی سے پوچھا۔
''بڑا قابل ڈاکٹر ہے اور زینت کہتی ہے اگر وہ ہسپتال میں نہ ہوتا تو کبھی یوں زندہ سلامت گھر نہ آتی۔ اباجی بڑے مشکور ہیں اس کے کہتے تھے آج وہ آئے تو اس کا خاص خیال رکھنا' بہت عزت واحترام دینا۔''
''اوتم ابھی تک یہیں کھڑے ہو' جاؤ مہمانوں کے لیے گرم چائے بھیجو۔'' زینی ایک ادھیڑ عمر خاتون اور ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی کے ساتھ چلی آ رہی تھی اور اس نے نادر کی ابھی تک موجودگی پر حیرت کے ساتھ ساتھ ناگواری کا بھی اظہار کیا تھا۔
وہ تھکے تھکے انداز میں ایک شکوہ بھری نگاہ اس پر ڈال کر پلٹنے لگا تو بولی۔
''اگر تمہیں اس سے زیادہ انعام کی توقع تھی تو اباجی سے مانگ لو۔ وہ اس وقت بہت خوش ہیں' ہزار کہو گے تو ہزار بھی دیں گے۔''
''میرے لیے یہی ہیں زینت بی بی......!'' وہ اتنا کہہ کر پلٹ آیا اور اپنے لیے خوشی اور امید کا ہر دروازہ بھی جیسے بند کر آیا۔
''بہت قابل ڈاکٹر ہے اور فون پر اس نے زینی کے رشتے کی بات دبے لفظوں میں کی بھی تھی۔'' چوہدری فیض اپنے بڑے بھائی کو بتا رہے تھے۔
''مگر ذات برادری؟''
''وہ ہم سے بھی اونچی ذات کا ہے اور زینت کی خوشی بھی اسی میں ہے کہ پڑھے لکھے گھر میں جائے۔ اب قسمت نے یہ موقع دیا ہے تو میں کیوں ضائع کر دوں گا۔''
نادر کو اتنی روشنیوں میں بھی اندھیرا محسوس ہونے لگا تھا۔
''منشی او منشی......!'' زوہری آوازیں دیتی قریب آ گئی تھی۔ ''ایسے کیوں کھڑے ہو' اوہ اب سمجھی تمہارا خواب ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے تو سمجھایا تھا پر تم نہیں سمجھے۔ اچھا ہوا جو تم جلدی ہوش کی دنیا میں آ گئے۔''
''تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ میں ہوش کی دنیا میں آ گیا ہوں۔''
''کیا مطلب' تو پھر ایسے کیوں کھڑے ہو؟''
''محبت کے جواب میں بے رخی ملے دکھ تو ہوتا ہے نا۔ اور زینت بی بی نے تو میرے جذبے کی قدر ہی نہیں کی۔ الٹا مذاق اڑایا ہے۔''

''اپنی بی بی کی تو یہ پرانی عادت ہے۔ تم پہلے نہیں ہو' ان کی زندگی میں تو ایسے کئی آئے اور انہوں نے ٹھوکر سے پرے پھینک دیے۔ تمہارے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔''
''کیا وہ ڈاکٹر کو واقعی پسند کرتی ہے؟'' نادر کی آواز خود اس کے لیے بھی اجنبی ہو رہی تھی۔
''ہاں کسی پڑھے لکھے' اچھے عہدے والے شہری آدمی سے شادی کرنا ہماری بی بی کا خواب تھا' اب انہیں وہ آدمی مل گیا ہے۔ وہ خوش ہیں۔ تم سے میں یہی کہوں گی جاؤ اب بھی نہ آنے کے لیے واپس چلے جاؤ اور اپنی برادری کی کسی لڑکی سے شادی کر لو۔ تم پڑھے لکھے ہو' سوہنے ہو مگر ذات کے تو نوکر ہو۔ نسلوں سے خدمت کرنے والے ہو۔ خواب دیکھتے ہوئے یہی بات یاد رکھنی ہوتی ہے۔''
نادر نے گہری سانس کھینچ کر ہاتھ میں دبے ان دو سو روپوں کی جانب دیکھا اور بولا۔
''محبت صلے کی محتاج تو نہیں ہوتی۔ زینت مجھے چاہے یا نہ چاہے' میری محبت اسی طرح رہے گی۔''
''لو ایک اور بے وقوفی۔'' زوہری منہ بنا کر پلٹ گئی۔
زینت کے گاؤں سے ان کی واپسی رات گئے ہوئی۔ اپنے گاؤں میں داخل ہوئے تو سارا گاؤں سو رہا تھا۔ وہ فوراً امیرن سے ملنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔ صبح کب ہوگی' اسے اندھیرا مار رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سر درد سے پھٹا جاتا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی مگر وہ تنہائی میں نہیں کسی غم گسار کے سامنے رونا چاہتا تھا اور یہ غم گسار امیرن کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ ''میں ماسی کے گھر جا رہا ہوں۔''
''آج ادھر جا کر کیا کرے گا۔ حنیفہ اور امیرن تو گھر نہیں ہوں گی اور مرد بھی کھیتوں پر چلے جائیں گے۔''
''امیرن کہاں گئی ہے؟''
''اس کے چاچے کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ دونوں ماں بیٹی کل دوپہر سے ادھر گئی ہیں۔ شاید آج شام تک واپس آ جائیں۔''
''اس کے چاچے کو بھی آج ہی کچھ ہونا تھا۔'' جھلا کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔
''ہیں، ہیں تجھے اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے، وہ بے چارہ کوئی جانتے بوجھتے بیمار پڑا ہے۔''
''اماں! بس مجھے نہیں پتا۔ میں کیا کہہ رہا ہوں تو مجھے ٹوک نہیں۔''
''ہوا کیا۔ آخر پتا تو چلے۔''
''کچھ نہیں۔'' وہ مزید سوال و جواب سے بچنے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔
سارا دن وہ لوگوں سے بچتا بچاتا ویران جگہوں پر خاموش بیٹھا اپنے اندر کے نوحوں کو سنتا رہا اور شام کو اس دعا کے ساتھ ماسی کے گھر کی جانب قدم اٹھائے کہ خدا کرے امیرن گھر آ گئی ہو۔
دروازہ کھلا تو اور چولہے سے اٹھتا دھواں یہ اعلان کرتا تھا کہ وہ آ چکی ہے۔ کسی اپنے سے دکھ درد کہہ دینے کا وقت قریب آ رہا تھا اور ضبط کی شدت سے اس کے گلے میں درد ہونے لگا تھا۔
گھر میں داخل ہوا تو امیرن صحن میں ہی کھڑی تھی اور اس کے سامنے چارپائی پر چند کپڑوں کے جوڑے پڑے تھے۔ نادر کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''آؤ دیکھو۔ تمہاری چوہدرائن نے بیٹی کی شادی کے بعد اس کے پرانے کپڑے گاؤں کی عورتوں میں بانٹ دیے ہیں۔ یہ تین جوڑے بنا میرے کہے ہی مجھے بھیج کر اپنی طرف سے مہربانی فرمائی ہے مگر نادر! میں یہ اترن نہیں پہنوں گی۔ میرا باپ اور بھائی ان کا دیا نہیں کھاتے۔ جو تھوڑی بہت زمین ہے۔ اس پر محنت کرتے ہیں اور میں پڑھ لکھ کر گاؤں کے اسکول میں استانی لگنا چاہتی ہوں' عزت سے جینا چاہتی ہوں اور عزت کا سبق دینا چاہتی ہوں۔ میں گاؤں کے غریب بچوں کو بتانا چاہتی ہوں۔ آن کیا ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کتنی مشکل مگر بہت ضروری ہے۔''

''امیرن! میں بہت اداس ہوں' صبح سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' اس کی کوئی بات شاید نادر نے سنی ہی نہیں۔ ''تم تو زینت بی بی کے گھر گئے تھے' ہے ناں؟'' اسے یاد آ گیا۔

نادر اسی چارپائی پر بیٹھنے لگا جس پر کپڑے رکھے وہ کھڑی تھی۔

''یہاں نہیں چولہے کے پاس آ جاؤ۔ مجھے کام کرنا ہے۔ تمہاری بات بھی سنتی رہوں گی۔''

اور نادر نے سب بتا دیا۔ اس کی بے رخی' اس کا ظلم' اپنے دل کی حالت اور اپنی محبت کی گہرائی۔

''یہ تو ہونا تھا' آج نہیں تو کل یہ ہو کر رہنا تھا۔ قسمت نے تمہیں دھوکا دیا۔''

''تمہیں کیسے پتا؟''

''بہت پڑھا ہے میں نے اور سارے ذہین لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔''

''غلط کہتے ہیں سب' میں تو مر رہا ہوں' میرا دل جیسے کسی کی مٹھی میں ہے۔'' وہ اس وقت انتہائی مجبور اور بے بس دکھائی دیتا تھا۔

امیرن ادھر ادھر کی باتوں میں اسے بہلانے' دھیان بٹانے کی کوشش کرتی رہی مگر اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔

اور آنے والے دنوں میں اس کی ناکام محبت کا علم بہت سوں کو ہو گیا۔ اس کی حالت جو اعلان کر رہی تھی اب سب اس کھوج میں تھے کہ آخر اس کی محبت کون تھی' لوگ تو بال کی کھال اتارتے ہیں اور تاڑ ہی جاتے ہیں۔ سب کو علم تھا۔ وہ چوہدری کی بھتیجی زینت کی تیمارداری کے لیے کتنے ہی دن شہر کے ہسپتال میں رہا تھا اور زینت کے حسن کے چرچے بھی عام تھے تو یوں کہانی مکمل ہو گئی۔ کڑی سے کڑی مل گئی اور وہ زینت کا ناکام عاشق کہلانے لگا۔

اس کے محبوب کا نام کسی دوسرے کے ساتھ آئے لوگ۔ اس حوالے سے نادر کو پچھانیں یہ امیرن کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ اماں اور ابا چاچا کی طرف گئے تھے۔ بھائی گھر نہیں تھے تب اس نے ایک بچے کو بھیج کر نادر کو بلوا لیا۔ ''یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے۔ جانتے ہو۔ لوگ کتنا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کیا کیا باتیں بنا رہے ہیں۔'' وہ ڈپٹ کر کہہ رہی تھی۔

''کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔'' نادر کو پروا ہی نہیں تھی شاید وہ خوش تھی کہ اس کا اور زینت کا نام ایک ساتھ زبان پر آنے لگا تھا۔

''جب وہ تمہاری نہیں بن سکتی۔ اسے تمہاری پروا نہیں ہے تو پھر یہ بدنامی' یہ رسوائی کیوں؟ تم جانتے ہو بات اگر چوہدری کے کانوں تک پہنچ گئی تو کیا حشر ہو گا تمہارا۔''

''اگر قتل بھی کر دے تو پروا نہیں۔'' انداز ہنوز تھا۔ تھکا تھکا اداس ہر جذبے سے خالی۔ خوب صورت آنکھوں والا نادر اس کے سامنے تھا اور امیرن کا دل اس کو دیکھ کر رو رہا تھا۔ قسم ٹوٹ گئی اور وہ نیچے فرش پر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''کیا تمہاری محبت دنیا سے انوکھی نرالی تھی۔ کیا تم دنیا کے پہلے شخص ہو جسے اپنا محبوب نہیں ملا۔ مجھے دیکھو' میں نے کئی راتیں انگاروں پر گزاری ہیں اور اب بھی کانٹوں کے فرش پر ننگے پیر کھڑی ہوں۔ کبھی کوئی شکوہ کیا' کبھی تم نے میری آنکھ میں آنسو دیکھا ہے' مجھے پاگلوں کی طرح گلیوں میں چکراتے دیکھا ہے تم نے کبھی' بولو نادر! جواب دو۔'' وہ رونے لگی۔

''امیرن! تم' کیا کیا تم بھی۔'' وہ حیران تھا، چونک اٹھا تھا۔ ''کون ہے وہ' کہاں رہتا ہے تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ کیسی دوست ہو تم؟''

اس نے امیرن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے آنسوؤں میں بھیگا اس کا چہرہ اونچا کیا۔

''یہی تو میں پوچھتی ہوں کیسے دوست ہو تم۔ میرے دل کا راز نہیں جان پائے۔ مجھے اپنی محبت کی کہانی سناتے رہے۔ یہ نہیں سوچا ایسے میں میرے دل پر کیا بیتتی ہو گی۔ نادر میں تمہیں چاہتی ہوں' میں تم سے محبت کرتی ہوں' تم زینت کے ہو چکے تھے اور میں نے سوچا اب یہ راز کبھی نہیں کھلے گا۔ میرے ساتھ ہی دفن ہو گا مگر تمہاری حالت نے مجھے قسم توڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں اپنی محبت کو گلیوں میں بھٹکتا' خود سے بے خبر یوں لٹا پٹا نہیں دیکھ سکتی۔ نادر! میں تیری چھایا بننا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے سارے دکھ اپنے نام کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں پرسکون دیکھنا چاہتی ہوں۔ جیسے تم زینت کو چاہتے ہو' ایسے ہی میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں یا شاید اس سے بھی زیادہ کہ میرا دل ایک عورت کا دل ہے جو ایک ہی بار کسی کے لیے دھڑکتا ہے اور جس کے لیے دھڑکتا ہے اسی کی خاطر فنا بھی ہو جاتا ہے۔ تم اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔ میں بدلے میں کچھ نہیں مانگتی۔ بس تم سکھی ہو جاؤ۔ تمہاری یہ حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔''

وہ روئے جا رہی تھی' منتیں کر کر کے ہاتھ جوڑ کے صرف اور صرف دکھ مانگ رہی تھی اور نادر کو اس انکشاف نے حیران کر دیا تھا۔ کیا امیرن اتنی گہری تھی یا پھر وہ اندھا تھا کہ اتنے سال ایک ساتھ رہنے کے باوجود جان ہی نہیں سکا اور اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ امیرن کو کیا جواب دے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ امیرن کے اعتراف نے اس کے اندر دکھ کے کھولتے سمندر کو کچھ ٹھنڈا کر دیا تھا۔ چاہنا خوب صورت ہے مگر چاہے جانا شاید اس سے بڑھ کر ہے۔ یہ اعتماد' فخر اور کبھی کبھی غرور میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اپنی حیثیت کا تعین ہوتا ہے اور یہ احساس بھی کہ ہم کتنے اہم کس قدر قیمتی ہیں۔ امیرن اس کی نظر میں کبھی بھی معمولی لڑکی نہیں رہی تھی' وہ معمولی تھی بھی نہیں۔ گاؤں کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی اور گہری باتیں کرنے والی تھی اور پھر اس کی دوست بھی تو تھی۔ وہ دل کی ہر بات اس سے کہتا چلا آیا تھا۔ آج وہ پڑھی لکھی' سیانی لڑکی اس کے قدموں میں

بیٹھی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ ایک ایک کر کے سارے نقاب اتار گئی تھی' اس کے لیے بلک رہی تھی۔ محبت کا اعتراف تو کرتی تھی مگر اس میں یہ جرات نہیں تھی کہ بدلے میں محبت مانگ لے۔ وہ تو کسی سوالی کی طرح تھی جسے دھتکارے جانے کا ڈر ہوتا ہے اور وہ گڑگڑا کر ہاتھ جوڑ کر یہ کہتا ہے۔

''بابا تمہاری خیر کرے۔ رب تمہیں حیاتی دے۔ میری جھولی میں وہ ڈال دو جو تمہارے کسی کام کا نہیں ہے۔''

امیرن نے دل کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد نادر نے کوئی بات نہیں کی۔ بس وہی اپنی بے بسی اور بے تابی کی داستان سناتی رہی اور پھر اسے اس کی قسمت کا فیصلہ سنائے بغیر نادر خاموشی سے اٹھ کر گھر آ گیا۔ امیرن اسے روک بھی نہیں سکی کہ اب کوئی اختیار تھا ہی کہاں۔ اب اس کی تقدیر نادر کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ڈپٹ کر رعب ڈال کر یا دوستانہ بے تکلفی سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

نادر اگلے روز بھی نہیں آیا اور اس سے اگلے روز بھی نہیں مگر وہ اس کے انتظار میں رہی اور پر امید بھی کہ اسے یقین تھا۔ آخر کار اسے یہیں آنا ہے' گلی میں آتے جاتے بچوں سے اس نے نادر کے بارے میں ضرور پوچھا تھا اور سب نے یہی کہا۔ آج دوسرا دن ہے۔ ہم نے اسے نہیں دیکھا اور چند ایک نے یہ بھی بتایا۔ وہ اپنے گھر میں ہے۔ اس نے گلیوں میں آوارہ پھرنا چھوڑ دیا ہے اور وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی۔

☆......☆......☆

گھر بھر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ ابھی کتابیں کھول کر بیٹھی ہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر کتاب بند کر دی۔ وہ چونک کر مڑی اور نادر کو کھڑا پا کر کچھ کہہ نہیں سکی۔

''بس کرو۔ جتنا پڑھ لیا اتنا کافی ہے۔'' آج لہجہ بدلا ہوا تھا۔ دوستانہ انداز میں' مذاق کے رنگ میں یہ بات نہیں کی تھی بلکہ حکم کا نمایاں رنگ تھا۔

''استانی بننے کا خیال چھوڑ دو۔ جو عورتیں اس طرح کے کاموں میں پڑ جاتی ہیں۔ اپنے گھر بار پر توجہ نہیں رکھ سکتیں۔'' اسی حکمیہ لہجے میں ایک اور جملہ ادا ہوا پھر وہ اس کے سامنے آ بیٹھا۔

''کیا پکایا ہے تم نے؟'' ''چنے کی دال' کھاؤ گے؟''

''ہاں لے آؤ۔'' وہ بستر پر نیم دراز ہو گیا اور امیرن اٹھ کر چولہے کے پاس آ گئی۔

محبت اے محبت۔ کتنا جھکا دیتی ہے تو اور کتنا مجبور بنا دیتی ہے۔ کل تک ہم دوست تھے' برابری کی سطح پر تھے مگر آج میں پہلے اعتراف کر کے عاشق اور وہ معشوق بن گیا ہے' کتنا اچھا کیا رب نے جو اظہار کی طاقت مرد کو سونپ دی اور کبھی جو میری طرح کسی عورت کو اقرار میں پہل کرنا پڑ جاتی ہے تو پھر اسی طرح اسے اپنی سطح سے نیچے آنا پڑتا ہے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ یہ بھی سہی۔ میں نے تو نادر سے اس کے دکھ مانگے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کے سامنے روٹی رکھ کر یہیں دوسرے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔

''سنو۔ میں زینت کو بھول نہیں سکتا۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ اب تمہاری مرضی کہ تم۔'' اس نے کندھے اچکا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں بھئی' اپنی منوانا' شان دکھانا' نخرے کرنا تو مرد کا حق ہے اور عورت کی ناز اٹھوانے کی عمر بڑی

تھوڑی ہوتی ہے۔ بس اتنی ہی جب تک وہ مرد کے اظہار کے بعد اعتراف نہ کر لے مگر امیرن کو یہ تھوڑی سی عمر بھی نہیں ملی کہ اظہار میں پہل اس نے کی تھی۔''

نادر کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا مگر خاموشی' جھکا ہوا سر' ایک ایک حرکت یہ کہتی تھی۔ ہم تمہارے غلام ہیں۔ حکم کے بندے۔ تم جو کہو گے۔ قبول ہو گا۔

''وہ تو بہت خوب صورت عورت ہے۔ دیکھو تو دیکھتے ہی جاؤ۔''

نادر اس کی تعریفیں کرتا چلا گیا اور عورت کبھی سوکن کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی۔ امیرن کے دل پر بھی آرے چلتے رہے۔ وہ التجا آمیز نگاہوں سے نادر کو بار بار دیکھتی رہی۔ یہ نہیں جان پائی کہ اس عورت کے ٹھکرانے کی توہین کا بدلہ وہ امیرن سے لے رہا ہے۔ اسے جلا کر اپنے جذبے کی تسکین کر رہا ہے۔ زینت نے اسے رد کیا تو دکھ کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ستاتا رہا۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا کمی تھی مجھ میں؟ آخر ایک عورت کا ٹھکرا دینا ناقابل برداشت تھا۔ اور اب امیرن نے محبت کا اعتراف کر کے اسے پھر سے عرش پر بٹھا دیا تھا مگر مرد کی فضیلت کے عین مطابق زینت نے جو توہین کی وہ بھولی نہیں تھی اور امیرن کو جلانا' اسے ہر طرح سے آزمانا اور اس پر پابندیاں لگانا' اسے بہت تسکین بخش رہا تھا۔

وہ دن میں ایک بار ضرور ماسی کے گھر آتا اور امیرن پر ہر روز ہی نئے سے نئے اعتراض ہوتے۔ اسے حیرت تھی یہ وہی امیرن ہے جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کیا کرتی تھی اب ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ خاموش رہتی اور اس کی ہر بات سنتی اور سن کر مانتی چلی جاتی۔

''تم بہت بدل گئی ہو۔'' ایک روز جھلا کر اس نے کہا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

''کوئی بات کیا کرو مجھے تمہاری چپ اچھی نہیں لگتی۔''

''تمہیں تو میں بھی اچھی نہیں لگتی۔'' وہ آج شکوہ کر ہی بیٹھی۔

''نہیں خیر' ایسا بھی نہیں۔'' انداز گول مول سا تھا۔

''اور امیرن یہ نہیں کہہ سکی۔ میری ہی بخشی ہوئی محبت نے تمہیں مغرور بنا دیا ہے۔'' کہ آج ہی صبح اماں نے بتایا تھا۔ نادر کی ماں چند روز میں تمہیں نادر کے لئے مانگنے آ رہی ہے اور امیرن تو کیا کوئی بھی عورت بھلا اپنے سرتاج سے ایسی بات کہہ کر ساری عمر کے لئے کانٹوں کا تاج سر پر رکھ سکتی ہے۔ (نہیں یہ بڑا مشکل ہے)

''پرسوں اماں آئے گی تمہاری طرف۔ کہہ رہی تھی بات تو ہم بہنوں نے کب سے طے کر رکھی ہے۔ اب باقاعدہ رشتہ ڈال کر انگوٹھی پہنا دے گی۔''

''کیا تم میری بات سن رہی ہو' امیرن کی خاموشی پر اسے حیرت ہوئی۔ چہرے سے ہی خوشی کا اظہار کر دیتی مگر ایسا کچھ بھی تو نہ تھا۔'' کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''کس بات کی خوشی؟ تم کل بھی زینت کے تھے۔ آج بھی زینت کے ہو اور ہمیشہ اسی کے رہو گے''

''ہاں یہ تو ہے مگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔'' (یہ توہین تھی کہ عورت اس سے نسبت ٹھہرنے پر خوش نہ ہو)۔

''میں نے تم سے صرف تمہارے دکھ مانگے تھے اور کچھ بھی نہیں۔''

''یہ کیا بکواس ہے۔'' وہ جھلا کر واپس چلا گیا اور امیرن کے آنسو دل پر ہی گرتے رہے۔

چند دنوں کے بعد باقاعدہ نسبت ٹھہر گئی۔اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی سونے کی انگوٹھی سے سج گئی جو نادر شہر سے بنوا کر لایا تھا اور جس پر اس نے نام کا پہلا حرف این (N) لکھا تھا۔ خالہ سبز جوڑا لے کر آئی۔کاجل' سرخی' پاؤڈر سب ہی لگا کر بھی تم زینت کے پیروں کے گرد کے برابر بھی نہیں ہو۔

خلاف توقع اس نے یہ نہیں کیا۔بس جانے سے پہلے یہ کہہ کر چلا گیا۔

''صبح چوہدرائن کو سلام کرنے حویلی آ جانا۔''

اور دل نہ چاہنے کے باوجود اسے وہاں جانا پڑا۔ نادر موجود اور اسی کا منتظر تھا۔ اندر زنانے میں پیغام بھجوایا اور امیرن کے ساتھ ہی اندر آیا۔ وہاں زینت اور ڈاکٹر ساجد کو موجود پا کر دونوں ہی ٹھٹکے۔ زینت کا لباس بتاتا تھا۔شادی کو تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے۔

''اوہ نادر! یہ تم ہو۔ ہماری شادی میں کیوں نہیں آئے؟'' زینت نے تمسخر سے نادر کو دیکھ کر کہا تھا۔

''اچھا یہ نادر ہے۔'' ساجد نے زینی کی طرف دیکھا شاید وہ اس بے وقوف عاشق کے بارے میں شوہر کو بتا چکی ہوگی۔ سبکی کا احساس' رقیب سے شکست کا خیال' نادر کے اندر آگ سی بھڑک اٹھی۔

''یہ لڑکی کون ہے؟'' زینت پوچھ رہی تھی۔

''یہ میری منگیتر ہے۔ بچپن سے مجھے چاہتی آئی ہے۔ اب میں نے منگنی کر لی۔'' نادر نے جتایا تھا کہ کوئی اسے بھی چاہ سکتا ہے۔

''اوہو! اچھا چلو اچھا کیا۔'' زینت اور ساجد ہنس پڑے۔

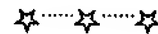
''ایف اے تک پڑھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی پڑھتی رہتی ہے سناؤ ناں کوئی اچھا سا شعر ڈاکٹر صاحب کو۔'' پرائمری پاس زینت کے مقابلے میں امیرن کی یہ خوبی لے آیا تھا۔

''مگر پھر بھی بے وقوف ہے۔'' زینت نے امیرن کی آنکھوں میں دیکھ کر جیسے یہ کہا تھا جسے میں نے چھوڑ دیا۔تم نے سر پر بٹھا لیا۔''

''ارے اتنی تعلیم اور گاؤں کی لڑکی۔'' ڈاکٹر یقیناً متاثر ہوا تھا اور نادر کا سر اونچا ہو گیا تھا۔

مگر امیرن رکی نہیں۔ وہ چوہدرائن کو سلام کیے بغیر ہی واپس ہوئی۔ ناہید بی بی کی شادی کے بعد ان کی کچھ اترنیں چوہدرائن نے اسے بھیجی تھیں۔ وہ جوں کی توں پڑی تھیں اس نے سب کی سب نکال لیں۔ اچھے کپڑے ہیں اور جب سرکا سائیں ان لوگوں کی چھوڑی ہوئی چیز ہے تو پھر ان کپڑوں کو پہننے میں عار کیوں؟

نادر شام کو اس کی طرف آیا تو وہ ان ہی میں سے ایک سوٹ پہنے ہوئے اپنی کتابیں نکال رہی تھی۔ خالی چہرہ، خالی آنکھیں مگر ہر نقش ایک عورت کا نقش تھا۔مشرقی عورت کا نقش' اطاعت' سعادت مندی اور غلامی پسند کرنے والا نقش۔



پچھلے پہر کے سناٹے میں

''کنیز! او کئی پتر کدھر ہو تم؟''

زاہدہ اور اجیت کور کے ساتھ پراندہ بناتی کنیز اس آواز کو سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم دونوں بیٹھو۔ ماما جی آئے ہیں، میں سلام کر کے آتی ہوں۔'' انداز میں عجلت اور خوشی ہلکورے لے رہی تھی۔

کمروں کے پیچھے بنے اس حصے سے نکل کر سامنے والے آنگن میں آئی تو نا صرف ماما جی بلکہ ان کا پیارا سا بیٹا سالار بھی موجود تھے۔

''ہائے سالار بھی آیا ہے، کتنا پیارا لگ رہا ہے۔ سنہرے کھسے پہنے ہوئے۔''

اس نے جھک کر آٹھ سالہ سالار کا منہ چوم لیا۔

''ابا تمہارے لیے سوٹ لائے ہیں۔'' سالار نے بازو اس کی گردن میں ڈال کر اطلاع دی اور وہ یونہی جھکی ہوئی اس کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے اس سے باتیں کرنے لگی۔

''کئی پتر! ادھر آ یہ دیکھ تیری مامی (ممانی) نے تیرے لیے یہ گوٹے والا سوٹ بھیجا ہے۔'' ماما جی نے سوٹ نکال کر اسے پکڑایا۔

''ہائے ماما جی! یہ میرے لیے ہے۔'' رومال میں لپٹا ہرا سوٹ اپنے ساتھ لگائے وہ بے ساختہ چیخ کر خوشی سے کہہ رہی تھی۔

کفایت علی ہنس پڑے اور بہن سے بولے۔

"دیکھا فاطمہ! اس جھلی کو، ایک جوڑے پر اتنی خوش ہو رہی ہے۔ میرا تو جو کچھ ہے اس کے اور سالار کے لیے ہی تو ہے۔"

"بھاجی! آپ کی یہی محبت یہی پیار تو ہے جو اس یتیم کو یتیم ہو کر بھی رانیوں والی زندگی ملی ہے۔"

"یہ میری بیٹی ہے فاطمہ اس کو تو فکر ہی نہ کیا کر۔ تم دیکھنا یہ رانی بن کر ہی راج کرے گی۔"

"مامی کو میرا بڑا بڑا اسلام کہنا۔" کنی جوڑا اٹھا کر سہیلیوں کو دکھانے چل دی۔

"میں بھی آ جاؤں کنی؟" سالار نے پوچھا۔

"ہاں ہاں آ جاؤ۔" وہ اجازت ملتے ہی چارپائی سے اترا اور دوڑ کر کنی کے ساتھ مل گیا۔

"بھاجی! اب کنی بڑی ہو گئی ہے، پندھرواں سال لگ گیا۔ راتوں کی نیند اڑ گئی ہے میری کچھ کریں۔ اس کے لیے ادھر ادھر لڑکا تلاش کریں۔"

"فاطمہ! بھلا یہ بات کہنے کی ضرورت ہے، کنی کا باپ میرا سگا چچا زاد تھا اور تو میری لاڈلی چھوٹی بہن ہے، یہ تو ہوئی ناں پھر میری ہی بیٹی، تجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سارا انتظام میں خود کروں گا۔"

"ذرا جلدی کر لیں بھاجی! جوان لڑکی کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

"او اس کا ماما ابھی زندہ ہے۔ کسی کو اس کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اللہ تمہاری پگ کا شملہ اونچا رکھے بھاجی! بڑی مہربانی ہے تمہاری جو یتیم بھانجی کا اتنا خیال کرتے ہو۔"

"فاطمہ! تو کنی کو یتیم نہ کہا کر میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔"

"بھاجی! میں تمہارے لیے لسی لے کر آتی ہوں تم جوتا اتار کر ٹھیک ہو کر بیٹھو ناں۔" فاطمہ نے بات بدل کر خوشگوار انداز میں کہا۔

"میں ٹھیک ہوں اور تجھے یہ کہنے آیا ہوں کہ ملک کے حالات ٹھیک نہیں۔ مسلمان الگ وطن کا مطالبہ تو کب سے کر رہے تھے۔ پر اب سننے میں آ رہا ہے گورنمنٹ ہار گئی ہے۔ الگ وطن بن جائے گا۔ ہندو اور سکھ بڑے سخت غصے میں ہیں۔ حملے ہو سکتے ہیں۔ تم لوگ ضروری سامان باندھ کر رکھو اگر حالات خراب ہوئے تو پھر میں تم لوگوں کو اپنی طرف لے جاؤں گا۔"

"خیری صلا بھاجی! اپنے گاؤں کے لوگ بہت اچھے ہیں پھر یہاں مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ ہم یہاں محفوظ ہیں۔ آپ ہماری طرف سے بالکل فکر نہ کریں۔"

"گاؤں کے لوگ ابھی تک تو اچھے ہیں پر کل کی خبر نہیں ہے فاطمہ! میں نے سنا ہے سالوں اکٹھے رہنے والے اور وہ جو مسلمانوں کے احسانوں تلے دبے ہوئے جی حضوری کرتے تھے، اب وہ بھی سر اٹھانے لگے ہیں۔ مسلمان نہتے ہیں، سکھ کرپانیں لہراتے پھر رہے ہیں۔ گھروں کو آگ لگانے اور لڑکیاں اٹھانے کی دھمکی دیتے ہیں۔"

"نہیں بھاجی! اپنے پنڈ میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اب بھی اجیت کور ہمارے گھر آئی بیٹھی ہے۔ کنی کی

بڑی پکی سہیلی ہے، اس کی ماں بھی ہمارے گھر آتی رہتی ہے۔ غریب لوگ ہیں، میں مدد کر دیتی ہوں ان کی۔"

پھر ذرا توقف کے بعد فاطمہ بولی۔

"کیا خیال ہے بھاجی! ہمارا گاؤں تو پاکستان میں شامل ہوگا ناں۔"

"بلے وی بلے تجھے تو وطن کا نام بھی معلوم ہے۔" کفایت علی ہنس پڑے پھر بولے۔

"کیوں نہیں اپنا گاؤں تو ضرور پاکستان میں شامل ہوگا۔ کہہ رہے ہیں جو زیادہ آبادی والے علاقے ہیں میرا مطلب ہے مسلمانوں کی آبادی والے۔"

"جی جی بھاجی! میں سمجھ رہی ہوں۔"

"وہ سب پاکستان میں شامل ہوں گے چلو، یہ تو اچھی بات ہے۔ ہمیں ہجرت نہیں کرنا پڑے گی، ویسے فاطمہ یہ الگ وطن کا کھڑاک سمجھ میں نہیں آتا۔ انگریز بادشاہ اتنے تو مہربان...... ہیں ہم پر۔ ذرا سی بات پر خوشی پر لمبی جائیداد دے دیتے ہیں۔"

"نہیں بھاجی جائیداد تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ آخر ہم انگریز کے غلام ہی تو ہیں اور تو اور علاقے کا نمبردار بھی ہندو اور تھانیدار بھی ہندو ہماری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔"

"او پر جب یہ الگ وطن کا شور نہیں پڑا تھا تب تو سب اکٹھے تھے۔ صلح صفائی سے رہتے تھے۔"

"ناں بھاجی میں نہیں مانتی۔ دیکھو ناں اگر سب ٹھیک ہوتا تو شہر کے پڑھے لکھے مسلمان الگ وطن کا شور نہ مچاتے۔ ہم تو جاہل ہیں۔ ہمیں کیا پتا کوئی بات ہوگی، جبھی تو جوان لڑکے گولی کھانے کو سڑکوں پر آ گئے ہیں۔ پردہ دار لڑکیاں جلوس نکالتی ہیں۔"

"تجھے یہ سب کیسے پتا فاطمہ؟" وہ حیران ہوئے۔

"سرداراں کا لڑکا شہر میں پڑھتا ہے جب بھی آتا ہے۔ سب کو اکٹھا بٹھا کر پاکستان کی باتیں کرتا ہے۔"

"ایسے ہی لڑکے آگ بھڑکائیں گے۔ سکھ اور ہندو تو پہلے ہی غصے میں ہیں۔ انہیں چاہیے ہوش کریں۔ سر نیواں کر کے بیٹھ جائیں۔ گورنمنٹ سے بھی معافی مانگ لیں۔"

"ناں بھاجی! آج اگر سر نیچا کر لیا تو پھر کبھی سر اٹھا نہ سکیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان ہمیشہ غلام بن جائیں گے۔ سر کٹ جائے، نیچا نہیں کرنا۔ یہی شان ہے مسلمانوں کی۔"

کفایت علی نے بہن کی باتیں سنیں تو بات بدل دی اور بولے۔

"اس سال فصل کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ ایک دو مینہ پڑ جائے تو بڑا اچھا ہو جائے۔"

"ہاں بھاجی! مینہ کی دعا تو سب ہی مانگ رہے ہیں۔"

"ابا جی! کنی کہتی ہے۔ اب تو بڑے ہو گئے ہو، اسکول میں پڑھنا شروع کر دو۔" سالار آ کر کفایت علی سے کہہ رہا تھا۔

"اوہ میرا پتر!" وہ ہنس پڑے پھر بیٹے کو گود میں بٹھا کر بولے۔ "بھلا زمینداروں کے بیٹے بھی اسکولوں

میں پڑھتے ہیں۔"

"نہیں بھاجی! اب تو مسلمانوں کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ پڑھے لکھے ہوں گے تب ہی اپنا ملک سنبھال سکیں گے۔"

"فاطمہ! تو تو جانتی ہے میرا ایک ہی بیٹا ہے اور کن منتوں مرادوں کے بعد ملا ہے مجھے۔ تیری شادی دو سال بعد ہوئی تھی پھر بھی تیری کنیز سالار سے سات سال بڑی ہے۔ کیا کیا دعائیں، منتیں نہیں، کیں۔ تب کہیں جا کر خدا نے مراد پوری کی ہے۔ بڑا پیار ہے مجھے سالار سے۔ اسے پڑھائی لکھائی کے جھنجھٹ میں نہیں ڈال سکتا۔"

"اچھا بھاجی! تم بیٹھو میں روٹی پانی کا انتظام کرلوں۔ آج تو میرا سالار بھی آیا ہے؟" پھر سالار کو مخاطب کرکے بولی۔ "میرا بیٹا کیا کھائے گا۔ پھوپھو ابھی بنا کر لائے گی۔"

"پھوپھی! مجھے زردہ اچھا لگتا ہے۔" سالار نے جھٹ فرمائش کردی۔ فاطمہ نے اسے گود میں لے کر چوما اور پھر اٹھ کر کھانا بنانے لگی۔

کفایت علی گاؤں کے لوگوں سے ملنے ملانے چلے گئے۔ کنی ماں کا کام میں ہاتھ بٹاتی رہی ساتھ ساتھ سالار سے باتیں کرتی رہی۔ دوپہر کو روٹی کھا کر فاطمہ اور کفایت سوگئے۔ کنی اور سالار جاگتے رہے۔ سالار اسے اپنے دوستوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس عمر کے بچوں کی طرح اپنی بہادری کے کئی چھوٹے قصے سنائے کنی نے ہر قصہ غور سے سنا اور مسکراہٹ دبا کر اس کی بہادری کو خوب سراہا، پھر اس نے کہانی سننے کی فرمائش کردی، کنی اسے شہزادی اور شہزادے کی کہانی سنانے لگی۔

"تم شہزادی ہو اور میں شہزادہ!"

اس نے کنی کے گلے میں بازو ڈال لئے۔ کنی نے ہنس کر اس کے ماتھے پر پیار کرلیا۔

شام کو سالار اور ماماجی واپس اپنے گاؤں چلے گئے، جاتے جاتے ماما نے کہا۔

"تم دونوں تیاری رکھو چند دن کے بعد آؤں گا، پھر تم دونوں کو اپنے گاؤں لے جاؤں گا۔ تیری مامی تو بڑا یاد کرتی ہے تجھے، چند دن ہمارے پاس آ کر رہو، مامی بھی خوش ہوگی اور سالار بھی۔"

کنی کو ماموں کے ہاں جا کر ہمیشہ بہت مزا آتا تھا۔ وہ تو ابھی سے تیاری کرنے لگی۔

☆......☆......☆

"کنی! بانو کی بات پکی ہوگئی ہے۔ بڑا سوہنا ہے اس کا ہونے والا دولہا۔"

زاہدہ نے اسے بتایا وہ فوراً ہی ماں سے اجازت لے کر زاہدہ کے ساتھ بانو کے گھر پہنچی اسے مبارکباد دی اور دیر تک دونوں سہیلی سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔

بانو سے چھوٹی بتا رہی تھی۔ "بہت سوہنا ہے ہمارا ہونے والا بہنوئی۔"

"اپنی بانو بھی تو کسی سے کم نہیں۔" کنی نے اسے گلے لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

اس رات سونے سے پہلے اس نے کئی بار اسے سوچا، وہ جو گھوڑے پر بیٹھ کر آئے گا۔ اور ساتھ میں

ڈولی لائے گا۔ وہ کیسا ہوگا۔ وہ کس دیس سے آئے گا۔ وہی جو لال جوڑا لائے گا کب آئے گا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ سونا چاہتی بھی نہیں تھی۔

تاروں بھرا آسمان، چاند کی شروع کی تاریخیں تھیں۔ ہر سو تاریکی تھی اور اس تاریکی میں آسمان پر چمکتے تارے بڑے نمایاں اور بہت اچھے لگ رہے تھے۔ آج شام بارش ہوئی تھی، موسم خوشگوار تھا۔ آسمان صاف شفاف۔ ماں کمرے میں سو رہی تھی۔ اور وہ دبے پاؤں بستر سے اٹھی تھی اور باہر آ کر کوٹھے پر جاتی کچی سیڑھیوں پر آ بیٹھی تھی۔

ایک توانا مرد کا ہیولہ کبھی پیچھے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں، سامنے نہیں آتا تھا۔ وہ جب چونک کر اس کی جانب دیکھتی تھی تو غائب ہو جاتا تھا۔ کنیز شدید چاہت کے باوجود چہرہ نہیں دیکھ سکی۔

"پتا نہیں وہ کہاں رہتا ہے، شہر میں، گاؤں میں، شاید میرے ہی گاؤں میں۔"

اس خیال سے دل دھڑک اٹھا اگر میرے ہی گاؤں میں تو پھر کون ہوسکتا ہے۔ وہ مسلمان گھرانوں کے لڑکوں کے بارے میں سوچنے لگی پھر شرما گئی اور اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی، اسے اجیت کور یاد آئی جو اسی گاؤں میں رہنے والے گھبر سنگھ کو چاہتی تھی۔ چوری چھپے ملتی تھی۔

اور ان ملاقاتوں کا حال سہیلیوں کو مزے لے لے کر سنایا کرتی تھی۔ اور بینا کماری جو گاؤں کے ایک مسلمان لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ کہتی تھی اس کی خاطر مسلمان ہو جاؤں گی۔ پھر ایک رات وہ مرگئی لوگ کہتے تھے اسے اس کے گھر والوں نے زہر دے کر مار دیا تھا۔

☆......☆......☆

ماماجی کا گاؤں بھی ویسا ہی تھا جیسے سب گاؤں ہوا کرتے ہیں۔ وہی ہری ہری فصلیں، پیپل اور ٹاہلی کے درخت کچے پکے مکان، چھوٹی چھوٹی چند دوکانیں اور تنور پر روٹی لگاتی ماچھنیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر کنی کو ماماجی کا گاؤں اچھا لگتا تھا۔ اس لیے کہ یہاں اس کی ننھیال تھی۔ اس کی ماں یہاں آتے ہوئے بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ اور ماں کو خوش دیکھ کر اس کا دل بھی خوش ہو جاتا تھا۔

"دیکھا اماں! ماماجی کے گاؤں میں اسکول بھی ہے، وہ سالار کو کیوں اسکول میں داخل نہیں کرواتے۔"

"میں نے بھی سمجھایا تھا بھاجی کو، پر وہ کہتے ہیں۔ میرا منتوں مرادوں سے لیا ہوا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ میں اس پر پڑھائی کا بوجھ نہیں ڈال سکتا اور کہتے بھی تو ٹھیک ہیں۔ ایسا ملوک سا تو ہے سالار۔"

"لے اماں! اتنا صحت مند ایسا سرخ سفید تو ہے وہ۔" کنی ہنس پڑی۔

"اچھا چل ہٹ کیسے منہ بھر کے صحت مند کہہ دیا۔ اللہ اسے حیاتی دے، ماں باپ کے دل کی ٹھنڈک ہے، ہنستا کھیلتا رہے، میرے بھاجی کے گھر میں تو اجالا ہی اس کی وجہ سے ہے۔ میرے باپ کی نسل اسی سے تو آگے بڑھے گی۔"

"اوہ اماں تو تو ناراض ہوگئی۔ بھلا ایسا میں نے کیا کہہ دیا سالار کو۔"

فاطمہ مسکرا دی اور بولی۔

"میں ناراض نہیں ہوں۔ بس تو سالار کے لیے ایسے نہ بولا کر نظر لگ جاتی ہے۔ وہ تو ہے بھی بڑا سوہنا۔ میں تو اس کی طرف نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں۔"

باتیں کرتے کرتے وہ ماما جی کے گھر والی گلی میں آ گئیں۔ چوڑی پکی گلی جس کے دونوں طرف چند مکان تھے۔ اس کے بعد کھلا میدان تھا۔ اور آگے جا کر پھر مکانوں کا سلسلہ تھا۔ سالار چند لڑکوں کے ساتھ باہر میدان میں کھیل رہا تھا۔ اس نے فاطمہ اور کنیز کو آتے دیکھا تو کھیل چھوڑ کر ان کی طرف دوڑا اور آ کر پہلے کنی سے لپٹا پھر فاطمہ سے، فاطمہ نے جھک کر اسے گود میں لے لیا اور منہ چومنے لگی۔ مٹی سے اٹے اس کے ہاتھ اور بال اپنی چادر سے صاف کیے اور اسی طرح گود میں اٹھائے گھر میں داخل ہوئی۔ بھابی نے بڑھ کر استقبال کیا۔ کفایت علی اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ نند، بھابی باتیں کرنے لگیں۔ وہ سالار کے ساتھ آ گئی۔ اس نے کنی کو خرگوش کے بچے بھی دکھائے اور بکری بھی۔

"یہ بکری ابا لایا ہے میرے لیے۔ میں نے اس کا نام پتا ہے کیا رکھا ہے۔" وہ بکری کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شوق سے کہہ رہا تھا۔

"کیا رکھا ہے؟" کنی نے پوچھا۔

"کنی۔" وہ پیار بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہائے میں مرگئی۔ تو نے اپنی بکری کا نام کنی رکھ دیا۔" کنیز کی ہنسی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ سالار نے بازو اس کے گلے میں ڈال دیے اور بولا۔

"مجھے تم بھی اچھی لگتی ہو۔ بکری بھی اچھی لگتی ہے۔ بس اسی لیے میں نے اس کا نام کنی رکھ دیا۔"

"چل ہٹ پرے۔" کنیز نے اس کے بازو پیچھے کیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں اچھا نام ہے مگر لڑکیوں کے لیے، بکری کو ایسا نام نہیں دیتے، بس تو فوراً اس کا نام بدل دے۔"

"یہ ناراض ہو جائے گی۔" سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

"لے، دیکھو تو، بکری کی ناراضی کا کتنا خیال ہے اور جو میں ناراض ہو رہی ہوں، میری کوئی پروا ہی نہیں۔ بس میں جا رہی ہوں، اب نہیں بولوں گی تجھ سے۔" وہ جانے لگی۔

سالار راستے میں آ گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "تم نہ جاؤ کنی! مجھے تم بکری سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہو بس اب میں بکری کا نام بدل دوں گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" کنیز نے اس کا نرم پھولا ہوا گال کھینچ کر صلح کا اعلان کیا۔

"کنی اب جوان ہو گئی ہے بھابی! بن باپ کی بچی ہے، مجھے فکر رہتی ہے اس کی طرف سے۔"

"تمہارے گاؤں میں اس کے جوڑ کا کوئی تو ہوگا فاطمہ! تم نام بتاؤ، میں کوشش کروں گی۔"

"نہیں بھابی! اپنے گاؤں میں تو کوئی نہیں، تم جانتی ہو، ہم اچھے زمیندار لوگ ہیں۔ اور ہمارے گاؤں کے تو اکثر لوگ چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ اب میں کسی سبزی والے کسی کمہار، موچی کو تو لڑکی نہیں دے سکتی۔"

"بس تو فکر نہ کر فاطمہ! تو نے مجھ سے کہا تھا میں بھی ادھر ادھر نظر رکھوں گی، جونہی کوئی مناسب رشتہ ملا، تجھے اطلاع دے دوں گی۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے بھابی!"

"لو بھلا فاطمہ! ایسا کیوں کہتی ہے، کنی میری کچھ نہیں لگتی کیا!"

"کیا باتیں ہو رہی ہیں نند بھابی میں!" کفایت علی آ گئے۔

"سلام بھاجی!" فاطمہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے پیڑھے سے اٹھی۔

"کب آئی تو اور کنی کدھر ہے؟"

"کنی، سالار کے ساتھ ہے۔ اپنی بکری دکھانے لے گیا ہے۔ پتا ہے بکری کا نام بھی کنی رکھ چھوڑا ہے اس نے۔" بھابی ہنس کر بتا رہی تھی۔

"ہاں بہت پیار کرتا ہے کنی سے۔" فاطمہ بھی ہنس پڑی۔

"دیکھو تو ماما جی! یہ تمہارا بیٹا مجھے اپنی بکری سے ملاتا ہے۔" کنی نے سلام سے پہلے لاڈ بھرے انداز میں سالار کی شکایت لگائی۔

"سالار بیٹا! پھوپھی کے پاس بھی تو آ، صدقے جاؤں بڑا یاد کرتی ہوں تجھے میں۔" فاطمہ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا، کنی ماما جی سے باتیں کرنے لگی۔

"پھوپھی! اب تم جلدی واپس نہ جانا، ادھر ہی رہو ہمارے پاس۔"

"ہاں فاطمہ! تم ہمیشہ جانے کی جلدی ڈال دیتی ہو، اب کچھ روز تسلی سے رہو۔" بھابی نے بھی بیٹے کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں تو رہ ہی پڑوں۔ پر کنی اپنے گھر سے اداس ہو جاتی ہے۔ جلدی ڈال دیتی ہے۔"

"یہ بھی تو تیرا اپنا ہی گھر ہے پتر!" کفایت علی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے کہا۔ سالار اچھل کر کھڑا ہوا، اور بولا۔

"تم ادھر رہ جاؤ، روز مجھے کہانی سنایا کرنا، میرے خرگوشوں سے کھیلا کرنا اور بکری سے باتیں کرنا۔ میں تمہارے لیے باغ سے کھٹیاں توڑ کر بھی لاؤں گا۔"

"ہاں یہاں کھٹیاں مل جاتی ہیں۔" کنی کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"ہاں قریب ہی باغ ہے۔ بچے چوری چھپے توڑ لاتے ہیں۔"

"چوری کی چیز تو میں نہیں کھاؤں گی۔"

"اچھا پھر میں مالی کو پیسے دے کر لاؤں گا، پھر تو کھاؤ گی نا؟" تب کنی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شام کو وہ چوزوں کو روٹی کے بھورے ڈال رہی تھی۔ تب سالار جھولی میں بہت سے کچے مالٹے (کھٹیاں) لیے آ پہنچا۔ اس کے چہرے پر مسرت تھی اور وہ اسے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟"

"کھٹیاں!" وہ مسکرا کر بولی۔

سالار نے اثبات میں سرہلا دیا اور جھولی اس کے سامنے کر دی وہ کچے مالٹے اٹھانے لگی پھر رک گئی اور بولی۔

"چوری کر کے تو نہیں لائے؟"

"نہیں اللہ کی قسم، میں نے پیسے دے کر لیے ہیں۔"

"اچھا، پیسے کہاں سے لیے؟" اس نے کھٹیاں اٹھاتے ہوئے یونہی روا روی میں پوچھ لیا۔

"پیسے میں نے تارے کی جیب سے نکالے تھے۔"

بچپن کی معصوم شرارت کا عکس اس کے چہرے پر جھلملایا اور اس نے بڑے فخر سے بتایا کنی نے ساری کھٹیاں پھینک دیں اور بولی۔

"ہائے چوری کی تم نے، مسلمان ہو کر چوری کرتے ہو، تمہیں پتا نہیں اللہ پاک کتنا ناراض ہوتا ہے، جاؤ میں نہیں کھاؤں گی یہ چوری کی کھٹیاں۔"

"نہیں نہیں چوری کیوں؟ تارا تو میرا دوست ہے۔"

"دوست ہو یا دشمن پوچھے بغیر کسی کی چیز اٹھاؤ تو چوری ہوتی ہے۔ کتنے پیسے نکالے تھے تم نے؟"

"ایک آنہ!" وہ اب کافی شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ کنی نے دوپٹے کے کونے پر بندھی گرہ کھولی پیسے نکالے اور اسے دیتے ہوئے بولی۔

"یہ دو آنے ہیں۔ ایک تم رکھ لو۔ ایک اپنے دوست کو دے آؤ۔ جب تک تم پیسے دے کر نہیں آؤ گے، میں یہ کھٹیاں نہیں کھاؤں گی۔"

"میں ابھی دے کر آتا ہوں۔" وہ فوراً چلا گیا۔ کنی وہیں بیٹھی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ وہ جلد ہی پیسے دے کر واپس آ گیا اور بولا۔

"اب تو اللہ میاں ناراض نہیں ہے نا مجھ سے۔"

کنیز کو بہت پیار آیا اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور بولی۔

"میرا سوہنا ویر، اب تو تو نے پیسے دے دیے ہیں۔ اب بھلا اللہ کیوں ناراض ہوگا، دیکھ کبھی چوری نہیں کرتے، جھوٹ نہیں بولتے اور لڑائی جھگڑا بھی نہیں کرتے، جو بچہ اچھا ہوتا ہے اس سے سب پیار کرتے ہیں۔"

"میں اب کبھی چوری نہیں کروں گا، جھوٹ تو میں بولتا ہی نہیں، لڑائی جھگڑا بس تب کرتا ہوں، جب کوئی مجھ سے لڑتا ہے۔"

"ہاں جب کوئی لڑے تو پھر بہادری سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ مسلمان اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اور سن سالار تو اسکول کیوں نہیں جاتا؟"

"میرا جی تو کرتا ہے جانے کو، پر ابا نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے تو بس کھیلا کر، بڑا ہوگا تو وائی بیجی کرنا۔ پڑھنے لکھنے سے کیا مل جائے گا۔"

"تیرا دل کرتا ہے ناں، پھر بول ماما جی کو کہ میں تو پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا میں کہوں گا ابا سے!"

☆......☆......☆

ماما جی کے ہاں بہت اچھا وقت گزر رہا تھا۔ اماں اور مامی کام بھی کرتیں اور سر جوڑے جانے کیا کیا باتیں بھی کرتی رہتیں۔ کبھی جو کنی ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتی تو فوراً کہتیں۔

"چل ہٹ یہاں سے۔ تیرے سننے کی باتیں نہیں ہیں۔"

"تو ایسی باتیں کرو ناں جو میرے بھی سننے کی ہوں۔" دونوں ہنس پڑتیں مگر مزا انہیں ان ہی باتوں میں آتا تھا۔ جو کنی کے سننے کی نہیں تھیں، اسے یہاں سے اٹھا کر ہی دم لیتیں۔

وہ پھر سالار کے پاس آ بیٹھتی اور کبھی جو سالار باہر کھیلنے یا ماما جی کے ساتھ کھیتوں پر چلا جاتا تب وہ خرگوش کے بچوں کے پاس آ بیٹھتی۔ کتنے پیارے تھے یہ سفید سفید معصوم سے خرگوش، وہ اکثر سالار کا گال کھینچ کر کہا کرتی تھی۔

"مجھے یہ خرگوش بالکل تمہارے جیسے لگتے ہیں۔"

رات ماما جی کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ روٹی بڑی خاموشی سے کھائی، مامی جی اور اماں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پر انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی جب روٹی کھا کر سالار اور کنیز اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے تب ماما جی نے فاطمہ اور مامی کو سامنے والے بستر پر بیٹھنے کو کہا۔ اور لفظوں کو ترتیب دے کر بولے۔

"ملک کے حالات بہت خراب ہیں فاطمہ! اور ہماری کنی جوان ہے۔ ہمیں جلد از جلد اس کا نکاح کر دینا چاہیے۔"

"مگر بھا جی! ہمارا گاؤں تو پاکستان میں شامل ہوگا۔"

"کوئی پتا نہیں۔ حالات بڑے خراب ہیں۔ مسلمان یہ علاقے چھوڑ کر لاہور کی طرف جا رہے ہیں مگر ہم زمیندار لوگ ہیں۔ ہم تو اپنی زمین کسی صورت میں نہیں چھوڑ سکتے ہمیں تو یہیں رہنا ہے اور ان حالات میں جب کہ مسلمان یہ علاقے چھوڑ رہے ہیں۔ مناسب رشتہ ملنا ناممکن ہے۔"

"تو پھر بھا جی؟" فاطمہ نے بے حد پریشان ہو کر کہا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے مولوی صاحب سے بات بھی کر آیا ہوں۔ کل شام کو کنی کا نکاح ہے سالار کے ساتھ۔"

فاطمہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ جب کہ سالار کی ماں ٹکر ٹکر شوہر کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ یہ کوئی انہونی تو نہیں۔ تجھے یاد نہیں فاطمہ! ہماری اماں جی بھی ابا سے بڑی تھیں۔"

"وہ تو صرف دو سال کا فرق تھا بھا جی!" فاطمہ نے جیسے دہائی دی۔

"یہاں بھی کون سا دس بیس سال کا فرق ہے، صرف پانچ چھ سال ہی بڑے ہیں۔ اور زمینداروں میں

تو ایسی شادیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔خود ہمارے گاؤں میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔''

''پھر بھی بھاجی! کنی اب جوان ہے۔سالار ابھی بچہ ہے۔''

''مرد کو جوان ہوتے کون سی دیر لگتی ہے۔زمیندار کا بیٹا ہے۔بس دو چار سال کی بات ہے۔پھر جوان ہوگا۔تو دل میں کوئی وہم نہ لا فاطمہ! کنی میری بھی بیٹی ہے۔بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے میں نے اور دیکھ نا زمینداروں کے گھروں میں تو ایسی مثالیں عام مل جاتی ہیں۔''

''اس سے تو مجھے بھی انکار نہیں۔''

اب فاطمہ کے دل کو کچھ قرار آ گیا تھا کہ واقعی یہ عام سی بات تھی ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔یہاں تو فرق چھ سال کا تھا۔اکثر ایسا بھی ہوا کہ لڑکی دس سال بڑی ہے، پھر کنیز خوبصورت بھی تھی وہ عام دیہاتی لڑکیوں کی طرح چوڑے جسم کی نہیں تھی۔نہ قد زیادہ لمبا تھا۔نازک سی گورے رنگ کی خوبصورت لڑکی تھی۔زیادہ سے زیادہ پانچ سال، چلو پانچ نہیں تو سات سال پھر سالار جوان ہوگا۔سات سال کم مدت نہیں تھی۔مگر بھائی فیصلہ کر چکا تھا۔فاطمہ نے دل کو تسلی تو دینا تھی۔کفایت علی کہہ رہے تھے۔

''سارے گاؤں کو کہہ آیا ہوں۔حلوائی کو لڈو بنانے کے لیے بھی کہہ دیا ہے۔چھوہارے اور بتاشے بھی آ جائیں گے۔سالار کی ماں تو اپنے بیاہ کا کوئی سوٹ ٹھیک کر کے کنی کو پہنا دینا۔اپنی کوئی انگوٹھی بھی پہنا دینا۔ابھی وقت نہیں۔اس لیے میں نے جوڑے کا کپڑا نہیں لیا۔''

دونوں عورتیں خاموش بیٹھی رہیں۔

کفایت علی سونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔فاطمہ بھی بھاوج سے نگاہ چرا کر خاموشی سے اٹھی اور اپنے بستر کی طرف چل پڑی۔اس نے کنی کی طرف دیکھا کنی اور سالار ساتھ ساتھ کے بستروں پر باتیں کرتے کرتے سو گئے تھے۔کنی کا ہاتھ اس کے سر کے گھنے بالوں میں تھا۔اور سالار نے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔فاطمہ کے دل سے ہوک اٹھی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔اور جا کر بستر پر لیٹ گئی۔سالار کی ماں کفایت علی کے پاس چلی آئی اور سرگوشی میں بولی۔

''ایک ہی بیٹا تھا۔کیوں یہ ظلم توڑا اس معصوم کے ساتھ۔''

''کوئی ظلم نہیں ٹوٹا، چل سو جا چپ کر کے۔''

''یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔میں جانتی ہوں بہن اور بھانجی سے بڑی محبت ہے تجھے۔پر اس محبت پر اکلو ایک بیٹا بھی قربان کر دو گے۔یہ تو کبھی نہ سوچا تھا میں نے۔''

''بیٹا قربان نہیں کیا جا سکتا۔بیٹے پر سے باپ قربان ہو جاتا ہے۔''

''پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟'' بیوی کو بہت گلہ تھا۔

''بے وقوف عورت! جانتی ہے کنی کے باپ کے پاس کتنی زمین تھی؟''

''ہاں وہ بڑا زمیندار تھا۔''

''اور اب وہ ساری زمین کس کے نام ہے؟''

''کنی اور اس کی ماں کے نام۔''

''سالار کے ساتھ کنی کے نکاح کے بعد کس کا حق ہوگا اس پر؟''

''سالار کا۔''

''بس یہی ساری بات ہے، اب بھی سمجھی ہو یا نہیں۔''

''کیا فائدہ ایسی دولت کا بیوی ہی پسند کی نہ ہو۔'' اب سالار کی ماں کے لہجے میں وہ تلخی اور دکھ نہیں تھا بس ہلکی سی شکایت تھی۔

''بیوی پسند کی کیوں نہ ہو۔کنی اچھی لڑکی ہے۔دونوں میں بڑا پیار ہے، اور پھر اگر اس کی بیوی کی حیثیت سے کنی پسند نہ بھی آئی تو بھی فکر کی کیا بات ہے۔مذہب میں چار کی اجازت ہے، دیکھ ناں سالار کی ماں! ہمارے پاس ہے ہی کیا۔زمین کا ذرا سا ٹکڑا۔کنی کی زمینیں اسے مل جائیں گی تو ایک شان بن جائے گی سالار کی۔''

''ہاں سالار کے ابا! میں بھی حیران تھی بھلا تم نے ایسا فیصلہ کیوں کر لیا۔'' اب وہ بالکل مطمئن تھی۔

صبح کفایت علی اس کی بیوی تو معمول کے مطابق دکھائی دے رہے تھے۔مگر فاطمہ کچھ چپ چپ تھی۔

''ہم نے برا نہیں چاہا، اپنی بیٹی سمجھ کر بھلائی کی ہے۔'' کفایت علی بار بار سمجھا رہے تھے۔

''اچھا بھاجی! جو میری بیٹی کی قسمت!''

فاطمہ نے کنی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی، وہ سارا دن سالار کے ساتھ بیلے میں رہی۔گھر میں نکاح کی تیاری ہوتی رہی۔مامی نے اپنی شادی کے جوڑوں میں سے سبز ساٹن کا جوڑا نکالا۔جس کے دوپٹے میں سنہری گوٹا لگا ہوا تھا۔گوٹے کو کالا ہونے سے بچانے کے لیے یہ دوپٹہ کالے کپڑے میں باندھ کر رکھا ہوا تھا۔اس صندوق میں نیم کے بہت سے خشک پتے پڑے ہوئے تھے تاکہ کپڑوں کو کیڑا نہ لگے۔سب سے اچھا سوٹ یہی سبز ساٹن کا تھا، اماں کو بھی جوڑا پسند آیا۔

''دیکھو تو بھابی! شادی کے وقت تم بھی کنی کی طرح دبلی پتلی تھیں یہ سوٹ تو بالکل کنی کو پورا ہوگا۔'' اب فاطمہ کافی حد تک یہ فیصلہ قبول کر چکی تھی اور ہنس بول رہی تھی۔

لڈو تیار ہو گئے حلوائی مبارک بار کے ساتھ دینے آیا اور بنوائی کے علاوہ بھی پیسے وصول کیے۔بتاشے چھوہارے بھی گھر آ چکے تھے اور فاطمہ انہیں پیتل کے تھالوں میں ڈال رہی تھی۔

کنی اور سالار گھر آئے سالار بکری کی طرف چلا گیا۔وہ اندر آئی یہ سب سامان پڑا دیکھا تو حیران ہوئی۔

''یہ سب کیا ہے اماں؟''

''بیٹی! تیرا نکاح ہو رہا ہے۔'' مامی نے گلے لگا کر ماتھا چوما، اس کا دل زور سے دھڑکا۔شرم سے پلکیں جھک گئیں۔وہ وہاں رکی نہیں۔جلدی سے ساتھ والے کمرے میں گھس گئی، اور تکیہ لے کر لیٹ گئی۔سخت شرم آ رہی تھی۔اس وقت وہ کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔دل شور مچا رہا تھا۔کبھی لب آپ ہی آپ مسکرانے

لگتے۔ بھی گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔

"ہائے اللہ! ایکدم سے اتنی جلدی بالکل اچانک کیسے ہوگیا یہ سب؟ رشتہ پکا ہونے سے پہلے لڑکے کے گھر والے لڑکی کو دیکھنے بھی تو آتے ہیں۔" وہ سوچتی رہی، پچھلے دنوں کون کون سی عورتیں آئی تھیں مگر اسے یاد نہیں آیا کہ قابل ذکر تو کوئی بھی نہ تھی۔ وہی روزانہ کی آنے والی تھیں کوئی کمہارن، کوئی تیلن اور ماچھن اور تو کوئی نہیں آئی۔

"ہائے دیکھ تو کنیز کو، کنی ادکی اٹھ ناں نہالے اٹھ کر، شام کو نکاح ہے۔" مامی نے آکر کھیس اس پر سے کھینچ لیا۔ اسے اٹھنا پڑا۔

"پانی میں نے بھر دیا ہے۔ چار پائی کھڑی کرکے نلکے کے پاس آڑھی بھی بنادی ہے۔ تو بال بھی دھولے اور نہا بھی لے۔ اب ذرا دیر بعد ہی عورتیں آنا شروع ہو جائیں گی اور سن نہانے کے بعد بال خشک کرکے آج سر میں ناریل کا تیل لگالینا اور ہاں تیری اماں موتیے کے ہار پرو رہی ہے۔ وہ بالوں میں لگالینا۔ باقی شادو تجھے آکر تیار کردے گی۔"

اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا نہانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، نہانے کے بعد بال خشک کیے پھر اندر آئی، تب مامی اماں سے کہہ رہی تھی۔

"میں ذرا سالار کو تو دیکھوں، وہ کدھر رہ گیا ہے۔ اسے بھی تو تیار کرنا ہے۔"

کنی اندر آئی ماں کو مامی کا سبز جوڑا پکڑے دیکھا۔

"ارے مامی! تو اب اتنی موٹی ہوگئی ہے۔ بھلا یہ جوڑا پورا آئے گا اسے۔" یہی سوچ کر ماں سے بولی۔

"یہ سوٹ کس کے لیے نکالا ہے؟"

"تیرے لیے اور کس کے لیے؟" اماں مسکرائی۔

"میرے لیے۔" اسے اچنبھا ہوا کہ جوڑا تو لڑکے والے لاتے ہیں۔

"ہاں آج تیرا نکاح ہے۔ سالار کے ساتھ بس کل اچانک ہی فیصلہ ہوگیا۔ اب اتنی جلدی میں نہ تو نیا جوڑا بن سکتا ہے نہ زیور۔ اس لیے بھرجائی نے اپنا جوڑا نکالا ہے اور یہ انگوٹھی دیکھ۔ یہ سبز نگ والی انگوٹھی یہ تیری نانی کی ہے۔ اس نے اپنی بہو کو دی تھی۔ اب بھرجائی اپنی بہو کو پہنا رہی ہے۔"

اماں جانے کیا کیا بتاتی رہی اس کے گرد ایک ہی جملہ چکراتا رہا۔ "آج تیرا نکاح ہے سالار کے ساتھ۔"

"تو پریشان ہوگئی ہے دیکھ اس میں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ چند سال کی بات ہے۔ پھر وہ جوان ہو جائے گا۔ وہ تیرے مامے کا بیٹا ہے۔ میرا اپنا بھتیجا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ میری بیٹی میرے بھائی کے گھر جارہی ہے۔ اب زمینداروں کے ہاں رشتے ملنے مشکل ہو رہے ہیں۔ اکثر لڑکے نکے آوارہ ہیں اور ہم برادری سے باہر تو رشتہ کر نہیں سکتے۔ اچھا ہے سالار سے تیرا رشتہ پکا ہوگیا۔"

اماں سمجھاتی رہی، اس کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دیتی رہی، مگر کنی کچھ سن ہی کب رہی تھی۔ اسے لگ

رہا تھا۔ سارے کمرے میں دھواں بھر گیا ہے۔ اس کی ڈولی جل رہی ہے۔ گھوڑی پر سوار سہرہ باندھ کر آنے والا توانا مرد اچانک مر گیا تھا اور اس کی موت کے ساتھ ہی کنی کا دل بھی مر گیا۔

خاموشی سے وہ ماتم کرتی رہی خشک آنکھوں سے روتی رہی۔ اس نے نکاح نامے پر انگوٹھا لگا دیا۔ وہ اور سالار۔ سالار اور وہ اب سالار سے میرا کیا رشتہ ہے۔ اس کا جی چاہا چیخیں مارتی ہوئی جنگلوں میں نکل جائے۔

قریب بیٹھی عورتوں اور لڑکیوں کی افسوس بھری آوازیں۔

"ہائے اتنی موہنی ہے جوانی برباد ہوگئی اس کی۔"

مگر جوں ہی مامی کمری میں آتی عورتیں لفظ بدل دیتیں مامی کو مبارکباد دیتیں اور کہتیں۔

"اتنا زیادہ فرق تو نہیں ہے۔ چند سال کی بات ہے پھر سالار جوان ہوگا۔"

پھر تقریب ختم ہوئی سالار بچوں کے ساتھ کھیلنے گلی میں نکل گیا۔ اس نے کپڑے بدل لئے انگوٹھی فاطمہ نے نہیں اتارنے دی۔ اور اسے انگلی کے گرد یہ چبھن چپ چاپ برداشت کرنا پڑی۔

"اماں صبح ہی اپنے گاؤں واپس چلو۔" اس کی ایک ہی رٹ تھی، کنی کی چپ کو ماموں اور مامی نے بھی محسوس کیا مگر خاموش رہے۔ سالار کو شاید کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔ جب وہ دلہن بنی تب بھی باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا باہر ہی اس نے انگوٹھا لگایا اور کھانا کھایا جب اندر آیا۔ تب وہ لباس تبدیل کرچکی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کنی اس کی دلہن بن چکی ہے۔ معمول کے مطابق کنی کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ یہیں اس کے برابر والے بستر پر لیٹا باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

صبح وہ فاطمہ کے ساتھ واپس اپنے گاؤں آگئی۔ جب ماموں کے گاؤں جارہی تھی کتنی خوش تھی اور اب واپسی پر یوں لگتا تھا ساری خوشیاں کسی نے چرالی ہیں۔ زندگی بھر مسکرا نہ سکے گی۔

"حالات بہت خراب ہیں، فاطمہ بہن! تمہیں چاہئے تھا بھائی کے گاؤں ہی میں رہتیں۔" زاہدہ کے باپ نے سمجھایا تھا۔

"اپنا گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے بھرا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم ماں بیٹی گھر میں اکیلی ہوتی ہو۔ اب تو گاؤں کے باہر کے سکھ اور ہندو بھی اسلحہ لیے ہمارے گاؤں میں آنے لگے ہیں۔ ان لوگوں کی آنکھیں بدل گئی ہیں۔ یہ آپس کی محبت میل ملاپ کو فراموش کرچکے ہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔" فاطمہ کو آنے والے طوفان کا رتی بھر بھی اندازہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اس رات کنی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، وہ جلدی سو گئی تھی۔ ماموں مامی اور سالار رات کو کس وقت ان کے ہاں آئے۔ اسے کچھ بھی پتا نہیں چلا۔

"کنی، کنی جلدی اٹھ پتر!" مامی نے اس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"پتر جلدی کر۔" ماموں کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

"اماں، اماں کیا ہوا ہے؟" وہ پریشان ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"الگ وطن کا اعلان ہو چکا ہے۔ ہمارا اور تمہارے ماموں کا گاؤں اس میں شامل نہیں ہے۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو مرنے مارنے پر تل گئے ہیں۔ ہمیں جلدی اس علاقے سے نکلنا ہے۔"

"اماں! اماں! یہ ہمارا گھر ہے۔" وہ رو پڑی۔

"وہاں بھی ہمارا گھر ہوگا۔ تم جلدی سے اٹھو اور سنو، یہ زیورات کی پوٹلی کمر سے باندھ لو اور یہ تمہارا نکاح نامہ ہے۔ میں نے چمڑے میں سی دیا ہے۔ تعویذ کی طرح اسے سنبھال کر رکھنا۔ گلے میں ڈال لو۔"

ابھی اماں کچھ اور بھی کہتی گلی میں نامانوس شور ہونے لگا۔

"ابا!" سالار نے خوفزدہ ہو کر کفایت علی کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی پھر یوں لگا دروازہ توڑا جا رہا ہے۔

"چلو جلدی کرو، دوبارہ پچھلے دروازے سے نکلو۔" ماموں کی آواز پر وہ سب دوبارہ پچھلے دروازے کی جانب دوڑے، تعویذ کنی نے گلے میں ڈال لیا تھا جب کہ زیورات کی پوٹلی ابھی ہاتھ میں تھی۔ ایک ایک گٹھڑی مامی اور اماں نے اٹھائی ہوئی تھی۔ سالار کفایت علی کی گود میں تھا۔ اس کا بازو فاطمہ نے پکڑ رکھا تھا اور وہ اندھا دھند دوبارہ کھیتوں میں دوڑے جا رہے تھے۔

پھر کیا ہوا کیسے ہوا؟ اس نے تو بس ماموں کو گرتے دیکھا۔ سالار ان کی گود سے نکل کر کہیں کھیتوں میں گر پڑا۔

اماں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کنی کو گھنی فصل کی جانب دھکیل دیا۔ لمحوں کی بات تھی، اس کی زندگی باقی تھی۔ مامی اور اماں اس کے سامنے دم توڑ گئیں۔ اس کی زبان خوف نے سلب کر لی اور احساسات منجمد ہو گئے۔ آن کی آن میں وہ ماں کی شفقت اس کے بے لوث پیار سے محروم ہو گئی۔ ماموں اور مامی بہت دور دوسرے جہان چلے گئے۔ وہ کب تک کھیت میں بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

کوئی رویا سسکیوں کی آواز اس نے سنی۔

"کون؟" وہ چونک اٹھی۔

"ابا!" کوئی دھیرے دھیرے پکار رہا تھا۔

"سالار!" اس کی تمام حسیں بیدار ہونے لگیں، چاند کی آخری تاریخیں تھیں تاروں کی ہلکی روشنی میں اس نے سالار کو پہچان لیا۔

وہ زندہ ہے دوسراہٹ کا خیال ہی اسے تقویت دے گیا۔ وہ کھیتوں سے نکلی اور سالار سے لپٹ گئی۔

"کنی۔" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور اس کے سینے میں منہ چھپا لیا، خوف سے وہ کانپ رہا تھا۔ کنی کا اپنا حال بھی مختلف نہیں تھا۔

"ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔" پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا۔ زیورات کی پوٹلی کہیں گر گئی تھی۔ مامی والی گٹھڑی قریب پڑی تھی۔ اس نے وہی اٹھالی، سالار کی انگلی پکڑی اور اندھا دھند بھاگنے لگی۔

اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ ٹھیک سمت میں جا رہی ہے یا غلط، نہ ہی اسے اس وقت یہ خیال تھا وہ تو بس بھاگی جا رہی تھی اور سالار اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

پھر انہیں ایک قافلہ مل گیا۔ لٹے پٹے لوگ کوئی باپ کی قربانی دے آیا تھا۔ کوئی ماں اور بھائی بہنوں کی کسی نے سب قربان کر دیا تھا۔

طویل مسافت تاریک سفر مگر روشنی کی امید میں مسافر چلتے رہے کئی بار حملہ ہوا بہت سے راہ میں بچھڑے وہ سالار کو مضبوطی سے تھامے رہی۔ اس کا ساتھ بہت غنیمت تھا۔ لگتا تھا ساری عمر سفر میں کٹ جائے گی۔ پاؤں کے چھالے بنتے اور پھوٹتے رہیں گے۔ پیاسے لب پانی پانی پکارتے رہیں گے اور قافلے کے لوگ یونہی مرتے رہیں گے یہاں تک کہ سب ختم ہو جائیں گے مگر نہیں روشنی تک پہنچنا ہے۔

کسی نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ چیخیں، آنسو، قہقہے سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ لوگوں نے اس دھرتی کو سجدہ کیا۔ اس کی مٹی کو چوم لیا۔

"کیا واقعی ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں۔" سالار کا ہاتھ تھامے وہ بے یقین سی کھڑی تھی۔

"آؤ بہن! روٹی کھا لو۔" کیمپ میں وہ لڑکا اس کے سامنے روٹی اور سالن کی پلیٹ رکھ کر گیا تھا۔ واپس آیا۔ وہ تب بھی یونہی بیٹھی تھی اور ایک بچہ اس کے کاندھے سے سر ٹکائے نڈھال بیٹھا تھا۔

"بہن! روٹی کھا لو، اپنے بھائی کو بھی کھلاؤ ناں۔ دیکھو اس کو بھوک لگی ہے۔"

تب اس نے سالار کی جانب دیکھا اور روٹی کا نوالہ توڑ کر اسے کھلانے لگی۔

دن پر دن گزرنے لگے۔ قافلے آتے رہے ہر ایک دکھی تھا۔ سب کی داستان ایک تھی۔ یہاں لڑکے اور لڑکیاں ان کی خدمت کو موجود تھے۔ ان کے زخم پر مرہم رکھنے کو ہر لمحے تیار تھے۔

سالار کو بخار آنے لگا کنی کی پریشانی دیدنی تھی۔ وہ یہ آخری رشتہ کھونے کو تیار نہیں تھی۔ اب وہی تو تھے ایک دوسرے کے لیے۔ اسے بازوؤں میں اٹھائے ڈسپنسری میں لے آئی۔

"کیا ہوا بیٹی!" ڈاکٹر اس کے بہتے آنسوؤں سے متاثر ہو کر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"یہ دیکھیے اسے بخار آنے لگا ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہاں تو سب ہی دکھے ہوئے دلوں والے تھے، ذرا سی بات پر یونہی رو دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر جھک کر سالار کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے تسلی دی۔

"گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ یہ دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔" نوجوان ڈاکٹر نے دوا بھی لکھ دی اور دعا بھی دی۔ وہ ساری رات جاگتی رہی۔ بار بار سالار کا ماتھا چھوتی رہی، صبح پھر ڈاکٹر کے پاس موجود تھی۔

اس کا بخار تو کم نہیں ہوا جی!" وہ رونے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک کیا ہنس پڑا اور بولا۔

"آپ خوامخواہ فکر کرتی ہیں۔ اب تو آپ کا بھائی پہلے سے بہت بہتر ہے۔"

تین دن تک وہ ڈاکٹر کے پاس جاتی رہی۔ اس عرصے میں اس نے یہ بھی پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے اور راہ میں کون کون بچھڑ چکا ہے۔ بس میں اور سالار اب ہم دونوں ہی ہیں۔ یہ میرے ماموں کا بیٹا ہے۔" وہ یہ نہ بتا سکی کہ ہم دونوں کا نکاح ہو چکا ہے۔

''رشتے تو نئے بھی بن سکتے ہیں کنیز!'' ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر نرم سی نگاہ ڈال کر بہت امید سے کہا تھا۔

''کیسے رشتے؟'' وہ سمجھی نہیں۔

''میرا ہاتھ تھام لو، وعدہ کرتا ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ نبھاؤں گا۔''

''جی!'' وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی، کتنی دیر تک اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

''کیا میری بات بری لگی ہے؟'' وہ پشیمان تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور دھیرے سے بولی۔

''میں شادی شدہ ہوں۔''

''کہاں ہے تمہارا شوہر؟''

''وہ ادھر پاکستان میں ہی ہے۔ وہ ادھر ہی ملازم تھا۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔'' اس نے جھوٹ بولا تھا۔ کیسے بتاتی۔ سالار اس کا شوہر ہے۔

''اچھا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ مجھے نام پتا بتاؤ، میں ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔''

وہ اب بھی مخلص تھا۔ مگر کنیز کیا نام پتا بتاتی۔ وہ اٹھا کر آنسو پونچھتی واپس آ گئی۔

☆......☆......☆

پچھلے کچھ مقامی لوگ آنے والوں کی خبر گیری کے لیے آیا کرتے تھے۔ انہی میں وہ عمر رسیدہ جوڑا بھی شامل تھا۔ انہوں نے کنیز کو ایک بیمار بچے کے پاس غمزدہ اداس بیٹھے دیکھا تو اس کے پاس چلے آئے۔ بڑھیا نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔

''بیٹی! کون کون ہے تمہارے ساتھ؟''

اس نے سالار کی جانب اشارہ کر دیا۔

''اور کوئی نہیں۔'' تب اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم ہمارے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟'' اب اس نے لب کھولے۔

''ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکان خالی ہیں۔ ایک تم لے لو۔ ہم تمہاری خبر گیری کریں گے، تمہیں اکیلے ہونے کا احساس نہیں ہونے دیں گے'' پھر بڑے میاں بھی قریب آ گئے۔ اور پوچھنے لگے۔

''وہاں تمہارے پاس کتنی جائیداد تھی۔ کچھ کاغذات بھی پاس ہیں یا نہیں؟''

اس نے ساتھ لائی ہوئی گٹھڑی کو پہلی بار کھولا، یہ گٹھڑی مامی والی تھی اس میں کاغذات موجود تھے، ماموں کی جائیداد تھوڑی سی تھی۔ اسے اس کے بدلے میں اتنا ہی مل سکتا تھا۔ اپنی جائیداد کے کاغذات یقیناً اماں کے پاس تھے جو وہیں رہ گئے تھے۔

☆......☆......☆

گھر اچھا تھا۔ دو منزلیں تھیں۔ سرخ اینٹوں کا فرش، چار کمرے نیچے دو اوپر، جانے والے اپنا سامان بھی چھوڑ گئے تھے۔ وہ اب اس عمر رسیدہ جوڑے کو خالہ اور خالو کہنے لگی تھی۔ بہت اچھے تھے وہ دونوں، بہت مدد کی اس کی ہر طرح سے ساتھ دیا اور سارے محلے میں بھی کہا کہ ہماری رشتے کی بھانجی ہوتی ہے، انہی کے کہنے پر کنی نے اوپر کا حصہ کرائے پر چڑھا دیا۔ مامی کا کچھ زیور اس کے پاس تھا۔ ایک انگوٹھی اور کانوں میں ہلکی سی بالیاں وہ پہنے ہوئے تھی۔ خالہ نے کہا۔

''زیور سنبھال کر رکھو، کام آئے گا۔ آخر تمہاری شادی بھی تو کرنا ہے۔''

''میں تو شادی شدہ ہوں خالہ!'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''اچھا۔ تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

''ادھر ایک شہر میں ملازم تھا۔ پتا نہیں پاکستان پہنچا یا نہیں؟''

''اللہ رحم کرے اس پر، خیر خیریت سے اسے پاکستان لائے۔ تم دل چھوٹا مت کرنا۔ وہ ضرور آئے گا۔''

اور کنی سر اثبات میں ہلا کر رہ گئی۔

''ادھر تم کسی گاؤں میں رہتی تھیں؟ پڑھی لکھی تو نہیں ہو گی؟''

''نہیں ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کے لیے اسکول نہیں تھا۔ صرف لڑکوں کے لیے ایک پرائمری اسکول ہوا کرتا تھا۔''

''تعلیم اچھی چیز ہے۔ میں نے شادی سے پہلے صرف پانچ کلاسیں پڑھی تھیں، بعد میں مڈل کیا اگر تم چاہو تو میں پڑھنے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

''کیوں نہیں خالہ جی! یہ تو بڑی اچھی بات ہے، مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔''

''اور سنو۔ تم سالار کو اسکول داخل کرا دو۔ پڑھ لکھ جائے گا تو مستقبل بن جائے گا۔ اسکول یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ گلی محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ یہ بھی چلا جایا کرے گا۔''

''ٹھیک ہے خالہ! مگر کیسے داخل کروایا جاتا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔''

''اے لو، تمہیں بھلا کیا ضرورت ہے وہاں جانے کی، تمہارے خالو سے کہوں گی۔ وہی سارے کام کریں گے۔''

''بہت مہربانی خالہ!'' مارے تشکر کے کنی کی پلکیں نم ہونے لگیں، کہاں سوچا تھا اپنوں سے بچھڑنے کے بعد بھی اپنے مل جائیں گے۔

''بس میری بچی! رونا نہیں، میں تیری ماں ہوں، تو اکیلی نہیں ہے۔'' خالہ اسے اپنی ساتھ لگائے اسے ہولے ہولے تھپکتی رہیں۔

☆......☆......☆

سالار اسکول جانے لگا اور کنی خالہ سے گھر پر سبق لینے لگی۔ سالار اب بہت تیز ہو رہا تھا۔ گھر میں تو جی ہی نہیں لگتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ گلی میں کھیلتا رہتا۔ وہ کئی بار جھانک کر اطمینان کرتی کہ گلی میں ہی ہے کہیں

آگے تو نہیں نکل گیا۔ ذہین تھا کم محنت کے باوجود پڑھائی میں اچھا تھا۔

"کنی! مجھے ایک روپیہ دے ناں!" ایک روز بڑی معصوم سی شکل بنا کر وہ کہہ رہا تھا۔

"ہائیں پورا ایک روپیہ! ارے کیا کرو گے اتنے پیسے لے کر؟"

"کبوتر خریدوں گا۔" بڑے شوق سے بتایا۔

"کبوتر بازی تو گندے لڑکے کرتے ہیں۔ تم تو بہت اچھے ہو پڑھنے کے لیے اسکول جاتے ہو، کبھی کسی پڑھنے والے بچے کے پاس کبوتر دیکھے ہیں تم نے!"

"بس ایک ہی لوں گا ناں!" وہ ٹھنکا۔

"بہت غلط دوستوں میں رہتے ہو تم۔ بس اب میں تمہارا گلی میں نکلنا بند کر دوں گی!" کنیز نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں باہر کھیلنے ضرور جاؤں گا۔" اس نے پیر زمین پر پٹختے ہوئے ضد کی۔

"پھر وعدہ کرو۔ کبوتروں کا نام نہیں لو گے گلی میں صرف اچھے بچوں کے ساتھ کھیلو گے۔"

"اچھا!" اس نے بادل ناخواستہ بات مان لی۔ اور سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر پیر ہلانے لگا۔ کنی کا دھیان کرتے کی طرف سے ہٹ چکا تھا۔ وہ ایک ٹک سالار کو دیکھ رہی تھی۔

"کب بڑے ہو گے تم؟ تب جب میں تھک جاؤں گی، تمہارے ساتھ ایک قدم بھی نہ چل سکوں گی اور تم مجھے راہ میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤ گے۔"

یہ سوچ کر ہی روح تھرا اٹھی۔

"سالار!" اس نے خوفزدہ ہو کر اسے پکارا۔

"کیا ہے؟" وہ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

"مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو؟"

"ذرا بھی نہیں۔" وہ ناراض تھا بغیر سوچے سمجھے بول گیا۔

"ذرا بھی نہیں۔" وہ کرتا ایک طرف کر کے کھوئے کھوئے انداز میں اس کی طرف بڑھی دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے اور بولی۔

"بہت بری ہوں میں۔ بولو کیا بہت بری ہوں۔" وہ ایک دم سے رونے لگی۔

"کنی کیا ہوا؟" سالار اس کے رونے سے پریشان ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"تم جو کہہ رہے ہو، میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔"

"نہیں، نہیں۔ مت روؤ۔ تم بہت اچھی ہو۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے کنیز کے آنسو صاف کیے۔

"وعدہ کرو ہمیشہ مجھ سے محبت کرو گے؟" وہ بھول گئی ایک بچے سے مخاطب ہے، جوانی کی سرحد ابھی دور ہے۔ اتنی مدت تک یہ وعدہ بھلا کہاں یاد رہ پائے گا اس کو۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔

☆......☆......☆

وقت اتنا آہستہ آہستہ کیوں گزر رہا ہے، عورتیں اس کے پاس آتیں، تو پہلا سوال یہی کرتیں۔

"کنیز! تمہارے شوہر کی کوئی اطلاع آئی کہ نہیں؟" وہ گلے میں پڑے تعویذ کو بے اختیار چھو کر سر نفی میں ہلا دیتی ہے۔

خالہ کہتیں۔ "چار سال گزر چکے ہیں، کسی عالم سے پوچھو تو، وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"نہیں نہیں خالہ! ساری عمر یہی نام ساتھ رہے گا، اور کوئی نہیں آئے گا۔" وہ تڑپ کر انکار کر دیتی۔

"کنی! کھانا نکالو۔" بارہ تیرہ سالہ سالار اسکول سے آ گیا، دھاڑ سے دروازہ کھول کر کھانا مانگا۔

"اے ہے! دیکھو تو اس لڑکے کو نہ سلام نہ دعا۔ آتے ہی کھانا اور کنیز تجھ سے بڑی ہے۔ بڑوں کو بھلا یوں مخاطب کرتے ہیں۔ پھر کنی کی جانب رخ کر کے بولیں۔

"تم بھی قصوروار ہو۔ کبھی اسے نہیں ڈانٹتیں، کچھ بھی کرتا رہے۔ پٹائی نہیں کرتیں، میں کہتی ہوں۔ بچوں پر اتنی نرمی بھی اچھی نہیں۔"

"میں اس پر ہاتھ کیسے اٹھا سکتی ہوں۔" بے ساختہ ہی وہ کہہ گئی۔

"کیوں، جب پالا ہے تو یہ حق بھی حاصل ہو گیا ہے تمہیں۔" خالہ اس کی بات کیسے سمجھتیں۔

"اب تو بڑا ہو گیا ہے۔" کنیز پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"جب چھوٹا تھا، تب کون سا تم ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں۔ ہمیشہ کلیجے سے لگا کر رکھا ہے۔ میں کہتی ہوں، لڑکا ہے۔ ہاتھ سے نکل گیا تو سنبھال نہ پاؤ گی، ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا سختی کرو اس پر۔"

"کھانا کہاں ہے؟" منہ دھو کر آیا، پھر شور مچانے لگا۔

"ادھر آ شیطان! میں دوں تجھے کھانا۔ بے ہدایت ہر وقت شور مچاتا ہے۔" خالہ پاؤں سے چپل اتار کر ڈرا رہی تھیں۔

وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "شور تو خالو بھی کرتے ہیں، کیا تب بھی چپل اتار لیتی ہو؟"

"اوں ہوں سالار!" کنیز نے تنبیہی انداز میں دیکھا، مگر اس کی بات پر مسکراہٹ بھی لبوں پر دوڑ گئی۔

خالہ نے کون سا سچ مچ مارنے کے لیے چپل اتاری تھی۔ اس کی بات پر ہنس پڑیں اور بولیں۔

"تیرے خالو بھی اگر بچپن میں تیرے جیسے شریر ہوں گے تو ضرور پٹتے ہوں گے، اپنی ماں سے۔ میں تو بیوی ہوں حکم کی غلام۔ میں بھلا کیسے کہوں انہیں۔"

کنی کے لبوں کی مسکراہٹ کافور ہو گئی، اس نے سالار کی طرف دیکھا پھر کھانا نکالنے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کھانا لا کر سامنے رکھا۔ اس نے ناک چڑھائی۔

"آلو مٹر میں نہیں کھاؤں گا۔ مجھے زہر لگتے ہیں۔"

"دیکھو دیکھو تو نواب صاحب کے نخرے۔" خالہ نے گھرکا۔

"انڈا بنا دوں؟" کنیز نے دھیرے سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر چلا کر بولا۔

"پتا ہے، مجھے اچھے نہیں لگتے، کیوں پکائے تھے۔ بس میں نے کہہ دیا۔ اب اس گھر میں آلو مٹر رہیں

گے یا میں رہوں گا۔"

آخر میں لہجہ شریر ہوگیا۔ خالہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔ کنیز اس کے لیے انڈا بنانے لگی۔

"کنی! انڈے میں ادرک ضرور ڈالنا اور زیرہ بھی۔"

وہ ہدایات جاری کر رہا تھا۔ کنی خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ جب انڈا لا کر سامنے رکھا۔ تب تک وہ آلو مٹر کے سالن کے ساتھ ہی کافی ساری روٹی کھا چکا تھا۔

خالہ اٹھ کر چلی گئیں۔ تب کنی سے بولا۔

"مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے۔"

"کیا کرو گے۔" وہ اس کے مانگنے پر ہمیشہ دے دیا کرتی تھی، مگر پوچھتی ضرور تھی۔

"آج رات میلہ چراغاں ہے۔ وہاں جانا ہے مجھے۔"

"ہائے سالار ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ اتنی دور جاؤ گے وہ بھی رات کے وقت۔ نہ بھئی اگر کہیں گم ہو گئے تو پھر میں کیا کروں گی۔"

"اب اتنا بھی بچہ نہیں کہ گم ہو جاؤں، اب میں بڑا ہوں، طاقتور بھی ہوں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں سے بھی لڑتا ہوں، اور ہرا دیتا ہوں۔"

"اچھا تنگ مت کرو۔" وہ دوپٹہ چھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شام کو مان جاؤ گی نا؟" اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایسی مصیبت کیا ہے۔ سارا وقت تم گلی محلے میں پھرتے رہتے ہو۔ گھر تو بیٹھتے ہی نہیں۔"

"سارا وقت کہاں گلی محلے میں پھرتا ہوں۔ اتنا سارا وقت تو پڑھائی میں گزر جاتا ہے۔"

باہر دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"یقیناً تمہارا کوئی دوست ہوگا۔" کنی یہ کہتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی، اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

"سالار گھر پر ہے؟" صابر اور واجی پوچھ رہے تھے۔

"یہ تم دونوں کیا ہر وقت سالار کے ساتھ چپکے رہتے ہو، نہیں ہے وہ گھر میں۔" اس نے اس کے دونوں دوستوں کو ڈانٹ دیا۔

آواز سالار تک بھی گئی، کھانا چھوڑ کر دوڑ آیا۔

"واجی! صابر! جانا نہیں۔ روٹی کھا کر میں آتا ہوں۔"

"سالار!" کنیز نے تنبیہی انداز میں اسے دیکھا۔ وہ نظر انداز کر گیا، اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

دن تو جیسے تیسے گزر جاتا ہے مگر راتیں پتا نہیں کیوں اب لمبی ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ کئی بار سوتے سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ چونک کر چاروں طرف دیکھتی ہے۔ پھر سوچنے لگتی ہے، ابھی کیا خواب دیکھا تھا میں

نے۔ وہ کون تھا جس نے آ کر میرا بازو پکڑ لیا۔ میرا دوپٹہ تو گوٹے والا تھا۔ اب یہ سادہ دوپٹہ کہاں سے آ گیا۔ گاؤں کا کچا مکان، وہ کچی سیڑھیوں پر کھڑی کھیتوں کی جانب دیکھ رہی تھی، ہوا ٹھنڈی تھی۔ سامنے جوار کی فصلوں کے ساتھ ساتھ سفید گھوڑی پر سوار وہ آیا تھا۔

وہ کون ہے، اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ رات میں اسے پیاس بھی بہت لگتی تھی۔ پانی پینے اٹھتی تو کتنی دیر سالار کے کمرے میں کھڑی اسے سوئے ہوئے دیکھتی رہتی۔ کیسا بے خبر تھا۔ وہ کتنا معصوم، کیا ہمیشہ یونہی بے خبر اسی طرح معصوم رہو گے۔ کبھی جوان بھی ہو گے یا نہیں۔ اور وہ دن تو بہت اچانک آ گیا۔

میٹرک کے امتحان ہو رہے تھے۔ سالار خلاف توقع کافی سنجیدگی سے پڑھ رہا تھا۔ باہر جانا دوستوں کے ساتھ آوارہ پھرنا۔ میلوں ٹھیلوں میں عبادت سمجھ کر شریک ہونا، تاش، چوسر کھیلنا سب چھوڑ رکھا تھا۔ اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ وہ وہیں کھانا دے آتی۔

خالہ آتیں تو اسے اس دلجمعی سے پڑھتے دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔ اس روز کنیز اس کے لیے گاجر کا حلوہ بنا رہی تھی۔ خالہ چلی آئیں، باورچی خانے میں اس کے قریب پیڑھی رکھ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"کنیز بیٹی! اپنی گلی کا ہی ایک مکان بک رہا ہے، میں نے سوچا تجھے بتا دوں، کچھ زیور تو رکھا ہے ناں تمہارے پاس،، بیچ کر مکان خرید لو۔ کرائے پر چڑھا دینا۔"

"وہ زیور تو سالار کی ماں کا ہے خالہ!"

"ارے تو کیا ہوا خرچ بھی تو سالار پر ہی ہوگا۔ اس کی آمدن دیکھو ناں، اب سالار جوان ہو گیا ہے اور جیسا ہاتھ کا کھلا یہ لڑکا ہے۔ اب صرف چوبارے کے کرائے سے تمہارا گزارا نہیں ہوگا۔"

سالار جوان ہو گیا ہے، اسے لگا پورے بدن میں اس فقرے نے سنسنی دوڑا دی ہے۔ چمچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ خالہ سے رخ موڑ کر بیٹھ گئی کہ لگتا تھا خون چہرے پر سمٹ آیا ہے دل چاہ رہا تھا۔ دوڑ کر

سالار کے کمرے میں جائے اسے دیکھے، کیا واقعی وہ جوان ہو گیا ہے۔

"کنیز اسے سنبھالو بیٹی! محلے والوں کو شکایتیں بھی ہیں اس سے۔ اصل میں دوست بڑے غلط ہیں اس کے۔ صابر بکھڑا بنانے میں ماہر ہے تو واجی دنگا فساد میں آگے آگے۔ سالار کو دوسروں کا مذاق اڑانے ہنسنے کھیلنے میں مہارت ہے، جب تینوں اکٹھے ہو جاتے ہیں، تو کسی شریف آدمی کا تو گلی سے گزرنا ہی محال ہو جاتا ہے۔"

"میں کیا کروں خالہ؟ آپ تو جانتی ہیں اسے سمجھانا بھی میرے بس کی بات نہیں۔" ان کی بات سن کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"اسے کالج میں ضرور پڑھانا۔ یہ نہ ہو کہ دس جماعتیں پڑھ کر فارغ ہو بیٹھے۔ پڑھائی چھوڑ دی تو پھر کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اے لو، میں بات کیا کرنے آئی تھی، قصہ کیا لے بیٹھی۔ ہاں بولو کیا رائے ہے اگر مکان خریدنے کا ارادہ ہے تو کہو۔ میں تمہارے خالو سے بات کرتی ہوں زیور بھی وہی بکوائیں گے۔ مسکن بھی لے دیں گے۔"

"ٹھیک ہے خالہ! آپ کا مشورہ مناسب ہے۔ میں ابھی زیور لا دیتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ زیور کی پوٹلی انہیں تھمائی، پھر کانوں کی بالیاں اتارنے لگی۔

"میرا خیال ہے، اسی زیور سے کام بن جائے گا۔ تم بالیاں اور انگوٹھی مت اتارو۔" خالہ زیور لے کر چلی گئیں۔ حلوہ تیار ہوا تو وہ خالہ کے ہاں دے کر آئی۔ خالو بھی موجود تھے اس نے پوچھا۔

"کیا محلے والے سالار کو بہت برا بھلا کہتے ہیں؟"

"نہیں بیٹی! اب ایسی بھی بات نہیں۔ ان آبادیوں میں تو بہت کم لڑکے پڑھتے لکھتے ہیں۔ سالار تو اچھا خاصا لائق لڑکا ہے۔ بس صابر اور واجی کی وجہ سے اس کا نام بھی آ جاتا ہے۔"

اسے کچھ تسلی ہوئی۔ واپس آئی تو وہ گھر کے باہر بنے چبوترے پر کھڑا واجی اور صابر سے باتیں کر رہا تھا۔

"او چلو بھاگو یہاں سے۔" اس نے برقعے کا نقاب اٹھا کر دونوں کو گھورا اور اونچی آواز میں ڈانٹا۔

"کیا کرتی ہو؟" سالار کے انداز میں احتجاج تھا۔ اس نے پروا نہیں کی، دونوں سے بولی۔

"نہ پڑھائی سے مطلب، نہ کوئی کام نہ کاج۔ اب جو یہ پڑھ رہا ہے تو پڑھنے دو۔ تم دوست نہیں دشمن ہو۔ تمہاری وجہ سے یہ بھی محلے میں بدنام ہو رہا ہے۔"

"باجی جی! ایسا تو مت کہیں یہ ہمارا دوست ہے ہم اس کے ساتھ دشمنی نہیں کر سکتے۔ ہم تو اس کی خاطر جان بھی دے سکتے ہیں۔"

"بکومت، یہ دشمنی نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ پڑھ رہا تھا۔ تمہاری وجہ سے کتابیں چھوڑ کر باہر...... آ کھڑا ہوا ہے۔"

"اچھا باجی! ہم چلے جاتے ہیں۔" دونوں کھسک گئے اور گلی میں کھیلنے والے بچے جو اس بحث کو دیکھ کر اپنے کھیل چھوڑ کر متوجہ ہو گئے تھے، پھر سے کھیلنے لگے

"کیا کرتی ہو کنی؟" سالار اندر صحن میں آ کر سخت ناراض لہجے میں بولا تھا۔ پھر چارپائی پر لیٹ کر دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ جب بھی خفا ہوا کرتا تھا۔ یونہی کرتا تھا۔ کنی مسکرا دی۔ اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔

"پگلے! یہ سب تمہارے ہی فائدے کے لیے تو کرتی ہوں پڑھ لکھ کر اچھے عہدے پر لگ جاؤ گے۔ تو تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔"

"اچھا جیسے تمہیں تو کچھ نہیں دوں گا۔" اس نے ہاتھ ہٹا دیے۔ کنی کا دل تیزی سے دھڑکا۔ واقعی خالہ سچ کہتی تھیں۔ سالار اب جوان ہو گیا ہے۔ جوانی کا سبز خط واضح ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں معصومیت، بھولپن کی تحریر مٹ سی گئی تھی۔ چہرے کی نرمی سختی کی طرف مائل تھی۔ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سالار نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے گھبرا کر چھڑانا چاہا۔ اندازہ ہوا اب ان ہاتھوں میں بہت مضبوطی آ چکی ہے، وہ ہاتھ چھڑا نہیں پائے گی۔

"بیٹھو ناں کنی! اتنی جلدی کیوں ناراض ہو جاتی ہو، پڑھتا تو ہوں، تمہاری ہر بات مانتا ہوں، ورنہ محلے کے لڑکے تو اپنی ماؤں کی بھی نہیں سنتے۔ باپ تک کو چکر دے ڈالتے ہیں۔ مگر میں تمہاری اتنی عزت کرتا ہوں۔ تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔ اتنا خیال کرتا ہوں، احترام دیتا ہوں۔"

"اچھا بس کرو اور جاؤ اپنے کمرے میں۔" کنیز کا دل ابھی تک اس کے قابو میں نہیں تھا۔ وہ سالار کی جانب دیکھنے سے گریزاں تھی، کتنا انتظار تھا اسے۔ مگر اب دل کہتا اسے بچہ ہی رہنا چاہیے تھا۔ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ جی ٹھکانے پر نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں آ کر اس نے آئینہ دیکھا سالار جوان ہو گیا ہے۔ کیا وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ نہیں یہاں بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے۔

"کنی!" سالار نے پکارا اس نے جلدی سے آئینہ رکھ دیا اور دوپٹہ سر پر رکھنے لگی۔

"کنی! اگر حلوہ بن گیا ہے تو مجھے دے جاؤ۔" کنیز نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ حلوہ پلیٹ میں نکالا۔ اس کے کمرے میں آئی۔ وہ کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ خاموشی سے پلیٹ اس کے قریب میز پر رکھی اور واپس پلٹ گئی۔

اس رات تو نیند بار بار ٹوٹی۔ بار بار ایک ادھورا سا خواب دیکھا۔ پیاس بھی بہت لگی۔ کتنی بار پانی پینے باہر آئی، سالار کے کمرے کی جانب دیکھا۔ مگر اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

☆......☆......☆

سالار کی جوانی تو لگتا تھا تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہے، وہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ جسم مضبوط اور لب ولہجہ شوخ بے فکرا تھا۔ امتحان ختم ہوئے تو اس کے لیے گھر میں ٹک کر بیٹھنا محال ہو گیا۔ اب واجی، صابر کے علاوہ اور بہت سے لڑکوں سے اس کی دوستی تھی، مگر پکے یار اب بھی یہ تین ہی تھے۔

رات گئے وہ لوگ گلی محلے کے چبوتروں پر بیٹھے رہتے۔ صابر گانا گاتا تھڑا بجاتا۔ درمیان میں یہ لوگ فقرے بازی کرتے، اونچے اونچے قہقہے لگاتے۔ آس پاس کے گھروں کی کھڑکیاں کھلتیں، کوئی بزرگ عورت باہر جھانک کر انہیں گھورتی۔ برا بھلا کہتی۔ پھر دھاڑ سے کھڑکی بند کر لیتی۔ مگر ایسی باتوں کا ان بے فکروں پر بھلا کیا اثر ہوتا تھا۔ شہر میں میلوں ٹھیلوں کا رواج بہت زیادہ تھا، اور ہر میلے میں شامل ہونا گویا ان کا فرض تھا۔

سائیکل کرائے پر لے لیے جاتے اور گلیوں محلوں کے بے فکرے پہنچ جاتے۔ کبھی کبھی یہ تینوں شہر کے مشہور پہلوانوں کے اکھاڑوں یا بیٹھک پر بھی چلے جاتے۔ یہاں بھی خوب رونق ہوا کرتی تھی۔ پہلوان بھی اور ان کے پٹھے (شاگرد) زور کر رہے ہیں، اور تماشائیوں نے شور مچا کر سارا لاہور سر پر اٹھا رکھا ہے۔ بیٹھکوں میں کھانے پینے کے نئے انداز دیکھنے کو ملتے۔ پہلوان اتنا کھاتے تھے کہ ہاتھی بھی کیا کھاتا ہوگا۔ کبھی کبھی یہ ہی لوگ راوی کی طرف نکل جایا کرتے تھے، مگر ذرا کم کہ راوی پر زیادہ تر عاشق معشوق کا قبضہ ہوتا تھا۔ فی الحال تینوں میں سے کسی کی بھی کوئی محبوبہ نہ تھی۔ وہاں جاتے کچھ شرمندگی ہوتی تھی۔ کئی بار صابر نے کہا۔ "اب ایک عدد محبوبہ رکھ لینی چاہیے۔" مگر پھر فرصت نہ ملی اور کام درمیان میں ہی رہ گیا۔

واجی کو بلانے سالار اس کے گھر گیا۔ اس کی اماں نے کہا۔

''اندر لنگ آ پتر! واجد نہا رہا ہے۔ تو اس کے کمرے میں بیٹھ جا آ کر۔''

وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر یہیں ڈیوڑھی سے اوپر جاتی، سیڑھیاں طے کر کے اوپر آ گیا۔ کہ چھت پر واجی کا کمرا تھا۔ اس وقت چھت پر ہر سو دھوپ تھی، ساتھ کی چھت پر کبوتروں کی چھتری تھی، اور کبوتر اپنے کابک میں بیٹھے غٹرغوں کر رہے تھے۔ وہ دیوار پر بازو رکھ کر دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔

ہنسی کی آواز کہیں قریب سے ہی ابھری، اس نے چونک کر دیکھا۔ ساتھ ساتھ ملی ہوئی چھتوں میں دائیں طرف والی چھت پر وہ ہاتھ میں دھلے کپڑوں کی بالٹی لیے کھڑی نیچے کسی کو دیکھ کر ہنسی تھی۔ سالار کی ساری توجہ اس گلابی سوٹ والی لڑکی کی جانب ہو گئی۔

''اری جانی! ایسے ہی اپنے پاس سے باتیں نہ بنایا کرو۔'' وہ پھر ہنسی۔

''اچھا اچھا ابھی کپڑے ڈال کر نیچے آتی ہوں، پھر پوچھتی ہوں تجھ سے۔''

وہ اب پیچھے ہٹی۔ بالٹی نیچے رکھی اور کپڑا نکال کر وہاں بندھی رسی پر ڈالا۔ ابھی تک اس کی نظر سالار پر نہیں پڑی تھی۔

''السلام علیکم سوہنیو!'' سالار اس کے برابر والی دیوار کے قریب آ گیا۔ اور دھیرے سے کہا۔

وہ تو اچھل ہی پڑی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نظر سالار کے مسکراتے چہرے پر پڑی۔ ہونٹ سکیڑے اور بولی۔

''شرم نہیں آتی تمہیں؟''

''سلام ہی تو کیا ہے۔ برا ماننے والی کیا بات ہے اس میں۔''

''سلام کراپنی۔''

''ٹھہرو ٹھہرو پیچھے مت ہٹنا۔'' وہ یوں بولا کہ لڑکی بوکھلا گئی۔ کپڑا ہاتھ سے چھوٹا اور گھبرا کر وہ اس دیوار سے چپٹ گئی، جس کے ادھر سالار کھڑا تھا۔ اب ڈرتے ڈرتے ادھر دیکھا کہ کیا ہے، جو اس نے پیچھے ہٹنے سے منع کیا تھا۔ وہاں تو کچھ نہیں تھا۔ شدید ناراضی لیے اس لڑکے کی جانب دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ ''ناراض نہ ہونا۔ میں قریب سے تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔''

''فٹے منہ۔'' وہ دوپٹہ درست کرتی پیچھے ہٹ گئی کہ چھوٹی سی تو چار دیواری تھی، اور اس کے بہت قریب کھڑی تھی۔

''سنو نام کیا ہے تمہارا؟'' سالار نے اس کی ناراضی کا ذرا برابر بھی نوٹس نہیں لیا۔

''تمہیں کیا؟'' وہ کچھ دیر پہلے والی بوکھلاہٹ پر شرمندہ سی تھی۔

''رانی کہہ لوں تمہیں؟'' وہ ہنس پڑی اور فرش پر گرا کپڑا اٹھانے لگی۔

''پھر کب آؤ گی چھت پر؟'' اسے رام ہوتے دیکھ کر سالار نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''تم سالار ہو نا؟'' ایک اجنبی لڑکی کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت تو ہوئی، مگر اظہار نہیں کیا۔ سر اثبات میں ہلایا۔

''واجی، تمہارا دوست ہے، مگر تم اس کے گھر تو کم کم ہی آتے ہو۔؟''

''تم کیا ہماری جاسوسی کرتی رہتی ہو؟'' اب کے اسے کہنا ہی پڑا۔

''چل ہٹ دے۔'' وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ''میں کیوں کروں گی۔ تم لوگوں کی جاسوسی۔ یہ دیوار سے تو دیوار ملی ہے ہماری۔''

''نام کیا تمہارا؟''

''نسرین۔''

''کل پھر آؤ گی چھت پر؟''

''میں تو روز ہی آتی ہوں، کبھی کپڑے ڈالنے کبھی خشک کپڑے لینے، کبھی کبوتروں کو دانہ پانی ڈالنے۔''

''اچھا کل دوپہر کو میں آؤں گا۔ تم انتظار کرنا۔''

''ہائے اللہ! جو کسی نے دیکھ لیا؟'' نسرین کے انداز میں بھرپور رضامندی تھی۔

''دیکھ لیا تو کہہ دینا کبوتر لینے آیا تھا۔''

''کتنے چالاک ہو؟''

''تم سے کم ہوں۔'' اس نے گہری نگاہ نسرین پر جما کر کہا۔

''تو میں نے کون سی چالاکی دکھائی ہے۔'' وہ ادا سے بولی۔

سالار کے پیچھے سیڑھیوں پر چاپ ابھری۔ وہ جلدی سے دیوار کے قریب سے ہٹ گیا۔ نسرین بھی کپڑوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ آنے والا واجی تھا۔

''اماں نے بتایا تھا تم آئے ہو۔''

''پھر بھی تم نے نہانے میں اتنی دیر کر دی۔''

''دیر کہاں لگا دی۔ میں نے تو جلدی میں کرتا بھی الٹا پہن لیا تھا۔''

دونوں ہنستے ہوئے واجی کے کمرے میں آ بیٹھے۔ واجی نے بال بنائے، جوتے پہنے اور ایک بار پھر دونوں گھر سے باہر تھے۔

صابر ایک دکان کے باہر کھڑا مل گیا اور تینوں فلم دیکھنے چل پڑے۔

☆......☆......☆

''سالار! تم نے آگے داخلہ نہیں لینا کیا؟'' وہ جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا کہ ابھی نسرین سے ملنے جانا تھا۔

''لے لوں گا داخلہ بھی۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔''

''جلدی کیوں نہیں۔ تم دسویں جماعت پاس کر چکے ہو۔ خالہ بتا رہی تھیں۔ آگے داخلہ شروع ہو گیا ہے، دیر ہو گئی تو سال ضائع ہو جائے گا۔''

"ابھی بہت دن باقی ہیں۔" اس نے کھانا کھا کر برتن ایک طرف کیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب کہاں چل دیے؟"

"تو گھر بیٹھ کر کیا کروں؟"

اس سوال کا کنیز کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ خاموشی سے برتن اٹھائے اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

سالار دبے پاؤں سیڑھیوں کی جانب بڑھا، آج کل ان کا چوبارہ خالی تھا۔ سات گھروں کے فاصلے پر واجی کا گھر تھا۔ اگر گلیوں سے جاتے تو فاصلہ طویل تھا۔ تین گلیاں چھوڑ کر اس کا دروازہ بنتا تھا۔ مگر چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ پھلانگتے ہوئے ذرا دیر میں وہاں پہنچا جا سکتا تھا۔

بہت احتیاط سے وہ اپنی چھت سے ہمسائیوں کی چھت پر اترا اور اسی طرح ایک ایک چھت پر سے ہوتا ہوا نسرین کی چھت کے قریب آ گیا۔ اس وقت دوپہر تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ خاصی گرمی ہو رہی تھی، مگر نسرین بی بی بھی اس کے انتظار میں چھت پر موجود تھیں۔ اسے دیکھا، مسکرا کر چہرے کا پسینہ پونچھا۔ اور سالار آخری دیوار بھی پھلانگ کر اس کے پاس آ گیا۔ ملاقات چند منٹ سے زیادہ کی نہیں تھی کہ کسی بھی لمحے کسی کے اوپر آ جانے کا خطرہ تھا۔

اگلی ملاقات کا وعدہ کر کے وہ واپس آ گیا۔ نسرین سے ملاقات کی تفصیل تو کیا دوستوں کو ہوا بھی نہیں لگنے دی، کہ واجی نسرین کا پڑوسی تھا۔ بات کا اسے پتا چلتا تو اپنے تک تھوڑی رکھتا، اور جو نسرین کے بھائیوں تک پہنچ جاتی تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو جاتا۔

روز ملاقات اور اگلی ملاقات کا وقت طے کرنا اب معمول بن گیا۔ وہ کہتی۔

"ہم ہر روز چھت پر ملتے ہیں۔ کسی روز راوی پر چلو ناں؟"

"ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔ بس موسم ذرا اچھا ہو لے۔"

نسرین کی باتوں، اس کی بے خوفی سے اندازہ ہوتا تھا۔ وہ اس میدان کی پرانی کھلاڑی ہے۔

☆......☆......☆

پنجابی مشاعرہ تھا۔ ان تینوں کو بھی جانا تھا۔ مشاعرہ تو رات کو تھا۔ یہ لوگ دوپہر ڈھلتے ہی گھر سے نکل گئے۔

"کیا خیال ہے، راوی پر چلیں؟" یہ مشورہ صابر کا تھا۔ واجی بھی سر ہو گیا تو اسے مانتے ہی بنی۔ جب تک وہاں پہنچے۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ موسم اچھا تھا۔ اور یہاں رونق بھی کافی تھی۔ جو جگہ انہوں نے منتخب کی، وہاں قریب ہی چار پانچ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ تین تو خوب شوخ و شنگ اور ایک بالکل خاموش اداس اور کھوئی کھوئی سی۔ انہوں نے آوازے کسے۔ انہوں نے جواب دیے، پہلے ہلکی پھلکی لڑائی ہوئی اور بعد میں دوستی ہو گئی۔ لڑکیاں تو سر پر سوار ہوتی محسوس ہوتی تھیں، یہ دامن چھڑانا چاہتے، پر چھوڑتی نہیں تھیں۔

باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم کر لیا کہ لڑکے کرتے کیا ہیں۔ کیسے گھرانوں سے تعلق ہے۔ تینوں نے اپنے متعلق جھوٹ بولا اور یہ بتایا آپس میں رشتہ دار ہیں اور لمبی چوڑی زمینداری ہے۔ تینوں کافی متاثر ہوئیں، جب کہ وہ ان کے قریب سے اٹھ کر الگ جا بیٹھی تھی۔

"ان کی چونی گم ہو گئی ہے کیا؟" سالار نے پارو نامی لڑکی سے پوچھا۔ تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر نینی بولی۔

"تم خود ہی جا کر پوچھ لو۔ ہمیں تو کچھ نہیں معلوم۔" فوراً اس کے پاس چلا آیا۔ وہ گھٹنوں پر چہرہ رکھے گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔

"سنیے!" سالار نے پکارا تو وہ چونک گئی۔

"یوں الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہیں، آپ بھی ادھر آ جائیں ناں۔"

"مجھے پرندے پھانسنا اچھا نہیں لگتا۔" اس نے سر سے پاؤں تک سالار کو دیکھا، اور زہرخند لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" بات واقعی سالار کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"کیا تم لوگ سمجھ چکے ہو کہ ہم کون ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"میں یعنی زری، نینو، پارو اور گڈی ہم سب کا تعلق اس بازار سے ہے، جہاں شریف آدمی قدم رکھتے بھی گھبراتا ہے۔ یہ تینوں صرف سیر کے لیے ہی یہاں نہیں آتیں۔ شکار پھانسنے بھی آتی ہیں۔ جیسے آج تم لوگ مل گئے ہو، اس طرح ہمیشہ کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔"

"اور تم، تم ایسا کیوں نہیں کرتیں؟"

"میرا دل گوارا نہیں کرتا، شکار پھانسنے کے لیے خود کو دانہ بنانا پڑتا ہے، یہ میں نہیں کر سکتی۔"

"تم ان تینوں سے مختلف ہو۔" سالار نے توصیفی انداز میں کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لوگ تو مجھے بھی اسی نام سے یاد کرتے ہیں جو نام ان کو دیتے ہیں۔" اس کی پلکیں بھیگی بھیگی تھیں۔

"تمہیں یہ کام پسند نہیں تو کیوں کرتی ہو؟"

وہ اس کے بھول پن پر ہنس پڑی اور بولی۔

"پاؤں میں زنجیر ہے۔ مجبور ہوں میں۔ میرا تعلق بازار سے نہیں، شریف گھرانے کی بیٹی ہوں۔ جب پاکستان بنا تو میں بارہ تیرہ برس کی تھی۔ لاہور کے قریب ہی میرا گاؤں تھا۔ میرے والد اور بھائی پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ ہمارے گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندو دبے دبے سے رہتے تھے، مگر ہندو کی ذہنیت مسلمان نہیں سمجھ سکتا۔ وہ اس پستی تک پہنچ نہیں سکتا۔ ہمارے علاقے کے ایک ہندو نے مجھے، پروین اور نوری کو اغوا کیا، ہم پانی بھر کر واپس آ رہے تھے۔ جب اس کے آدمیوں نے ہمیں اٹھوایا اور یہاں لاہور کے

بازار میں بیچ دیا۔ پروین بیمار ہو کر چند روز کے بعد ہی مرگئی۔ نوری کو کسی نے خرید لیا۔ اور میں اب بھی یہاں ہوں۔'' وہ بات کے اختتام پر رونے لگی۔

سالار کو اس کی داستان سن کر افسوس بھی ہوا اور ہمدردی بھی۔

''مجھے اپنا دوست سمجھو۔'' اس نے خلوص سے کہا۔

''دوست کوئی نہیں، سب ہوس کے پجاری ہیں۔'' وہ ڈسی ہوئی تھی، یقین نہ کر سکی۔

''نہیں، میرا اعتبار کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے ملتے ہوئے کبھی یہ خیال دل میں نہیں آئے گا۔ کہ تم لڑکی ہو اور میں لڑکا ہوں۔

تم مجھے اپنا پتا بتا دو۔ میں ملنے کے لیے آؤں گا۔'' اس کے چہرے، اس کی آنکھوں میں سچائی کی روشنی تھی۔

زری کو اس کی بات کا یقین کرنا اچھا لگا۔ اپنا پتا بتا دیا، اور یہ کہہ دیا کہ ان لڑکیوں پر یہی ظاہر کرنا کہ میں تمہیں پسند آگئی ہوں۔ تم گاہک کی حیثیت سے مجھ سے ملنے آ رہے ہو۔

''بات تو بہت گھٹیا ہے، مگر ہم مجبور ہیں۔ ایسا کہنا ہی پڑے گا۔ اور سنو وہاں آؤ گے تو صرف مجھ پر ہی نہیں، سب لڑکیوں پر توجہ دینا۔''

''وہ کیوں......؟''

''ہماری بائی بڑی لالچی ہے، میں نہیں چاہتی، وہ تم سے لمبے لمبے مطالبے کرے، میں اس بات کو پسند نہیں کروں گی۔''

وہ اٹھ کر باقی سب کے پاس آ بیٹھے، پھر ذرا دیر کے بعد لڑکیوں نے جانے کی اجازت مانگی۔

ان کے جانے کے بعد واجی اور صابر ہنسنے لگے، اور بولے کہتی تھیں روز آنا نہیں ملا کریں گے۔ اتنے فارغ ہیں ہم، اور ان سے اچھی تو ہمیں بہت مل سکتی ہیں۔ پھر یہاں تک آنے کا فائدہ؟''

''نہیں یار! وہ جو گم صم تھی۔ وہ تو بہت خوبصورت تھی۔'' صابر نے کہا۔

''ہاں مگر وہ ہم سے بات کرنے پر راضی ہی کب تھی، صرف سالار سے بات ہوئی ہے اس کی۔''

''کیا کہہ رہی تھی یار؟''

''بہت دکھی ہے، شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت اغوا ہو گئی تھی، اس زندگی سے سخت بےزار ہے۔''

''کس زندگی سے؟'' وہ دونوں سمجھے نہیں، اور سالار کو خیال آیا کہ ان لڑکیوں نے انہیں اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا، سالار نے ساری بات دوستوں کو بتا دی۔

''تب تو ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔'' صابر جوش میں آ کر بولا۔

''ہاں یار! ساتھ لے جاتے پھر دیکھتے کیسے یہ لوگ اسے اس کی مرضی کے خلاف مجبور کر کے یہ کام کرواتے ہیں۔'' واجی بھی جوش میں آ گیا۔

''جی ہاں، گھر لے جاتے محلے والوں کی باتیں سنتے، گھر والوں کے جوتے کھاتے۔'' سالار نے صاف صاف نقشہ کھینچ دیا۔

''ہاں، یہ تو ہے، ہم بھی کتنے مجبور ہیں۔''

''کیا خیال ہے چلو گے ناں میرے ساتھ اس سے ملنے۔''

''ارے ہم تو یاروں کے یار ہیں، جہاں لے چلو گے چلیں گے'' دونوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیے۔

وہ لوگ جتنی دیر یہاں بیٹھے رہے۔ زری کی باتیں کرتے رہے، پھر اٹھ کر مشاعرے میں شرکت کے لیے چل پڑے۔

رات گئے وہ گھر آیا، تو کنی جاگ رہی تھی۔

''تم باہر کا دروازہ کھول کر سو جایا کرو۔'' اس نے نظر چرا کر اور اتنی دیر سے آنے پر کچھ شرمندہ انداز میں مشورہ دیا۔

''تم جلدی نہیں آسکتے کیا؟'' وہ زچ سے انداز میں گویا ہوئی۔

''نہیں۔'' سالار کا انداز قطعیت بھرا تھا۔ کنیز نے پھر کچھ نہیں کہا، اس سے کھانے کا بھی نہیں پوچھا، کمرے میں چلی گئی۔

سالار نے کمرے سے کپڑے اٹھائے۔ نل سے پانی کی بالٹی بھر کر پانی غسل خانے میں رکھا اور نہانے چلا گیا۔

واپس آیا تو وہ کمرے میں لیٹی تھی، کمرے کی بتی ابھی جل رہی تھی، جس کا مطلب تھا کہ جاگ رہی ہے۔

''کنی!'' دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے دھیرے سے پکارا۔

''کیا ہے؟'' وہ رخ موڑے ہوئے ہی بولی۔

''اتنا گرم موسم ہے، یہاں بند کمرے میں کیسے سوؤ گی؟''

''جیسے روز سوتی ہوں۔'' اسے اندازہ ہو گیا، اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، اسے منانے کو باتیں بنا رہا ہے۔

''آج گرمی زیادہ ہے، تم صحن میں چارپائی ڈال لو۔''

کنیز نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ کچھ دیر دہلیز پر کھڑا سر کے بال تولیے سے رگڑتا رہا، پھر چلا گیا۔ کنیز نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا اور چت لیٹ گئی۔ سامنے بلب روشن تھا۔ اسے روشنی میں الجھن تو ہو رہی تھی، مگر بستر سے اٹھنے کو دل بھی نہیں کر رہا تھا۔

''کنی!'' ایک بار پھر اس کی آواز آئی اور جو یہ سوچ کر بڑے آرام سے لیٹی تھی، وہ جا کر بستر پر لیٹ چکا ہوگا۔ ہڑبڑا کر اٹھی اور قریب رکھا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھنے لگی۔

اس بے اختیار حرکت نے سالار کو شرمندہ کر دیا کہ اسے یوں اچانک کنیز کے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ذرا دیر کو وہ بھول ہی گیا کہ کیا کہنے آیا تھا۔ کنیز بھی خاموش سر جھکائے بستر پر بیٹھی رہی، اس خاموشی کو سالار ہی نے توڑا اور بولی۔

"میں نے اپنا بستر باہر گلی میں ڈال لیا ہے۔ تم صحن میں آ جاؤ۔"

"ہاں گلی میں، دن کو بھی باہر رہتے ہو۔ رات بھی باہر اور بہانا میرا ہے۔" وہ بستر سے اترتے ہوئے بڑبڑائی مگر اس بڑبڑاہٹ میں سختی نہیں تھی۔ وہ اب بھی نظر ملاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ سالار کا یہ کہنا کہ میں باہر سو رہا ہوں۔ تم صحن میں آ جاؤ اپنی جگہ ایک معنی رکھتا تھا۔

سالار نے آگے بڑھ کر اس کا بستر لپیٹا۔ کندھے پر رکھا اور چارپائی صحن میں بچھا دی۔ پھر کچھ بھی کہے بغیر باہر چلا گیا۔

کنیز کی نیند اڑ گئی۔ بستر پر لیٹی وہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اور دل معمول سے کہیں زیادہ رفتار میں دھڑکتا رہا۔

☆......☆......☆

"سالار! آج تم رک جاؤ کچھ دیر کے لیے۔" صبح ناشتا اس کے سامنے رکھتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"کیوں آج کیا آفت آئی ہے؟" رات کی بات سالار کے لیے کیا اہم ہوتی، البتہ کنی پر اب بھی اثر باقی تھا وہ رکی رکی، سمٹی سمٹی سی تھی۔ گویا اپنے احساسات کے ساتھ ساتھ اب سالار کی ذہنی اور جسمانی جوانی کا بھی احساس تھا۔

"خالہ کے ساتھ کچھ لوگ اوپر والا حصہ دیکھنے آ رہے ہیں۔ خالہ کہہ رہی تھی، اچھا کرایہ دیں گے۔"

"رہنے دو، کیا کرنا ہے کرائے پر چڑھا کر، دوسرے مکان سے اچھا خاصا کرایہ مل جاتا ہے۔ آسودہ حال ہیں ہم۔ اسے یونہی رہنے دو۔" اب وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ فیصلہ سنا سکے۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی، مگر ہمارے لیے تو یہ نیچے والا حصہ ہی کافی ہے۔"

"چلو فی الحال تو اسے خالی رہنے دو۔ جب ضرورت پڑے گی چڑھا دیں گے۔"

اب کیسے کہتا کہ تم نے کرائے پر چڑھا دیا تو میں نسرین سے ملنے کیسے جایا کروں گا۔ اور ادھر ادھر تاک جھانک کا مواقع بھی تو گنوا بیٹھوں گا کہ نہیں۔

"سنو کل سے تم اپنا بستر چھت پر لگا لینا۔ میں نیچے صحن میں سویا کروں گا۔"

"تم اوپر سو جایا کرو۔ تمہیں گرمی بھی تو بہت لگتی ہے۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور تم جو رات کو بار بار پانی پینے کے لیے اٹھتی ہو۔ بے مقصد ادھر ادھر چکر لگاتی رہتی ہو، کبھی رات میں برتنوں والی الماری دوبارہ ترتیب دینے لگتی ہو، تو کبھی کسی کپڑے کو ادھیڑنے لگتی ہو۔ چھت پر یہ سارے مشغلے کیسے ہو سکیں گے۔

وہ جواب طلب انداز میں اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔ میں رات کو دیر سے آتا ہوں۔ نیچے ہی ٹھیک ہے۔" کنیز اثبات میں سر ہلا کر اپنے

کمرے میں چلی گئی۔

سالار کچھ دیر کسی سوچ میں گم بیٹھا رہا، پھر ایک فیصلہ کر کے کنیز کے کمرے کی جانب بڑھا۔ اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی صابر کی آواز، وہ اسے بلا رہا تھا۔ سالار بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"یار! ادھر بازار میں لڑائی ہوئی ہے۔ برف کے ٹوٹے اور سوڈے کی بوتلیں چل رہی ہیں۔"

"اچھا!" وہ ناشتا چھوڑ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ واقعی بڑے زور کی لڑائی تھی۔ ایک طرف پہلوان تھا تو دوسری طرف اس علاقے کے معروف بدمعاش کے آدمی تھے۔

سوڈے کی بوتلیں کئی لوگوں کو زخمی کر چکی تھیں، لوگ چبوتروں پر کھڑے شور مچا مچا کر لڑنے والوں کو حوصلہ بڑھا رہے تھے اور کچھ اس لڑائی کو ختم کروانے کی کوشش میں تھے۔

سالار اور صابر بھی...... جا کر کھڑے ہو گئے اور شور مچانے لگے کون جیتتا ہے، اور کون ہارتا ہے۔ اس سے انہیں دلچسپی نہیں تھی۔

"واجی کدھر ہے؟" سالار نے پوچھا۔

"ادھر ہی کہیں ہوگا۔ ایسا ہنگامہ ہو، اور وہ دیکھنے سے محروم رہے ناممکن ہے۔"

☆......☆......☆

سالار سارا دن گلیوں، بازاروں میں دوستوں کے ساتھ بے مقصد پھرتا تھا۔ رات کو دیر سے گھر آتا تھا۔ کنیز کے ٹوکنے کا اثر نہیں تھا اس پر، مگر ایک تسلی تھی کنیز کو، پڑھائی سے بے زار نہیں تھا۔ کالج جاتا تھا۔ اور وہ سوچتی پڑھ لکھ کر اچھی جگہ ملازم ہو جائے گا تو یہ تمام دوستیاں خود بخود ہی ٹوٹ جائیں گی۔

صبح ناشتے کے لیے سامنے والوں کے بچے کو پیسے دے کر بازار سے چھولے منگوائے۔ اس نے کھانے سے صاف انکار کر دیا۔

"نہاری یا پائے منگوایا کرو، صبح صبح چھولے میں نہیں کھا سکتا۔"

"توبہ سالار! کتنے نخرے کرتے ہو تم؟" اسے ہنسی آ گئی، پھر بولی۔

"انڈا بنا دوں؟"

"رہنے دو۔ بازار سے ناشتا کر لوں گا۔" وہ آوازیں ہی دیتی رہ گئی، مگر رکا نہیں۔

دوپہر کو سخت دھوپ میں کمرے سے باہر قدم رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اور سالار صاحب اس وقت چھتیں پھلانگتے ہوئے نسرین سے ملاقات کو تشریف لے جایا کرتے تھے۔

"اتنی دیر سے آ رہے ہو۔ میرا تو سا پگھلنے لگا ہے؟" نسرین پسینے میں شرابور ناراض سی کھڑی تھی۔

"کیا کرتا تمہارے ہمسایوں کو بچہ چھت پر کھڑا گڈی اڑا رہا تھا۔ انتظار کرنا پڑا۔ وہ کہیں دفع ہو تو میں ادھر آؤں۔" گرمی نے اس کا مزاج بھی خراب کیا ہوا تھا۔

"ابھی انہیں یہاں کھڑے دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ نیچے سے نسرین کی اماں اسے آوازیں

دینے لگی۔

"اچھا، میں چلتی ہوں۔" وہ فوراً بھاگی اور اسے واپس آنا پڑا۔

☆......☆......☆

کنیز رات کو چھت پر سویا کرتی تھی اور گیارہ بارہ بجے گھر آنا، دروازے کی کنڈی کھول کر وہ اوپر جاتی تھی۔ سو خبر نہ ہو پاتی کہ کب آیا ہے رات کو کھانا بھی اب عموماً وہ باہر ہی کھاتا تھا۔ آتا اور سو رہتا۔

بارہ کا وقت تھا۔ وہ ابھی ابھی آ کر بستر پر لیٹا تھا۔ کنیز سیڑھیاں طے کر کے نیچے اتر رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اکثر اس کے قدموں کی چاپ سے سالار کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی، مگر نیند فوراً پھر اسے اپنی آغوش میں لے لیتی، کبھی نہیں پوچھا۔

"سوتی کیوں نہیں ادھر ادھر کیوں چکراتی پھرتی ہو؟"

آج اسے نیند نہیں آئی تھی۔ آنکھوں پر بازو رکھے کنیز کو نیچے آتے، پھر اپنے بستر کے پاس آ کر رکتے دیکھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی چاند کی روشنی میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر گھڑونچی کی جانب بڑھی۔ پانی کا گلاس بھرا، ہونٹوں کے قریب لے کر گئی، پھر کچھ سوچتے ہوئے گھڑے میں انڈیل دیا۔ تخت کے پاس جا کر اس پر رکھے گاؤ تکیے کا غلاف سیٹ کیا۔ گملوں کی ترتیب بدلی۔ یہ سب کچھ بالکل غیر ضروری اور عجیب تھا۔ سالار خاموش پڑا بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ جا کر سیڑھیوں میں بیٹھ گئی۔ آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لیتی رہی، پھر اٹھی گھڑونچی کے پاس آئی۔ پانی کا گلاس بھرا ہونٹوں کے پاس لے جاتے ہی پیاس بجھ گئی۔ پانی پھر سے گھڑے میں ڈال دیا۔ مگر سارا نہیں۔ کچھ پانی ابھی گلاس میں باقی تھا۔ ایک گھونٹ بھرا، بظاہر سوئے سالار کی جانب دیکھنے لگی، اور ایک دم ہی اس نے باقی کا پانی اس پر پھینک دیا۔ وہ تیار ہی کہاں تھا۔ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ کنیز اس پر جھپٹی، اس کے دونوں شانوں کو سختی سے پکڑا اور بستر پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یہی طریقہ ہے تمہیں جگانے کا۔ میں کانٹوں پر چل رہی ہوں، تم مزے سے سو رہے ہو، اب میں تمہیں بھی سونے نہیں دوں گی۔"

وہ رو رہی تھی اور بار بار اس لفظ کی تکرار کر رہی تھی۔ سالار کی قمیص اس نے مضبوطی سے مٹھیوں میں بھینچ رکھی تھی۔ جیسے پھاڑ دینا چاہتی ہو۔ سالار نے اسے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔

"کنی! او کنی!" وہ اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ایک دم ہی کنی کی جنونی کیفیت غائب ہو گئی۔ بند مٹھیاں کھل گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ نیند سے جاگی ہو۔ سالار کے بازوؤں سے نکل کر اس نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ خاموشی سے اٹھی اور سیڑھیاں طے کر کے اوپر چلی گئی۔ یوں لگتا تھا یہ سب اس نے ہوش و حواس میں نہیں کیا۔

سالار سو نہیں سکا۔ وہ دیر تلک کنیز کے بارے میں سوچتا رہا، پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر کروٹ لے لی۔

"صبح ضرور کنی سے بات کروں گا۔"

رات دیر سے سویا تھا۔ صبح جلدی آنکھ نہیں کھلی، آج کنی نے اس کی پسند پر پائے منگوائے ہوئے تھے۔ پراٹھے بنائے، ناشتا اس کے کمرے میں رکھا اور خود دوبارہ چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ رات جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد وہ اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

سالار نہا کر آیا تو جلدی سے ناشتا کرنے لگا۔ پھر کتابیں اٹھا کر چلا گیا کہ اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔

اور جب وہ واپس آیا تو بھی کھانا تیار اس کے کمرے میں رکھا تھا۔

"کنی!" وہ اسے آوازیں دیتا اس کے کمرے میں آ گیا۔

"ارے تم فرش پر کیوں بیٹھی ہو؟" وہ حیران ہوا۔ کنیز نے اس کی طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ بھی آ کر اس کے برابر میں نیچے بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا تھا، وعدہ کرو برا نہیں مانو گی۔"

"ایسی بھلا کیا بات ہے۔" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب اسے بھول جاؤ۔"

"کسے؟" وہ سمجھی نہیں۔

"وہی، جس کے نام پر اتنے سالوں سے بیٹھی ہو۔ تم تو کہتی رہی ہو۔ وہ پاکستان آ گیا تھا۔ تم نام بتاؤ۔ میں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ اس کی جانب سے رخ پھیر کر دیوار پر لگے کلینڈر کو دیکھنے لگی۔

"بتاؤ کیا نام تھا اس کا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟" اسے متوجہ کرنے کو ہاتھ شانے پر رکھ کر اسے بلایا۔

"بولتی کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں؟" تھکے تھکے لہجے میں آہوں کا طوفان تھا۔

"جو پوچھ رہا ہوں، جواب دو نا اس کا۔"

"جس سوال کا کوئی جواب ہے ہی نہیں، اس کا جواب کیسے دوں۔"

"کیا مطلب؟ تم کھل کر کیوں نہیں بات کرتیں۔" اس پر جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔

"بات یہ ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، وہ کہیں نہیں، نہ پاکستان میں نہ ہندوستان میں۔"

وہ چہرا ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔

"تو کیا شہید ہو گیا تھا، ہیں کنی پھر تم نے اتنی دیر یہ جھوٹ کیوں بولا۔؟"

"میں نے کہا ناں، وہ تھا ہی نہیں۔" آنسو بھرے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اس نے ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سخت حیران تھا۔

"لوگوں سے کیا کہتی، کیسے عزت سے جی پاتی تمہیں اور خود کو باعزت رکھنے کے لیے میں نے یہ جھوٹ بولا تھا کہ جانتی تھی عورت کے سر پر سائبان نہ ہو تو لوگ سر کی چادر بھی کھینچ لیتے ہیں۔"

''کنی!'' اس نے احترام اور جذبات سے بوجھل آواز میں اس کا نام دھرایا، پھر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

''کاش میں جوان ہوتا۔ تب تمہیں بے سائبان نہ رہنے دیتا۔''

''یہی تو دکھ ہے سالار! کہ تم جوان نہیں تھے، میری قسمت ہی خراب ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں تمہاری شادی بہت دھوم دھام سے کروں گا۔ تم اب میری ذمہ داری ہو۔''

''نہیں سالار! میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔'' وہ ایک دم اس سے الگ ہوئی اور اٹل لہجے میں بولی۔

''کیوں؟ کیوں نہیں کروگی تم شادی؟''

''بس کہہ جو دیا نہیں کروں گی۔ مجھے اسی گھر میں پڑا رہنے دو۔''

''میری بات نہیں مانو گی تو خالہ سے کہہ دوں گا۔ ساری بات ان کے سامنے رکھ کر کہوں گا۔ اب کنی کو شادی کے لیے راضی کرنا آپ کا کام ہے۔''

''سالار! اگر تم نے ایسا کیا تو میں زہر کھالوں گی۔'' وہ پوری سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''کیوں تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ میں سمجھ نہیں پا رہا؟''

''وقت آنے پر سمجھا دوں گی۔'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

سالار بھی اپنے کمرے میں آ گیا، کھانا کھانے کے دوران اسی کے بارے میں سوچتا رہا، پھر اٹھ کر صحن میں آیا۔ سیڑھیاں طے کیں اور چھت پر چلا گیا۔ شام کو کنی صحن میں چھڑکاؤ کے بعد گملوں میں لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ تب خالہ چلی آئیں۔ آتے ہی سالار کے بارے میں پوچھا۔

''ابھی ابھی باہر نکلا ہے۔''

''پڑھتا بھی ہے یا سارا دھیان سیر سپاٹوں کی طرف ہی ہے۔''

''پڑھنے جاتا ہے، مگر پتا نہیں کیا پڑھتا ہے۔'' وہ مسکرا دی۔

''میری مانو تو کہیں بات وات چلاؤ اس کی۔''

اور پانی کا ڈول کنیز کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ وہ پریشان نظروں سے خالہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''اوہو! تم تو ذرا سی بات پر ہول اٹھتی ہو۔ میں کہتی ہوں جب بچہ تھا تب ہی قابو میں کیوں نہ رکھا۔ اس وقت تمہارا خوف دل میں بیٹھ جاتا تو جوان ہونے پر بھی آنکھ نہ اٹھا پاتا تمہارے سامنے۔''

''کیا ہوا ہے خالہ؟'' اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا۔ ابھی تو خیر ہی ہے۔ پر لگتا ہے کچھ نہ کچھ گل ضرور کھلائے گا۔ ہے بھی تو ایسا جوان، اتنا سوہنا۔ دامن بچائے تو بھی ہاتھ بڑھتے ہیں اس کی جانب۔

اے یہ تو کھلی حقیقت ہے آج کل کی لڑکیاں بھی بڑی بے شرم ہوگئی ہیں۔ کچھ یہ ہے مزاج کا شوخ۔ تمہارے خالو بتا رہے تھے، کچھ لوگوں نے ان تینوں دوستوں کی شکایت کی ہے، وہ دونوں تو ہیں ہی پرلے

درجے کے آوارہ۔ میرا مشورہ ہے سالار کو نکیل ڈال دو۔ کر دو کہیں اس کی بات پکی۔ ایک آدھ سال بعد شادی کر دینا۔''

''خالہ! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، دیکھنے میں بڑا لگتا ہے مگر ابھی کم عمر ہے۔'' کنیز نے بڑی دقت سے کہا تھا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

''ارے بٹی! تو ساری بات دیکھنے کی ہی تو ہے۔ اب جوان دکھنے لگا ہے تو سمجھو ہو بھی گیا ہے۔ یہ تو ہم تم ہیں ناں کہ اسے بچہ سمجھتے ہیں۔ کبھی گلی محلے والوں سے اس کے کارنامے پوچھو۔ سینما وہ دیکھتا ہے، ہوٹلوں میں جا کر وہ بیٹھتا ہے۔ تھڑوں پر اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے، اور تو اور اسکول آنے جانے والی کچھ بدتمیزی چھوکریوں سے ہلسی مذاق کا بھی سنا ہے، مگر اس بات پر پکی بات ہے یقین نہیں آیا۔ ضرور یہ حرکت واجد اور صابر کم بخت کی ہوگی۔ ساتھ میں بدنام سالار بھی ہے۔ سچ ہے بروں کی دوستی سے بچنا چاہیے۔''

خالہ جتنی دیر بیٹھی رہیں، ادھر ادھر کے قصے سناتی رہیں۔ مگر خود اس پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ ان کی باتوں پر دھیان ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ وہ گئیں تو کنیز دروازہ بند کر کے صحن میں چارپائی پر لیٹ گئی۔ یہ وقت بھی تو آنا تھا۔ لوگ مجھے تمہاری شادی کے لیے کہیں گے اس بارے میں تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

سالار! تم میرے ہو، اس رشتے سے انجان ہو تو کیا ہوا، تم ہو تو صرف میرے لیے۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکوں گی...... کہ کہ......''

اس کی سوچ نے پلٹا کھایا۔

''کیا ہم دونوں یونہی تمام عمر گزار دیں گے میں اسے کبھی نہیں بتاؤں گی۔ میں سالار پر ظلم توڑوں گی۔ ہاں یہ ظلم ہی تو ہوگا۔ اتنا خوبرو لڑکا برباد ہو جائے گا، اور کیا واقعی وہ برباد ہو جائے گا۔ نہیں اتنا تو جذباتی ہے، اگر ذہن میں شادی کی سما گئی، پھر میں کون ہوں گی اسے روکنے والی، وہ تو کر کے رہے گا۔ اسے بتا دینا چاہیے کہ میں اس کی کون ہوں، مگر کیسی بتاؤں کیا کہوں میں اس سے، اور سن کر اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیا وہ ایسی بات قبول کر پائے گا۔ کتنا حیران ہوگا، یہ بات سن کر اسے جھٹکا لگے گا کیا سوچے گا، جسے اتنی عزت دیتا آیا ہوں وہ میرے نکاح میں ہے، میری دسترس، میری بیوی کنیز کو ایسا سوچنا بھی بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ بھلا سالار سے کیسے کہہ سکتی ہوں یہ بات۔

پھر اسے خیال آیا، کیا سالار کو وہ تقریب یاد نہیں، جب حلوائی نے بہت سی مٹھائی بنائی تھی۔ ماموں کے گھر مہمان آئے تھے، سالار کو اچھے کپڑے پہنائے گئے تھے، نکاح کا وہ دن اسے کچھ تو یاد ہوگا۔ آخر آٹھ سال کا تھا۔ یہ۔ اگر اسے وہ بات یاد آ جائے تو پھر باقی سب بتانا۔ تھوڑا آسان ہو سکتا ہے۔ اس نے گلے سے تعویذ اتارا اور سالوں پہلے لگے ٹانکے کھولنے لگی۔ ذرا دیر کے بعد نکاح نامہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

نکاح نامہ اس نے سالار کی پڑھنے والی میز پر رکھ دیا، کتابیں اٹھانے یا پڑھنے کے لیے بیٹھتے بڑے

آرام سے اس کی نظر پڑ سکتی تھی، مگر وہ چند منٹ ہی اسے وہاں رکھ سکی، پھر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی، اور کپڑوں والے صندوق میں رکھ دیا۔ بار بار یہی خیال آتا تھا۔ جب سالار کے علم میں یہ بات آئے گی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ رات وہ دیر تک جاگ کر اس کا انتظار کرتی رہی۔ یہ سوال بھی ابھرتا، وہ آئے گا تو بھلا میں کیا کہوں گی آخر؟ میں اب تک کیوں جاگ رہی ہوں۔ مجھے سو جانا چاہیے، لیکن سو نہیں سکی، انتظار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ رات کا ایک بج گیا۔ تب وہ انتظار کرتے کرتے تھک کر سیڑھیوں میں بیٹھی ہی سو گئی۔

☆......☆......☆

"یہاں کی دنیا کچھ اور طرح کی تھی، حالانکہ یہاں بھی گلیاں تھیں۔ مکان تھے، مگر پھر بھی کوئی بات تھی جو صاف پتا دیتی تھی۔ یہاں کے مسکن اور طرح کے ہیں۔ وہ اور واجد پہلی بار آئے تھے۔ صابر دو مرتبہ آ چکا تھا۔ مگر واقفیت کسی سے نہ تھی، انہوں نے شمو بائی کے کوٹھے کا پتا پوچھا اور ڈرتے ہوئے آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر آ گئے، باہر سے یہ عمارت خستہ حال اور کافی گندی تھی، مگر اندر ماحول ہی اور تھا۔ ان سے پہلے یہاں تین آدمی اور بیٹھے تھے۔ ابھی محفل شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ تین لڑکے، شمو بائی نے ان پر خاص توجہ نہیں دی کہ اس قسم کے لڑکوں کو خوب سمجھتی تھی۔ جیب میں چند پیسے ہوتے ہیں، اور آ جاتے ہیں ناچ گانا دیکھنے۔

ایسے گاہک کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں ہوا کرتے تھے۔ ذرا دیر کے بعد نینو اور گڈی آ گئیں۔ نینو ناچنے میں ماہر تھی، جب کہ گڈی صرف گایا کرتی تھی۔ اس کے بدن میں وہ لوچ نہیں تھی جو ناچ کے لیے ضروری ہوتا ہے باقی آواز اچھی تھی۔ جب کہ گڈی اچھا ناچتی تھی۔ آواز کی خوبی سے محروم تھی۔

وہ زری کے لیے آئے تھے، مگر لگتا تھا آنا بے کار ہی گیا۔ "یہیں کا کہا تھا نا اس نے" صابر سالار کے کان میں پوچھ رہا تھا "ہاں یار! کہا تو یہی تھا۔ پتا نہیں کہاں رہ گئی۔"

رات کا ایک بجنے کو تھا، ان کی جیبیں خالی ہو چکی تھیں۔ انہیں یہاں کے ادب آداب کا پتا نہیں تھا، نہ ہی کہیں کے رئیس تھے کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شمو بائی سے براہ راست زری کے بارے میں پوچھ لیتے سالار مایوس ہو کر اٹھا تو دونوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔

"کیا ہے یار؟" اتنا مزا آ رہا تھا۔ دونوں اس سے الجھ رہے تھے، وہ بگڑا بگڑا سا سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ غصہ تھا زری پر، اگر بلایا تھا تو آئی کیوں نہیں۔ کہیں اس نے مجھ سے مذاق تو نہیں کیا۔

"شی، اے سنو" ہلکی سی آواز میں کسی نے پکارا تھا۔ وہ دونوں دوستوں سے آگے تھا اور لکڑی کے اس زینے کے نزدیک تھا جو اوپر کی طرف کہیں جاتا تھا۔ آواز اس تاریکی میں ڈوبے زینے سے ابھر رہی تھی۔ وہ رک گیا اور اسی سمت دیکھنے لگا۔ کسی نے دیا سلائی روشن کی اور اب زری کا چہرا اس کے سامنے تھا۔

"زری تم!" وہ ساری کوفت بھول گیا اور کھل اٹھا۔

"کل صبح کو راوی پر آ جانا۔ وہیں ملیں گے۔"

"صبح کو کتنے بجے؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"نو بجے آ جانا، اب جاؤ۔" وہ تیزی سے واپس چلی گئی۔

"کیا کہتی تھی؟" دونوں اسے دیکھ چکے تھے۔

"ابھی چلو۔ باہر چل کر بتاتا ہوں۔" وہ یہاں سے جلدی نکل جانا چاہتا تھا۔

باہر آ کر ساری بات دوستوں کو بتائی۔

"لگتا ہے میری جان لڑکی تم پر فریفتہ ہوئی ہے۔" واجی ہنس رہا تھا۔

"وہ مجبور لڑکی ہے، اس ماحول کی ہے نہیں۔ اسے قبول نہیں کر پائی۔ مجھے اس کی مدد کرنا چاہیے۔"

سالار سنجیدہ تھا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

☆......☆......☆

وہ گھر آیا تو کنی سیڑھیوں میں بیٹھی سو رہی تھی، پہلے جگانے کو اس کے قریب آیا، پھر یہ سوچ کر کہ اتنی دیر سے گھر آنے پر باز پرس کرے گی، واپس ہو گیا۔ رات بہت بیت چکی تھی، اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس جگہ کا ایک ایک منظر نظر کے سامنے آ جاتا اور آخر میں دیا سلائی کی مدھم روشنی میں زری کا خوبصورت چہرا، اس کا راوی پر بلانا، جہاں بار بار ان سوچوں میں ڈوبتا ابھرتا رہا، وہاں سیڑھیوں میں بیٹھے اس کا انتظار کرتے کرتے سو جانے والی کنی بھی اس کی توجہ کھینچتی رہی۔

صبح وہ پھر جلدی میں تھا۔ کنی نے ایک دو باتیں بھی کیں، جن کا جواب ہوں ہاں سے زیادہ نہیں ملا۔

"کہاں گم ہو تم؟" جھلاہٹ بھرے انداز میں اس کا شانہ پکڑا۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"میں پوچھ رہی ہوں۔ رات کتنے بجے آئے تھے؟"

"پتا نہیں وقت تو نہیں دیکھا تھا میں نے۔" وہ جلدی جلدی ناشتا کرنے لگا۔

"کہاں رہتے ہو، اتنی رات گئے تمہیں کچھ احساس نہیں، لوگ کتنی باتیں بناتے ہیں، اور وہ جو تم نے دوست بنا رکھے ہیں، بھلا وہ اس قابل ہیں کہ ان سے دوستی کی جا سکے۔"

"بچپن سے ہم سب ساتھ ساتھ ہیں۔ اب دوستی توڑ دوں۔" اس نے برا ماننے کے انداز میں کہا۔

"بری صحبت سے بچنا ہی چاہیے۔ رات کو دیر تک باہر رہتے ہو۔ سونے کو وقت کم ملتا ہے۔ نیند پوری نہیں ہوگی تو پڑھائی کیا خاک ہوگی۔"

"اچھا آئندہ پڑھائی پر توجہ دوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج کیا پکاؤں دوپہر کو؟" وہ پوچھنے لگی۔

"آج بھی مجھ سے پوچھ کر پکایا ہے، جو جی چاہے پکا لو۔" اس پر عجلت سوار تھی۔

"آج پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دو۔"

"اچھا پھر گوبھی، شلجم پکا لو۔" اس نے کچھ زچ ہو کر کہا تھا۔

''اس موسم میں نہ شلجم ہوتے ہیں نہ گوبھی۔'' وہ ہنس پڑی۔

''کہہ جو رہا ہوں، اپنی مرضی سے پکا لو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔'' وہ کمرے میں گیا، فائل اٹھائی اور باہر کی راہ لی۔

واجی اور صابر اس کے منتظر گلی سے آگے بازار میں بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی ساتھ ہو لیے اور تینوں کا رخ راوی کی طرف تھا۔

''وہ آ تو جائے گی ناں؟'' صابر کہہ رہا تھا۔

''وہ زری کے دیے ہوئے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گئے تھے۔ اس وقت یہاں پر خاموشی اور کچھ ویرانی کا سا تاثر تھا۔ رونق یا تو صبح سورج نکلنے سے پہلے ہوا کرتی تھی، جب جادو، ٹونا کرنے والے اور ان کا توڑ کرنے والے۔ ورزش اور سیر کے شوقین یہاں آیا کرتے تھے، یا پھر شام کو لوگ سیر کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ زری دیے ہوئے وقت سے دس منٹ پہلے ہی آ گئی۔ سالار پر نظر پڑی تو چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''یہی سوچ رہی تھی، پتا نہیں تم آؤ گے بھی یا نہیں۔''

''اور مجھے پورا یقین تھا، تم ضرور آؤ گی۔''

''یہ اعتماد تو تمہارا اپنی ذات پر ہے، تم جانتے ہو، تم سے دھوکا نہیں کیا جا سکتا۔''

وہ اکیلی نہیں تھی۔ نینو بھی! اس کے ساتھ تھی۔ یہاں آ کر دانستہ الگ ہو گئی تھی۔ صابر اور واجی بھی ایک طرف جا بیٹھے۔ یہ دونوں باتیں کرتے کرتے کنارے کے بالکل نزدیک آ گئے اور یہاں بیٹھ گئے۔

''میں کل شام صرف تمہاری خاطر وہاں گیا تھا مگر اتنی دیر بیٹھنے کے باوجود تم سامنے نہیں آئیں۔''

''تمہارے سامنے محفل سجانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں تمہاری موجودگی میں نہیں گا سکتی تھی، یہ سوچ کر ہی دل بند ہونے لگتا تھا۔ میں شرم اور غیرت سے مرنے لگتی تھی کہ تمہارے سامنے میں تماشائیوں میں گھری نغمہ سرائی کروں گی، اور تم تماش بینوں میں شامل ہو گے۔ کل میں نے سب سے نظر بچا کر اچار کھا کر پانی پی لیا تھا۔ میرا گلا گانے کے قابل ہی نہیں رہا، اور میں اس عذاب سے بچ گئی۔''

''مجھے وہاں آنا اچھا نہیں لگا۔ یہ خیال کہ تم اس ماحول میں رہتی ہو۔ مجھے غصہ بھی دلاتا تھا اور افسردہ بھی کرتا تھا۔''

''کیا بتاؤں کیسے زندگی گزرتی ہے وہاں مجھ جیسی لڑکیوں کی، یہ خیال کہ میں عزت دار گھرانے کی بیٹی ہوں، اور آج کوٹھے پر بیٹھی ہوں، مجھے اتنی اذیت سے دوچار کرتا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ میں نے دو بار خودکشی کی کوشش کی، مگر تقدیر میں رسوائی لکھی ہے، میں مر نہیں سکی۔ یہ لڑکی نینو، یہ شمو بائی کی بیٹی ہے، مگر ماں سے بہت مختلف، کوٹھے کی پیداوار ہونے کے باوجود یہ دل میں میرے لیے ہمدردی رکھتی ہے، اسے میرے دکھ کا احساس ہے۔ شمو بائی مجھے کبھی یہاں نہ آنے دیتی، مگر نینو کی وجہ سے اس نے مجھے نہیں روکا۔ میں تھوڑے سے وقت کے لیے یہاں آ گئی ہوں۔''

''تھوڑے سے وقت کے لیے؟'' سالار نے بے چین ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

''ہاں سالار! بہت مجبور ہوں میں۔'' اس نے سالار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور آنسو بھری آنکھوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں زری! تمہیں اس عقوبت خانے سے ضرور نکالوں گا۔ میں تمہیں باعزت زندگی دوں گا۔ تم پھر سے عزت دار کہلاؤ گی۔''

''بہت آئے ایسے وعدے کرنے والے مگر وفا نہیں کر پائے، مگر دل کہتا ہے تم پر یقین کر لوں۔ تم وعدہ کر کے پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہو۔''

''ہاں زری۔! وعدہ کیا ہے تو پورا کروں گا۔ اب راہ کی کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاؤں گا۔''

''زری! اب چلو بہت دیر ہو رہی ہے۔'' نینو آوازیں دے رہی تھی۔

زری نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی، جانے کی اجازت چاہی۔ سالار نے ہاتھ میں اس کا نرم و نازک ہاتھ تھاما اور ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا۔ ''اگلے پیر پھر یہیں ملیں گے۔'' دونوں لڑکیاں چلی گئیں۔ یہ تینوں یہیں کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

''کیا کہتی تھی؟'' صابر اور واجی جاننے کو بے تاب تھے۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ شادی کروں گا تو زری سے۔'' سالار کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

''سالار! تم تو جذباتی ہو رہے ہو۔'' اس حد تک پہنچنے کی توقع ان دونوں کو نہیں تھی۔

''کچھ بھی کہو مگر اب یہی میرا فیصلہ ہے۔''

''سالار! وہ عمر میں تم سے بڑی ہو گی۔'' واجد نے احساس دلانا چاہا۔ وہ ہنس دیا اور بولا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، محبت عمر، حسب نسب کچھ نہیں دیکھتی۔ یہ تو دل کے سودے ہوتے ہیں۔''

''اچھا طرح سوچ لو، ایسا نہ ہو۔ بعد میں پچھتانا پڑے۔''

''ایسے معاملات میں سوچنا کیسا۔'' وہ سرشاری میں بول رہا تھا۔

''تمہیں تو کالج جانا ہو گا۔'' صابر کو اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل دیکھ کر خیال آیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے پھر تم جاؤ، ہم دونوں بھی حکیم کے ڈیرے پر چلتے ہیں۔''

ان کے جانے کے بعد سالار پھر یہیں آ کر بیٹھ گیا۔ جہاں کچھ دیر پہلے زری کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اب پڑھنے کو کس کا جی چاہتا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہا، پھر وہاں سے اٹھا تو لارنس گارڈن آ گیا۔ زری خیالوں ہی خیالوں میں اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ شام تک وہ اس کے تصور سے باتیں کرتا رہا۔ یاد ہی نہیں رہا کنیز گھر پر اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اور آج دوپہر نسرین سے بھی ملاقات کا وعدہ تھا۔

کنیز نے دوپہر کو اس کا انتظار کیا۔ سوچ کر غصہ بھی آیا کہ پھر واجی اور صابر کے ساتھ نکل گیا ہو گا۔ برآمدے میں سلائی مشین رکھے وہ خالہ کا جوڑا سیتی رہی۔ شام کے چار بج گئے۔ تب اس نے اٹھ کر گلی

میں جھانکا اس وقت یہاں ماؤں سے نظر بچا کر گھروں سے نکلنے والے بچے ہی کھیل رہے تھے۔ لڑکیوں نے چبوتروں پر گڑیا گھر سجا رکھے تھے۔ کوئی گھر سے چاول چرا لائی تھی تو کوئی دودھ اور شکر۔ اور اب گڑیا کی شادی ہو رہی تھی۔ لڑکے گلی ڈنڈا اور چند دوسرے کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔

''بات سنو، تم لوگوں نے سالار کو تو بازار یا گلی میں نہیں دیکھا۔'' چق اٹھا کر ادھر ادھر جھانکا، سالار یا اس کے دوستوں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا تو بچوں سے پوچھنے لگی۔ سب نے نفی میں جواب دیا۔

''اچھا جا میرا ویر! ذرا دوڑ کر بازار میں دیکھ کر آ سالار تو نہیں بیٹھا کہیں پر؟''

''کیا ہے کنی باجی! ہمیں کھیلنے دو ناں۔'' بچے اپنے دلچسپ اور ضروری کھیل چھوڑ کر جانے پر بھلا کیسے راضی ہو سکتے تھے۔

''جاناں ایک آنہ دوں گی۔'' اس نے لالچ دیا۔ تب دو بچے جانے کے لیے راضی ہو گئے۔

وہ یہیں چق کے پیچھے کھڑی انتظار کرتی رہی، اور بچیوں بچوں کے کھیل دیکھتی رہی۔ ذرا دیر کے بعد بچوں نے آ کر بتایا۔ ''سالار تو کہیں بھی نہیں۔''

''کہاں رہ گیا وہ؟'' اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''باجی! ہمارا اک آنہ۔'' بچوں نے یاد دلایا۔ وہ اندر آئی، مشین میں رکھے پیسوں میں سے پیسے نکالے، اس کے بعد کھونٹی سے اپنا کالا برقعہ اتارا اور پھر ادھر آ گئی، بچوں کو پیسے پکڑائے، برقعہ پہنا اور ان سے یہ کہہ کر کہ ''ابھی آ رہی ہوں ذرا گھر کا خیال رکھنا۔''

وہ گلی میں آ گئی۔ رخ واجد کے گھر کی جانب تھا۔ یوں تو گھر ساتھ ساتھ تھے، چھتوں سے چھتیں ملی ہوئی تھیں، لیکن واجد کے گھر کا دروازہ دوسری گلی میں تھا۔ جب وہ وہاں پہنچی تو واجد کی ماں اور بھابی سویاں بٹ رہی تھیں، سامنے کپڑا۔ بچھا رکھا تھا اور اس پر بٹی ہوئی سویاں کافی زیادہ تھیں، گویا کام ختم ہونے والا تھا۔

''سلام خالہ! سلام بھابی!''

''آؤ بھئی کنی؟ آج تم کیسے راستہ بھول پڑیں۔'' دونوں نے مسکرا کر سواگت کیا، پھر خالہ بولیں۔

''میں نے کئی بار سالار سے کہا، کنی سے کہو۔ کبھی ہماری طرف بھی چکر لگا لیا کرے۔ سارا دن گھر میں کیا کرتی رہتی ہے۔''

''خالہ! میں سالار کا پتا کرنے ہی آئی تھی، صبح کا گھر سے نکلا ہے اب تک اس کا کوئی پتا ہی نہیں۔ خالہ! آپ ہی سمجھاؤ ان لڑکیوں کو، اب یہ آوارہ گردی چھوڑ دیں۔''

''اے بٹی! یہ کسی کی سنیں تب ناں۔ سالار تو پھر بھی بہت بہتر ہے، اپنی پڑھائی تو مکمل کر رہا ہے، جب کہ واجی؟ اسے تو کوئی ہوش نہیں، نہ پڑھائی سے مطلب ہے اور نہ ہی کوئی کام کرتا ہے۔ باپ اور بھائی کہہ کہہ کر تھک گئے کہ دوکان پر بیٹھا کرو۔ مگر مجال ہے، جو اس لڑکے پر اثر ہو۔''

''کنی! تم کہہ رہی تھیں، سالار ابھی تک گھر نہیں آیا۔'' بھابی نے خالہ کے دکھڑوں کے درمیان اسے مخاطب کیا۔

''ہاں، ہاں بھابی! صبح کا نکلا واپس نہیں آیا۔ پتا نہیں اس وقت کون سا کالج لگتا ہے، اس کے لیے۔''
آج اسے سالار پر غصہ بھی آ رہا تھا اور فکر بھی تھی کہ جانے کہاں رہ گیا ہے۔

''واجد تو دوپہر کو گھر آ گیا تھا، اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ہی کہیں نکلا ہے۔''

بھابی کی بات نے کنیز کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔

''یہی تو دونوں دوست ہیں۔ اس کے ہر جگہ ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، واجد گھر آ چکا ہے، اب بھائی کے ساتھ نکلا ہے تو پھر سالار کہاں رہ گیا ہے؟''

''تم صابر کے ہاں پتا کرو، شاید اس کی بیٹھک میں بیٹھ گیا ہو۔'' خالہ نے مشورہ دیا۔

''ہاں۔ ایک تو صابر کی بیٹھک نے لوگوں کو بڑا خراب کیا ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے تاش کھیلتے ہوئے وہاں کچھ لڑکے لڑ پڑے تھے۔ وہ تو بڑوں کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ورنہ بات تھانے تک پہنچ رہی تھی۔'' کنیز کو ان سب باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اسے تو صرف سالار کی فکر لگی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے بیٹھنے کو کہا مگر وہ پھر آؤں گی، کہہ کر چلی آئی۔ اب اس کا رخ صابر کے گھر کی طرف تھا۔

صابر کی اماں صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد اب جھاڑو لگا رہی تھی، چھوٹا سا صحن سامان سے اٹا ہوا تھا، اس پر مزید یہ کہ مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ جھاڑو لگانے میں کافی وقت لگ رہا تھا۔

''سلام خالہ!'' کنی نے ان کی محنت و مشقت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اے وعلیکم۔ آؤ کنی! اندر آ جاؤ۔'' وہ جھاڑو چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، اور اسے اندر کمرے میں لے آئیں۔ جہاں صابر کی بہن جمیلہ اور اس کے ساتھ نسرین موجود تھی۔ جمیلہ تو خیر اٹھ کر ملی ہی، نسرین کا ملنا اور استقبال غیر معمول تھا۔ وہ تو اس سے لپٹ ہی گئی تھی۔

''کیسی ہو نسرین؟'' نسرین کے ساتھ اس کی کوئی ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔ کبھی محلے کی کسی تقریب میں ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ یا ایک دو بار عید، شب برات پر جمیلہ کے ساتھ وہ ان کے ہاں آئی تھی۔

''ہائے باجی! تمہیں دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔'' نسرین ایک بار پھر اس سے لپٹ گئی۔

''کنی باجی! میں بتا نہیں سکتی کہ آپ مجھے کتنی اچھی لگتی ہو۔ ہائے میں تو اتنا یاد کرتی ہوں آپ کو۔''

''تو آ جایا کرو ناں میرے گھر پر۔ اکیلی ہی تو ہوتی ہوں میں۔ سارا دن، اور گھر کون سا دور ہے ہمارا؟''

''بس باجی! وقت ہی نہیں ملتا۔'' نسرین کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ آئی اور لہجہ ذرا دھیما ہو گیا۔

''ہٹو بھی نسرین! کنی آپا کو بیٹھنے تو دو۔'' جمیلہ نے ہاتھ پکڑ کر کنیز کو پلنگ پر بٹھایا اور بولی۔

''آپا! میں کتنے دنوں سے تمہاری طرف آنے کا سوچ رہی تھی۔ ایک ٹانکا پوچھنا تھا مجھے۔''

''تو آ جاتی۔ سوچنے میں اتنے دن کیوں لگا دیے۔''، پھر نسرین سے بولی تم بھی آنا۔

اور نسرین بی بی ایک بار پھر شرما گئیں۔

''جمیلہ! صابر گھر پر ہے یا نہیں؟''

''اس وقت تو گھر پر نہیں۔ کیوں خیر تو ہے ناں آپا؟''

''سالار ابھی تک گھر نہیں آیا۔ صبح کالج جانے کے لیے نکلا تھا، دیکھو تو اب کیا وقت ہونے کو آیا ہے۔ میں پہلے واجی کے گھر گئی تھی۔ پتا چلا۔ وہ تو دوپہر کو گھر آ گیا تھا اور اب بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کہیں نکلا ہے، پھر میں نے سوچا شاید صابر اور وہ کہیں نکل گئے ہوں۔ اسی کا پتا کرتی ادھر آئی ہوں۔''

''صابر بھائی تو دوپہر کو گھر پر ہی تھے آپا!'' یہ کہہ کر اس نے کنیز کو اور بھی پریشان کر دیا۔

''تمہیں اچھی طرح یاد ہے وہ گھر آیا تھا، اکیلا ہی تھا یا ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

''اکیلے ہی تھے، دو گھنٹے تک سوئے رہے، پھر ابھی کچھ دیر پہلے ہی باہر گئے ہیں۔''

''کہاں رہ گیا سالار؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھو ناں آپا! اتنے دنوں کے بعد تو آئی ہو۔''

''نہیں۔ اس وقت دل ٹھکانے پر نہیں، پھر آؤں گی۔''

''کنی بیٹا! بیٹھ ناں میرا کام بھی بس ختم ہو گیا ہے۔'' صحن میں آئی تو صابر کی ماں نے کہا۔

''نہیں خالہ! اس وقت بڑی جلدی میں ہوں۔ ایک کام سے آئی تھی، پھر کبھی سہی۔''

وہ جلدی سے گلی میں آ گئی۔

''کروں تو کیا کروں، یہ سالار ضرور مجھے پاگل کر دے گا۔'' گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ سوچا خالہ کے گھر چلی جاتی ہوں۔ خالو سے کہوں گی، کہیں ادھر ادھر تلاش کریں۔ بیٹھا ہوگا بازار میں، کسی دکان پر۔ یا کسی کی بیٹھک میں۔

خالہ کے گھر جانے سے پہلے ہی گلی میں دو تین لڑکوں کے ساتھ سالار اسے کھڑا نظر آ گیا۔ ایک بچے کو اس پیغام کے ساتھ اس کے پاس بھیجا کہ کہنا تمہیں گھر بلا رہے ہیں۔ خود گھر کی طرف بڑھ گئی۔

برقعہ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

دیکھو تو آج کتنا پریشان کیا اس نے مجھے پہلے تو کالج سے آ کر کھانا کھاتا ہے، کچھ آرام کرتا ہے، پھر یار دوستوں میں جاتا ہے، مگر آج تو گھر آنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی، لگتا ہے بہت بے زار ہو گیا ہے گھر سے۔ اس خیال پر وہ رکی۔ گھر سے اس کا مطلب ہے مجھ سے۔ اس پر ایک دم ہی یاسیت طاری ہو گئی۔

سوچا تھا آج وہ گھر آئے گا تو خوب باز پرس کرے گی، اسے اس کی غیر ذمہ داری کا احساس دلائے گی، مگر اب اس خیال نے سارے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے سالار اس سے بھاگ رہا ہے۔ وہ اسی لئے گھر نہیں آتا کہ یہاں کنی رہتی ہے، میرا وجود اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ خیال بڑی شدت کے ساتھ اس پر حاوی ہونے لگا۔ جب سالار گھر آیا تو وہ اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ یہاں تک کہ اٹھ کر کھانے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا۔ اپنے کمرے میں بیٹھی بستر کی چادر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

وہ گھر آئے اور کنی اپنے کمرے سے ہی نہ نکلے۔ یہ بات غیر معمولی تھی۔ سالار کپڑے بدل کر ادھر آ گیا۔

''کنی!'' اس نے پکارا۔ کنیز نے تھوڑا سا رخ موڑ کر خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم ناراض ہو مجھ سے؟ آج مجھے آنے میں دیر ہو گئی ہے، تم خفا ہو، ہے ناں!'' وہ اس کے برابر میں آ بیٹھا۔ کنی ایک بار پھر چادر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''میں پڑھنے کے لیے ایک دوست کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا تھا۔ بس اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔'' اس نے جھوٹ بول کر اسے مطمئن کرنا چاہا۔ کنیز کے دل میں آئی اسے قسم دے کر پوچھے۔

''سچ سچ کہو سالار! تم مجھ سے بھاگ رہے ہو ناں؟'' مگر پھر یہ خیال آیا، اگر اس نے کہہ دیا۔

''ہاں میں واقعی تم سے دور رہنا چاہتا ہوں، قریب آتے ہوئے یہ ڈر ہے کہ تمہارے وجود کی اداسیاں مجھ سے بھی چمٹ جائیں گی۔ میرے اندر بھی ڈیرے ڈال لیں گی۔ میں تمہارے قریب آتے ہوئے الجھن محسوس کرتا ہوں۔'' تو پھر میں کیا کروں گی، کیا رہ جائے گا میرے پاس۔

''کیا سوچنے لگی ہو؟'' اس نے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے اور اس کے چہرے پر جھک کر اپنائیت سے پوچھا۔

لمبی آہ جیسی سانس کھینچ کر کنیز نے آنکھیں بند کر لیں، وہ قریب تھا، کتنا قریب وہ ہمیشہ کے لیے ان لمحوں کو محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔

''تم میرے لیے اتنی فکر مند مت ہوا کرو، دیکھو ناں اب میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں کہ تمہیں میرے کھو جانے کا ڈر ہو۔''

''جب بچے تھے، تب مجھے یہ ڈر نہیں تھا۔ اب جوان ہو تو دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔'' وہ آنکھیں موندے خوابیدہ لہجے میں بول رہی تھی۔ سالار نے اس کے شانوں پر سے ہاتھ ہٹائے، اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''کھانا میں نے نہیں کھانا۔ تھک گیا ہوں۔ ذرا دیر آرام کروں گا۔ صابر یا واجی آئیں تو کہہ دینا سات بجے میں ٹیپو کی بیٹھک میں آ جاؤں گا۔ وہیں میرا انتظار کریں۔''

''سات بجے جاؤ گے تو پھر واپسی تو رات کے ایک دو بجے سے پہلے نہیں ہوگی؟'' اس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور ذرا سنبھل بھی گئی تھی۔

سالار نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ یوں بن گیا جیسے سنا ہی نہیں اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس وقت چھ بج رہے تھے، موسم گرمیوں کا تھا۔ اس وقت بھی کافی تپش تھی۔ مگر کنیز کو چین کہاں تھا۔ کوئی کام نہ ہوتا تو بھی ڈھونڈ ڈھانڈ کر مصروفیت نکال ہی لیتی تھی۔ اب بھی کڑھائی کا فریم اور دوسرا سامان اٹھا کر برآمدے میں آ بیٹھی، مگر ہاتھوں میں لرزش تھی، ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ کوشش کے باوجود یہ کام کر نہیں سکی، دھیان بار بار سالار کی طرف جا رہا تھا پتا نہیں سو گیا ہے یا جاگ رہا ہے، اگر جاگ رہا ہے تو کیا سوچ رہا ہے۔

آخر وہ فریم رکھ کر اٹھی اور اس کے کمرے میں آ کر اسے پکارا۔

''ہوں!'' اس نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔

''اگر تم سو نہیں رہے تو میں بیٹھ جاؤں؟''

''ہاں ہاں آؤ بیٹھو'' اس نے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا، مگر آج کنیز کے انداز میں کچھ اور ہی بات تھی۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ یہ اسی بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسے تھوڑا سا پیچھے ہو کر اسے بیٹھنے کے لیے کھلی جگہ دینا پڑی۔ وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ کوئی اہم بات ہی ہوگی، جو وہ یہ جان کر بھی کہ آرام کی غرض سے لیٹا ہے اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔

''تمہیں اپنا گاؤں، اپنے والدین تو یاد آتے ہوں گے سالار۔''

''والدین بھی کوئی بھولنے کی چیز ہیں۔'' ایک سایا، یادوں کی ایک لہر سالار کے چہرے پر آتی ہوئی اس نے صاف محسوس کی۔

''تمہیں یاد تو آتے ہوں گے؟''

''تمہیں پھوپھو یاد آ رہی ہے کئی؟'' اس نے دلاسا، سہارا، اپنائیت دینے کو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کتنے پیار سے پوچھا تھا۔

''ہاں میرے لیے تو ماں بھی وہی تھی، اور باپ بھی، اور میرے سارے دکھ سکھ بھی وہی سنتی تھی۔ اسی سے کہہ کر جی کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھی۔ اب تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''ایسے مت کہو۔ کیا میں نہیں ہوں تمہارے ساتھ۔ مجھ سے کہو ناں، میں سب سنوں گا۔ تمہارے دکھوں کی بات بھی اور سکھ کی بھی۔''

وہ اب نیم دراز تھا۔ ایک ہاتھ کنیز کے بازو پر رکھے، واقعی کسی محبت کرنے والی ہستی کی طرح کہہ رہا تھا۔

''تم سچ کہتے ہو سالار؟'' اس کا دل زور سے دھڑکا اور آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''تمہیں شک کیوں ہے۔ ہم اپنے پیاروں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہم نے آگ کا سمندر پار کیا ہے۔ ہم تو دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو صرف تم ہی میری خاطر قربانی دے سکتی ہو، نہیں کئی! میں بھی تم سے ایسی ہی محبت کرتا ہوں تمہارے لیے سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔''

''سالار! تمہیں یاد ہے وہاں، گاؤں میں تم نے خرگوش پالے ہوئے تھے، اور تمہارے پاس ایک بکری بھی تھی۔''

''اچھا!'' اس نے ہلکے سے تحیر سے کہا۔

اس کا مطلب ہے اسے کچھ بھی یاد نہیں۔ کنیز کو تھوڑی مایوسی ہوئی، مگر ہمت نہیں ہاری۔

''اور تم نے اپنی بکری کا نام کئی رکھ چھوڑا تھا۔'' اس بات پر وہ ہنس پڑا۔ اور ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر بولا۔

''اب بھی اگر کبھی بکری پالی تو یہی نام رکھ دوں گا۔''

''اوں، میں تب بھی ناراض ہوئی تھی۔ نام بدلوا کر چھوڑا تھا۔''

''کیوں بھئی اتنا اچھا تو نام ہے کئی، البتہ کنیز اچھا نہیں لگتا۔''

''تمہارے گھر کے پاس ایک باغ تھا۔ تم وہاں سے کھٹے توڑ کر لاتے تھے۔''

''تم نے یہ سب سنانے کے لیے میری نیند خراب کی ہے۔'' وہ آخر کہہ ہی بیٹھا۔

''میرے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔'' کنیز ناراض ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سچ قسم کھا کر کہتا ہوں، مجھے نیند آ رہی تھی۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا اہم بات کرنے آئی ہو۔''

بات تو اہم ہی تھی، مگر وہ یہ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سالار کو سب کچھ خود ہی یاد آ جائے، اس روز گاؤں میں جو تقریب ہوئی تھی، وہ اسے یاد آ جائے، اور اس کا مفہوم بھی پا لے۔

سالار پھر آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔ کنیز کمرے میں آ گئی۔ صندوق کھولا اور نکاح نامہ نکال کر دیکھتی رہی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو یوں جلدی سے پھر اسے صندوق میں ڈال کر بند کر دیا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے لگی تھی۔ سانسوں کی ناہمواری کے ساتھ وہ بیرونی دروازے تک آئی۔ آنے والا صابر تھا، وہ سالار کے بارے میں پوچھ رہا تھا، پھر اس کے بولنے سے پہلے اس کی حالت پر ٹھٹھک کر بولا۔

''کئی باجی! تمہیں کیا ہوا ہے؟ تمہاری تو سانس سے سانس نہیں مل رہی۔''

''کام کر رہی تھی گرمی بھی بہت ہے، بس اسی لیے اور تم کیا کرنے آئے ہو...... یقیناً سالار کا پوچھنے۔''

''اللہ کے بندوں کبھی تو اسے آرام کرنے دیا کرو۔ نہیں آپا۔ آپ اس کا پتا کرنے ہمارے گھر گئی تھیں۔ میں نے سوچا۔ خیر خبر لے لوں، پتا کر لوں۔ وہ اب بھی گھر آیا ہے یا نہیں۔''

''وہ گھر آ گیا ہے اور سو رہا ہے۔ کہتا تھا شام کو ٹیپو کی بیٹھک میں جائے گا۔''

''اچھا باجی! السلام علیکم۔'' صابر واپس ہو گیا۔

کئی پھر اندر آئی، مگر اب صندوق کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی، وہ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگی۔ پھر بستر کی چادریں لپیٹتی اور صندوقوں پر ڈالے کپڑے سب دھو ڈالے۔ جب خالہ ادھر آئیں تو وہ آخری میز پوش دھو رہی تھی۔

''آئے ہائے کئی! دیوانی تو نہیں ہو گئی ہو۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو تو نے یہ سب دھوئے تھے۔''

ان کی بات پر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، خالہ! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب تو مجھے خود بھی محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ کچھ پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔''

''کئی! کیا بات ہے بیٹا! چہرا اتنا زرد کیوں ہو رہا ہے، اور یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔''

انہوں نے بڑھ کر کئی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ملنے کی دیر تھی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

خالہ کتنی دیر اسے ساتھ لگائے تسلیاں دیتی رہیں۔ خاموش کراتی رہیں۔ کافی دیر بعد سنبھلی تو وہ بولیں۔

''اب بتاؤ۔ کیوں روئی تھیں تم؟''

''خالہ! سالار میرا بالکل خیال نہیں رکھتا۔'' اس کی آواز رونے کی وجہ سے بھاری ہو رہی تھی۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولیں۔

''میری مانو تو تم اب دوسرا نکاح کر لو۔''

''نہیں خالہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ عورت کے دل کا دروازہ بار بار تھوڑی کھلتا ہے۔''

"جب تم مجھے ملی تھیں تو ہوگی کوئی چودہ پندرہ برس کی۔ اس عمر میں شوہر تم سے بچھڑا تھا۔ تب تو تمہیں سمجھ بھی نہیں ہوگی، مگر اب جوان ہو۔ اکیلی ہو۔ ایسے کیسے گزارو گی تم نکاح کرلو۔"

"وہ زندہ ہے خالہ! میرا دل کہتا ہے، میرا سہاگ ابھی سلامت ہے، پھر میں یہ گناہ کیسے کرسکتی ہوں۔"

خالہ نے پھر بات دوہرائی، ذرا دیر کو چپ ہوگئیں پھر بولیں۔

"کنی بیٹی! ایک بات تمہیں سمجھا رہی ہوں، دوسری شادی کرو یا نہ کرو، مگر دیکھو، سالار سے آس مت لگاؤ۔ وہ جس عمر سے گزر رہا ہے۔ اس میں تو اپنا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ دوسروں کا خیال کہاں رکھ سکتا ہے، اور پھر یہ تو بہت ہی لاابالی لڑکا ہے۔ اس سے امید رکھو گی تو دکھ ہی اٹھاؤ گی اور فکر کیوں کرتی ہو، میں جو ہوں تمہارے ساتھ۔"

"ہاں خالہ! آپ کا تو بہت آسرا ہے مجھے۔"

"یہ سالار ہے کہاں؟" خالہ نے پوچھا۔

"سو رہا ہے۔"

"سو رہا ہے، اے یہ کون سا سونے کا وقت ہے۔ اب تو شام ہونے کو آئی۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔"

وہ مسکرادی اور بولی۔ "کہہ رہا تھا۔ تھک گیا ہوں، ذرا دیر آرام کروں گا۔"

☆......☆......☆

نسرین سے ملاقات ہوئی کہہ رہی تھی۔ "کل صبح میں اپنی خالہ کے ہاں جارہی ہوں۔"

"میرا کوئی احساس نہیں۔" سالار نے منہ پھلالیا۔

وہ اس محبت پر اترائی اور بولی۔ "مرتے کیوں ہو۔ ایک ہفتے تک آجاؤں گی۔"

"ایک ہفتہ۔" اس نے آنکھیں نکالیں، پھر بولا۔ "مرن جوگی پھر کہتی ہو مجھ سے محبت ہے۔ ایک ہفتہ مجھ سے ملے بغیر کیسے رہ سکتی ہو، تو جاؤ پھر اب میں تم سے ملنے اتنی گرمی میں لوگوں کی چھتیں پھلانگتا نہیں آؤں گا۔"

"ہائے وے تو تو ذرا سی بات پر ناراض ہوجاتا ہے سن تو میں نے پروگرام بنایا ہے۔"

"بول۔" وہ اب بھی روٹھا ہوا تھا۔

"خالہ کی طرف جاؤں گی۔ وہاں سے راوی پر جاؤں گی، تم بھی ملنے آجانا۔"

"پہلے کبھی گئی ہو راوی پر؟"

نسرین نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہاری چھت کے برابر ہوگا کہ وہاں جاکر کھڑی ہوجاؤ گی اور میں بھی وہیں آجاؤں گا۔ اور یہ تمہیں راوی پر جانے کا اتنا شوق کیوں ہے؟"

"میں کبھی وہاں نہیں گئی۔ میری سہیلی کی منگنی ہوئی تو وہ وہاں جایا کرتی تھی اپنے منگیتر سے ملنے۔"

"مگر تمہاری تو منگنی نہیں ہوئی؟" سالار نے جیسے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"ہٹ وے۔" وہ کچھ شرمندہ سی ہوکر اسے دھکیلنے لگی۔

"نسرین! ونسرین! کہاں مرگئی ہے۔"

"چل اب جا۔ تمہاری اماں کو یاد ستانے لگی ہے۔" سالار یہ کہہ کر واپس ہوگیا۔

"اتنی گرمی میں چھت پر کیوں جاتے ہو؟" سیڑھیاں اتر رہا تھا جب کنی سے ٹکراؤ ہوگیا۔ ذرا ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔

"راتوں کو تو تم جاگتی ہی ہو۔ اب بھی نیند نہیں آئی تمہیں؟"

"ہاں مجھے نیند نہیں آتی۔ بولو ہے کوئی علاج تمہارے پاس؟" ایک ہاتھ کمر پر رکھے وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔

وہ نسرین سے مل کر آرہا تھا۔ راستے میں کنیز نے پکڑا تھا اور پوچھا بھی تھا کہ اتنی گرمی میں چھت پر کیا کرنے جاتا ہے۔ غلط کام کے بعد پکڑے جانے کا احساس، شرمندگی اور ہلکی سی گھبراہٹ اس پر طاری تھی۔ کنیز کے انداز کو نہیں دیکھا اور بولا۔

"کہو تو کسی روز ڈاکٹر کے پاس لے چلوں یا پھر تم خالہ کے ساتھ چلی جانا۔ یہیں قریبی بازار میں ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ تم ضرور علاج کراؤ۔ پتا ہے نیند کا نہ آنا بیماری ہوتی ہے۔"

وہ بولنے کے ساتھ ساتھ باقی کی سیڑھیاں اترا اور اب اس کے قریب سے ہوکر اندر کمرے میں جانے لگا۔ کنیز نے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولی۔

"بڑا آیا سیانا کہیں کا، پتا ہے مجھے بیماری ہوتی ہے اور اس کا علاج بھی اگر میں کہوں کہ جانتی ہوں، تو پھر کیا کہے گا۔"

"میں نے کیا کہنا ہے۔" بازو سے اس کا ہاتھ ہٹا کر وہ اس کے عجیب انداز پر کچھ حیرت زدہ سا اندر چلا گیا، اور کتاب لے کر بستر پر آبیٹھا۔

"سالار!" کچھ دیر بعد کنیز نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ اب مزاج نارمل لگ رہا تھا۔ اس نے کتاب چہرے سے ہٹا کر سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ اس کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہے کچھ کہنے آئی تھیں؟" اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر سالار کو پوچھنا پڑا۔

"بس ایسے ہی باتیں کرنے کو جی چاہا تھا۔"

"پھر کرو ناں باتیں۔ تم تو خاموش بیٹھی ہو۔" اس نے کتاب بند کرکے ایک طرف رکھ دی۔

"تمہیں یاد ہے وہاں گاؤں میں ایک بار میں تمہارے ہاں آئی ہوئی تھی۔"

"کیا بات ہے تمہیں گاؤں بہت یاد آنے لگا ہے۔" اس کی بات کاٹ کر اس نے کہا۔

"ہاں بہت یاد آتا ہے۔ کیا تمہیں وہ سب یاد نہیں ہے تم اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے۔ سالار آٹھ برس کے تو تھے۔"

''ہاں مگر جو سفر ہم نے طے کیا آنکھوں کے سامنے پیاروں کو مرتے دیکھا۔ راستے میں لاشیں، زخموں سے کراہتے لوگ، بے سروسامانی، بھوک اور خوف، ان سب نے مل کر مجھ پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اب جب کبھی ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہی منظر یاد آتا ہے، اور میں گھبرا کر واپس حال میں لوٹ آتا ہوں۔ مجھے ماضی مت یاد دلایا کرو۔''

''تو تم کو کچھ بھی یاد نہیں۔'' مایوس ہو کر وہ اس کے کمرے سے چلی آئی۔

''آخر کیوں کیا تھا ماما جی نے ایسا فیصلہ، اور میری ماں نے قبول بھی کر لیا۔ یہ بچپن میں طے کئے گئے رشتے کتنا دکھ دیتے ہیں۔ انسان کو، آخر مجھے اور سالار کو بڑے بھی تو ہونا تھا۔ وہ لوگ ہمارے بڑے ہونے تک انتظار کر لیتے تو آج میں یوں زخم زخم تو نہ ہوتی۔ انہیں یہ خطرہ ہوگا کہ بڑا ہو کر سالار شاید اس رشتے کو قبول نہ کرے، یہ نہیں سوچا، اگر اس کا دل نہیں مانے گا تو پھر کنیز کا کیا بنے گا۔ وہ تو زندہ درگور ہو جائے گی۔ کیوں کیا گیا ایسا غلط فیصلہ؟''

فرش پر لکیریں کھینچتی رہی اور نصیب کے اس مذاق پر روتی رہی۔

☆......☆......☆

''زری! تم تیار رہو۔ تمہیں بہت جلد میرے ساتھ چلنا ہے، تم اس جگہ پر رہتی ہو، یہ سوچ ہی میری برداشت سے باہر ہے۔''

''میں تیار ہوں سالار! تم بھی ایک بار پھر سوچ لو۔ کیا میرا ساتھ دینے پر گھر کے دروازے تمہارے لیے بند تو نہ ہو جائیں گے۔ تم اپنے لوگوں سے ہمیشہ کے لیے دور تو نہیں ہو جاؤ گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہوتا بھی، تب بھی میں تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہو جاتا۔''

''خدا نے میری دعائیں سن لی ہیں۔ تم ان التجاؤں کا صلہ ہو، جو میں نے سجدے میں گر کر خدا سے کی ہیں۔'' ''نینو ساتھ تو دے گی ناں، کہیں ایسا نہ ہو۔ تمہاری یہ بات سن کر معذوری کا اظہار کر دے۔''

''جس روز تمہارے ساتھ جانا ہوگا۔ نینو کو ساتھ نہیں لاؤں گی۔ یہ بہت اچھی سہیلی ہے میری میں نہیں چاہتی تمہارے ساتھ جانے پر اس سے باز پرس ہو۔ اور وہ لوگ اسے تشدد کا نشانہ بنائیں۔''

''پھر تم کیسے آؤ گی؟ کیا وہ تمہیں اکیلے نکلنے دیں گے؟''

''میں تمہاری خاطر آگ کا سمندر بھی پار کر سکتی ہوں، جس وقت کہو گے، جہاں کہو گے، میں آ جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے، پھر اگلی ملاقات پر وہاں سے ہمیشہ کے لیے نکلنے کے ارادے کے ساتھ آنا۔''

سالار آج اکیلا اس سے ملنے آیا تھا۔ صابر اور واجی ساتھ نہیں تھے۔ وہ نینو کے ساتھ چلی گئی، تو یہ بھی گھر آ گیا۔ کنی گھر نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر کے چبوترے پر کھڑا گلی میں کھیلتے بچوں کو دیکھتا رہا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کنیز آ گئی۔

''تم کہاں گئی تھیں۔ کب سے انتظار کر رہا ہوں میں۔''

''میں واجد کی طرف گئی تھی۔ یہ لو تم بھی کھاؤ۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی لڈوؤں کی پلیٹ سامنے کر دی۔

''یہ کس سلسلے میں ہیں؟'' مسکرا کر اس نے دو اکٹھے اٹھا لیے۔

''تمہارے دوست کی بات پکی ہو گئی ہے۔''

''کیا؟ نہیں بھئی؟ یقین نہیں آ رہا ابھی کل تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی،

''ارے واجی صاحب کو تو اب بھی پتا نہیں۔ وہ تو اپنی نانی سے ملنے گوجرہ گیا ہوا ہے۔ بس پڑوسی اکٹھے بیٹھے اور اچانک بات پکی بھی ہو گئی، حالانکہ نسرین بھی اپنی خالہ کی طرف گئی ہے۔''

''کک کیا۔؟'' لڈو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گلی میں گر گئے۔ کنیز دروازہ کھول رہی تھی۔ اس کا بدلتا انداز نہیں دیکھ سکی، بولی۔

''پڑوس میں رہتی ہے واجد کے۔ دونوں کی ماؤں کی آپس میں بڑی دوستی ہے، کہتی ہیں، ہم نے تو کب سے سوچ رکھا تھا۔ اب مردوں کے بیچ بھی بات اٹھائی گئی اور مٹھائی بھی بٹ گئی۔''

''پوری دنیا میں ایک ہی رہ گئی تھی واجی کے لیے۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

''ہاں تمہارے دوست میں تو ہیرے جڑے ہیں ناں۔ اس کے لیے تو کوئی حور پری چاہیے تھی۔''

وہ پلیٹ رکھنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ سالار اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چھت پر چلا آیا۔ اف یہ کیا ہو گیا۔ نسرین اور واجی، اب میں کبھی واجی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں گا، اور ہماری اتنی پرانی دوستی کیا اب وہ قائم رہ سکے گی؟ نسرین جیسی لڑکی سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اس رشتے کے باوجود مجھ سے مل سکتی ہے۔ وہ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ غصے میں آ کر وہ واجی کو میرے خلاف بھڑکا بھی سکتی ہے۔ اگر وہ کچھ نہ بھی کرے تو بھی میں بھلا دوست کے سامنے کیسے سر اٹھا سکتا ہوں۔ ہمیشہ اس سے شرمندہ ہوں گا۔

واجی اس رشتے پر بہت خوش تھا۔ صابر بھی خوب چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ مگر اسے نظر ملانے میں دقت کا سامنا تھا، وہ صرف صابر کا ساتھ دینے کو مجبوراً ہنس رہا تھا۔

''تم زری کو کب گھر لا رہے ہو؟'' صابر نے پوچھا۔

''بہت جلد، میں نے اس سے کہہ دیا ہے اب کے آئے گی تو پھر واپس وہاں نہیں جائے گی؟''

''ہم تمہارے دوست قدم قدم پر تمہارے ساتھ ہیں۔'' واجی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پورے خلوص سے کہا، اور اس کا جی چاہا اس سے کہا۔

''تم نسرین سے شادی مت کرو، میرے دوست! تمہارا یہ دوست اس کے دل میں یونہی مستقل طور پر اتر چکا ہے۔ تمہارے لیے اب وہاں جگہ مشکل سے بنے گی۔ میں تمہارا سامنا کرتے ہوئے جھجک رہا ہوں۔ میرے سینے پر بوجھ ہے۔''

مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکا، اٹھ کر چلا آیا، انہوں نے روکا تو کام کا بہانا بنا دیا۔

''سالار! آج اس وقت گھر آ گئے۔ خیر تو ہے؟'' کنی نے مذاق میں کہا تھا، پھر اس کا اترا چہرہ خاموشی پر چونکی۔

''کیا ہے، خیر تو ہے۔ اتنے چپ چپ کیوں ہو؟''

"بس طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔" کیسے بتاتا واجی اور نسرین اس کے لیے یہ دو نام الجھن کا باعث بن گئے ہیں۔ انہیں اکٹھے نہیں ہونا چاہیے۔ وہ آ کر کمرے میں لیٹ گیا۔

"اللہ خیر کرے، کیا ہوا ہے اسے؟" کنی تو پریشان ہو کر سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے پیچھے ہی کمرے میں آ گئی۔ "خیر صلا! ایسے کیوں لیٹے ہو؟" کنیز نے آ کر اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا پھر بولی۔

"بخار تو نہیں ہے۔ آخر ہوا کیا۔ جب گھر سے گئے تھے تب تو ٹھیک تھے ویسے میں یہ دیکھ رہی ہوں کل سے چپ چپ ہو۔" "دل اچاٹ ہو رہا ہے ہر چیز سے۔" وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

"دوستوں کے پاس چلے جاتے۔" کنی اس کا سر دبانے لگی۔

"اب کہیں نہیں جایا کروں گا۔ تمہیں بھی گلہ رہتا تھا، ہر وقت باہر رہتا ہے یہ گلہ بھی دور ہو جائے گا۔"

"سالار! کیا لڑائی ہوئی ہے دوستوں سے؟"

"نہیں دوستوں سے لڑائی کیوں ہو گی؟"

"پھر، آخر بتاتے کیوں نہیں؟"

"تمہیں کیا بتاؤں۔ میں اپنی کیفیت خود بھی نہیں سمجھ پا رہا۔"

"کہو تو مولوی صاحب سے پانی دم کرواؤں۔"

"نہیں رہنے دو۔"

"کنی!" ذرا توقف کے بعد پکارا۔

"ہاں کہو۔ میں سن رہی ہوں۔"

"تم اوپر والا چوبارہ اب کرائے پر دے دو۔"

"یہ اچانک چوبارے کا خیال کیوں آ گیا!" وہ ہنس کر بولی۔

"بس ایسے ہی۔ تم اسے اب کرائے پر چڑھا دو۔"

"تمہارے لیے رات کو کیا بناؤں؟" وہ اسے بہلانا چاہتی تھی۔

"جو پکا ہوا رکھا ہے کھا لوں گا۔ جاؤ تم اپنے کام نبٹاؤ، میرے پاس بیٹھ کر وقت ضائع کر رہی ہو۔"

"لو بھلا کام مجھے تم سے زیادہ ہیں۔ سالار اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر سے دوا منگوا لو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ۔" اس نے کروٹ بدل لی۔ مگر کنیز بھی وہیں بیٹھی رہی، کبھی اس کی پیشانی چھوتی کبھی نبض۔ "تم تو مجھے سچ مچ بیمار بنا دو گی۔"

"تو ایسے کیوں پڑے ہو۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

"اچھا بابا! اٹھ بیٹھتا ہوں۔" وہ کہنے کے ساتھ ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ "اب تو خوش ہو۔"

"مجھے تمہارے لیٹ جانے پر کیا اعتراض تھا، تمہارے تو چہرے سے لگ رہا تھا کوئی بات ہے ضرور۔"

"اچھا تو چہرے بھی پڑھ لیتی ہو۔ یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔" اس نے مذاق اڑایا۔

"سب کے نہیں۔ صرف ان کے جن کے لیے دل میں پیار ہوتا ہے، جو اپنے ہوتے ہیں۔" کنی دھیرے سے کہہ رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے صرف میرا، تمہارا اپنا تو میں ہی ہوں، اور مجھی سے تم پیار بھی کرتی ہو۔"

"تم سمجھتے ہو میرے پیار کو؟ تمہیں احساس ہے اس محبت کا۔" یہ بات کنیز کے لیے نئی بھی تھی، اور خوش کن بھی۔

"ہاں کنی! بہت قدر ہے مجھے اس محبت کی، اور تم نے کبھی محسوس کیا۔ میں بھی بہت چاہتا ہوں تمہیں۔"

اور وہ دن کنی کی زندگی کا خوبصورت ترین دن بن گیا۔ وہ اڑی اڑی پھری۔ اتنی خوش دکھائی دی کہ کئی بار آپ ہی آپ مسکرا دی۔ سالار جلدی سو گیا مگر آج اسے پھر نیند نہیں آئی۔ مگر آج کی بات کچھ اور تھی۔ وہ بے چین نہیں تھی۔ بہت پرسکون تھی۔ صندوق کھولا اور وہ کاغذ جو ان دونوں کے درمیان بندھے رشتے کا گواہ تھا نکال کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ اور ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو کر بستر پر آ گئی۔

☆......☆......☆

صبح سالار کل کے مقابلے میں کافی بہتر تھا۔ ناشتا اس کے ساتھ ہی کیا، اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ آج شام کو دیر سے واپسی ہو گی۔

اسے آج کالج نہیں جانا تھا، بلکہ زری سے ملاقات کے لیے جانا تھا، صابر اور واجی کو اس نے بتا دیا تھا وہ دونوں ٹیپو کی بیٹھک کے چبوترے پر اس کے منتظر تھے، سالار کے جانے کے بعد کنی نے برتن سمیٹے اور پھر جی جان سے گھر کی صفائی کی۔ ایسے میں خالہ آ جاتیں تو ضرور کہتیں کنی دیوانی تو نہیں ہو گئی۔ صاف ستھرے گھر کو لگی ہے، پھر صاف کرنے۔ سالار کے کمرے کے پردے تبدیل کیے، بستر پر نئی چادر، نیا میز پوش، اس کی کتابوں کی ترتیب بدلی اور ایک بچے کو بازار بھیج کر تازہ گلاب اور موتیے کے پھول منگوا کر گلدان میں لگا دیے۔ کمرہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ پھولوں کی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑی کچھ دیر تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر صندوق کھولا۔ وہ کاغذ نکالا اور دھڑکتے دل کے ساتھ گلدان کے پاس میز پر رکھ دیا۔ اس کاغذ کو یہاں رکھتے ہی اسے یہ کمرا اپنا اور سالار کا مشترکہ محسوس ہوا، اور آس پاس گلاب، موتیے کے ساتھ مہندی کی خوشبو بھی آنے لگی۔ وہ کتنی دیر یہاں اکیلی کمرے میں بیٹھی رہی۔ کبھی کرسی پر، کبھی اس کے پلنگ پر۔ جب تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندیں تو بہت عرصے کے بعد گھوڑی پر سوار اس تنومند مرد کو دیکھا جو ڈولی اور باراتی لے کر آ رہا تھا، اس سے پہلے کبھی چہرا اس پر واضح نہیں ہوا تھا۔ مگر آج اس نے دیکھ لیا۔ وہ سالار کا چہرا تھا۔

کھانا بھی بہت شوق سے بنایا۔ وہ کہہ کر گیا تھا۔ دیر ہو جائے گی، مگر پھر بھی وہ ساٹن کا گلابی جوڑا پہنے اس کی منتظر تھی۔ اس نے کبھی ایسے کپڑے نہیں پہنے تھے، اور چہرے پر بھی جو رنگ آج تھا اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ تبھی تو خالہ چونک گئیں، اسے گلے لگا کر بولیں۔

"ایسے ہی رہا کرو، سہاگن ہو۔ خدا تمہارے سہاگ کو سلامت رکھے، تم اتنی اجڑی ہوئی کیوں رہا کرتی تھیں؟"

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ "ہاں خالہ! میں نے بھی سوچا ہے جب وہ میرے سر پر سلامت ہے تو پھر رونا کیوں؟"

خالہ کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی، یہ مخصوص انداز سالار کا تھا۔ وہ ایسے ہی دستک دیتا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ایک بار تو ہمت جواب دے گئی، جی چاہا، اس کے کمرے میں جا کر وہ کاغذ اٹھا لے، مگر دل نے انکار کر دیا۔ وہ ایسا کرنے سے باز رہی۔ اتنی دیر میں وقفے وقفے سے وہ تین بار دستک دے چکا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھول دیا۔

''آؤ آ جاؤ۔'' پتا نہیں وہ کس سے مخاطب تھا۔ کنی ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے سالار کے ساتھ ایک برقعے والی کو اندر آتے دیکھا۔ شاید وہ برقعے سے گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ اندر آتے ہی نقاب الٹ دی اور کنیز کو لگا گھرے بادلوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا۔

''یہ زری ہے۔ میں نے نکاح کیا ہے اس سے، آ جاؤ صابر، مٹھائی اندر لے آؤ۔'' وہ پلٹ کر کہہ رہا تھا اور کنیز بت بن گئی تھی۔

''کنی! تم زری کو اندر کمرے میں لے جاؤ۔'' سالار کے چہرے پر خوشی اور پا لینے کی مسرت کا نمایاں رنگ تھا۔ کنیز نے سرد بے جان ہوتے ہاتھ سے زری کا ہاتھ پکڑا اور اسے سالار کے کمرے کی جانب لے چلی۔ پر ہر قدم پر اسے لگتا تھا۔ وہ گر پڑے گی۔ ابھی رونے لگے گی۔ مگر اپنے ضبط کا اس نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ نہ وہ روئی، نہ ڈگمگائی تھی۔ پھر اچانک اسے اپنے رکھے ہوئے اس کاغذ کا خیال آیا۔ وہ تیزی سے میز کی جانب لپکی اور کاغذ ہاتھ میں لے لیا۔ اسی وقت سالار اندر آ گیا اور بولا۔

''کنی! دلہن سے کھانے کا نہیں پوچھو گی؟'' بولنے کی سکت اس میں کہاں تھی۔ اثبات میں سر ہلا کر باہر آ گئی۔ کاغذ اب بھی اس کی مٹھی میں تھا۔ اور نوکیلے کانٹے کے چبھن دے رہا تھا۔ آگ روشن کی اور مٹھی کھول کر اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھنے لگی۔

''کنی!'' سالار آواز دیتا شاید ادھر آ رہا تھا، اس نے جلدی سے کاغذ جلتی آگ میں پھینک دیا۔

''کیا تھا یہ؟'' وہ یوں ہی روا روی میں پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں۔ ایک بار بڑوں نے بھی گڑیا گڈے کی شادی کا کھیل رچایا تھا، مگر وہ کھیل بچوں کے کھیل کی طرح بے ضرر نہیں تھا۔ اس میں سب سے زیادہ نقصان گڑیا کا ہوا۔ اس کے ارمان خون میں نہا گئے، ایک عمر اس کا وجود ان دیکھی آگ میں جلتا رہا، اور یہ آگ کوئی نہیں دیکھ سکا، حیرت ہے سالار! آج یہ کاغذ جلتا ہوا تم نے کیسے دیکھ لیا؟''

سالار کا دھیان اپنے کمرے کی جانب تھا، جہاں اس کی دلہن سج سجائے بیٹھی تھی۔ وہ پانی لینے آیا تھا، لے کر چلا گیا، اور اتنی دیر میں کاغذ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ اور کنیز کا مقدر بھی، دل بھی، خواب بھی اور ارمان بھی۔

☆......☆......☆

میں نے لکھیا سوہنا یار

''اب تو گاؤں کی زندگی بھی بہت بدل گئی ہے، لوگوں کے رہن سہن میں نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے یہاں بجلی بھی آ گئی ہے اور ٹیلی فون کی سہولت بھی میسر ہے۔''

حاکمین گردیزی کی تقریر کے یہ آخری فقرے تھے' جواب میں اس کے اکلوتے سامع نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''ہاں واقعی بجلی تو آ گئی ہے، فون بھی کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ بل ادا کرنے کے پیسے ہوں۔ اوئے میرے بادشاہ! جن کے پاس کھانے کو کچھ نہیں جو ایک ایک روپیہ بڑی محنت سے کماتے ہیں۔ وہ بھلا بجلی اور ٹیلی فون کے خرچے برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ چیزیں اگر گاؤں میں آئی ہیں تو صرف تم جیسے زمینداروں کی سہولت کے لیے۔ بے چارے غریبوں کا نام مت لو۔''

''الو یہ غریب ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔ تم مجھ پر طنز مت کیا کرو۔ یہ لوگ تو اپنے آباؤ اجداد سے ایسے ہی بھوکے ننگے چلے آ رہے ہیں۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی ساری زمینیں ان میں بانٹ دوں۔ اور خود ہوا کھاؤں۔''

''ہاں اب بیٹھ جاؤ منہ پھلا کر۔'' وقار کو اس کے تیوں تیوری چڑھا کر بولنے پر ہنسی آ رہی تھی۔

''تم میرے منہ پر مجھے برا بھلا کہو گے تو کیا مجھے غصہ نہیں آئے گا۔'' حاکمین کا انداز بدستور روٹھا روٹھا سا تھا۔ وقار سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔

''یہ لوگ تمہاری زمینوں پر کام کرتے ہیں' کیا تمہارا فرض نہیں ان کی بہتری اور بھلائی کے لیے سوچو۔ یہاں نہ تو کوئی ہاسپٹل ہے نہ پکی سڑک اور نہ ہی پینے کے پانی کا کوئی مناسب انتظام۔''

پاس کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ حاکمین نے دائیں ٹانگ پر بائیں ٹانگ جمائی اور صوفے کی بیک سے کمر ٹکا کر بولا۔

''جی ہاں اگر پاس موٹر گاڑیوں کی قطار ہو تو پھر ہاسپٹل دور نہیں لگتا۔ مگر کسی جاں بہ لب مریض کو چارپائی پر ڈال کر پیدل یہ کچا راستہ طے کرنا پڑے تو مریض کو لے جانے والے بھی بیمار ہی ہوجاتے ہوں گے۔''

''اب یہ ایسے بھی نازک نہیں ہیں۔ ہم تم سے زیادہ سخت جان ہوتے ہیں۔ دراصل شروع سے محنت کے عادی ہوتے ہیں ناں یہ۔''

''تم کیوں نہیں کرتے محنت؟'' وقار نے ردعمل جاننے کے باوجود سوال کردیا۔

حاکمین نے جواب نہیں دیا۔ اونچی آواز میں کسی اللہ ڈیوائے کو پکارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دبلا پتلا ملازم لڑکا ادب سے ہاتھ جوڑے علاؤ الدین گردیزی کی بیٹھک میں داخل ہوا اور حکم کا انتظار کرنے لگا۔

''جاؤ ایک پھاوڑا، ایک کلہاڑی اور ایک کسی اٹھا لاؤ۔''

ایسی فرمائش پر لڑکے نے حیران ہوکر چھوٹے مالک کی طرف دیکھا اور وقار بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''آخر مقصد کیا ہے تمہارا' کیوں منگوا رہے ہو، یہ چیزیں......؟''

''تمہارے لیے میرے یار! تمہیں بڑا درد اٹھتا ہے ناں غریبوں کا، اور مفت میں مجھے مشوروں سے بھی نوازتے رہتے ہو۔ اب جو کچھ میں نے منگوایا ہے' ان سے جو کام لیے جاتے ہیں۔ ان کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے' تمہیں جو بھی پسند آئے اٹھالینا' اور اپنے بے چارے غریبوں کے ساتھ جاکر کام شروع کردینا۔''

''اوہ!'' وقار کچھ گھبرا کر' کچھ کھسیا کر ہنس پڑا' پھر بولا۔ ''کیا پاگل پن ہے؟''

''یہ پاگل پن نہیں ہے۔ تم ذرا عملی قدم بھی تو اٹھاؤ۔ یہ خالی خولی ہمدردیاں کسی کام کی نہیں۔''

''بکومت۔ میں خالی خولی ہمدردیاں نہیں کرتا۔ اخبار میں لکھتا ہوں ان لوگوں کی خاطر، اور میرا یہی کام ہے' میں ان کے ساتھ مل کر مشقت نہیں کرسکتا' مگر ان کے لیے اس مشقت کے بدلے میں بہتر زندگی کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔''

''ہاں شروع ہوجاؤ۔ کرلو اب بکواس۔ تم پڑھے لکھے لوگوں کا یہی المیہ ہے۔ عمل میں بے حد کمزور ہوتے ہو۔ اپنی بات ڈٹ کر نہیں کرسکتے۔ نرم الفاظ، نرم تاثر اور اندر سے کھوکھلے۔''

''حاکمین! میں تم سے نہیں جیت سکتا۔ اس لیے کہ تم نے کسی کی ایک نہ سننے کی قسم کھا رکھی ہے۔''

''تو کیوں ہر دوسرے روز شہر سے بھاگے چلے آتے ہو میرے پاس۔'' حاکمین نے پیار سے دوست کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہا۔

''ہر دوسرے روز یہ الزام ہے، بہتان ہے' کمینے پورے ایک ماہ کے بعد آیا ہوں میں۔''

''اور پیارے یہ ایک ماہ مجھ پر قیامت کی طرح گزرا ہے۔'' حاکمین نے آہ بھری۔ پھر دونوں قہقہوں پر

قہقہے برسانے لگے۔

''کون آیا ہے اللہ ڈیوایا؟۔'' سفید یونیفارم میں ملبوس سیاہ چادر میں چہرہ چھپائے کاندھے پر کالج بیگ ڈالے زہرہ بانو اس وقت بیٹھک کے قریب ہی تھی۔ اور ان بلند و بانگ قہقہوں کو سن کر ذرا تھم گئی تھی۔ خیال گزرا تھا شاید، چچا علاؤ الدین کے کوئی ملنے والے آئے ہوں گے پھر وہ تو مصروف ہوں گے، مجھے یہیں سے اپنے گھر واپس چلے جانا چاہیے۔

''چھوٹے مالک کے دوست آئے ہیں۔ آپ اندر تشریف لے جاؤ بی بی! بڑے صاحب بھی بس آنے والے ہوں گے۔'' اللہ ڈیوایا نے آگے بڑھ کر اس کے لئے لکڑی کا وہ بڑا سا دروازہ کھولا، جو رہائشی حصے میں کھلتا تھا، اور گھر کے افراد ان کے عزیز رشتہ دار ادھر ہی نشستیں بھی جمایا کرتے تھے۔ زہرہ بانو نے قدم نہیں بڑھائے وہ پوچھنے لگی۔

''تو کیا چچا جان بھی گھر پر نہیں ہیں؟''

''وہ زمینوں پر گئے ہیں، صبح کے نکلے ہوئے ہیں۔ اب تک تو آنے والے ہوں گے۔ کھانا تو گھر پر ہی آکے کھاتے ہیں' ہمارے بڑے مالک۔''

زہرہ بانو نے کلائی پر بندھی سنہری رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ واقعی چچا کھانا گھر پر ہی کھاتے ہیں وہ آنے ہی والے ہوں گے۔ مطمئن سے انداز میں سانس کھینچ کر وہ رہائشی حصے کی طرف بڑھ گئی، اور پیچھے اللہ ڈیوایا نے لکڑی کا منقش دروازہ بند کردیا۔

پھوپھی فاطمہ اس وقت ملازماؤں کو کھانے کے سلسلے میں مختلف ہدایات دے کر بڑے کمرے کی طرف آرہی تھیں۔

زہرہ نے دور سے سلام کیا۔ وہ مشفق انداز میں مسکرائیں اور دعاؤں کے بعد بولیں۔

''آؤ زہرہ! بڑے دنوں کے بعد چکر لگاتی ہو۔ یہی سوچ لیا کرو کہ میں یہاں اتنے بڑے گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔''

''ارے پھوپھی جان! اتنے تو لوگ ہے یہاں۔'' وہ دلکشی سے ہنسی اور اس سے بہت متاثر اس کے حسن کو چاہنے والی یہاں موجود دو تین ملازمائیں بھی ساتھ ہنس پڑیں۔ کہ زہرہ بی بی کا یہاں علاؤ الدین گردیزی کی حویلی میں آنا انہیں بڑا اچھا لگتا تھا۔

زہرہ بانو علاؤ الدین کے سوتیلے بھائی الیاس گردیزی کی بیٹی تھی۔ ہر چند کہ علاؤ الدین اور پھوپھی فاطمہ۔ اس کے سوتیلے رشتے تھے۔ مگر زہرہ ان سے محبت کرتی تھی' اور مشقت کی بھٹی میں جلتے جلتے ہاتھ پاؤں کی ساخت ہی بدل جانے والی لڑکیوں کو زہرہ بانو اپنے بے پناہ حسن کے باعث پسند تھی۔ وہ مزاج کی بھی اچھی تھی، ان سے بڑے آرام سے بات کرتی تھی' اور کپڑے کیسے نفیس پہنتی تھی' ہلکے ہلکے رنگ، خوبصورت۔ نفیس کڑھائیاں اور نازک زیورات وہ ہر لحاظ سے ان کی باقی بیبیوں سے مختلف تھی۔ کبھی چمک دمک والے کپڑے پہنے نہ چھن چھن کرتے زیور مگر پھر بھی اس کی سجاوٹ میں کمی نہیں ہوتی۔

''وہ تو سب سے زیادہ دکھتی ہے، سب سے زیادہ بجی سجائی لگتی ہے، اس کی کالی کالی آنکھیں ایسی سرمہ بھری ہیں کہ سات چشموں میں بھی نہالے، یہ آنکھوں کا سنگھار نہ چھوٹے۔ اس کے بالوں کی رنگت بھی گہری سیاہ ہے۔'' اٹھارہ سالہ بسو جو جیرے موچی کی بیٹی ہے، اور کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے علاؤ الدین گردیزی کی حویلی آجاتی تھی۔ وہ کہتی تھی۔

''زہرہ بی بی کے بال سیاہ کالے ہیں مگر چمک ایسی کہ دیکھتی رہ جاؤ۔ میں نے تو بڑی ہی محدود دنیا دیکھی ہے، میں ان کی مثال کہاں سے لاؤں۔'' اور لڑکیوں اور عورتوں کو اس کی گول سفید کلائیاں بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ جب بھی زہرہ ادھر آتی ہے وہ پھول چن کر انہیں پرو کر زہرہ کو دیتی ہیں اور جب زہرہ یہ پھول اپنی کلائی میں لپیٹ لیتی ہے تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ محنت کا صلہ مل جاتا ہے۔

''اگر ہمارے چھوٹے مالک سے زہرہ بی بی کی شادی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ ہمیشہ کے لیے یہاں آجائیں خوب صورت مہربان مالکن بن کر۔''

نوخیز جوانی والی یہ دبلی پتلی پھرتیلی سی لڑکیاں جو حسن کو محسوس کرتی ہیں تو کھل کر ایک دوسرے سے اس کا اظہار بھی کر دیتی ہیں، اور اہلِ حسن کے سامنے جھک جانے میں انہیں کوئی عار نہیں۔ وہ تو حاکمین کو بھی چوری چوری دیکھا کرتی ہیں۔ ہے نا ہمارا مالک لاکھوں میں ایک بلکہ ہم تو قسم کھا کر کہیں گے' ایسا گھبرو ہم نے اپنی دنیا میں نہیں دیکھا۔ اور جو ذرا بڑی عمر کی ملازمائیں ان کی باتیں سنتی ہیں تو منہ چھپا کر ہنس پڑتی ہیں۔ انہیں حاکمین کا لڑکپن یاد آجاتا ہے۔ تب وہ ایسا گھمنڈی اور خودسر نہیں تھا، اور تب یہ جوان تھیں۔ حاکمین کو دیکھا کرتی تھیں' اور کبھی کبھار موقع سے فائدہ اٹھا کر ذومعنی بات بھی اس سے کر جایا کرتی تھیں' جو اس عمر میں وہ نہیں سمجھتا تھا۔ اور ان کے ہنسنے پر بھنا کر ڈانٹنے لگتا تھا۔ اور جو آج کی لڑکیوں کی باتیں، ادھیڑ عمر ملازمائیں سن لیتی ہیں تو پیچھے بہت پیچھے چلی جاتی ہیں' جب وہ جوان تھیں اور حاکمین ننھا بچہ تھا۔ ایسا پیارا بچہ اتنا ہنس مکھ اور شریر، سارا وقت پھوپھی فاطمہ کے ارد گرد ہی منڈلاتا رہتا، کبھی جو فاطمہ بی بی ادھر ادھر ہوتی تو یہ لوگ لپک کر حاکمین کو اٹھا لیتیں' چوم لیتیں اور اکثر آپس میں کہتیں۔

''اس لڑکے کی جوانی غضب کی ہوگی۔'' اور فاطمہ کے قدموں کی چاپ ابھرتے ہی اسے گود سے اتار دیتیں کہ فاطمہ کو یہ پسند نہیں تھا، اس کا پیارا بھتیجا ان گندے کپڑوں والی عورتوں کے پاس جائے۔

فاطمہ بی بی کی شادی نہیں ہوئی، منگنی ہوئی تھی اپنے چچا زاد سے۔ وہ قتل ہوا اور فاطمہ کا دل بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔ جوانی میں ہی فاطمہ بے دل سی ہو گئی تھی۔

اس نے ہار سنگھار چھوڑ دیا تھا، اور ساری توجہ ننھے حاکمین پر لگا دی، جو ماں کی وفات پر دو سال کا تھا، اور بہت تلاش کرتا تھا۔ اس محبت بھری آغوش کو اور تھک کر، ہار کر رونے لگتا تھا۔ فاطمہ نے اسے اپنی گود بھی دی اور پیار بھی دیا، وہ پیار جو اس کے آنے والے بچوں کے لیے تھا، اور جنہیں اب کبھی نہیں آنا تھا تو وہ تو سارے کا سارا پیار اس نے اکیلے حاکمین کو دے دیا۔ یہ نہیں سوچا پہلے جھولی تو دیکھ لوں۔ اتنی محبت سما بھی سکتی ہے یا نہیں۔ بس فاطمہ محبت دیتی رہی، دیتی ہی چلی گئی۔ حاکمین لیتا رہا۔ لیتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اسے صرف

لینا ہی یاد رہ گیا۔ وہ دینے کا سلیقہ بھول گیا۔

''ارے پھوپھی جی! یہ کمرے کی سیٹنگ کب تبدیل کی آپ نے؟'' زہرہ نے بہت خوشگواری محسوس کی ان کے کمرے میں آ کر۔

''ابھی کل ہی' اصل میں چند روز پہلے شہر گئی تو پردے چادریں لے آئی تھی، یہ میز پوش، سنگھار میز پر ڈالا گیا کروشیے کا پردہ اور کشن ہمارے گاؤں کی لڑکیوں نے کاڑھے ہیں۔

اب جو میں نے چادریں پردے بدلے اور کچھ نیا فرنیچر کمرے میں رکھا تو یہ سب بھی استعمال میں لے آئی، جو کب سے لڑکیوں سے بنواتی رہی ہوں۔''

''آپ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد کمرے میں تبدیلی لاتی ہیں۔ اس سے طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے، تازگی کا احساس رہتا ہے۔'' اس نے بیگ کاندھے سے اتار کر صوفے کے قریب رکھ دیا، اور چادر سر سے ذرا پیچھے سرکا کر آرام سے صوفے بیٹھ گئی۔

''میں بلو سے کہتی ہوں، تمہارے لیے دودھ ٹھنڈا کر کے لائے۔''

''نہیں پھوپھو جی! رہنے دیں دودھ' مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''اتنی پڑھائی کرتی ہو۔ دن رات موٹی موٹی کتابوں میں غرق رہتی ہو۔ دودھ تو تمہارے لیے ضروری ہے۔ تمہیں روزانہ استعمال کرنا چاہیے۔''

''سونے سے پہلے روزانہ ایک گلاس لے لیتی ہوں کہ بابا بھی آپ کی طرح بہت تاکید کرتے ہیں۔'' زہرہ مسکرائی اور برابر میں صوفے پر پڑا ریشمی کشن اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

''کتنی محنت ہوئی ہے اس پر اور کلر بھی بہت اچھے استعمال ہوئے ہیں۔'' وہ اس پر کاڑھے پھول کی تعریف کر رہی تھی۔

''تمہیں پسند آئے، مجھے خوشی ہوئی، اصل میں۔ میں تمہارے جہیز کے لیے بھی کچھ نہ کچھ بناتی ہی رہتی ہوں' ماں تو تمہاری ہے نہیں' مجھے پورا احساس ہے' پروین بھابی کبھی بھی تم پر ایک ماں جیسی توجہ نہیں دے سکتیں۔ میرا تو تم خون ہو' مجھے تو خیال رکھنا ہی ہے۔''

''میں جانتی ہوں پھوپھو! آپ کو میرا بہت خیال رہتا ہے۔''

''جبھی اتنے دنوں کے بعد ملنے آتی ہو۔'' انہوں نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

''اور ایک سچی بات بتاؤں۔'' زہرہ شرارت سے ہنسی، پھر ڈر کے تاثر کی ساتھ رک رک کر بولی۔

''آج تو میں صرف اور صرف چاچا جان سے ملنے آئی تھی۔ مجھے ان سے کام تھا۔ میں تو بہت جلدی میں آئی، پتا چلا وہ موجود نہیں ہیں' ایک دم سے موڈ آف ہو گیا میرا۔''

''ایک تو تم لڑکیاں پڑھ لکھ کر بڑی ہی نازک مزاج ہو جاتی ہو۔ ذرا ذرا سی بات مزاج پر اثر ڈالتی ہے۔ زہرہ بچی یوں تو گزارہ نہیں ہوا کرتا۔ تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ آخر کار تم ایک دیہاتی لڑکی ہو۔ لاکھ پڑھ لکھ جاؤ۔ تمہارا بیاہ بھی کسی اپنے جیسے خاندان میں ہوگا، اور زمیندار گھرانوں میں عورت کو کیسی برداشت سے

کام لینا پڑتا ہے۔ یہ تم خود بھی بہت اچھی طرح سے جانتی ہو۔''

''پھوپھو جی! کیا یہ شادی کرنا ضروری ہے؟'' اس نے کچھ اکتاہٹ کا اظہار کیا، اس ذکر پر۔

''ہاں، بہت ضروری ہے۔'' وہ اس کے انداز پر مسکرائیں۔

''میرے خیال میں ضروری نہیں۔ اب آپ نے بھی تو شادی نہیں کی تو کیا بری گزاری ہے آپ نے۔''

''میری بات چھوڑ و بیٹی رانی! میرا تو معاملہ ہی اور ہے۔ دلاور کے ساتھ میرا سب کچھ دفن ہوا۔ خواب بھی۔ ارمان بھی۔ دل بھی۔ میں بیاہ رچا کر کیا کرتی، اور جو تم کہہ رہی ہو۔ بیاہ کے بغیر بھی میری اچھی ہی گزر گئی، تو بھی معاملہ اور ہے۔ حاکمین کی ماں کی وفات کے بعد بھرا علاؤ الدین نے شہری عورت سے شادی کر لی۔ اور وہ یہاں نہیں آئی۔ شہر ہی میں کوٹھی پر رہی۔ یہاں سیاہ و سفید کی میں مالک تو نظر آنے لگی، مگر یقین جانو، اپنی مرضی سے تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں بھابی شہر سے آتی تھی تو ایک ایک شے کا حساب رکھتی تھی۔ پھر بھرا علاؤ الدین اور چھوٹی بھابی میں اختلاف ہوا اور طلاق۔

میرا حاکمین بھی سمجھ دار ہو گیا، اور مجھے واقعی حویلی کی مالکن والے حقوق مل گئے۔''

''شہرزا! اتائی جان تو بڑی ماڈرن تھیں۔ انہوں نے تایا جان سے شادی پتا نہیں کیسے کر لی۔'' زہرہ کو وہ یاد آ گئیں۔

''دولت میں بڑی طاقت ہے' اور کچھ لوگوں کو تو دولت کے آگے کچھ سوجھتا نہیں۔ دیوانے ہوتے ہیں، ساری محبتیں دولت سے ہی ہوتی ہیں۔ ایسی ہی تھی وہ بھی۔'' پھر کچھ خیال آیا تو بولیں۔

''شہر سے حاکمین کا دوست آیا ہوا ہے۔ میں ذرا نیتی سے کہہ آؤں۔ ان سے کھانے کا پوچھ لے' اور کہیں تو وہیں بیٹھک میں ان کے لیے کھانا لگا دے' بہت اچھا دوست ہے حاکمین کا۔ میں ملی ہوں اس سے۔ مجھے یہ بچہ سادا اور پر خلوص لگا ہے۔''

زہرہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے حاکمین کے دوست سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

فاطمہ کمرے سے چلی گئیں۔ زہرہ کچھ اور بھی ریلیکس انداز میں صوفے پر تقریباً نیم دراز سی ہو گئی

''پھوپھو جی!'' پردہ ہٹا کر حاکمین نے جھانکا اور پھر ایک دم سے اندر آ گیا۔ روشنی سے اندھیرے میں آنے کی وجہ سے اسے فوراً ہی زہرہ کی یہاں موجودگی کا احساس نہیں ہوا اور زہرہ جو اسے بخوبی دیکھ رہی تھی' اسے دیکھ کر بھی کسی عجلت یا افراتفری کے بغیر بڑے آرام سے سیدھی ہو کر بیٹھی اور چادر کو سر پر ذرا آگے کھسکا لیا۔ ''اوہ تو تم ہو زہرہ! پھوپھی کہاں ہے؟''

''باورچی خانے میں نیتی کو کھانے کے سلسلے میں چند ہدایات دینے گئی ہیں۔''

زہرہ کا لہجہ کچھ اکتایا ہوا اور عجلت بھرا تھا وہ بات تو اس سے کر رہی تھی مگر دیکھ ادھر ادھر رہی تھی، گردن کچھ اکڑی ہوئی، چہرے پر ناشناسائی کا تاثر، لہجہ بھی ایسا ہی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ حاکمین سے اسی طرح بات کرتی آئی تھی۔

''تم کب آئیں......؟'' حاکمین نے آداب میزبانی ادا کرنے کی کوشش کی، اور پہلے کی طرح اب بھی نظر اس پر رکھی۔

''ابھی ابھی۔'' زہرہ کے پاس اس کے لیے الفاظ کے ذخیرے میں کمی ہو جاتی تھی۔ اب بھی مختصراً کہہ کر بیٹھ گئی۔

''کیا حال ہے چچا' چچی کا، اور انور کیسا ہے؟'' وہ اب تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہیں۔'' زہرہ نے صوفے کی بیک سے ٹیک لگا لی۔ اور یہاں آ کر حاکمین کا ضبط ایک دم سے جواب دے گیا۔ پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو۔ عورت تو بس عورت ہوتی ہے' چاہے دنیا کا سارا علم گھول کر پی جائے' یا چٹی ان پڑھ رہے۔ اس کا دماغ الیاس چچا نے خراب کر دیا ہے، یہ اپنی ہستی بھول گئی ہے' مرد کی برابری کرنے لگی ہے۔ بہتر ہے خود ہی سمجھ لے' اپنے مقام کو ورنہ زمانہ تو سمجھا ہی دیتا ہے۔ وہ ہونٹ بھینچے یہ سب سوچ رہا تھا۔ جب فاطمہ واپس آ گئیں۔

''حاکمین! تم یہاں موجود ہو۔ میں نے تو لڑکی کو بیٹھک میں بھیجا ہے کہ تم سے کھانے کا پوچھ کر آئے۔''

ان کی آواز پر وہ ادھر مڑا اور انہیں کھانے کے بارے میں بتانے لگا' اور اس لمحے زہرہ کی وہ نگاہ جو ابھی کچھ دیر پہلے ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ اب ٹک گئی تھی۔ اور حاکمین کے سراپے پر جمی ہوئی تھی۔ نگاہ اس پر تھی، اور دل میں کیسا آرام کسی نرم روندی کی مانند رواں تھا۔ وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ بس اسے دیکھ رہی تھی، دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ حاکمین اس پر نظر ڈالے بغیر' کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔

''زہرہ! منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا لگوانے لگی ہوں۔''

''مگر پھوپھو! میں تو تایا جی سے ملنے آئی تھی۔ مجھے کام تھا ان سے۔''

''اب تک نہیں آئے' لگتا ہے کھانا زمینوں پر ہی کھا لیا ہے۔ اب دیر سے آئیں گے۔ تم منہ دھو کر آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ اتنا کہہ کر باہر چلی گئیں' زہرہ کو اٹھنا پڑا۔

دسترخوان پر بس وہی دونوں تھیں۔ حاکمین نے کھانا اپنے دوست کے ساتھ بیرونی بیٹھک میں کھانا تھا۔ علاؤ الدین گردیزی ابھی تک گھر لوٹے ہی نہیں تھے' اور اتنی بڑی حویلی میں ان تین افراد کے علاوہ تھے تو درجنوں کے حساب سے ملازم جو اپنے وجود کا ہر طرح سے احساس دلانے کے باوجود گھر کے افراد تو کبھی نہیں ہوتے۔

''زہرہ! تم آتی جاتی رہا کرو' بھرا کی اپنی مصروفیات حاکمین کی اپنی۔ دونوں گھر پر ہوں تو بھی زیادہ تر بیٹھک میں ہی ہوتے ہیں۔ میں تو اکیلی ہی رہتی ہوں۔ یہاں تم آ جاؤ گی تو دل بھی بہلا رہے گا۔''

''پھوپھو جی! آپ ہماری طرف کیوں نہیں آتیں؟''

''بہت بکھیڑے لگے ہیں میرے ساتھ اور جو تمہاری طرف آؤں۔ تب بھی کون سا خوشی ملتی ہے تمہاری سوتیلی ماں مجھے دیکھتے ہی منہ بنا لیتی ہے' اس کا خیال ہے میں بھرا الیاس کو اس کے خلاف بھڑکا جاؤں گی۔''

آخر میں فاطمہ دکھ اور تاسف سے ہنس پڑیں۔

''ہاں، ماں کی طبیعت کچھ ایسی ہی ہے' وہ ہر کسی پر شک کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ مجھ پر بھی حالانکہ ہم کئی

سال سے ایک گھر میں رہ رہے ہیں' وہ میری طبیعت کو جانتی بھی ہیں۔ مگر پھر بھی ایسی بات کر جاتی ہیں۔"

"تم ادھر آ جایا کرو میرے پاس، کیوں اس عورت کی باتیں سنتی ہو۔"

"وہ میرے باپ کا گھر ہے' حق ہے میرا اس گھر پر، خدا میرے باپ کو سلامت رکھے' میرا سائبان صرف وہی ہے انور بھائی تو ہے مگر وہ تو خود معذور ہے' میرا سہارا کیا بنے گا۔"

"عورت اچھی ہو، نیک ہو تو سوکن کی اولاد سے بھی محبت کا سلوک کر جاتی ہے' اور یہ سلوک نسلیں سنوار دیتا ہے۔ اب تمہارے والد بھی تو میرے اور بھرا علاؤ الدین کے سوتیلے بھائی ہیں' مگر ہماری ماؤں نے ہمیشہ ہمیں آپس میں سلوک اور محبت کا درس دیا اور ہم نے ان کی نصیحت پر عمل کیا کبھی سگے سوتیلے کو بیچ میں نہیں لائے۔ دلوں میں ایک دوسرے کے لیے صرف محبت اور احترام ہے۔"

"ہاں پھوپھو! مجھے تو خود کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ آپ اور ابا سگے بھائی بہن نہیں۔ رشک آتا ہے مجھے آپ لوگوں کی محبت پر۔ آپ تو مجھے بہت ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"آج ادھر ہی رہ جاؤ۔"

"میں تو کپڑے بھی ساتھ نہیں لائی، اور یہ جو کالج کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ان میں تو مجھے گھر آتے ہی الجھن ہونے لگتی ہے۔ گھر پر ہوتی تو کب کی اتار چکی ہوتی۔ مگر جانے کو دل میرا بھی نہیں چاہ رہا۔ شام تک رک جاتی ہوں۔"

وہ پھوپھو کو یہاں کم کم آنے کی وجہ نہیں بتا سکتی تھی کہ..... حاکمین گردیزی اس کی شیر جیسی جوانی کے بڑے چرچے تھے' اس کے اکھڑے مزاج کا ذکر بھی سب ہی کرتے تھے، اور اس کی بے باکی کو بھی سب جانتے تھے۔ یہاں علاؤ الدین کی ملکیت میں آنے والے گاؤں ہوں یا الیاس گردیزی کے' ہر جگہ چرچا تھا۔ حاکمین کا اور زہرہ بانو بڑی آن بان والی' بڑی نازک مزاج' نفیس ذوق کی۔ بظاہر نازک سی مگر بڑے مضبوط کردار کی مالک لڑکی تھی۔ اپنی عزت، انا اور ذات بہت عزیز تھی اسے۔ حاکمین کبھی چچا کے گھر آتا تو وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی کہ ملازم عورتیں جو بظاہر اپنے اپنے کاموں میں مگن رہتی ہیں، نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں ان کی، اور یہ مالکوں کی ٹوہ میں رہتی ہیں۔ ذرا جو کچھ ایسا مل جائے تو پربت بنا چھوڑتی ہیں۔ پھر زہرہ کی تو ماں بھی سوتیلی اور ایسی کہانیاں گھڑنے سننے کی ماہر تھی۔

اور وہ صرف اور صرف حاکمین کی وجہ سے تایا کے ہاں کم کم آتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی لوگ یہ کہیں کو زہرہ حاکمین کے لیے تایا کی حویلی کے چکر لگاتی ہے، اسے اندازہ تھا لوگ بڑے ظالم اور بے رحم ہوتے ہیں بیٹیوں والے ہو کر دوسروں کی بیٹی کی چادریں کھینچ لینے کا مشغلہ اختیار کرتے ہیں۔

زہرہ اپنی پھوپھو فاطمہ سے ملنے علاؤ الدین کی حویلی جاتی ہے۔ اس بات میں تو کوئی مزا نہیں۔ مزا تو تب آتا ہے جب یہ کہا جائے کہ وہ حاکمین سے ملنے جاتی ہے تو کیا حرج ہے اگر یہ مزا لے لیا جائے۔ یہی سوچ ہے اوپر سے نیچے ہر طبقے کے اور اس معاشرے میں زہرہ جیسی حساس عزت و آبرو سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی لڑکیوں کے لیے بہت کانٹے ہیں۔ پاؤں زخمی ہونے سے بچانے کے لیے نگاہ راستے پر رکھے تو

آنچل کانٹوں میں الجھتا ہے' جو آنچل سمیٹیں تو پاؤں لہولہان، بس ہر دم چوکس رہنا پڑتا ہے۔ پاؤں بھی بچانے ہیں' آنچل بھی اور دامن بھی۔ زہرہ بانو اسی راستے پر چل رہی تھی۔ سنبھل سنبھل کر رک رک کر، مگر یہ راہ چھوڑنے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ بہت پیار تھا اسے اپنی انا اور اپنے پندار سے۔

اور وہ یہ بھی جانتی تھی حاکمین کے مشاغل میں دلوں کو توڑنا اور جسموں سے کھیلنا شامل ہے، اس کا چہرہ کیسا نکھرا اور ستھرا ہے۔ آنکھیں چمک دار، شفاف مگر دل سخت اور سیاہ۔ پھر ایسے بے درد کے لیے زہرہ جیسی لڑکی کیوں آنچل کانٹوں کے حوالے کرے اور پرخار راستہ چھوڑ کر ان راستوں پر آ جائے جو بظاہر خوشنما ہیں مگر جب قدم پڑیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں ان دیکھے کانٹے ہیں، جو پیروں میں نہیں دل میں چبھتے ہیں اور چبھ کر ٹوٹ جاتے ہیں، ان کی زہریلی نوکیں دل میں پیوست ہو جاتی ہیں اور انسان جب تک جیتا ہے لہو رستا رہتا ہے۔

آنچل کے بغیر ننگا سر لوگوں کے لیے موضوع بن جاتا ہے، ہستی راکھ کی طرح ہواؤں میں بکھرتی ہے عزت آبرو اور انا کے لفظ خواب ہو جاتے ہیں۔ زہرہ نے عہد کیا تھا خود سے۔ حاکمین میں تمہارے پیچھے خود کو نہیں رولوں گی' میں تمہاری سنگدلی کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔ میں لوگوں کے لیے موضوع نہیں بنوں گی۔ میں ہنسی اڑتی نہیں دیکھ سکتی خود پر اور میں سمجھتی ہوں اگر عزت و حرمت کا آنچل سر پر رہے تو کانٹوں کے راستے کا سفر کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔

وہ ابھی کم عمر تھی مگر اس کے ارادے اٹل تھے۔ وہ ہمیشہ سے اپنے فیصلوں میں ثابت قدم رہی تھی۔ حاکمین کے رویے اسے بہت شروع سے ہی اچھے نہیں لگے تھے' حالانکہ تب وہ بچے تھے اور حاکمین زہرہ سے عمر میں بڑا تھا، مگر اس کا خوامخواہ رعب جھاڑنا اور بات بے بات غصے میں آ جانا۔ ضد میں آ کر خوب چیخنا۔ کسی کی ایک نہ سننا۔ یہ سب زہرہ کو سخت برا لگتا تھا اور وہ اس لڑکے کے سامنے ڈٹ جایا کرتی تھی۔ جس کی بات سب مانتے تھے' حالانکہ وہ تو بڑی صلح جو اور خوش مزاج بچی تھی۔ مگر حاکمین کے سامنے اس کا رویہ کچھ سے کچھ ہو جاتا اور بچپن میں ہی حاکمین نے یہ سمجھ لیا زہرہ جو اس کے چچا کی بیٹی ہے۔ اس کے ساتھ کھیلنا ہوگا تو برابری کے اصولوں پر' وہ کوئی بے ایمانی برداشت نہیں کرے گی، وہ بالکل بھی رعب میں نہیں آئے گی اور حاکمین نے اس کے ساتھ اپنا رویہ بدل لیا۔ وہ اس کے ساتھ کسی صلح جو شریف النفس بچے کی طرح کھیلنے لگا۔ پھر وہ ذرا بڑے ہوئے اور یہ کھیل کود پیچھے رہ گئے' مگر حاکمین کا رویہ اس کے ساتھ وہی رہا۔

وقت کچھ اور آگے سرکا، حاکمین پڑھنے کے لیے شہر چلا گیا، پھر وہ بھی شہر میں آ گئی۔ میٹرک بھی اسکول کے ہاسٹل میں رہ کر کیا۔ اور اب کالج میں تھی تو ڈرائیور روزانہ پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا۔ حاکمین سے ملاقات کم اور بات چیت تو بہت ہی کم ہونے لگی۔ مگر وہ اس کی سرگرمیوں سے بے خبر نہیں تھی۔ چھوٹی امی اور گاؤں کی عورتیں ان کے ہاں کام کرنے والیاں سب ہی حاکمین کا ذکر کرتیں۔ خاص کر جب اس کی سوتیلی خالہ عذرا، ادھر آتی تو وہ اپنی بہن سے حاکمین کے بارے میں بہت پوچھتیں۔

چھوٹی خالہ کو تو بہت ہی دلچسپی تھی اس کی ذات میں اور امی کو یہ دلچسپی پسند نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں

کہ ان کی بہن دل کو اس کی محبت کا روگ لگا لے، کہ جانتی تھیں' یہ خاندان انہیں پسند نہیں کرتا۔ اس کی بہن کو کبھی قبول نہیں کرے گا' وہ اپنی بہن عذرا کا دل حاکمین سے پھیرنے کو جو کچھ سناتیں۔ وہ زہرہ بھی سنتی اور سچ سمجھتی۔ اسے خود پر شدید غصہ آتا اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رویہ حاکمین کے ساتھ بہت اکھڑا اکھڑا اور اکتاہٹ بھرا ہونے لگا۔ جسے حاکمین نے بھی محسوس کیا اور اسے زہرہ کا بے جا غرور سمجھا۔

☆......☆......☆

موسم گرما تھا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد فاطمہ پھوپھو کے پاس رک تو گئی، مگر کہہ رہی تھی۔

''میں نے تو گھر میں ذکر بھی نہیں کیا تھا پھوپھی جی! امی کو تو سخت غصہ آ رہا ہوگا جانے کہاں رہ گئی ہوں۔ آپ مجھے واپس جانے ہی دیں تو اچھا ہے۔''

''یوں کرتے ہیں تمہارے ڈرائیور کو واپس بھیج دیتے ہیں۔ جب تمہیں جانا ہوگا تو یہاں بھی گاڑیاں موجود ہیں چلی جانا۔''

بات معقول تھی پھر وہ اتنے پیار سے رکنے کو کہہ رہی تھیں۔ زہرہ نے اختلاف مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے نتی سے کہلا بھیجا کہ ڈرائیور کو اس پیغام کے ساتھ جانے کو کہو۔ ''زہرہ اپنی پھوپھو کے پاس ہے' دیر سے گھر لوٹے گی۔''

''آج ہم بہت سی باتیں کریں گے' سچ بیٹی رانی! میں تو بات کرنے کو بندہ ڈھونڈتی ہوں' اتنی بڑی حویلی میں اور اتنے لوگوں کے درمیان بھی بالکل اکیلی ہوں میں۔''

''چلیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ملازماؤں سے باتیں نہیں کی جاسکتیں۔ یہ سامنے تو بھولی بن کر سنتی رہتی ہیں، اور پھر بڑھا چڑھا کر آگے بیان کرتی ہیں۔ مگر آپ کے پاس تو بھائی بھی ہے اور بھتیجا بھی۔''

''اللہ سلامت رکھے میرے بھائی کو اور بھتیجے کو مگر زہرہ مرد کی محبت کا انداز ہی جدا ہوتا ہے۔ وہ عورت کے دل کی بات سن بھی لے تو سمجھ نہیں سکتا، اور اکثر تو سننے کا تکلف بھی نہیں کرتا۔ میرے پاس بھائی ہے، حاکمین ہے اور دونوں مجھے چاہتے ہیں، ان کی محبتوں پر تو فخر ہے مجھے مگر دل کی بات تو نہیں سمجھا سکتے۔ کبھی جو بتاؤں بھی تو حاکمین حیران ہو کر کہتا ہے۔ ''اف پھوپھو جی! یہ کیا کیا سوچتی رہتی ہیں آپ۔'' اکتانے لگتا ہے وہ اور پھر میں خاموش ہو جاتی ہوں۔''

''میں آپ کے پاس ہوں۔ آپ مجھ سے کریں ساری باتیں۔'' زہرہ نے پیار سے کہا۔

پھر دونوں فاطمہ کے کمرے میں آ گئیں اور جہازی سائز بیڈ پر لیٹ کر واقعی دونوں نے بہت باتیں کیں' زہرہ نے بھی یہ محسوس کیا۔ فاطمہ پھوپھو کی طرح وہ بھی اکیلی ہے' اسے بھی یہ سب سنانے کے لیے کسی عورت کی ضرورت تھی، گھر میں پروین بیگم تھیں۔ مگر وہ اس کی سوتیلی ماں تھیں' ان سے وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ دونوں کو پتا ہی نہ چلا، کب مغرب بھی ہوگئی۔ اذان ہوئی تو دونوں چونک گئیں۔ پھر ہنس پڑیں۔

''کتنا وقت گزر گیا اور ہمیں اپنی باتوں میں پتا ہی نہیں چلا۔''

''آج کا دن بہت اچھا گزرا۔ ہم نے گزرتے وقت کو آواز دی، اور اس وقت کے بارے میں اپنے

اپنے محسوسات بتائے۔ ہم نے آج ماضی کو بہت قریب سے محسوس کیا وہ لوگ جو آج ہم میں نہیں ہیں ان کو یاد کیا۔ آنسو بھی بہائے اور ہم ان کی باتوں کو دہرا کر مسکرا بھی اٹھے۔ ماضی سے حال اور مستقبل کی باتیں۔ اف کتنا بولے ہیں۔ آج ہم دونوں۔''

''پھوپھو جی! میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں آپ کسی کو کہہ دیں کہ ڈرائیور گاڑی تیار رکھے' اب میں چلوں گی۔''

''اچھا بیٹا! میں کہہ دیتی ہوں اور ہاں یاد رکھنا تمہیں میرے ساتھ میری خالہ کے بیٹے کی شادی میں ضرور جانا ہے۔ میں جب بھی اپنی ننھیال جاتی ہوں۔ تمہارا ذکر تو ضرور ہوتا ہے۔ تم اور حاکمین بس دو ہی تو ہو میری آنکھوں کو ٹھنڈک، اور وہ چھوٹا انور، میں اس کے لیے بہت دعا کرتی ہوں۔ خدا اسے صحت عطا فرمائے۔''

☆......☆......☆

اپنی حویلی آتے ہی سب سے پہلی ملاقات باپ سے ہوئی۔

''کہاں رہی میری بیٹی! آج سارا دن؟'' وہ جانتے تھے' بھائی علاؤ الدین کی طرف سے آ رہی ہے، سارے دن کی تفصیل جاننا چاہتے تھے، اس لیے پوچھ رہے تھے۔ باپ کا مشفقانہ رویہ سکون اور فخر بن کر رگ و پے میں اتر گیا۔ عورت بھی کیا چیز ہے' مرد کی اک نگاہ کے اشارے پر اس کی قسمت کا انحصار ہے۔ باپ، اعتماد دے' محبت سے پیش آئے تو اس پر جان بھی وار دی' شوہر پیار سے دیکھ لے تو اس پر قربان ہو جائے۔ وہ یہ نہیں سوچتی آخر کیوں کر رہی ہوں ایسا، یہ میری زندگی ان کی ملکیت ہے' یا میں باندی ہوں سرکار کی، رشتے بدلتے رہتے ہیں مگر مرد کی نگاہ اسے ہر دور میں دیکھنا پڑتی ہے' اس کی سردی گرمی کو محسوس کر کے قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ زہرہ کی خوش نصیبی، اسے باپ کی صورت میں جو مرد ملا، اس کی نگاہ میں شفقت تھی، اور اس پر فخر بھی کہ یہ بیٹی بڑی منتوں مرادوں کے بعد آئی تھی، شادی کے پورے آٹھ سال بعد۔

الیاس گردیزی نے تو کوئی در نہیں چھوڑا۔ منتیں مانیں' چڑھاوے چڑھائے۔ برس پر برس گزر گئے اور امید دم توڑنے لگی۔ پہلے بیٹے کا سوال کرتے تھے۔ اب تو اولاد مانگنے لگے۔ بیٹا ہو یا بیٹی آئے تو ان کے آنگن میں اور انہیں باپ ہونے کے فخر سے آشنا کر دے اور جب زہرہ آئی تو کتنی خوشی منائی گئی۔ الیاس گردیزی کی حویلی میں اور کتنا پیار دیا پھر آتے وقت میں انہوں نے بیٹی کو، انور تو اس سے چھ سال چھوٹا تھا اور یہ چھ سال بڑی۔ انہوں نے اس کے ناز اٹھاتے گزارے تھے اور جب بیٹی کے اتنے قریب رہے تو احساس ہوا۔ بیٹیاں کیسی پیاری ہوتی ہیں۔ یہ رشتہ کتنا خوب صورت اور مقدس ہے۔ انہوں نے زہرہ کو تعلیم دلوائی اور اس کی ذہانت پر ہمیشہ خوش ہوئے۔

اسکول کے بعد اس نے کالج جانے کا نام لیا تو چچا علاؤ الدین نے صاف منع کر دیا اس کی سوتیلی ماں پروین نے بھی کہہ دیا کیا کرو گے لڑکی کو اتنا پڑھا کر پہلے ہی دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ پتا نہیں خود کو سمجھتی کیا ہے۔''

"میری بیٹی ضرور پڑھے گی۔" یہ فیصلہ الیاس گردیزی کا تھا۔

"پہلے تمہارے خاندان میں کسی لڑکی نے اتنی تعلیم حاصل کی ہے جو یہ کرے گی۔" پروین بیگم کو ان کا ارادہ بتا گیا۔

"میری بیٹی جیسی بیٹی پہلے اس خاندان میں ہوئی بھی کہاں ہے، اس کی ذہانت میرے لیے فخر ہے۔ یہ جہاں تک چاہے گی پڑھے گی۔" اور پروین سر جھٹک کر اندر چلی گئی۔

الیاس نے صرف بیوی سے ہی نہیں کہا تھا۔ انہیں واقعی اپنی زہرہ باقی لڑکیوں کے مقابلے میں بلندی پر کھڑی نظر آتی تھی۔ انور ابھی چھوٹا تھا اور پھر زہرہ وہی بچی تھی، جس نے چھ سال تک ان کی محبتیں سمیٹی تھیں یہ وہی تھی جس نے انہیں باپ ہونے کا فخر دیا تھا۔ اور جب اس کی پیدائش کے بعد ایک عرصے تک کوئی اور اولاد نہیں ہوئی تو انہوں نے یہ ہی سوچا اگر زہرہ اکلوتی اولاد ہی ہے تو میں اسے ایسا دیکھنا چاہوں گا کہ لوگ اس کی مثالیں دیں۔ عزت کریں، اور یہ میرا نام اونچا کردے، اسے ایسی لڑکی بنانا ہے، جو خاندان کی سب لڑکیوں سے ممتاز نظر آئے۔

ان کا بڑا بھائی علاؤالدین گردیزی اپنے بیٹے حاکمین کا ذکر چاہت سے ہی نہیں غرور سے بھی کرتا تھا۔ اسے خاندان کی روایتوں کا امین اور اکلوتا وارث قرار دیتا تھا، پہلے الیاس گردیزی بے اولاد تھے تو علاؤالدین کی باتیں تیر کی طرح دل کو لگتی تھیں۔ اولاد کی خاطر ہی انہوں نے پروین سے دوسرا نکاح پڑھوایا تھا۔ کہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد سوتیلے بھائی علاؤالدین کا بیٹا ان کی تمام جائداد کا وارث بن جائے، اور پھر جب زہرہ بانو اس دنیا میں آئی تو ان کے رگ و پے میں سکون اتر گیا۔ خوشی ہلکورے لینے لگی۔

"اب میری جائداد اور میرے نام کی شناخت آگئی ہے، اب میرا وارث حاکمین نہیں میری بیٹی ہوگی۔"

علاؤالدین گردیزی نے زہرہ کی پیدائش پر انہیں مبارک باد دی، اور ساتھ ہی زہرہ کو حاکمین کے لیے مانگا، انہیں یہ بات سخت بری لگی، حالانکہ یہ کوئی انوکھی بات تو نہ تھی، ان کے خاندان میں اکثر ہی رشتے بچپن میں طے کردیے جاتے اور یوں بھی لڑکی پر سب سے زیادہ حق چچا کے بیٹے کا ہی سمجھا جاتا تھا مگر الیاس گردیزی نے صاف کہہ دیا۔

"میں بچپن میں رشتہ طے کرنے کا بالکل قائل نہیں ہوں، اور پھر میں نے تو اپنی بیٹی کے لیے کچھ اور ہی خواب دیکھے ہیں۔ میں اسے ڈھیر سارا پڑھاؤں گا۔ یہ لڑکی میرا اور اس علاقے کا نام روشن کرے گی۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے الیاس بھرا! ورنہ ہم میں کبھی بھی بیٹیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہیں رہا۔ لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ انہیں ایک روز جانا ہوتا ہے، تب باپ کا نام پیچھے رہ جاتا ہے اور ان کے نام کے ساتھ شوہر کا نام آنے لگتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں، میری بات پر غور کرو حاکمین! اپنا ہی بچہ ہے، جائداد باہر نہیں جائے گی، گھر میں ہی رہے گی۔"

الیاس کے دل و دماغ میں غم و غصے سے دھواں سا بھرنے لگا۔

"پھر وہی بات میری جائداد کا وارث، حاکمین، میرے نام کا امین حاکمین۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا میری

وارث میری بیٹی ہوگی۔ بھتیجا ہرگز نہیں۔"

انہوں نے ایک بار پھر علاؤالدین گردیزی کو رشتے سے انکار کردیا۔ اور علاؤالدین نے برا نہیں مانا اگر مانا بھی تو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

انور کی پیدائش زہرہ کے کئی سال بعد ہوئی اور الیاس گردیزی کی خوشی اس روز بھی دیدنی تھی مگر انور ذہنی معذور، جسمانی طور پر کمزور ثابت ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تمام آرزوؤں کا مرکز ایک بار پھر زہرہ بانو ہی بن گئی۔

وہ بہت ذہین بے حد خوب صورت لڑکی تھی، اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اس کی نشست و برخاست چال ڈھال، بول چال میں تمکنت تھی۔ وہ مقابل سے بغیر کسی جھجک کے بات اور بحث کرتی تھی۔ وہ دلیر اور بڑی رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی، اور اسے اپنے باپ کی عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اور علاؤالدین گردیزی جو کبھی اس کی تعلیم کے خلاف تھے۔ آج انہیں بھی بھتیجی پر فخر تھا۔

اور جب کبھی وہ زہرہ کی تعریف الیاس گردیزی کے سامنے کرتے تو الیاس گردیزی کو خوشی کا بے پناہ احساس ہوتا۔ ان کا سر فخر سے بلند ہوجاتا اور آنکھوں سے زہرہ کی محبت چمک بن کر جھانکنے لگتی۔

علاؤالدین اپنے حاکمین کا ذکر کرتے وہ جیسے تیسے کالج میں پہنچ تو گیا تھا مگر پڑھائی میں دلچسپی نام کو نہیں۔ اس نے اتنا ہی پڑھا کہ کالج میں رہ سکے، باپ کو پاس ہونے کی خوش خبری سنا سکے۔ ڈویژن کون سی بنتی ہے اور کیسے کن طریقوں سے پاس ہوا ہے، یہ کبھی نہیں بتایا۔ پڑھائی میں دلچسپی نہیں تھی۔ دوستیاں بڑھانا۔ سیر سپاٹے اور زندگی کے ہر تجربے سے گزرنے کی بڑی جلدی تھی اسے۔ وہ گلیاں بھی کم عمری میں ہی چھان ماریں، جہاں اس کا باپ آج بھی جانے سے گھبراتا تھا۔ جیسا حاکمین تھا۔ ویسے ہی اس کے دوست ہلا گلہ، ہنگامہ، شور ہا ہو۔ بس یہی تو ہے زندگی۔

وہ سب شہری لڑکے تھے۔ گاؤں کی کھلی فضا انہیں اچھی لگتی۔ اکثر آجاتے اور پھر سب دوست شکار پر نکل جاتے۔ اب اس کی تعلیم تو ختم ہوچکی تھی۔ دوستیاں اور مصروفیتیں البتہ وہی تھیں۔ لڑکے اب بھی اس سے ملنے کے لیے شہر سے آتے رہتے، اور پھوپھی فاطمہ یہ جان کر کہ میرے حاکمین کے دوست ہیں۔ خوب خاطر مدارات کرتیں، ان کے لیے طرح طرح کے کھانے بنتے، اور وہ مزے لے لے کر کھائے جاتے۔ ساتھ میں حاکمین کو خوب چڑھاتے اور وہ خود کو کوئی بہت ہی اونچی شے سمجھنے لگتا۔

وقار سے اس کی دوستی بس اتفاق ہی تھا۔ ملاقات تو اپنے ہی جیسے ایک دوست کے ہاں ہوئی۔ وقار اس کا کزن تھا۔ اس کی کڑوی باتیں اور نڈر لہجہ حاکمین کو اچھا لگا اور بس اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ وقار کو اس طرح کے بد دماغ پیسے والے گھرانوں کے لڑکے سخت برے لگتے تھے، مگر حاکمین میں اسے بڑی کشش محسوس ہوئی۔

وہ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ نظرانداز نہیں کرسکا۔ دوستی ہوئی اور ایک سال میں ہی انہیں اب تو یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ دونوں شروع سے ساتھ ساتھ ہوں، لاکھ اختلاف کے باوجود وہ رہ نہیں سکتے تھے، ایک

دوسرے کے بغیر، وقار دولت مندوں اور خاص کر زمینداروں، وڈیروں کے خلاف بولتا، اور حاکمین کبھی بھی اس کے دلائل کے سامنے ہار ماننے پر رضامند ہوتا۔ اسے حاکمین کے شوق بھی پسند نہ تھے' یہ کتوں اور گھوڑوں سے پیار، اور انسانوں سے اتنا خراب رویہ۔

"تم ان لوگوں سے یوں بات کرتے ہو' جیسے خدا ہو ان کے۔"

"چلو آج کے اعتراض کے بعد اب تمہیں روٹی ہضم ہو جائے گی۔" حاکمین نے اس کی کسی بھی بات کو سنجیدہ نہیں لیا تھا۔

"کیا عزت کا معیار دولت ہے؟" وقار بڑے دکھ سے سوال کرتا۔

"یہ معیار میرے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔" کبھی کبھی حاکمین اکتاہٹ سے جواب دیتا۔

حاکمین گردیزی کو ماں یاد نہیں تھی' اسے بچپن کی جو سہانی یادیں اب تک یاد تھیں، ان میں اس کے ساتھ ساتھ پھوپھی فاطمہ ہی تھیں ان کی محبت بھری آغوش پر شفقت لہجہ اور آنکھوں میں اس کے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ وہ اس کی ہر بات توجہ سے سنتی آئی تھیں۔ اس کی ہر آرزو کی تکمیل میں بے چین ہو جایا کرتی تھیں۔ بہت محبت دی انہوں نے حاکمین کو۔ بابا سائیں دوسری بیوی لے آئے تھے۔ زیادہ تر شہر میں رہتے تھے' ہر چند کہ بیٹے سے انہیں بھی بہت محبت تھی۔ بڑا فخر تھا اپنے لاڈلے پر۔ مگر وہ ان دنوں گاؤں میں ہوتے ہی کم تھے، اور پھر بچے کو جو محبت مہربان عورت کی آغوش میں مل سکتی ہے۔ وہ مرد کے ہاں کب پائی جاتی ہے۔ اسے بچپن کی خوشیوں سے بھر دینے والی اس ہستی سے محبت تھی، وہ بہت چاہتا تھا، فاطمہ پھوپھو کو' اور اسے خواہش تھی فاطمہ پھوپھو کے دل میں جتنی محبت اس کے لیے ہے' اتنی کسی اور کے لیے نہیں ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے میں اور پھر کوئی اور......

بابا جان اور پھوپھو فاطمہ نے کتنی محبت دی اسے اور گاؤں کے لوگوں نے شہزادہ مانا۔ بابا کے ملنے والوں نے سراہا۔ ہاں اگر کچھ سرد مہری اس نے محسوس کی تو الیاس چچا اور زہرہ بانو کی آنکھوں میں۔ الیاس چچا بظاہر تو کتنی محبت سے پیش آتے تھے۔ مگر حاکمین نے ان کی مسکراہٹوں اور محبتوں میں ایک سرد سی لہر کو پایا تھا۔ بہت بچپن میں ہی وہ ان کے رویے کو محسوس کر کے اداس ہوا تھا۔ ٹھٹکا تھا۔ ان کے پاس جاتے جھجک جاتا تھا۔ وہ جب بھی آتے تو پوچھتے۔

"کون سی کلاس میں پڑھ رہے ہو؟"

"کتنی دیر تک پڑھتے ہو؟"

"کتنے نمبر آئے ہیں۔"

اور پھر بتاتے' میری بیٹی زہرہ تو اتنی دیر تک پڑھتی ہے۔ کلاس میں ہمیشہ اوّل پوزیشن لیتی ہے۔ اسے زہرہ اپنے غرور اور سرد مہری کے باوجود اچھی لگتی تھی۔ وہ اس تقابل پر صرف حیران اور شرمندہ ہوتا تھا اور سمجھ نہیں پاتا تھا۔ چچا اس کا مقابلہ زہرہ سے کیوں کرتے ہیں۔ وہ اسے شرمندہ دیکھ کر آخر کیا خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اور زہرہ' اسے کیا دشمنی ہے، جبکہ میں باقی بچوں کی نسبت اس کی ہر بات مان لیتا ہوں۔ میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں وہ ہمارے گھر آیا کرے' اور مجھ سے بہت باتیں کرے' مگر زہرہ بڑی مغرور تھی۔ وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی ان کے گھر زیادہ دیر ٹھہرنا پسند کرتی تھی' جوں جوں بڑے ہوتے گئے۔ حاکمین کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب تو زہرہ ان کے ہاں آتی بھی تو اکثر وہ گھر پر ہوتا ہی نہیں تھا، اور جو ہوتا بھی تو ملاقات سرسری ہو پاتی۔

اب حاکمین بھی اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ اور زہرہ اپنے انہی سابقہ رویوں کے ساتھ تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آتی تھی' اور حاکمین کا خیال تھا۔ وہ اپنے حسن پر مغرور ہے' اور اس کے اس غرور پر حاکمین کو ہنسی بھی آتی تھی۔ اور جو میں چاہوں تو اس کا غرور توڑ کر رکھ دوں۔

اب زہرہ سر اٹھا کر نپے تلے انداز میں بات کرنے کی عادی ہے' پھر نہ سر اٹھے گا نہ بات ہو گی' لعنت ڈالے گی اپنی زندگی پر، مگر اس سوچ کے باوجود اس نے زہرہ کو کبھی کچھ نہیں جتایا، اس کے رویوں کا جواب ایسے ہی رویے سے نہیں دیا۔ جیسے پہلے نرمی سے بات کرتا تھا۔ اب بھی انداز وہی تھا، مگر زہرہ اس کی سرگرمیوں کو خوب جانتی تھی۔ اور اس سے بات کرتے ہوئے' نہ چاہتے ہوئے بھی اکتاہٹ اور بے توجہی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ مگر وہ چپکے چپکے اسے دیکھنے اور سراہنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکی' اور جو کبھی اندر سے سرزنش ہوتی تو کہتی۔

"کیا ہوا جو میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اچھی چیز کو دیکھنا اور سراہنا کیا برا ہے۔ شاندار قدرت' روشن خوبرو چہرہ یہ سب خدا کی دین ہے' اس میں حاکمین کا کمال تو کہیں نہیں۔ اگر اپنی شخصیت میں اس کا کچھ اپنا ہے تو عادات و اطوار اور اس کی شخصیت کا یہی پہلو کمزور ہے۔" اس کا باپ بھی حاکمین کو کچھ خاص پسند نہیں کرتا۔ یہ بات وہ جانتی تھی۔ وجہ سمجھنے سے قاصر تھی اور اسے اس پر نہ ملال تھا نہ خوشی۔

حاکمین پہلے تو ان کے ہاں کم ہی آتا تھا، اب کچھ عرصے سے اس کی دوستی یہاں قریب گاؤں کے کسی زمیندار سے ہو گئی تھی۔ ان کی طرف آتا تو سلام کے لیے چچا کے گھر بھی آ جاتا، اور جو ایسے میں پروین کی بہن عذرا آئی ہوتی تو پھر حاکمین کے لیے جلد واپسی ممکن ہی نہ ہو سکتی، وہ باتوں میں الجھا لیتی۔ خاطر مدارات میں لگ جاتی۔

پروین کو وہ ناپسند نہیں تھا مگر وہ عذرا کا اس طرف جھکاؤ بھی پسند نہیں کرتی تھیں کہ جانتی تھیں حاکمی کی شادی فاطمہ کی پسند کے مطابق ہو گی، اور فاطمہ کبھی بھی اپنے لاڈلے بھتیجے کے لیے پروین کی بہن عذرا کو پسند نہیں کر سکتی، جب انجام معلوم ہے تو کیوں ایسے راستے پر چلا جائے، مگر یہ بات عذرا نہیں مانتی تھی' اس کا خیال تھا۔ اگر حاکمین کے دل میں جگہ بنالی جائے تو پھر فاطمہ یا علاؤالدین گردیزی کچھ نہیں کر سکیں گے' حاکمین وہی کرے گا جو اس کا دل چاہے گا۔ مگر مصیبت یہ کہ ابھی تک حاکمین کے دل نے عذرا کو نہیں چاہا تھا، اور عذرا بڑی باہمت تھی' قدم پیچھے نہیں ہٹائے اس نے۔

اس سلسلے میں نہ بڑی بہن کے سمجھانے کا اثر ہوا نہ حاکمین کی عام سی باتوں کا۔ وہ بالکل ایسے ہی اس

سے بھی بات کرتا جیسے اپنی چچی سے حال چال پوچھتا تھا اور پھر فوراً بعد چچا کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔

وہ چچا کے ہاں جاتا تو زہرہ سے ملاقات بہت کم ہی ہوتی۔ کبھی تو سلام دعا کے بعد غائب ہو جاتی، اور کبھی تو سرے سے ملتی ہی نہیں۔ ایک دو بار گھر آ کر اس نے مذاق کے رنگ میں فاطمہ سے کہا بھی۔

''پھوپھی جی! مجھے تو لگتا ہے زہرہ نہیں بلکہ عذرا میرے چچا کی بیٹی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' پہلی بار اس نے یہ بات کہی تھی، تو فاطمہ نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

''زہرہ سامنے نہیں آتی اور عذرا سامنے سے ہٹتی نہیں۔'' وہ ہنس پڑا تھا۔ مگر فاطمہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''یہ کیا سوچ بیٹھی ہے، بھابی پروین۔ ہم تو ایک بہن لا کر پچھتا رہے ہیں۔ اب دوسری کو بھی گلے ڈال لیں۔ وہ بھی اپنے پیارے حاکمین کی دلہن بنا کر، نہیں یہ ناممکن ہے۔'' حاکمین سے فوراً ہی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہو سکی۔ وہ اپنی کہہ کر جا چکا تھا۔ مگر انہوں نے فیصلہ ضرور کر لیا۔ سمجھائیں گی اسے، ہوشیار کر دیں گی، کہ وہ عذرا اور پروین کے چنگل میں نہ آئے۔

اور جب موقعہ ملا انہوں نے یہ بات حاکمین کو کہہ بھی دی۔

''آپ کوئی وہم نہ پالیں، دل میں۔ میرا عذرا کی طرف کوئی جھکاؤ نہیں ہے۔'' وہ ان کے خدشے سے کافی محظوظ ہو کر بولا تھا۔

''جھکاؤ ہوتے کون سی دیر لگتی ہے، مرد کا دل تو ہتھیلی پر ہوتا ہے، اور چالاک عورتیں، قابو کرتے دیر نہیں لگاتیں۔''

''بہرحال وہ چالاک عورت عذرا تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔'' حاکمین نے پورے یقین سے کہا۔

''اب کے تم الیاس بھرا کی طرف جاؤ تو مجھے ساتھ لے کر جانا۔ آخر میں بھی تو دیکھوں بھابی پروین کی بہن کو۔''

''کوئی ایسی دیکھنے کی چیز نہیں ہے اور پھر وہ تو ہمیشہ وہاں موجود نہیں ہوتی۔''

''ویسے میں نے سنا ہے، وہ اکثر بہن کے ہاں آتی رہتی ہے۔''

''واہ گھر بیٹھ کر بھی کتنی باخبر ہیں آپ؟'' اس نے جیسے داد دی۔

''باخبر ہونا ہی چاہیے۔ ویسے مجھے عذرا کا بھی پروین کے ہاں آنے پر اعتراض نہیں۔ آخر وہ اس کی بہن کا گھر ہے۔ جیسے چاہے آئے جائے۔ مگر اسے ہمارے لڑکے پر ڈورے ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ بات میں برداشت نہیں کر سکتی۔''

''میں تو کہہ کر پچھتایا۔'' حاکمین نے منہ بنایا۔ مگر وہ ایک بار کہہ کر اور ان کا جواب سن کر بھی یہ بات کہتا ہی رہا۔ گو اب انداز صرف فاطمہ کو چھیڑنے کا ہوتا تھا۔ مگر وہ ہر ماہ سنجیدہ ہو جاتی تھیں۔

پھر ایک بار جب زہرہ ان کے ہاں آئی تو انہوں نے اس سے کہا۔

''سنا ہے تمہاری ماں کی چھوٹی بہن عذرا حاکمین کے بہت آگے پیچھے رہتی ہے، وہ تم لوگوں کے ہاں جاتا ہے تو خوب خاطر مدارات کرتی ہے۔''

''آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟'' زہرہ نے بڑی سنجیدگی سے یہ سوال کیا۔

''کون بتاتا۔ خود حاکمین کہتا ہے اور وہ جھوٹ کیوں بولے گا۔''

''آپ اس کی باتوں میں آ گئیں۔ ان مردوں کو تو عادت ہوتی ہے۔ ایسی فضول باتوں کی۔ ذرا کسی لڑکی سے ہنس کر بات کی، یہ فوراً غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ ضرور ہم پر مرتی ہے، آپ کا بھتیجا بھی ایسے ہی مردوں میں سے ہے، عذرا آپا اچھی طبیعت کی ہیں۔ (عذرا اس سے دو تین سال ہی بڑی تھی، اور آپا ہی کہلواتی تھی۔ خالہ کہلوانا پسند نہیں تھا)۔ ہر ایک سے گھل مل جاتی ہیں، اب ان بے چاری کو کیا پتا یہاں افسانے بنیں گے اور گلی گلی پھیلیں گے۔ واہ حاکمین صاحب کیا اعلا سوچ ہے۔'' وہ ایک دم سے جتنی تلخ نظر آنے لگی تھی۔ فاطمہ کو حیرت ہوئی۔

اور رات بستر پر لیٹ کر جب زہرہ نے اس کی بات کے متعلق سوچا تو اسے بھی احساس ہوا میں ضرورت سے زیادہ بول گئی تھی۔ عذرا جیسی تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی، اور یہ بات تو ان کے گھر کی ملازمائیں بھی کرتی تھیں۔ جب بھی چھوٹے سرکار آتے ہیں، اپنی عذرا بی بی بہت ساتھ ساتھ رہتی ہیں، مگر حاکمین ایک عورت کے مذاق اڑائے، اس کی محبت کو گلی گلی پرزوں کی صورت ہوا کے سپرد کرے اور ہوا یہ پیغام دور تک لے جائے۔ ہر جگہ ہنسی اڑے۔

یہ بات زہرہ کو اچھی نہیں لگی، اسے تمام عورتوں کی تذلیل محسوس ہوئی۔ اور حاکمین کے لیے دل میں سخت غصہ بھر گیا۔ پھر اسے عذرا پر بھی غصہ آنے لگا آخر کیوں، اسے اپنی عزت کا احساس نہیں۔ کیوں وہ حاکمین کی اس قدر ناز برداری کرتی ہے۔ عورت کو تو ہر قدم پر احتیاط کرنی چاہیے، ورنہ ذرا سی بھول بھی معاف نہیں ہوتی۔ مرد اپنی برادری کا تو قصور جھٹ معاف کر دیتا ہے مگر حوا کی بیٹی کے لیے اس کی عدالت میں معافی کا کوئی لفظ نہیں، اور حوا کی بیٹی کی یہ مجبوری ہے کہ وہ ابن آدم کی ان دیکھی زنجیروں میں بندھی ہے۔ بظاہر آزاد مگر قیدی ہے اور اسے آقا کی بات پر چلنا ہے، اس کا حکم سر جھکا کر مسکرا کر قبول کرنا ہے، چاہے دل خون کے آنسو ہی کیوں نہ رو رہا ہو۔

☆......☆......☆

وہ کالج سے لوٹی ہی تھی کہ ملازمہ نے حاکمین کی آنے کی اطلاع دی۔

''انہیں بٹھاؤ اور اماں کو اطلاع کر دو۔''

اور کہنے کے ساتھ ہی اسے خیال آیا۔ عذرا آپا تو آج کل ادھر ہی ہیں۔ جونہی اماں کو اطلاع ہو گی۔ انہیں بھی پتا چل جائے گا، اور پہنچ جائیں گی حاکمین کے حضور، یہی سوچ کر اس نے ملازمہ کو روک لیا۔ اور اپنے والد کے بارے میں پوچھا۔

''وہ گھر پر نہیں ہیں چھوٹی بی بی۔''

''اچھا چلو پھر رہنے دو۔ اماں کو بھی مت اطلاع دو۔ ایک یہ حاکمین بے وقت ہی چلا آیا ہے۔ اماں آرام کر رہی ہوں گی میں خود ہی اس سے مل لیتی ہوں۔'' وہ دوپٹہ سلیقے سے اوڑھ کر ہال کمرے میں آ گئی اور

بڑی سنجیدگی سے سلام کیا۔

''چچا گھر پر ہیں؟'' ادھر بھی ایسی ہی سنجیدگی تھی۔

''نہیں وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

''اچھا پھر میں چلتا ہوں۔ مجھے انہی سے کام تھا۔ ویسے وہ کب تک آ جائیں گے؟''

''میں تو ابھی کالج سے آئی ہوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''السلام علیکم، حاکمین آپ کب آئے؟'' عذرا کو اطلاع ہو ہی گئی اور وہ چھم سے آ موجود ہوئی۔

''ابھی ابھی آیا ہوں۔'' اسے دیکھ کر حاکمین کے سنجیدہ چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی اور زہرہ کے وجود میں غصے کی لہر۔

وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی اور پروین کے کمرے میں آ کر انہیں اس کی آمد کی اطلاع دینے کے بعد بولی۔

''ویسے آپ آرام کریں۔ عذرا آپا موجود ہیں ان کے پاس۔'' اور عذرا کی اس کے پاس موجودگی کا سن کر پروین بیگم بھلا کیسے آرام کر سکتی تھیں اور یہی مقصد تھا زہرہ کا انہیں اطلاع اسی لیے دی تھی کہ سنبھالیں اپنی بہن کو مت ہنسی اڑانے کا موقع دیں حاکمین کو۔ پروین فوراً چلی گئیں، اور وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے روز صبح وہ، پروین، عذرا، بابا جان اور انور کے ساتھ ناشتے کے لیے بیٹھی تھی۔ باقی سب تو خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے۔ عذرا خوب چہک رہی تھی اور مخاطب بابا جان تھے۔ وہ بابا کے بہت آگے پیچھے رہتی ہے۔ یہ بات زہرہ خوب ہی محسوس کرتی تھی۔ بابا بھی اسے چھوٹی بہن ہی سمجھتے تھے، اور اس کے ہنسی مذاق کا برا نہیں مناتے تھے۔

''آپ کا فون ہے چھوٹی بی بی!'' ملازمہ نے آ کر زہرہ سے کہا۔

''یہ اتنے سویرے کس کا فون آ گیا؟ وہ بھی میرے لیے۔'' اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی پھوپھو کا فون ہے چھوٹی بی بی! اور وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔'' پھوپھو کے فون کا سنتے ہی زہرہ بے تابی اور خوش دلی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''فاطمہ آپا زہرہ سے بہت پیار کرتی ہیں۔'' اس کے جانے کے بعد عذرا نے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر کہا۔

''بہت محبت ہے پھوپھی بھتیجی میں۔'' الیاس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''اتنا پیار تو انہیں حاکمین سے بھی نہیں جو بچپن سے فاطمہ آپا کے پاس ہی رہ رہے ہیں۔''

''تم ناشتا کرو خاموشی کے ساتھ، یہ کیا باتیں لے بیٹھی ہو۔'' پروین نے جو بات کا رخ حاکمین کی طرف مڑتے دیکھا تو ٹوک دیا اور اس نے بھی بڑی فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

''بابا جان! پھوپھو جی کا فون تھا۔ وہ بلا رہی ہیں مجھے، ان کے ننھیال میں کوئی شادی ہے۔ مجھے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چلی جاؤں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ضرور جاؤ۔ مجھے معلوم ہے فاطمہ اور علاؤ الدین نے ہمارے سارے گھر کو مدعو کر رکھا ہے۔ ہم لوگ تو شادی والے روز ہی جائیں گے۔ تم اپنی پھوپھو کے ساتھ پہلے ہی چلی جاؤ۔''

''ٹھیک ہے بابا! پھر میں تیاری کر لوں۔'' وہ چلی گئی تو پروین بولی۔

''سوتیلے رشتے ہیں اور آپ جوان لڑکی کو وہاں تنہا بھیج رہے ہیں۔''

الیاس نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر بولیں۔

''اور جو کبھی میرے بھائی یہاں آ جائیں تو زہرہ کمرے سے باہر نہیں آتی۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ وہ کبھی میرے ساتھ میرے میکے گئی ہو۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' الیاس کے لہجے میں تیزی تھی۔

''جو کہنا چاہتی تھی کہہ چکی اور آپ سمجھ بھی گئے ہیں۔''

ان کا انداز بھی ایسا ہی تھا پھر اٹھیں اور تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''آپ آپا جان کی بات کا برا نہ مانیں بھائی صاحب! ویسے مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے۔ شادی بیاہ کے رسم و رواج مجھے تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں گے ناں۔'' عذرا بڑے میٹھے اور اپنائیت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم بھی تو میری بہن ہو اور آج کل ہمارے گھر میں ہو۔ سب کو بلایا ہے تو اس حساب سے تمہارا جانا تو پکا ہے۔'' وہ بھی غصہ تھوک کر مسکرانے لگے۔

زہرہ جب علاؤ الدین کی حویلی پہنچی تو فاطمہ کو اپنا منتظر پایا۔ وہ رہائشی حصے کے گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر لان میں تھیں اور شدت سے اس کی منتظر تھیں۔

''بس میں نے تو ناشتا بھی نہیں کیا فوراً کپڑے رکھے اور چلی آئی۔'' زہرہ ان سے ملتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''ناشتا تو میں نے بھی نہیں کیا۔ آؤ اب مل کر کریں گے۔''

انہوں نے اس کا گلابی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دونوں ہال کمرے میں آ گئیں۔ علاؤ الدین اور حاکمین سامنے ہی موجود تھے۔ زہرہ کے سلام کا جواب آج علاؤ الدین نے بڑی ہی عجلت میں دیا اور پھر حاکمین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جو ان کے سامنے سر تھوڑا جھکائے مگر چہرے پر اپنا مخصوص کروفر بھرا انداز سجائے کھڑا تھا۔

''میں پوچھتا ہوں ایسے اعلا شوق تمہیں لگ کہاں سے جاتے ہیں آخر؟'' ان کے انداز میں چبھن اور لہجے میں تیزی تھی۔

''اس میں آخر برائی کیا ہے؟'' حاکمین کی آواز پست تھی۔
''تو اچھائی کیا ہے۔ یہ بھی سمجھاؤ مجھے۔'' وہ مزید گرم ہوئے۔
''یہ میرا شوق ہے۔''
''تم کوئی شریفوں والا شوق کیوں اختیار نہیں کرتے اور یہ تمہارے لفنگے دوست آ جاتے ہیں ہر دوسرے تیسرے دن' انہی کی خوشامدوں نے تمہارا دماغ ساتویں عرش تک پہنچا دیا ہے۔ تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے باپ کا۔ میں کتنی محبت کرتا ہوں اور تم سارا دن تفریح کے نام پر جنگلوں میں کتوں کے ساتھ خرگوشوں اور دوسرے جانوروں کے پیچھے بھاگتے ہو۔''
''ہائے اس نے کتے بھی پالے ہوئے ہیں۔'' زہرہ نے منہ بنایا۔ سخت نفرت تھی اسے کتوں سے۔ ابا نے ایک دو بار کتا رکھنے کا ارادہ کیا تو اس نے شور ہی کر دیا کہہ دیا میں گھر میں کتا ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔
اب حاکمین کے کتوں کا سن کر بھی وہ کراہیت محسوس کر رہی تھی۔
''بابا میں شکار پر کبھی کبھی ہی جاتا ہوں۔''
''اور باقی کا وقت کہاں گزارتے ہو' یہ بھی بتا دو۔''
''آخر ہوا کیا ہے بھرا' کیوں ڈانٹتے ہو بچے کو؟'' فاطمہ جواب تک خاموشی سے کارروائی دیکھ رہی تھیں پوچھ بیٹھیں۔
''بہت بگڑ رہا ہے۔ الٹے الٹے شوق چڑھتے ہیں اسے۔ اب کہتا ہے فالکن لینا ہے۔ ناں میں پوچھتا ہوں۔ کیا ضرورت ہے لاکھ سوا لاکھ معمولی فالکن پر برباد کرنے کی۔ اور یہ بھی بتا دوں۔ وہ مہنگا دے رہا ہے۔ یہ پرندہ اس سے کم قیمت پر بھی مل جاتا ہے۔''
''یہ سدھایا ہوا ہے اس لیے قیمت زیادہ ہے۔''
حاکمین اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ فالکن خریدنا ہے تو بس خریدنا ہے۔ دماغ میں یہ بات سما گئی تھی اور پوری کیے بنا اسے چین کہاں آنا تھا۔
علاؤ الدین گردیزی سر جھٹک کر باہر چلے گئے۔ ویسے ان کی چال اور انداز بتاتے تھے۔ بیٹے سے ہار مان لی ہے۔ پوری کر دیں گے اس کی یہ ضد بھی۔
''کب آئی ہو زہرہ؟'' اب حاکمین توجہ سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔
''ابھی ابھی'' اس نے مختصراً کہا۔
''رہو گی۔'' حاکمین کا لہجہ ہنوز اپنائیت بھرا تھا۔
''شاید۔'' جواب کا انداز اب بھی وہی تھا۔
''شاید کیوں' میں نے بلوایا ہے اس کو۔ اب یہ عزیز کی شادی تک یہیں میرے پاس رہے گی' میرے ساتھ ہی شادی میں شرکت کرے گی۔''

''اپنے اس پروگرام سے انہیں بھی آگاہ کر دیتیں پھوپھو اس بے چاری کو تو علم ہی نہیں کہ اسے یہاں بھی رہنا ہے اور شادی میں شرکت بھی کرنا ہے۔'' اب اسے زہرہ کے جواب پر غصہ آیا تھا۔ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی ٹالنے کو شاید کہہ دیا۔ اسے سنا کر وہ چلا گیا۔ زہرہ نے نوٹس نہیں لیا۔ فاطمہ سے کہنے لگی۔
''جلدی سے ناشتا لگوائیں۔ بھوک لگ رہی ہے۔''
فاطمہ نے نیتی کو آواز دے کر ناشتا لگانے کو کہا۔ پھر اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھیں۔
''یہ کیا قصہ تھا۔ تایا جان کافی ڈانٹ رہے تھے۔ حاکمین کو۔ آج سے پہلے میں نے انہیں اس موڈ میں کبھی نہیں دیکھا؟'' فاطمہ مسکرائیں اور بولیں۔
''حاکمین کے شوق بھی تو نرالے ہیں' مجال ہے جو کبھی کسی کام میں باپ کی مدد کی ہو۔ شکار کے لیے کتے رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے تو ان کتوں کی دیکھ بھال گھر کے نوکر ہی کرتے تھے۔ اب کل کہہ رہا تھا قریب ہی کہیں پکھی واسی آ کر ٹھہرے ہیں۔ یہ قوم کتے سدھانے میں ماہر ہے اور اب حاکمین کا ارادہ ہے اس سلسلے میں ان خانہ بدوشوں سے بات کرنے کا جبکہ علاؤ الدین بھرا کو یہ بات پسند نہیں۔ یہ خانہ بدوش ایک تو جرائم پیشہ ہوتے ہیں اور چرب زبان بھی حاکمین جیسے نوجوان جنہیں پیسے کی پروا نہیں۔ دھیان کھیل تماشوں کی طرف رہتا ہے۔ ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور پھر مزاج کا بھی تو گرم ہے۔ کوئی بات پسند نہ آئے تو خون اتر آتا ہے آنکھوں میں اور وہ لوگ بھی بڑے سخت مزاج کے ہوتے ہیں۔ بس اسی لیے اس کا باپ چاہتا ہے یہ ادھر نہ جائے۔''
''مگر اب تو بات کتوں کی نہیں کسی پرندے کی ہو رہی ہے۔ شاید جس کی قیمت ایک لاکھ روپے تک ہے۔''
''ہاں فالکن لایا ہے کوئی شکاری چولستان سے اور یہ حاکمین اسے خریدنا چاہ رہا ہے۔''
''آخر کیا کریں گے اتنا مہنگا خرید کر۔'' زہرہ کو غصہ آیا حاکمین کی ضد پر۔
''شکار کا شوق ہے اور فالکن شکاری پرندہ ہے۔ سدھایا جاتا ہے اسے شکار کے لیے۔''
''اگر یہی حال رہا آپ کے بھتیجے صاحب کا تو کوئی پتا نہیں یہاں ایک چڑیا گھر ہی آباد ہو جائے۔''
فاطمہ ہنس پڑیں اور بولیں۔ ''گھوڑے تو پہلے ہی پال رکھے ہیں اور ان کی خاطر خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔''

☆......☆......☆

''آپ سمجھاتیں کیوں نہیں حاکمین کو۔ اسے اب زندگی کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ فضول کے کھیل تماشے کسی کام نہیں آتے۔''
''ارے نہیں۔ زمینداروں کے لڑکے اس عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہی کھیل تماشے تو شان ہیں ان کی۔ وقت گزر جائے تو پھر یہ شوق اور جنون نہیں رہتا۔ کبھی میرے دونوں بھائی بھی گھوڑوں کے شوقین تھے۔ مگر اب ایسے جھنجٹ ہیں زمینداری اور دوسرے کاموں کے کہ سارے شوق بھول گئے ہیں' اور حاکمین تو پڑھا

لکھا اپنے ہم عمروں کے مقابلے میں کہیں سمجھدار اور سنجیدہ مزاج کا لڑکا ہے۔''
وہ اتنی تعریفیں کر رہی تھیں اس کی۔ اس صورت میں زہرہ نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار محفوظ رکھنا ہی بہتر جانا۔ ویسے اسے سراسر اختلاف تھا اس معاملے میں اپنی پھوپھو سے۔
نیتی ناشتا لے کر آئی اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی تھی۔
''آج چھوٹے سائیں کے دوست شہر سے آ رہے ہیں۔ کل سویرے یہ سب شکار کے لیے جائیں گے سائیں نے کہا ہے کل صبح سویرے چار مرغ بھون کر اور پراٹھے بنا کر باندھ رکھنا۔ ہم ساتھ لے کر جائیں گے۔''
''لیجیے شکار پر جا رہے ہیں اور بھنا گوشت ساتھ لے کر' وہاں کیا انہوں نے پھولوں پتیوں کا شکار کرنا ہے۔'' زہرہ کو ہنسی آ گئی۔
''شکار کا موسم ہی کہاں ہے۔ یہ تو بس لڑکوں کا جوش ہے ورنہ اس موسم میں تو گیدڑ ہی ملیں گے انہیں۔'' فاطمہ نے بھی ہنس کر کہا۔
''پھر کھانا تیار کریں جی!'' نیتی نے ان کی گفتگو کا یہی نتیجہ اخذ کیا۔
''اگر حاکمین سے اپنی چمڑی ادھڑوانے کا شوق ہے تو بے شک نہ تیار کرنا۔''
''آپ ہی تو کہہ رہی ہیں جی کہ......'' وہ شپٹائی۔
''مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ نہیں جا رہے۔ یہ ساری بات وہ بھی سمجھتے ہیں مگر جانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔''
''آپ حاکمین سائیں کی شادی کر دیں جی۔ بیوی گھر میں آ جائے گی تو سارے شوق ختم ہو جائیں گے۔'' نیتی کے برابر اب تک خاموش کھڑی سہو نے مشورے سے نوازا۔
''ایسے کون سے غلط شوق ہیں اس کے جو میں شادی کے لیے پابند کردوں اس کو۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔ نہیں چاہئیں ہمیں یہ مشورے۔''
فاطمہ نے جھڑک کر کہا اور دونوں سر جھکا کر واپس چلی گئیں۔
''کہتی تو وہ ٹھیک ہی تھی۔'' سہو کے جانے کے بعد زہرہ نے اس کی طرف داری کی۔
''ٹھیک کہیں یا غلط۔ ان ملازم پیشہ لوگوں کو اپنے کسی معاملے میں بولنے دینا بڑی غلطی ہے۔ یہ کوئی بات اپنے تک نہیں رکھتے۔ اگر ہم اپنی محبت میں حاکمین کی بھلائی کی خاطر ہی کوئی ایسی بات کر جائیں گے تو یہ لوگ بات کچھ اور طرح لیں گے اور سب میں پھیلائیں گے۔'' زہرہ کی سمجھ میں ان کی بات آ گئی۔
''بتاؤ آج کیا پکواؤں تمہارے لیے؟''
''آج کھانا ہم خود بنائیں گے پھوپھو؟''
''بس میں اور آپ ہوں گی باورچی خانے میں کھانا بھی بنے گا باتیں بھی ہوں گی۔''
''آج تو یہ ممکن نہیں۔ نیتی بتا تو رہی تھی حاکمین کے دوست آ رہے ہیں۔ وہ کافی سارے لڑکے

ہوں گے پھر گاؤں آتے ہیں تو ہر شے کو سوغات سمجھ کر کھاتے ہیں۔ اب ہم کہاں اتنی مقدار میں کھانا بناتے رہیں گے۔''
''آج موسم اچھا ہے پھوپھو! کیوں نہ ہم گاڑی نکلوائیں اور ذرا زمینوں کی سیر ہی کر آئیں۔''
''ہاں یہ خیال اچھا ہے۔ میں کھانے کے بارے میں نیتی سے کہہ دوں پھر ڈرائیور کو پیغام بھیج کر گاڑی نکلواتے ہیں۔''

☆......☆......☆

جس وقت وہ گاڑی میں حویلی سے روانہ ہوئی تھیں دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل تھے۔ اور ہوا میں شدت جولائی کا مہینہ شروع تھا۔ سخت گرمی کے بعد اس سال کی یہ پہلی بارش تھی جس کو آج برسنا تھا۔ ایسا موسم ان پر خوشی طاری کر رہا تھا۔ دونوں راستوں پر نظر دوڑاتی خوب باتیں کر رہی تھیں۔ ذرا دیر کے بعد وہ پکھی داسوں کے خیموں کے قریب پہنچ گئیں۔ ان کی عورتوں بچوں نے جو گاڑی دیکھی تو ادھر دوڑے چلے آئے اور ان کو گھیرے میں ہی لے لیا۔
''اوہو یہ تو نہیں ٹلنے والے۔ دیکھو تو کیسے راستہ روکے کھڑے ہیں۔'' فاطمہ نے الجھن محسوس کی۔ جبکہ زہرہ ان عورتوں کے زیورات دیکھ رہی تھی۔
''کتنا سونا چاندی چڑھائے یہ آرام سے ادھر ادھر آزادی سے پھرتی ہیں۔''
''واقعی دلیر قوم ہے۔'' وہ ان کے بلاق' تو تیڑی' اور گانی کو بغور دیکھ رہی تھی جبکہ وہ عورتیں اور بچے پوری دلجمعی سے مانگنے میں مصروف تھے۔
''انہیں کچھ دو۔ راستہ چھوڑیں۔'' فاطمہ نے ڈرائیور سے کہا تو وہ حکم کی تعمیل کو نیچے اترنے لگا۔
''کپڑے کیسے میلے پھٹے پرانے اور زیور کتنا سارا ہر عورت نے چار پانچ تولے تو ضرور سونا چڑھا رکھا ہے۔ چاندی اس کے علاوہ ہے۔''
''پتا نہیں خالص سونا ہے بھی یا نہیں۔'' فاطمہ کو سخت بیزاری ہو رہی تھی۔
ان عورتوں سے نظر ہٹا کر زہرہ نے ان کے خیموں کی طرف دیکھا۔
''اف کس قدر خوفناک کتے ہیں ان کے پاس۔'' اسے خوف اور کراہیت محسوس ہوئی۔ ''یہ تو خطرناک لوگ ہوں گے۔'' اس نے فاطمہ سے کہا۔
''پتا نہیں۔ ویسے ہمارے علاقے میں اسی جگہ ہر سال خانہ بدوشوں کی کوئی نہ کوئی قوم ڈیرے لگائے رکھتی ہے۔ خاص کر سردیوں کے موسم میں یہ خالی کلر زدہ میدان بہت آباد ہو جاتا ہے۔''
''ہماری طرف ایسے میدان نہیں ہیں۔ میں نے کبھی ان لوگوں کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا۔ ذرا دیکھیے تو کیسے خوفناک کتے ہیں ان کے پاس۔''
''ہاں یہ قوم کتے سدھانے میں ماہر ہے۔ حاکمین بھی ان کو ہی اپنے کتے دینا چاہتا ہے سدھانے کے لیے۔''
''آپ منع کریں اسے۔ یہ لوگ تو چہروں سے ہی بہت کرخت اور بے رحم لگتے ہیں۔ ان سے جتنی دور

رہا جائے اچھا ہے۔ آپ سمجھایئے اسے۔ یہ اس کے گاؤں کے رہنے والے غریب لوگ تو ہیں نہیں جو اس کے محتاج ہیں اور نظر جھکا کر بات کرتے ہیں یہ لوگ آزاد ہیں اور اپنی مرضی کرنے والے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ لوگ جرم بھی آسانی سے کرسکتے ہیں۔"

وہ کتوں اور ان کے قریب بیٹھے مردوں کو دیکھتی کبھی عورتوں کو۔

"ہاں سمجھاؤں گی مگر میں جانتی ہوں، مانے گا نہیں جو اس کے جی میں سما جائے کر کے چھوڑتا ہے۔ باپ کی حمایت بھی حاصل ہے۔ وہ ذرا کی ذرا ڈانٹیں گے پھر اسی کی ہاں میں ہاں ملائیں گے کہ جو اس کے شوق ہیں، کبھی وہی تو بھرا علاؤ الدین کے بھی ہوا کرتے تھے۔"

فاطمہ ہنس پڑیں۔ اور زہرہ نے سوچا۔ حاکمین کو حمایت تو آپ کی بھی حاصل ہے۔ آپ کو بھی اس کی کوئی بات غلط نہیں لگتی۔

گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔ خانہ بدوشوں کے خیمے پیچھے رہ گئے تھے۔ مگر اس کے دل پر کچھ بوجھ سا اب تک تھا۔ حاکمین کو ان لوگوں کے پاس نہیں آنا چاہیے یہی بات اس کے ذہن میں چکرا رہی تھی۔

"بھرا علاؤ الدین نے دو رتیاں (بھینسوں کی قسم) منگوائی ہیں کہو تو باڑے چلیں۔ بھرا کئی بار مجھے کہہ چکے ہیں کہ جا کر دیکھ لو۔"

"ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں۔" اسے جانوروں میں دلچسپی نہیں تھی مگر پھوپھی کی بات ٹالنا اچھا نہیں لگا۔

باڑے میں انہیں کچھ دیر لگی۔ وہاں بکریاں بھی تھیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی اور پرانی نیلیوں (بھینسوں کی قسم) کے ساتھ ساتھ دو رتیاں بھی کھڑی تھیں۔ مضبوط چست اور بڑے بڑے گولائی والے سینگوں والی، یہاں آ کر زہرہ کو اندازہ ہوا وہ بھینسوں کی اقسام اور عادات کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔ وہ اس کے رکھوالے سے دیر تک مختلف باتیں کرتی رہیں۔ زہرہ بکریوں کے بچے دیکھتی رہی۔

"ادھر کچھ ہی فاصلے پر حاکمین کے گھوڑے بھی ہیں کہو تو دیکھنے چلیں۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے نہیں دیکھنے۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"بی بی جی! رانی (گھوڑی) کو رت کی بیماری ہوگئی ہے۔"

"وہ اچھا۔ پھر کیا علاج کر رہے ہو تم؟" رانی کی فکر ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"پتا نہیں جی اس کا سائیس تو منگا ہے۔ وہ بہت ڈرا ہوا ہے۔ کہتا ہے اگر چھوٹے سائیں کو پتا چل گیا تو بہت ناراض ہوں گے۔"

"مگر چھپانا تو بہت غلط ہے۔ مالک کو ہر بات کی خبر ہونی چاہیے۔ منگے کو بھیجنا میرے پاس۔ اسے کہنا نسخہ لے جائے اور پلستر چڑھائے رانی کے پیروں پر۔ اور حاکمین کو تو میں خود خبر کروں گی۔ تم سب ایک سے بڑ حرام اور نکمے ہو۔ پھر اس پر مالک سے چھپاتے بھی ہو۔ اگر رانی کی بیماری بگڑ گئی تو کتنا نقصان ہو جائے گا ہمارا۔ مگر تم لوگوں کو کیا پروا۔ تمہیں تو بس اپنے کھانے سے مطلب ہے۔"

وہ اس پر گرم ہوتیں باہر آگئیں۔ غصہ غالباً کافی دیر برقرار رہا اور وہ اتنی دیر خاموش رہیں۔ زہرہ نے

بھی کوئی بات نہیں کی۔ پھر انہوں نے ہی زہرہ کو مخاطب کیا اور بولیں۔

"تم زمیندار کی بیٹی ہو تمہیں بھی ان سب باتوں کی پہچان ہونی چاہیے۔ میرا خیال ہے تم نہ تو بھینسوں کی قسموں میں تمیز کرسکتی ہو اور نہ ہی ان کی خصوصیات جانتی ہو۔ تمہیں فصلوں کے بارے میں کچھ پتا ہے نہ تم یہ جانتی ہو کہ ایک زمیندار کو ملازم کس طرح رکھنا چاہیے۔"

"چھوڑیں پھوپھو! مجھے یہ سب جان کر کرنا بھی کیا ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کیوں چھوڑ دوں تم زمیندار کی بیٹی ہو اور بیاہ کر زمینداروں کے گھر میں ہی جاؤ گی اور جب ہر بات پر لاعلمی کا اظہار کرو گی تو کیا عزت بنے گی۔ سسرال میں سب کہیں گے۔ اسکول کالج کی کتابیں ہی پڑھتی رہی اور وہ زندگی جس کو گزارنا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں۔ زہرہ میری بچی! یاد رکھو غیر تعلیم یافتہ لوگ بہت سخت اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی چالیں اور ان کی گفتگو اکثر تم پڑھے لکھے اور عملی زندگی سے دور رہنے والے نہیں سمجھ سکتے۔ تم جو اتنے سال کتابیں پڑھنے، تمیز شائستگی اور اچھی سوچ اپنانے میں گزارتے ہو یہ سارا وقت ان پڑھ لوگ زندگی کے عملی تجربات کر کے بسر کرتے ہیں۔ وہ وقت سے پہلے ہوشیار ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی بے رحم بھی۔ اگر ان سے برائی ہوئی ہو تو وہ اس کا بدلہ ہر ایک سے لینے میں خود کو حق بجانب خیال کرتے ہیں۔ میں تمہاری طرح تعلیم یافتہ نہیں مگر اردو لکھنا پڑھنا بخوبی جانتی ہوں اور جتنا عرصہ میں نے تعلیم حاصل کرنے میں بسر کیا تھا۔ وہ عرصہ میری ساتھی لڑکیوں نے خاندانی سیاستیں اور زندگی کے مختلف داؤ پیچ سیکھنے میں گزارا تھا۔ اور زہرہ ایک عرصے تک میں اپنے خاندان کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں خود کو بالکل بدھو سمجھتی رہی پھر رفتہ رفتہ میں نے وہ سب سیکھا جس کی مجھے اس ماحول میں رہتے ہوئے ضرورت ہوسکتی تھی۔"

"مگر پھوپھو! مجھے کسی سے مقابلہ نہیں کرنا نہ ہی برائی کا بدلہ برائی سے دینا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر اتنا تو سیکھ لو کہ کوئی تمہاری ہنسی نہ اڑا سکے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے نیم دلی سے کہہ دیا۔

"آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو مجھے یہ سب نہ سمجھانا پڑتا۔ وہ خود ہی تمہیں وقت کے ساتھ ساتھ سب سکھاتی رہتی۔ میں تو کہتی ہوں اب بھی کچھ عرصے کے لیے میرے پاس آ جاؤ تاکہ تمہیں پتا چلے۔ ایک زمیندار کا گھر اور گھر داری کیا ہوتی ہے۔ بظاہر سارا وقت گھر میں گزارنے والی زمیندار کی عورتیں اصل میں کتنی مصروف اور باخبر ہوتی ہیں اور ایسا کیونکر ہوتا ہے۔ یہ سب تمہیں جاننا چاہیے زہرہ!"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سنبھالنا تو سب نوکروں نے ہی ہوتا ہے۔" زہرہ کی عدم دلچسپی ہنوز برقرار تھی۔

فاطمہ یوں مسکرائیں جیسے ان کے سامنے ناسمجھ بچی نے کوئی بات کی ہو پھر بولیں۔

"یاد رکھو عورت گھر داری میں کتنی بھی طاق ہو۔ خاندان بھر میں نیک نام ہو مگر تب ہی اس کی ذہانت کو تسلیم کریں گے جب وہ ان باتوں میں بھی سوجھ بوجھ رکھے گی۔ جو مرد سے متعلق ہیں۔ چاہے وہ منہ سے کچھ

کہیں نہ کہیں مگر ایسا عورت کو تسلیم کیے بنا وہ رہ نہیں سکتے اور پڑھی لکھی عورت کا المیہ ہے' وہ نظر انداز کیا جانا سہہ نہیں سکتی اور نظروں میں رہنے کے لیے اس خواہش کی تکمیل کے لیے کہ وہ صرف تمہیں عورت ہی نہیں انسان بھی سمجھے' ضروری ہے کہ ماحول پر نظر رکھ. اور معلومات لیتی رہو اور ہمارا حاکمین تو یوں بھی کسی کو سراہنے کے معاملے میں بڑا کنجوس ہے۔''

''ارے اس سارے قصے میں حاکمین کا ذکر کیسے اور کیوں۔'' وہ چونکی' دل زور سے دھڑکا اور پھر اس کے بعد وہ توجہ سے سن نہیں سکی۔ فاطمہ کیا کہتی رہیں۔ اس کا دھیان اسی فقرے کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ تو کیا یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ کیا بزرگوں میں یہ بات طے ہے یا پھوپھو یونہی اپنی خواہش کا اظہار کر گئی ہیں۔ وہ سمجھ نہیں مگر اسے محسوس ہوا وہ کچھ ہلکی پھلکی سی ہو گئی ہے اور موسم پہلے سے کافی زیادہ خوشگوار ہو گیا ہے۔ وہ چاہ رہی تھی پھوپھو پھر سے حاکمین کی کوئی بات کریں۔ یونہی کوئی عام سی بات ہی سہی مگر وہ اس کے دل کی بات سمجھیں نہیں گفتگو کا رخ پھر حاکمین کی طرف نہیں آیا۔ جس وقت یہ لوگ کینوؤں کے باغ تک پہنچیں' اچھی خاصی بارش شروع ہو چکی تھی۔

''اب ایسے موسم میں گاڑی سے اترنا حماقت ہے۔''

''یہاں سے تھوڑی دور جب امرودوں کے باغ شروع ہوتے ہیں۔ وہاں الیاس بھرانے گیسٹ ہاؤس بنا رکھا ہے۔ اچھی خاصی آرام دہ اور پیاری جگہ ہے مگر میرا خیال ہے ہمیں اب گھر واپس چلنا چاہیے گیسٹ ہاؤس کو جو راستہ جاتا ہے وہ باغ کے درمیان سے ہے اور کچا ہے۔ پھر موسم کے آثار ایسے اچھے نہیں لگتے۔ لگتا ہے آج بادل برسیں گے اور خوب برسیں گے۔''

وہ دونوں گھر آ گئیں۔ باتیں کرتے اور سر سے چادریں اتار کر دوپٹے ٹھیک سے اوڑھنے کے دوران ہال میں داخل ہوئیں تو سامنے حاکمین کھڑا تھا۔

''کہاں تھیں آپ ایسے موسم میں؟'' اس نے فاطمہ کو مخاطب کیا۔ جواب میں انہوں نے تفصیل سے بتا دیا۔

''میرے گھوڑے بھی دیکھے آپ نے۔'' لہجے میں بڑا اشتیاق تھا۔ ویسے مخاطب وہ اب بھی فاطمہ سے ہی تھا۔

''نہیں ہم ادھر نہیں جا سکے۔ اصل میں جانا تو ہمیں باغ میں تھا۔ پھر بس ایسے ہی بھرا الیاس کی جھنگ سے منگوائی بھینسیں دیکھنے چلے گئے اور وہاں کوئی بتا رہا تھا تمہاری رانی کو رت کی بیماری ہو گئی ہے۔''

''کیا؟'' اس پر تو جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

''ٹھیک ہو جائے گی ابھی۔ میں نسخہ بھجواتی ہوں، اللہ ڈیوایا کے ہاتھ۔ ویسے سائیس خود بھی تجربہ کار ہے۔ وہ دیکھ بھال کرے گا۔'' مگر حاکمین نے نہ کچھ سنا نہ کہا۔ برستی بارش میں باہر نکل گیا۔

''اب ایسے موسم میں ڈاکٹر کو لائے گا۔ دیوانہ ہے یہ اپنے جانوروں کے پیچھے۔''

''صرف جانوروں کے پیچھے، اسے انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیا؟'' زہرہ نے آج پہلی بار انہیں

اس کے بارے میں کریدنا چاہا تھا۔

''لو یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' وہ ہنسی۔

''میرا مطلب ہے کوئی لڑکی؟'' اس نے دبے لفظوں میں وضاحت کی۔

''پتا نہیں' جوان لڑکا ہے اور رج کے سوہنا پھر زندہ دل، عمر بھی نازک، کوئی تو ہو گی ہی، پر یہ سب وقتی ابال ہوتا ہے۔ اس عمر کا حصہ ہوتا ہے یہ تو۔ ایسے پارسا تو کم ہی ہوتے ہیں جو یہ عمر بھی۔ بچ بچا کر گزاریں اور وہ زمیندار کا بیٹا۔''

''آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے زمینداروں کے بیٹوں پر یہ فرض ہے۔'' اس نے جیسے برا مانا۔

''فرض ہے نہیں مگر بنا ضرور لیا ہے۔ اسے بھی شان کی علامت سمجھتے ہیں۔''

''کیا یہ اچھی بات ہے؟'' زہرہ نے کہا۔

''نہیں اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''پھر آپ نے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''پہلی بات تو یہ کہ یہ وقتی ابال ہوتا ہے۔ اور دوسروں میں اسے روک سکتی بھی نہیں۔ اولاد اپنی بھی ہو تو ایک عمر پر آ کر خود مختار ہو جاتی ہے وہ تو بھتیجا ہے میرا۔''

''اور اس لحاظ سے تو اسے آپ کا احسان مند بھی ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ماؤں کی طرح راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ آپ نے اس کے دکھ اپنے دل میں اتارے ہیں حالانکہ آپ ماں نہیں تھیں۔''

''وہ مانتا ہے۔ بہت قدر کرتا ہے' میرے ان دنوں کا احساس اسے بہت ہے مگر زہرہ میں اب اسے ایسا کچھ نہیں کہتی۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھنے لگے۔ میں یہ روک ٹوک ان دنوں کے بدلے کے طور پر کر رہی ہوں۔ میں ان دونوں کے بدلے میں اب اس کے دن و رات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہوں اور پھر مجھے ٹھیک سے علم بھی تو نہیں کہ اس کے شوق صرف شکار اور کھیلوں تک ہیں۔ یا کچھ اور بھی۔ وہ شہر جاتا ہے کہاں رہتا ہے کیا کرتا ہے کبھی میں اس ٹوہ میں نہیں رہی۔''

اس کے دوست بار بار اندر پیغام بھجواتے رہے حاکمین کہاں ہے، کب تک آ جائے گا، ہمارے لیے کچھ کہہ کر گیا ہے یا نہیں۔

☆......☆......☆

وہ رات کو کافی دیر سے واپس آیا بارش کی تیزی اب زور توڑ چکی تھی مگر ہلکی بارش ابھی جاری تھی اور حاکمین کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔

''کہاں پھرتے رہے ہو کیچڑ بھی لگی ہے گیلے بھی ہو رہے ہیں کپڑے۔''

''بس وہ رانی کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ شہر سے ڈاکٹر کو لے کر آیا، اچھی خاصی بیمار ہے رانی میں اس سائیس کو تو نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کے لہجے میں غصہ چھلک رہا تھا۔

''جاؤ نہا کر کپڑے بدلو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔ یہ موسم کچھ اچھا نہیں ہے۔''

"گرمی کی بارش ہے، خیر ہے ناں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"بے شک گرمی کی بارش ہے، کبھی لوگ اس بارش میں ضرور ہی نہایا کرتے تھے مگر اب تو جیسے ہر شے کی تاثیر الٹ گئی ہے، تم جاؤ نہالو۔" پھر زہرہ سے بولیں۔ "ذرا جانا بیٹی! نیتی ہوگی باورچی خانے میں اسے کہو کھانا نکال دے۔ روٹی تو ابھی ابھی تازی ڈالے اور چائے بھی بنادے۔"

"چائے رہنے دیں۔ رات کو پی لوں تو پھر نیند دیر سے آتی ہے۔ میں تھکا ہوا ہوں۔"

زہرہ منہ سے کچھ بولے بغیر سر ہلا کر باہر آگئی۔ نیتی روٹی ڈالنے لگی۔ وہ ادھر ہی رک گئی۔

"تمہارے چھوٹے صاحب صبح شکار پر جارہے ہیں۔"

"ہاں بی بی! مجھے بیگم صاحبہ نے بتایا تھا۔ صبح ناشتا کھانا میں ہی تیار کرکے ساتھ کروں گی۔"

"کتنے بجے تک جائیں گے یہ لوگ؟"

"صبح سرگی ویلے۔ ابھی اندھیرا ہی ہوتا ہے یہ لوگ چل پڑتے ہیں۔"

"کبھی کوئی شکار لانے بھی یا شام کو یونہی ہاتھ ہلاتے چلے آتے ہیں۔"

"نہیں خیر موسم ہووے تو شکار بہت ہے ہمارے علاقے میں۔ پر آج کل مشکل ہی ہے اور کل تو اگر دھوپ نکلی تو بڑی تیز بدن کو چبھنے والی ہوگی۔ بارش کے بعد کی دھوپ اچھی نہیں ہوتی آپ سمجھاؤ چھوٹے سائیں کو۔"

"کیوں بھئی مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اور وہ کوئی ننھے بچے ہیں۔ سمجھدار ہیں۔ اگر جانا ہوگا تو میرے کہنے پر رک تھوڑی جائیں گے۔"

"بی بی! یہ جو منڈے (لڑکے) ہوتے ہیں ناں یہ بڑے لاپروا ہوتے ہیں۔ انہیں تو ہر بات کہنی ہی پڑتی ہے۔" زہرہ کوئی جواب دیے بغیر واپس آگئی۔ حاکمین نہا کر کپڑے تبدیل کیے...... فاطمہ کے پاس بیٹھا تھا۔

"کتنی دیر ہے کھانا تیار ہونے میں؟" اس نے زہرہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"پتا نہیں میں تو کہہ کر آگئی تھی۔" وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ نیتی اب کچھ ہی دیر میں کھانا لے آئے گی۔

مگر پتا نہیں کیا بات تھی۔ حاکمین سے وہ ایسے ہی انداز میں بات کرنے پر خود کو مجبور پاتی تھی۔

شاید اس لیے کہ وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے اسے اپنی ذات کچھ دبی ہوئی یا دبتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ کہیں یہ بات کہ زہرہ اس کے سامنے جھجک جاتی ہے بظاہر مضبوطی سے جمی یہ لڑکی اندر سے پگھلنے لگتی ہے۔ وہ نہ جان لے اسی لیے زہرہ روکھا لہجہ اپنانے پر مجبور ہوجاتی تھی۔

حاکمین اور فاطمہ کو وہیں چھوڑ کر وہ فاطمہ کے کمرے میں آگئی۔ جو آج کل اس کا بھی تھا۔ جب بھی ادھر آتی فاطمہ کے کمرے میں ہی سوتی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا زہرہ، فاطمہ اور علاؤ الدین گردیزی نے اکٹھے اور بڑے خوش گوار ماحول میں کھایا۔

حاکمین ان میں موجود نہیں تھا۔ اور چونکہ وہ تو کھانا لگنے کے بعد ہی فاطمہ کے کمرے سے بلوائی گئی تھی اس لیے نہیں جانتی تھی کہ اس کی غیر حاضری کی وجہ کیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں ہے یا دوستوں میں بیٹھا ہے اور اس نے ان سے پوچھا بھی نہیں۔

کھانے کے بعد علاؤ الدین شہر جانا چاہ رہے تھے ان کے کسی دوست کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع آئی تھی۔

"بھرا! صبح چلے جانا۔ آپ نے عیادت کو ہی جانا ہے ناں۔" فاطمہ نے ایک دو مرتبہ کہا مگر وہ اسی وقت روانہ ہونے کا ارادہ باندھے بیٹھے تھے۔

صبح جب زہرہ نماز کے لیے اٹھی تھی تو نیتی اور سکھاں کو بہت مصروف پایا۔

"کیا پوری بارات کا کھانا ساتھ لے کر جارہا ہے تمہارا چھوٹا سائیں۔" اسے ہنسی آگئی۔

"ناشتا بھی ادھر ہی کریں گے اور دوپہر کی روٹی بھی لے کر جائیں گے۔ ان کے شہری دوستوں کی فرمائشیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ ہم نے خشخاش کا حلوہ بھی بنایا ہے۔ چنے کی دال اور پیٹھے کا حلوہ بھی ہے۔ بھونا مرغ اور نہاری گیہوں کے سادے پراٹھے گڑ' انڈے والے پراٹھے اور بھونا قیمہ، ہم تو بس رات ذرا کی ذرا ہی کمر سیدھی کرنے کو لیٹے تھے۔ فکر یہی تھی کہیں کوئی چیز رہ گئی تو چھوٹا سائیں بہت ناراض ہوگا"

"یہ سب کے سب مطلبی دوستی ہیں۔ کھانے پینے کے شوق میں ہی شہر سے آتے ہیں اور تمہارا چھوٹا سائیں کسی شہنشاہ کی طرح اپنی دولت لٹاتا ہے۔ مجھے یقین ہے جب یہ حاکمین شہر جاتا ہوگا تب بھی سارے پیسے یہی خرچ کرتا ہوگا۔"

"تو آپ سمجھائیں چھوٹے سائیں کو۔" نیتی اور سکھاں اس وقت حاکمین کے لیے بڑی پریشان لگ رہی تھیں۔

"مجھے کیا ضرورت ہے۔ وہ اڑائے یا سینت کر رکھے میری بلا سے۔"

ان دونوں کے سامنے خود کو حاکمین سے بالکل لاتعلق ظاہر کرنا اسے بڑا مطمئن سا کرگیا۔ بس وہ ہر کسی پر یہ واضح کردینا چاہتی تھی کہ اس کا حاکمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

"لسی کا ڈول کدھر ہے؟" اللہ ڈیوایا جو سب سامان جیپ میں رکھ رہا تھا۔ لسی کا ڈول نہ پاکر پوچھنے چلا آیا۔

"ہا! وہ تو ہم ادھر ہی بھول گئے۔" سکھاں الٹے پاؤں باورچی خانے میں بھاگی اور جاکر ڈول لے آئی۔

جب حاکمین اونچی آواز میں دور ہی سے ساری تیاری کے بارے میں پوچھتا ادھر آیا تو زہرہ وہاں سے چلی آئی۔ اس نے سنا۔ وہ نیتی سے ایک ایک چیز کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مڑ کر دیکھا۔ ادھر حاکمین کی پشت تھی، بلند قامت، مضبوط و توانا، سر اٹھا کر ہاتھ پشت پر باندھے کھڑا وہ کتنا بھرپور کتنا شاندار دکھائی دے رہا تھا۔ زہرہ رک گئی اور ایک ٹک ادھر ہی دیکھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ برآمدے کی تین سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔

زہرہ نے گہری سانس کھینچ کر نظر پھیری اور وضو کرنے چل دی۔

نماز سے فارغ ہوئی تو فاطمہ کمرے میں نہیں تھیں وہ اٹھی کچھ سوچتی ہوئی دبے قدموں سے کمرے سے باہر آئی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ پورا ہال خالی پڑا تھا۔ وہ دائیں طرف مڑی اور دروازہ کھولتی گیلری میں آ گئی۔ یہیں علاؤ الدین اور حاکمین کے کمرے تھے۔ زہرہ نے محسوس کیا۔ اس کا دل معمول سے زیادہ رفتار میں دھڑک رہا ہے۔ چوری کا احساس ہے اور پکڑے جانے کا خوف مگر وہ خود کو باز نہیں رکھ سکی۔ ہلکے سے ہینڈل پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ بھاری پردہ ہٹا کر اندر حاکمین کے کمرے میں آ گئی۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ سب کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ زہرہ نے لائٹ آن کی اور ہر شے واضح ہو گئی۔

کھڑکیوں دروازوں پر بھاری گہرے براؤن اور کالے پرنٹ کے پردے پڑے تھے۔ قالین میں بھی ایسے ہی رنگ نمایاں تھے۔ فرنیچر بھاری اور بلیک کلر کا تھا۔ وارڈ روب بھی سیاہ تھی۔ اور اس کی آرائش جرمن سلور سے کی گئی تھی۔ بیڈ پر بھی جرمن سلور کا کام تھا۔ بیڈ شیٹ آف وائٹ تھی اور ہلکا سا پرنٹ بھی تھا۔ کمرے میں جگہ جگہ حنوط شدہ پرندے اور جانوروں کی کھالیں یقیناً آرائش کے لیے تھیں اور یہ زہرہ کو حاکمین کے سنگدلانہ مزاج کا پتا دیتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ بھلا سونے کے کمرے میں ایسی سجاوٹ کی کیا ضرورت ہے۔ کیسے نیند آجاتی ہے اسے ان معصوم پرندوں کے بے جان جسموں کے درمیان۔ مرغابیاں، ایک عدد تلور اور سیاہ ہرن یہ سب کبھی زندہ ہوں گے آزاد فضا میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قدرت کے حسین نظاروں میں سے ایک ہوں گے۔ بھلا یہ خوب صورت چیزیں مارنے کے لیے ہوتی ہیں۔'' کمرا خاصا بڑا تھا۔ یہاں ایک ریک اور ایک عدد شوکیس بھی نمایاں تھا مگر زہرہ آگے نہیں بڑھی۔ وہ وہیں کھڑی برے دل کے ساتھ ان حنوط شدہ چیزوں کو دیکھتی رہی اور پھر اس کی نظر سنہری فریم میں جکڑی حاکمین کی تصویر کی طرف اٹھ گئی۔ قدم خود بخود آگے بڑھے اور وہ اس تصویر کے سامنے جا کر رک گئی۔

آج ایک ایک نقش اس کے سامنے واضح تھا۔ اس نے چاہ کے باوجود کبھی حاکمین کو بغور نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈرتی تھی اگر اس نے اسے اپنی جانب متوجہ پالیا تو کیا ہوگا۔ ضرور زہرہ کی نگاہ جھک جائے گی پلکوں کے سائے گلابی ہوتے گالوں پر آ جائیں گے۔ اور بالائی ہونٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہوں گے اور جب یہ سب حاکمین کی نظر میں آ جائے گا تو وہ فاتح ہونے کا اعلان کر دے گا۔ وہ جشن منائے گا اور خوب ہنسے گا۔ زہرہ پر۔ بس وہ ایک مغرور انسان کو خود پر ہنستے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے اعتراف تھا حاکمین کی خوب روئی نے اس کے دل کو کچھ اور ہی انداز میں دھڑکنے پر مجبور کیا ہے مگر یہ اعتراف وہ کسی اور کے سامنے کرنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ خوب جانتی تھی۔ اختیار کی سرمستی، قوت کا یقین نشہ بن کر حاکمین کی رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں غرور اور سنگدلی اور اس کے ہونٹوں پر تمسخر کی ہنسی ہے۔ جوانی کا جوش کسی تند و تیز کوہستانی ندی کی مانند ہے اور زہرہ اس تندی و تیزی میں خس و خاشاک کی طرح بہنا نہیں چاہتی۔ تو پھر دل کی بات اپنے دل تک ہی ٹھیک ہے۔ تجھے اپنی عزت وانا سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ کبھی جو تم نے میری محبت کا راز میری آنکھوں سے پا بھی لیا حاکمین، تو لبوں سے یہ اقرار کبھی نہیں سن پاؤ گے۔ میں تمہیں خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گی کہ اپنی قدر و قیمت سے میں بخوبی واقف ہوں اور جانتی ہوں تم جوہر شناس نہیں ہو۔

وہ تصویر کے عین سامنے کھڑی بغور ایک ایک نقش نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ شاید حفظ کر رہی تھی۔

اس کی آنکھوں کی وہ چمک جس نے اس کی خوبروئی میں چار چاند لگائے تھے اور کسی کو اس پر مجبور کیا تھا کہ تنہائی میں وہ صرف حاکمین کو سوچے۔ وہ چمک تصویر میں بھی نمایاں تھی۔ اف جیسے چاندی کے دریا سے کچھ لہریں یہاں آسمائی ہوں۔ یہ چمک دار سیاہ آنکھیں جادو کرتی ہوئی سب جانتی ہوئی اندر تک اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے حدت محسوس کی اور گھبرا کر اپنی نظر کا زاویہ بدل دیا۔

وہ ٹھہر نہیں سکی کمرے سے باہر آ گئی اور دیر تلک خود کو ملامت کرتی رہی خود سے پوچھتی رہی لڑتی رہی۔ آخر میں کیوں گئی تھی اس کے کمرے میں مجھے کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی۔

وہ جیسا بھی ہے۔ مجھے اس سے کیا مطلب ہے۔ آخر میرے باپ نے بھی اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اور میرے بابا انسان شناس ہیں اور حاکمین اس کے پاس تو شاید کردار نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں جبھی تو بابا اپنے سگے بھتیجے سے زیادہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور میرے بابا سائیں کو مجھ پر فخر ہے۔ انہیں مان ہے اپنی بیٹی پر اور جو یہ بیٹی دل کی بات مان لے تو۔''

''نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔'' وہ پوری جان سے لرز گئی۔

اس روز خیال بٹانے کے لیے وہ بہت بولتی رہی فاطمہ کے ساتھ نیتی اور سکھاں کے ساتھ ڈھیروں باتیں کیں اور جب شام کے سائے اترنے لگے تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی کہ فاطمہ اب ہال میں حاکمین کی منتظر بیٹھی تھیں۔ وہ بس آیا ہی چاہتا تھا۔

''بی بی! بیگم صاحب کہتی ہیں آپ تیاری کر لیں۔ صبح آپ کو ان کے ساتھ کسی ویاہ میں جانا ہے۔''

''ہاں۔ شادی میں جانے کا تو مجھے پتا ہے مگر صبح ہی جا رہے ہیں۔ یہ میں نہیں جانتی تھی۔''

''آپ آ جاؤ جی اتنی رونق ہے چھوٹے سائیں اتنا بہت سا شکار لائے ہیں۔''

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا اور بازو میں پڑی چوڑیوں کو دیکھنے لگی۔

نیتی کو شاید ایسی بے نیازی کی توقع نہیں تھی۔ حیران ہو کر اسے دیکھا پھر چلی آئی۔

''آئیں نہیں بی بی!'' حاکمین نے پوچھا۔

''میں نے بتایا تھا آپ اتنا سارا شکار لے کر آئے ہیں کہنے لگیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور ویسے جی بیگم صاحب نے انہیں سامان رکھنے کو بھی کہا تھا۔ صبح وہ شادی میں جا رہی ہیں ناں۔''

حاکمین نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھا۔

نیتی جانے لگی تو پکارا۔ ''سنو! بابا سائیں کب تک آئیں گے شہر سے۔ تم کچھ جانتی ہو اس بارے میں؟''

''ناں سائیں یہ تو بڑی بیگم کو پتا ہوگا۔ کہیں تو پوچھ کر بتا دوں۔''

''نہیں رہنے دو۔'' اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور گھر کے بیرونی حصے میں چلا گیا جہاں ان کے دوست ٹھہرے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

زہرہ اور حاکمین کا سامنا صبح ناشتے پر ہی ہوا اور اس وقت فاطمہ بھی یہاں موجود تھیں۔

''چلے گئے تمہارے سب دوست؟''

''جی پھوپھی! چلے گئے۔'' اور ساتھ ہی وہ نیتی کو پکارنے لگا۔ آواز میں غصہ نمایاں تھا۔ نیتی مودب سی آ کر کھڑی ہوگئی اور ڈانٹ کر انتظار کرنے لگی۔

''یہ پراٹھے کس نے پکائے ہیں۔ اتنے موٹے اور گھی میں تربتر؟'' وہ برس رہا تھا۔

فاطمہ نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر چائے بنانے لگیں جبکہ زہرہ بالکل لاتعلق دکھائی دیتی تھی۔

''اور یہ انڈہ فرائی کیا گیا ہے۔ اگر نہیں آتے یہ کام تو کیوں، ہماری نسلوں پر احسان کرنے کے لیے چولہا سنبھال رکھا ہے۔ اب یہ چائے ہی دیکھو۔ نرا دودھ' پھوپھو یہ جنگلی لڑکیاں کیوں رکھ چھوڑی ہیں آپ نے گھر میں۔'' انداز اکتاہٹ اور خفگی سے بھرپور تھا۔

''تو کہاں سے لاؤں پڑھی لکھی' رکھ رکھاؤ والی نوکرانیاں۔ کام کرنے والیاں تو ایسی ہی ملتی ہیں۔ اگر اب سلیقے قرینے کو ایسا ہی دل چاہنے لگا ہے تو کرلو شادی بیوی آجائے گی تو سب کچھ تمہیں فرمائش کے مطابق ملے گا۔'' اس کے موڈ کو نظر انداز کر کے وہ چھیڑنے کے انداز میں بول رہی تھیں۔

''ہاں سائیں دوہٹی لے آؤ جی۔ ہمیں تو بڑا ارمان ہے۔'' نیتی یقیناً ڈانٹ ڈپٹ کی عادی اور ڈھیٹ تھی۔

''چلو جا کر اپنا کام کرو۔'' اس نے پھر جھڑکا۔

''چاء ہور بنا لاؤں؟'' وہ دو قدم پیچھے ضرور ہٹی مگر جانے سے پہلے پوچھنے لگی۔

''ہاں جیسے اب تو بڑی اچھی بنا کر لاؤ گی۔ جاؤ شکل گم کرو۔''

''بیگم صاحب! آپ شادی پر جا رہے ہو۔ مجھے بھی لے چلو۔ وہاں آپ کے کام کروں گی۔'' وہ اب فاطمہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''نیتی! میں کچھ اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گا۔''

حاکمین کے انداز میں شدید جھلاہٹ تھی جبکہ زہرہ کو نیتی کی دلیری بہت بھا رہی تھی۔

''مار دو جی۔ ہم کچھ بولتے ہیں بھلا۔'' نیتی جانے کے بجائے جمی کھڑی تھی۔

''ہاں نیتی! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بے شک وہاں بہت ملازم ہیں مگر اپنے نوکر کی بات اور ہے۔ تم کپڑے رکھ لو ہم بس ناشتے کے بعد روانہ ہو رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ اک کھلکھلاتی سی نظر حاکمین پر ڈال کر باہر نکل گئی اور زہرہ نے مسکراہٹ چھپانے کو سر جھکا لیا۔

''آج ہی جا رہے ہیں آپ لوگ؟'' اس نے فاطمہ سے پوچھا۔ انداز اب بھی روکھا سا تھا۔

''ہاں میں اور زہرہ آج ہی روانہ ہو رہے ہیں۔ بھرا علاؤ الدین شادی کے روز آئیں گے۔ تم بتاؤ تمہارا کیا پروگرام ہے۔''

''میں تو اتنے دن تک شور ہنگامہ برداشت نہیں کرسکتا۔ ساری برادری جمع ہوتی ہے۔ کبھی کسی پھوپھی کو اعتراض ہے کہ سلام نہیں کیا۔ کبھی کوئی ماسی منہ پھلائے بیٹھی ہے کہ ہم سے تو بات ہی نہیں کرتا۔ عجیب ہوتی ہیں یہ عورتیں بھی۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''تو تم مردانے میں ہی رہنا۔'' فاطمہ نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

حاکمین نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور بولا۔ ''ظاہر ہے رہنا تو ادھر ہی ہے مگر ہر بزرگ عورت کے پاس حاضری تو لازمی ہے ورنہ کیسے کیسے خطاب نہیں ملیں گے مجھے اور پھر ایسے موقعوں پر نہ تو ٹھیک سے آرام کا موقع ملتا ہے نہ ہی پسند کے مطابق کھانا۔''

''اچھا پھر تمہارا کیا پروگرام ہے۔ کب تک آ جاؤ گے تم؟''

''میں تو سہرابندی کے روز ہی پہنچ سکوں گا یا پھر شادی کے روز صبح کو آ جاؤں گا۔''

''نہیں پتر کوشش کرنا کہ سہرابندی کی رات ہی آ جاؤ۔ دیکھو ناں آخر برادری کا معاملہ ہے پھر زاہد سے تمہاری دوستی بھی تو ہے۔''

''ہونہہ دوستی، بس پوری برادری میں وہی ذرا معقول ہے بات کر لیتا ہوں تو اسے دوستی کا نام مت دیں۔ سہرابندی کے روز وقار نے آنا ہے شہر سے۔ بس اسی لیے میں ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا کہ آؤں گا یا نہیں۔''

''وقار تمہارا دوست؟''

''جی وہی۔''

''تو اسے بھی ساتھ لے آنا۔ ہماری برادری کی شادی میں شرکت کر لے گا۔ اس نے کہاں دیکھی ہوں گی زمینداروں کی شادیاں۔ اچھا ہے دیکھ لے گا۔''

''ایسی کوئی سی انوکھی شادیاں ہوتی ہیں زمینداروں کی۔'' اس نے پہلے اعتراض کیا پھر بولا۔ ''میں کہوں گا وقار سے اگر مان گیا تو اسے بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جب نیتی بڑی خوشی خوشی اپنی تیاری مکمل ہونے کی اطلاع کے ساتھ کمرے میں آئی تو وہ موجود نہیں تھا۔

''چھوٹے سائیں کو کچھ پسند ہی نہیں آیا۔ پتا نہیں کیا بات ہے پہلے تو وہ میرا ہاتھ کے پکے پراٹھے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔''

''صرف تمہارے ہاتھ کے ہی نہیں وہ ویسے بھی پراٹھے شوق سے کھاتا ہے۔'' فاطمہ نے فوراً بڑی سنجیدگی سے اسے ٹوکا جبکہ زہرہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''وہ تو بھوکے ہوگے ان کے لیے کچھ بنالوں راستے میں کھالیں گے۔'' نیتی کے لیے ڈانٹ یا روک ٹوک کوئی معنی نہیں رکھتی تھی جیسے۔

''کون سے راستے میں؟ وہ تو ساتھ نہیں جا رہا۔'' اور زہرہ نے دیکھا نیتی کی خوشی اور جوش و خروش جاتا رہا۔

نیتی کچھ برتن اٹھا کر باہر چلی گئی تو فاطمہ بولیں۔

"بڑی منہ زور اور اتھری ہوئی ہیں یہ کمیوں کی بیٹیاں۔ بڑے بڑے پیسے والے پڑھے لکھے۔ زمیندار ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم خاندانی عورتیں توڑ نہ جانیں تو ککھ ہو جائیں۔ ان پر نگاہ رکھنا ضروری ہوتی ہے۔ تم تو ہر بات پر ہنس پڑتی ہو۔ یہ رویہ ٹھیک نہیں۔ ان پر نظر رکھنا اپنے گھر کے مردوں کو ان سے بچانا سیکھو۔"

"واہ پھوپھو! یہ جوان مرد کیا ننھے چوزے ہیں جو ہم ان کے بچاؤ کی ترکیبیں لڑائیں۔ ارے ایسے مرد جو بیوی سے بے وفائی اور نوکرانی سے سگائی کریں ان پر تو سو بار لعنت ڈالنی چاہیے۔"

"تمہارا رویہ غلط ہے۔ یہ سوچ خود کو ہی دکھی کرتی ہے۔ خدا نہ کرے بیٹی رانی تمہاری زندگی میں کوئی دکھ آئے۔ تم بہت سمجھ دار لڑکی ہو، بس اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں۔ تم کچھ نظر رکھو اس ماحول پر حاکمین پر اس کے بابا کی نگاہ ہے انہوں نے کہہ رکھا ہے گاؤں کی ہر لڑکی چاہے موچی، کمہار کی بیٹی ہو یا اونچے گھر کی ہماری عزت ہے۔ ان پر غلط نگاہ ڈالنا بھی جرم ہے اور اگر تم نے یہ جرم کیا تو میں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ مگر تم نے ان لڑکیوں کو دیکھا۔ کیسی اتھری ہیں۔ کوئی ڈر خوف نہیں ہے۔ خاص کر یہ نیتی تو تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ باقی حاکمین کے غصے سے ڈرتی ہیں مگر اسے کوئی ڈر خوف نہیں۔ میرا خیال ہے اب مجھے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"اسی لیے تو لے جا رہی ہوں۔ نہ بھرا گھر پر ہیں نہ ہم دونوں یہاں ہوں گی۔ صرف حاکمین ہی یہاں ہوگا اور میں کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتی جس پر پچھتانا پڑے۔"

زہرہ نے اطمینان بھری سانس کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

اللہ ڈیوایا سامان اٹھانے اندر آیا تو فاطمہ بیگم نے اسے پکارا اور بولیں۔

"ہم شادی میں شرکت کے بعد واپس آ جائیں تو تم نیتی کے باپ کو میرا پیغام دے دینا کہ میں اسے بلواتی ہوں۔ کہہ دینا بیٹی کے لیے کوئی رشتہ سوچ کر میرے پاس آئے۔ شادی کا خرچہ میں دے دوں گی۔"

"نیتی کے لیے کوئی لڑکا؟" اللہ ڈیوایا نے آنکھیں دو تین بار جھپکیں اور چہرے پر کچھ تذبذب کے آثار ظاہر ہوئے۔ فاطمہ بیگم نے بغور نوجوان ملازم کی طرف دیکھا پھر بولیں۔

"تم سادی کرنا چاہتے ہو نیتی سے؟"

"اللہ آپ کو خوش رکھے' آپ کو شاد و آباد رکھے بیگم صیب۔ (صاحب)" اس نے ہاتھ جوڑ دیے اور آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"ٹھیک ہے پھر تم اپنا اور نیتی کا رشتہ پکا سمجھو میں گاؤں واپس آ جاؤں تو اس کے باپ کو شادی کی تیاری کا پیغام بھجوا دوں گی۔"

اللہ ڈیوایا دل کی خوشی چھپانے کی کوشش میں مصروف سامان اٹھا کر باہر چلا گیا۔ فاطمہ نے مسکرا کر زہرہ کو دیکھا اور بولیں۔

"چلو یہ کام تو ہوا۔ اس لڑکی کو نکیل ڈالنی بڑی ضروری ہو گئی تھی۔"

"لگتا ہے اپنے بیٹے پر بالکل بھی بھروسا نہیں ہے آپ کو۔"

زہرہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر گئی۔

"بھلا مرد بھی بھروسے والا ہو سکتا ہے۔" فاطمہ نے اس کی بات کو ناسمجھ بچی کی بات کی طرح لیا اور خوب ہی ہنسی۔ یہاں تک زہرہ شرمندہ ہو گئی۔

☆......☆......☆

شادی والا گاؤں دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ وہی روایتی ماحول وہی ہنگامہ شور شرابا اور گفتگو کے انداز، سب نے زہرہ کو دیکھ کر فاطمہ سے اس کے بارے میں پوچھا اور یہ پتا چلنے پر کہ وہ ان کے سوتیلے بھائی الیاس کی بیٹی زہرہ ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے بھی ہوئے۔

"اچھا تو یہ زہرہ ہے۔"

"اوہ تو یہ ہے زہرہ۔"

"اچھا اچھا یہ ہے وہ۔"

سب کا انداز ایک سا اور کچھ کہتا ہوا سا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر لمبی اوہ یا اچھا کیوں کہتی ہیں۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا بات کرتی ہیں، زہرہ بالکل نہیں سمجھ سکی۔ وہ ہر ایک سے اپنائیت سے ملی مگر اس نے عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے انداز میں ایک کھنچاؤ سا محسوس کیا۔ اسے اور فاطمہ کو ایک ہی کمرا ملا۔ وہ تو یہاں اجنبی تھی۔ ملنے ملانے سے فارغ ہوئی تو کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ فاطمہ کے تو یہ سب ننھیالی عزیز تھے کوئی خالہ تو کوئی ممانی کوئی رشتے کی نانی کوئی پھوپھی وہ تو انہی کے درمیان بیٹھی تھیں۔

زہرہ کچھ دیر تو کمرے میں رہی پھر یہ سوچ کر کہ سب سے تعارف تو ہونا چاہیے۔ آخر چار پانچ روز یہاں گزارنے ہیں' وہ بھی ہال کی طرف آ گئی۔

"اے فاطمہ! تمہاری اور علاؤ الدین کی تو مت ہی ماری گئی ہے۔ اپنے خاندان کی اتنی لڑکیاں چھوڑ کر تم سوتیلے بھائی کی لڑکی اپنے گھر لانا چاہتے ہو۔"

پتا نہیں کون تھی جو فاطمہ پھوپھو سے مخاطب تھی۔ زہرہ کے بڑھتے قدم رک گئے۔

"سوتیلا سمجھیں تو سوتیلا ہوتا ہے۔ ہم ایک باپ کا خون ہیں۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے سے نہ ایسا کہا نہ سمجھا۔ مجھے جس طرح حاکمین پیارا ہے ایسے ہی زہرہ پیاری ہے۔" یہ فاطمہ تھیں۔

"میں پوچھتی ہوں کیا ادھر لڑکیوں کی کمی ہے جو تم لوگ ایسا سوچ بیٹھے ہو؟"

"بات کی یا زیادتی کی نہیں ہے بوا جی!" فاطمہ کہنے والی کو سمجھانے لگی تھیں۔ زہرہ وہیں سے واپس پلٹ آئی۔

اب سمجھی یہ وجہ تھی اس طرح کے استقبال کی اور یہ پھوپھو اور چچا کیا سوچے بیٹھے ہیں۔ کیا یہ اپنے طور پر ہے یا بابا کا فیصلہ بھی یہی ہے اور کیا حاکمین جانتا ہے اس کے بارے میں۔ زہرہ کا دل زور سے مگر اچھی تال پر

دھڑک رہا تھا۔ تو حاکمین اس کا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے اسے مل سکتا ہے۔ یہ سوچ اسے سارا دن سرشار کیے رہی مگر رات کو جب لڑکیاں ڈھولک لے کر بڑے صحن میں اکٹھی ہوئی تھیں وہ سر درد کا بہانا بنا کر کمرے میں چلی گئی تب اس نے سوچا کیا وہ مان جائے گا، بزرگوں کے فیصلے کو چپ چپاتے قبول کرلے گا۔ اس کے کسی بھی انداز سے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں اس کے لیے کچھ خاص ہوں۔ اگر اس نے انکار کیا تو میری طرف سے بھی انکار ہوگا۔ پھر بزرگ لاکھ زور لگائیں۔ اسے راضی کر بھی لیں مگر میں نہیں مانوں گی۔

☆......☆......☆

''شادی تمہارے عزیزوں میں ہے۔ بلایا تمہیں ہے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔'' وقار نے سنتے ہی جانے سے صاف انکار کردیا۔

''جو میں کروں گا وہی تم بھی کرلینا۔''

''اور تم کیا کرو گے؟''

''گپ شپ کھانا پینا سونا جاگنا اور بس۔''

''یہ سب تو ہم یہاں بھی کرسکتے ہیں۔ بہتر ہے تم بھی نہ جاؤ۔'' وقار نے نئی راہ دکھائی۔

''او خدا کو مان۔ تمہیں پتا نہیں ہے میری برادری کا۔'' حاکمین ہنس دیا۔

''اچھا پھر شادی کے روز چلے جانا۔''

''ہاں جاتا تو میں شادی کے روز ہی اگر وہ وہاں نہ موجود ہوتی تو مگر اب مجبوری ہے پہلے جانا پڑے گا۔''

''وہ کون؟'' وقار چونکا۔

''وہی جو دھرتی پر پیر رکھتی ہے تو دھرتی پر احسان جتا کر۔'' حاکمین کے لبوں پر مسکراہٹ اور لہجے میں خمار اتر رہا تھا۔

''تم نے پہلے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ کیا رشتے داروں میں سے ہے۔''

''ہاں چچا کی بیٹی ہے۔ زہرہ الیاس گردیزی۔'' مسکراہٹ ہنوز تھی جیسے یہ ذکر سر سے پیر تک سرشار کرگیا ہے۔

''اوہ پھر تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے ظالم سماج کی کوئی انٹری نہیں ہوگی۔''

''فی الحال تو وہ خود ہی ظالم سماج ہے۔'' حاکمین اب ذرا سنبھل کر بولا۔

''کیا مطلب تم نے بتایا ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور پھر بھی؟''

''نہیں نہیں۔ میں نے ایسی کوئی بات کبھی نہیں کی اور کروں گا بھی نہیں جب تک یہ نہ جان لوں اس کی مرضی کیا ہے۔''

''ارے واہ تم دوسروں کی رائے کے سلسلے میں اتنے حساس کب سے ہوگئے؟''

''مجھے واقعی دوسروں کی رائے کی پروا نہ کبھی تھی نہ ہوگی۔ میرے بازوؤں میں طاقت ہے اور میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنی منوا سکوں تو کیوں کسی کی پروا کروں مگر میرے دوست وہ زہرہ ہے۔ حاکمین کے

تک صرف اس کی رسائی ہے اور جو دل میں اتر جاتے ہیں وہ تو مالک بن بیٹھتے ہیں اور کوئی مالک کے حکم سے روگردانی کیسے کرے۔ میں اسے تب ہی اپناؤں گا جب وہ چاہے گی۔ کہ میں محبت میں جبر کا قائل نہیں ہوں۔ وہ میرے لیے قابل احترام بھی ہے۔''

''کیسے ہوا یہ سب؟'' وقار حیران تھا۔

''یہ واردات اچانک ہی ہوتی ہے پتا تو تب چلتا ہے جب دل اپنا نہیں رہتا۔''

''ٹھیک ہے میرے یار! اب جبکہ میں تمہارا مسئلہ جان گیا ہوں تو جب تم کہو گے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاؤں گا اور دعا کروں گا وہ جو دھرتی پر پیر دھر کر دھرتی پر احسان کرتی ہے۔ وہ تم پر بھی احسان کردے اور اس کے دل میں بھی تمہاری محبت کروٹیں لینے لگے۔''

''اور ہاں یار! دعاؤں کی تو بڑی ضرورت ہے یہاں۔'' حاکمین نے اس کی بات کے جواب میں خوشدلی سے کہا۔

☆......☆......☆

سہرا بندی کی شام زہرہ نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ اس پر سلور کا کام تھا اور اس نے سلور جیولری پہن رکھی تھی۔ زیورات سے لے کر کپڑوں کی تراش خراش اور کڑھائی ہر شے میں نفاست تھی اتنی لڑکیوں میں وہ سب سے پیاری اور منفرد نظر آتی تھی۔

جس وقت حاکمین یہاں پہنچا رسم میں کچھ دیر تھی لڑکیاں ڈھولک رکھے بڑے صحن میں بیٹھی تھیں۔ لڑکیوں کے ساتھ ساتھ اکثر شادی شدہ خواتین بھی نیچے بچھی دریوں پر بیٹھ گئی تھیں اور گانے کے بولوں کے ساتھ تالیاں بجا رہی تھیں۔

رہائشی حصے میں آتے ہی حاکمین کی نگاہ زہرہ پر پڑی۔ دوسری لڑکیوں کے برعکس وہ بڑی شان سے کرسی پر براجمان تھی۔ بڑی سنجیدگی سے ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ وہ رک گیا اور ادھر ہی دیکھنے لگا۔ ملازم عورتیں مٹھائی کے بھرے تھال لے کر آئیں تو لڑکیاں گانا روک کر مٹھائی کے لیے شور کرنے لگیں اور زہرہ نے بڑی ادا سے ذرا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور ہاتھ رومال سے صاف کرلیا۔ حاکمین جہاں کھڑا تھا وہاں مہندی کی باڑھ اور گلاب کی بیلیں تھیں وہ یہ سارا منظر بخوبی دیکھ رہا تھا جبکہ خود وہ ان سب کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

مٹھائی کھانے کے بعد لڑکیوں نے پھر ڈھولک سنبھال لی۔ حاکمین بھی سب سے ملنے کے لیے اب اس اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ نگاہ اب بھی زہرہ پر تھی۔

باگے وچ رانی اے
چاچی دیا وے پترا
ڈولی تیرے گھر جانی اے

ترجمہ:۔ (باغ میں رانی ہے او میری چاچی کے بیٹے میری ڈولی تمہارے گھر جانی ہے)۔

اور یہی وہ وقت تھا جب زہرہ نے نگاہ اٹھا کر ادھر دیکھا۔ حاکمین بھی ادھر ہی متوجہ تھا۔ نگاہیں متصادم ہوئیں۔ گیت کے بول اور حاکمین کی نگاہ کی زد میں آیا اس کا وجود زہرہ کا دل زور سے دھڑکا اور پلکیں جھک

گئیں۔ حاکمین آگے بڑھ گیا اور مشترکہ سلام کے بعد جو بزرگ خاتون سب سے پہلے سامنے آئیں ان کے سامنے سر جھکا کر پیار اور دعائیں لینے لگا۔ جبکہ لڑکیاں پتا نہیں کیوں یہ بول بار بار دوہرا رہی تھیں۔

زہرہ اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھی اور جلدی جلدی قدم اٹھاتی کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لیے اور تبھی اسے خیال آیا' میں تو ہار گئی آج حاکمین جیت گیا۔ گیت کے بولوں نے راز فاش کر دیا۔ میں خود کو چھپا نہیں سکی۔ عیاں ہو گئی حاکمین پر۔ ایسا کیسے ہو گیا۔ کیوں کیا میں نے ایسا۔ مجھے یوں اٹھ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ اب خود کو ملامت کر رہی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی جو ہو گیا سو ہو گیا وقت واپس نہیں آ سکتا۔

اور یہ رات حاکمین کے لیے بڑی رنگین بڑی سہانی تھی۔ گیت کے بول جیسے اب بھی اس کے آس پاس گونج رہے تھے۔

چاچی دیا وے چترا
ڈولی تیرے گھر جانی اے

پھر زہرہ کا اس کی جانب دیکھنا۔ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر ان مغرور نگاہوں پر پلکوں کا جھک جانا اور پھر زہرہ کا اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر چلے جانا۔ شاید اس نے میری نگاہ سے اوجھل ہونے کی کوشش کی تھی۔ تم نے اسے چاہا تو کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ اس قابل ہے کہ حاکمین گردیزی کے دل پر بڑی شان سے حکومت کر سکے۔ بہت دیکھی ہیں مگر مجھے اعتراف ہے زہرہ الیاس گردیزی! تم سی کوئی بھی نہیں۔ تم بے مثال ہو، انمول ہو اور میری پہلی اور آخری تمنا ہو۔ تم ہو تو سب کچھ ہے تم نہیں تو میرے لیے دنیا ویرانہ ہے۔ زہرہ الیاس گردیزی۔ تم خوش نصیب ہو کہ حاکمین تم سے محبت کرتا ہے اور جانتا ہے محبت کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ یہاں جبر کا کوئی دخل نہیں۔ جس سے محبت کرو اسے عزت بھی دو اور اس کے جذبات کی قدر بھی کرو زہرہ میں تب تک تمہارا حقدار نہیں ہوں جب تک تم بھی مجھے دل میں نہ بسا لو۔ میں نے تمہیں اپنے دل پر حکمران کیا ہے اور میری خواہش تمہارے دل پر حکومت کی ہے جس روز تم نے مجھے اپنے دل میں جگہ دے دی اس روز ہی تمہارے سر پر سرخ آنچل ڈالوں گا اور گاؤں بھر میں چراغاں کر دوں گا۔

☆......☆......☆

صبح الیاس گردیزی، پروین بیگم اور ان دونوں کے ساتھ عذرا بھی یہاں موجود تھی اور پروین سب سے ہی کہتی پھر رہی تھیں کہ بہن میرے ہاں آئی ہوئی تھی تو میں زبردستی اسے ساتھ لے آئی۔ یہ تو کہتی رہی بن بلائے جانا اچھا نہیں لگتا جبکہ حقیقت الٹ تھی۔ عذرا پروین کے منع کرنے کے باوجود ساتھ آئی تھی اور صرف اس لیے کہ پوری امید تھی حاکمین موجود ہو گا۔

''بھرا! آپ انور کو بھی لے آتے۔'' فاطمہ کہہ رہی تھیں۔

''انور کو یہاں لانا ہمارے لیے بھی مسئلہ تھا اور اسے بھی تکلیف ہوتی۔ ذہنی طور پر بہت پیچھے ہے اپنے ہم عمروں سے گھبرا جاتا ہے نئی جگہ جا کر اور پھر اس کی خبر گیری کو تو چوبیس گھنٹے دو نوکر ساتھ رہنے ضروری ہیں۔''

''اچھا بھرا! پھر میں آؤں گی کسی روز انور کو دیکھنے۔''

''ہاں ہاں فاطمہ! تم ضرور آؤ اور میں تو کہتا ہوں اب میرے پاس ہی رہو۔'' بھائی کی محبت پر وہ مسکرا دیں اور بولیں۔

''بھرا! خدا آپ کے گھر کو شاد و آباد رکھے ہے ناں گھر کو دیکھنے والی جبکہ بھرا علاؤ الدین کا گھر تو مجھ پر ہی ہے۔ میں زیادہ دنوں کے لیے کہاں آ جا سکتی ہوں۔''

''علاؤ الدین بھرا دکھائی نہیں دیے۔ کیا شادی میں شریک نہیں ہوئے؟'' پروین نے پوچھا۔

''بھرجائی! وہ شہر گئے ہیں۔ ان کے ایک دوست کو حادثہ پیش آ گیا۔ خدا نے چاہا تو شام تک آ جائیں گے اور شادی میں شرکت کریں گے۔''

عذرا ان لوگوں کے درمیان سے اٹھی اور باہر آ گئی۔

''بی بی! کچھ چاہیے تھا؟'' نیتی عذرا سے واقف نہیں تھی مگر یہاں اسے فاطمہ لائی تھیں اور وہ الیاس کے گھرانے کو بھی بخوبی جانتی تھی اس نے خود بخود ان سب کی خدمت کو بھی فرض جان لیا۔

''ہاں وہ حاکمین کہاں ہوں گے؟ مجھے ان سے کام ہے۔'' عذرا کا انداز بظاہر سرسری سا تھا۔

''کیا کام ہے؟''

''تمہیں اس سے مطلب۔ جاؤ دیکھو کدھر ہے وہ؟'' اب کے انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ نیتی حکم کی غلام چلی آئی اور حاکمین کو کہہ دیا ایک لڑکی بلا رہی ہے آپ کو۔

''کون زہرہ؟''

''نہیں زہرہ بی بی کو تو میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ کوئی اور ہیں۔ ویسے آپ کے چچا چچی کے ساتھ ہی آئی ہیں۔''

''اچھا عذرا ہو گی۔'' اب کے وہ سمجھ گیا اور اس نیت کے ساتھ چلا آیا کہ چچا چچی کو بھی سلام کر لے گا۔

''آپ نظر ہی نہیں آئے کب سے آپ کو دیکھ رہی تھی۔'' عذرا نے اسے دیکھتے ہی اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔

''کوئی کام ہے مجھ سے؟''

''لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ کیا میں کام کے علاوہ آپ سے نہیں مل سکتی۔'' وہ ناراض دکھائی دینے لگی۔

''میں چاچا جی کو سلام کر آؤں پھر تم سے بات ہو گی، کہاں بیٹھے ہیں وہ لوگ۔'' عذرا نے جواب میں ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔

وہاں کمرے میں اس کے چچا چچی کے علاوہ زہرہ اور فاطمہ بھی موجود تھیں۔ اس نے جا کر سلام کیا تو الیاس بولے۔

''اچھا تم بھی آئے ہوئے ہو۔ میرا تو خیال تھا باپ شہر میں ہے تم علاقے کی خبر گیری کو رک گئے ہو گے۔'' ان کا انداز ہمیشہ کی طرح جتاتا ہوا سرد اور کٹیلا سا تھا۔

"دو دن کی تو بات ہے چاچا جی ایسا کون سا طوفان آ جانا ہے پیچھے۔" ان کے انداز کو محسوس کرنے کے باوجود وہ ہنس کر بات ٹالنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ تو اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ ذمے داری محسوس کرو تو ہی جانو۔" اتنا کہنے کے بعد وہ پروین سے باتیں کرنے لگے گویا جواب میں کچھ سننا پسند نہیں۔

حاکمین کو ان کے اس لب و لہجے پر حیرت تو ہمیشہ رہی تھی۔ آج سبکی کا احساس بھی ہوا اور زہرہ‘ وہ بھی اپنے بابا کے اس رویے پر حیران تھی۔ حاکمین بھتیجا تھا ان کا۔ مگر وہ کس طرح نظر انداز کرتے تھے اور ہر بات میں گہری چوٹ کر جاتے تھے اس پر۔ آج زہرہ کو ان کا رویہ خاصا برا محسوس ہوا تھا۔ انہیں یوں نہیں کرنا چاہیے۔ حاکمین واپس چلا گیا۔ عذرا منتظر تھی۔

"کر آئے سلام؟" اس نے دیکھتے ہی پوچھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا چاچا جی کا رویہ میرے ساتھ اتنا روکھا اور بیگانہ کیوں ہوتا ہے۔" وہ جو سوچ رہا تھا بول بھی گیا۔

"کیا مطلب؟" عذرا نے وضاحت چاہی اور اس نے وضاحت کر دی۔

"سیدھی سی بات ہے۔ آپ سمجھتے ہی نہیں۔" بڑی تیزی سے عذرا کے ذہن نے کام کیا اور وہ حاکمین کو لے کر نسبتاً الگ تھلگ حصے میں لے آئی۔ یہاں ایک دو ملازم عورتیں کام کر رہی تھیں یا چند بچے کھیل رہے تھے۔

"آپ کے چچا نہیں چاہتے کہ وہ اپنے سوتیلے بھتیجے سے کوئی تعلق رکھیں۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی کو بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہی بابا سائیں کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا ہے۔" حاکمین کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔

"ہاں ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔" عذرا ذرا گڑبڑائی پھر بولی۔ "اصل میں زہرہ نہیں چاہتی کہ اس کی شادی خاندان میں ہو اور آپ کے چاچا اپنی بیٹی کی بات بھلا کیسے رد کر سکتے ہیں۔"

"کیا یہ زہرہ کی خواہش ہے؟" حاکمین کی آواز دھیمی اور لہجہ شکستہ سا تھا۔

"ہاں یہ زہرہ کی خواہش ہے اور اس کے بابا نے تو قسم کھا رکھی ہے۔ بیٹی کی کوئی خواہش رد نہیں کرنی پتا نہیں کیا بنا رکھا ہے بیٹی کو جیسے انوکھی پیدا ہوئی ہے دنیا میں۔"

"کس کو پسند کرتی ہے وہ؟" حاکمین نے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں مگر یہ تو طے ہے اسے گاؤں کی زندگی اور اپنے رشتے دار پسند ہی نہیں۔ اس کی نظر میں سب جاہل اور اجڈ گنوار ہیں۔ یہاں کوئی اس کے قابل ہی نہیں۔"

"تم یہ سب کیسے کہہ رہی ہو؟" حاکمین کے لہجے کی شکستگی عذرا پر سب واضح کر گئی۔ اس کے چہرے پر چھایا رہنے والا اعتماد کا رنگ کتنا دھیما پڑ گیا تھا۔ وہ تھکن زدہ لگنے لگا تھا۔ تو میں نے جو سمجھا غلط نہیں۔ عذرا اور

بھی بہت کچھ کہتی مگر حاکمین رکا ہی کہاں اس کے پاس۔ نیتی کھڑی نظر آئی تو اسے بلایا اور کہا۔

"پھوپھو سے کہہ دینا۔ میں گاؤں واپس جا رہا ہوں۔"

"مگر آج تو شادی ہے جی۔"

"مجھے بھی معلوم ہے۔" اس نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

"تو پھر رک جائیں اور وہ آپ کے دوست وقار باؤ، کیا وہ بھی آپ کے ساتھ جا رہے ہیں؟"

تب اسے خیال آیا وہ تو وقار کو ساتھ لے کر آیا تھا اب یوں تقریب میں شریک ہوئے بغیر واپس جانا ہوا تو اسے کیا کہے گا۔ وہ تھک سا گیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم پھوپھو سے کچھ مت کہنا۔"

"تو آپ نہیں جا رہے۔" نیتی نے جلدی سے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔" وہ پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھے بیٹھے تھا۔ "طبیعت ٹھیک ہے ناں جی؟"

"نیتی! میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔"

"گولی سے تو میں نہیں ڈرتی پر چلو جی آپ کہتے ہیں تو جا رہی ہوں۔" نیتی اس کے ہر مزاج کا مزا ہی لیتی تھی۔ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

شام کو بارات کی روانگی سے کچھ ہی دیر پہلے وہ رہائشی حصے کی طرف آیا۔ نیتی نے بتایا۔

"زہرہ بی بی اور بیگم صاحب اس سامنے والے کمرے میں ہیں۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر ادھر آ گیا۔ زہرہ اسی وقت کمرے سے باہر نکلی۔ اسے سامنے پایا تو نگاہوں میں بڑا واضح سرد انداز آ کر بیٹھ گیا۔

"پھوپھو اندر ہیں۔" یہ انداز بخوبی پہچان کر بھی حاکمین نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ بے زار سے انداز میں کہہ کر چلی گئی اور حاکمین کو اب تو کوئی شبہ ہی نہیں رہا۔ عذرا جو کچھ آج صبح کہہ رہی تھی۔ اس کی تصدیق پہلے بھی چاچا اور زہرہ کا رویہ کرتا تھا مگر اب ان باتوں کو سننے کے بعد اس نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا اور شک کی تصدیق چاہی تھی۔ وہ چلی گئی۔ حاکمین گہری سانس کھینچ کر اندر گیا جہاں فاطمہ سامنے ہی موجود تھیں۔

کل تک کتنی خوشی تھی زہرہ حاکمین سے نگاہ کے ایک نازک سے وقت میں مل جانا اس کا اندر باہر روشن کر گیا تھا۔ مگر آج عذرا نے کیا کہہ دیا اور کس چاؤ سے بازو میں پڑا وہ کنگن دکھایا جو حاکمین نے اسے دیا تھا۔ کتنی بڑی بھول ہوئی مجھ سے، میں نے کیوں اسے دل میں جگہ دی۔ پہلے بھی تو میں اسے جانتی تھی۔ پھر نادانی پر نادانی کرتی چلی گئی۔ ہائے وہ عذرا کا ہو جائے گا میری آنکھوں کے سامنے اور میں کیسے دیکھ پاؤں گی یہ منظر۔ سارا دن اس کا بدن درد سے چور رہا اور شام تک وہ بمشکل خود کو تیار ہونے پر آمادہ کر سکی۔ جو ہوا سو ہوا۔ بس اب مزید تماشا نہیں۔ میں نے نہ پہلے خود کو اس پر عیاں کیا نہ اب ہونے دوں گی۔ میرا درد میرے ساتھ رہے گا۔ مگر راز بن کر اور اسی سوچ نے اسے حاکمین کے ساتھ بے زار اور روکھا رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ وہ

اچھی طرح جانتی تھی۔ فاطمہ کمرے میں موجود ہیں مگر حاکمین سامنے آیا تو زہرہ کا دل خود کو ملامت کرنے لگا۔ اور غصہ حاکمین پر بھی آیا۔ بس اسی لیے جواب ٹھیک سے نہیں دیا اور چلی آئی۔

حاکمین، فاطمہ کے پاس آیا تو کسی اور کام سے تھا مگر زہرہ کے رویے نے کہلوا کچھ دیا۔

"میں اور وقار گاؤں واپس جا رہے ہیں پھوپھو۔"

"ہیں مگر کیوں اور یہ کون سا وقت ہے واپسی کا۔ بارات تیار کھڑی ہے۔"

"جانتا ہوں مگر وقار کو کچھ کام ہے گاؤں، اسے اپنا سامان لے گا اور شہر چلا جائے گا۔ میں بھی ایک دو روز کے لیے اس کے ساتھ شہر جا رہا ہوں۔"

"اگر وقار کو ایسا ضروری کام ہے تو وہ چلا جائے مگر تم تو یوں نہ جاؤ۔ آخر برادری کا مسئلہ ہے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔" اس نے واقعی ایسے لہجے میں کہا جیسے سب کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے اور چلا گیا۔

"عجیب ہے یہ حاکمین بھی۔ پتا نہیں بیٹھے بٹھائے نئی نئی باتیں کیوں سوجھ جاتی ہیں اسے۔"

بارات روانہ ہوئی تو وہ اور زہرہ ایک ہی گاڑی میں تھیں۔ یقیناً وہ اپنی بھتیجی سے ہی مخاطب تھیں مگر بات حاکمین کی تھی۔ اس نے کان بند کر لیے۔ یوں بیٹھی رہی جیسے سنا ہی نہیں۔

"شہر چلا گیا ہے اپنے دوست کے ساتھ۔" انہوں نے خود ہی بتا دیا۔

"اچھا۔" اس نے گہری سانس کھینچی اور سوچا یہ تو بہت اچھا ہوا۔ پھوپھو کے ساتھ مجھے واپس ان کے گھر جانا ہے کیونکہ میری کتابیں اور کپڑے ادھر ہی پڑے ہیں پھر پھوپھو نے کہا بھی ہے کہ ابھی تین چار روز میں ان کے پاس رہوں گی۔ یہ سوچ کتنا پریشان کر رہی تھی کہ وہاں حاکمین بھی ہوگا۔ اچھا ہوا جو وہ شہر چلا گیا۔

اسے کسی رسم میں دلچسپی نہیں تھی۔ دل بجھا بجھا اور سوچ پریشان تھی۔ اس کی نگاہ جب بھی عذرا کی طرف اٹھی اسے ہنستے مسکراتے اٹھلاتے پایا اور اس کے نصیب پر زہرہ رشک کیے بنا رہ نہیں سکی۔

"ہاں بھئی یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

الیاس، پروین اور عذرا تقریب اٹینڈ کر کے واپس اپنے گاؤں چلے گئے اور وہ فاطمہ کے ساتھ آ گئی۔

"کیا بات ہے تھک گئی ہو۔ بہت خاموش ہو۔"

"نہیں پھوپھو! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے خوامخواہ مسکرا کر چہرے پر بشاشت لانے کی کوشش کی۔

"بیگم جی! وہ اللہ ڈیوایا آیا ہے جی۔" نیتی بڑی بے نیازی سے اطلاع دے رہی تھی۔

"ہاں ہاں بلاؤ اسے اور تم جاؤ ہانڈی چولہا دیکھو جا کر۔" نیتی سر ہلا کر چلی گئی۔

"اللہ ڈیوائے کو بھی جلدی ہوگی۔" وہ زہرہ کی طرف دیکھ کر مسکرائیں اور زہرہ کو بھی یاد آ گیا۔ معصوم نیتی اسے تو پتا بھی نہیں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ پھر کبھی یوں مسکرا نہیں سکے گی۔ آج اسے نیتی سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی اور اس کے دکھ پر دل دکھی ہونے لگا۔

"سلام بیگم صیب!" ڈیوایا مودب سامنے موجود تھا اور زہرہ نے دیکھا آج وہ پہلے کے مقابلے میں بہت صاف ستھرا اور با اعتماد دکھائی دیتا تھا۔ دل میں حاکمین اور قسمت میں اللہ ڈیوایا' نیتی کیسے جی پائے گی۔

زہرہ کا جی گھبرانے لگا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی اور کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

شام تک اللہ ڈیوائے اور نیتی کی بات پکی ہو چکی تھی اور نیتی کی چپ زہرہ کا دل چیر رہی تھی۔ کیا میرے ساتھ بھی ایسا ہوگا۔ میں بھی سگائی کے روز ایسے ہی مرجھا جاؤں گی۔

"پھوپھو! میں کل واپس جانا چاہتی ہوں۔" اس نے انہیں فیصلہ کرنے کے بعد مضبوط لہجے میں بتایا۔

"پھر کب آؤ گی زہرہ؟"

"اب تو حاکمین کی شادی پر ہی آؤں گی۔" وہ خود کو اذیت دیتے ہوئے بولی اور فاطمہ خوب ہنسیں۔

"ہاں تمہیں حاکمین کی شادی پر تو آنا ہے۔" ان کا انداز معنی خیز تھا۔

رات حاکمین شہر سے واپس آ گیا۔ صبح یہ اطلاع اسے سکھاں کی زبانی ملی اور یہ بھی کہ نیتی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ کام پر نہیں آئی۔ حاکمین کی واپسی کا سن کر زہرہ نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے گی مگر سکھاں جب ناشتے کے لیے بلانے آئی تو ساتھ یہ اطلاع بھی تھی شہر سے چھوٹے سائیں کے ساتھ کچھ دوست بھی ہیں اور وہ انہیں لے کر باغ والے مکان پر چلے گئے ہیں۔ وہیں ٹھہریں گے چند روز تک،

موسم صبح سے ابر آلود تھا اور فاطمہ اس کے جانے سے اداس ہو رہی تھیں۔ بہانے سے اسے روک بھی رہی تھیں مگر وہ رکنا نہیں چاہتی تھی۔ یہی کہتی رہی۔

"اب آپ ہمارے گھر آنا پھوپھو!" باتوں کے دوران آہستہ آہستہ سامان بھی سمیٹتی رہی اور مغرب ہو گئی۔

"اب تو کل ہی جانا موسم خراب ہے زہرہ! اور راستہ خراب ہے۔ مشکل پڑے گی بارش کے موسم میں۔"

"نہیں پھوپھو میں تیز بارش سے پہلے ہی گھر پر ہوں گی۔ راستہ اتنا لمبا تو نہیں ہے۔"

اور جب وہ رہائشی حصے سے باہر آ کر گاڑی میں بیٹھی تو بادلوں نے گھرا اندھیرا کر رکھا تھا۔ ہوا میں تیزی تھی۔ ایسے موسم میں اسے ڈر لگتا تھا۔ خاص کر جب بجلی کڑکتی تو وہ اپنے کمرے کے تمام کھڑکیاں دروازے بند کر دیا کرتی تھی۔ مگر آج صرف حاکمین سے دور جانے کے لیے وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ ابھی وہ لوگ علاؤ الدین کی حویلی سے تھوڑی ہی دور آئے تھے کہ آندھی نے زور پکڑ لیا اور بجلی کی کڑک زہرہ کا دل دہلانے لگی۔ ایک بار تو جی میں آئی واپس پھوپھو کے پاس چلی جائے مگر پھر یہ خیال جھٹک دیا اور خاموش بیٹھی رہی۔ حویلی پیچھے رہ گئی اور آموں کے باغات شروع ہو گئے۔ ہوا کی تیزی ہر سوٹی ہی مٹی اور بجلی کی کڑک گاڑی سے کچھ ہی آگے ایک تناور درخت جڑ سے اکھڑا اور راستے پر آ گرا۔ ساتھ ہی زہرہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے لبوں سے بے اختیار چیخ نکلی اور چہرا ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اگر یہ تناور درخت گاڑی پر آ گرتا تو۔ اسے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کسی بھی وقت کوئی اور درخت جڑ سے اکھڑ سکتا ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی اس راستے سے ہٹا کر دوسرے راستے پر ڈال لی تھی۔ وہ کہاں لے کر جا رہا ہے۔ زہرہ میں یہ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی اب تو بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔ اگر زیادہ دیر ہو گئی تو اس طوفان باد و باراں میں گھر تک پہنچنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ کچے راستے اور راستے کے ساتھ نشیب میں بہتی نہر اگر سلپ ہوں تو نہر میں جا پڑیں۔

"آؤ بی بی!" کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور نے نیچے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا اور کہا۔ وہ چپ چاپ اتر آئی۔

"آپ اندر چلو میں گاڑی کو کسی مناسب جگہ پر کھڑی کردوں۔"

زہرہ نے یہ نہیں پوچھا کون سی جگہ ہے۔ سامنے بنی عمارت کو دیکھا۔ جلدی سے گاڑی سے نیچے اتر کر برآمدے میں آئی اور سامنے کمرے کے دروازے کی طرف تقریباً بھاگتے ہوئے بڑھی۔ بادل کی گرج اتنی تھی اگر وہ دستک دے کر اجازت طلب کرتی تو بھی شاید اندر تک آواز نہ جاتی اور وہ تو اتنا ڈر رہی تھی کہ دستک کا خیال ہی نہیں آیا۔ دروازے کو دھکیلا تو کھلتا چلا گیا۔ وہاں بہت سے چہرے تھے مگر اس کے سامنے دو ہی چہرے تھے جیسے باقی سب تو دھند میں گم ہوگئے مگر حاکمین اور وہ عورت جو گا رہی تھی اور شاید ناچ بھی رہی تھی۔

زہرہ بھول گئی۔ اسے بجلی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ سخت خوف زدہ حالت میں یہاں تک آئی ہے اور کسی محفوظ کمرے میں چھپ جانا چاہتی ہے۔ بس لمحوں کی بات تھی اس نے یہ دیکھا۔ واپس پلٹی اور ڈرائیور کو آوازیں دینے لگی۔

حاکمین حیران سا اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر آیا کہ اسے یقین نہیں تھا۔ واقعی زہرہ اس کے ڈیرے پہ آئی ہے۔ وہ تو اس سارے ماحول سے کتنا زہرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور جو ایک دم سے دروازہ کھلا اور اس کا چہرہ نظر آیا تو اسے اپنا وہم ہی سمجھا۔ پھر جب وہ واپس پلٹی تو پیچھے چلا آیا۔

"زہرہ! یہ تم ہو۔"

"کوئی ضرورت نہیں مجھ سے بات کرنے کی۔" زہرہ تڑخ کر بولی اور پھر ڈرائیور سے گاڑی لانے کو کہنے لگی۔

"ہم ابھی اسی وقت یہاں سے جائیں گے۔" اس کے فیصلے نے ڈرائیور کو حیران اور فکر مند کردیا۔

حاکمین نے اس کے کندھے پر سختی سے ہاتھ رکھ کر اپنی جانب کیا اور بولا۔

"ہاں ہم دیہاتی جنگلی جاہل لوگ ہیں۔ تمہارے قابل ہی کہاں ہیں۔ مگر یاد رکھنا زہرہ بیگم! یہ غرور اور اکڑ کبھی کبھی بہت مہنگی پڑتی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب سوائے افسوس اور پچھتاوے کے کچھ پاس نہیں رہتا۔" "آپ جنگلی دیہاتی جاہل لوگ نہیں آپ حاکم اور سائیں ہیں۔ ان داتا ہیں۔ انسانوں کے احساسات سے قطعی ناواقف۔"

شانے سے اس کا ہاتھ ہٹا کر وہ گاڑی میں جا بیٹھی اور ذرا دیر کے بعد نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ اندر نہیں گیا۔ اس طوفانی موسم میں وہیں کھڑا رہا۔ کبھی کبھی تیز ہوا کے ساتھ بوچھاڑ کا رخ ادھر ہوجاتا تو اس کے کپڑے بھیگنے لگتے۔ وہ جیسے ہوش میں تھا ہی نہیں۔

"آؤ حاکمین! کیوں کھڑے ہو یہاں؟" اس کے دوست کچھ دیر انتظار کے بعد باہر آ گئے۔

"نہیں...... میں یہیں ٹھیک ہوں۔ یہ سب تم لوگوں کی خواہش پر کیا تھا جاؤ عیش کرو مجھے یہیں رہنے دو۔ اندر گھٹن ہے مجھے سانس لینے میں دشواری کا سامنا ہے۔"

☆......☆......☆

"زہرہ پتر! میں جانتا ہوں تمہیں فاطمہ سے بہت محبت ہے اور وہ بھی تمہیں بہت پیار کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ تم علاؤ الدین کے گھر مت جایا کرو۔" اگلے روز الیاس گردیزی نے تب یہ بات شروع کی تھی جب پروین کمرے میں موجود نہیں تھی۔

"کیوں بابا! آپ نے پہلے تو کبھی مجھے وہاں جانے سے منع نہیں کیا؟"

"تم پہلے کبھی اتنے روز کے لیے گئیں بھی تو نہیں۔" پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔

"علاؤ الدین میرے اور اپنے رشتے کو مضبوط کرنا چاہتا ہے وہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتا ہے زہرہ دھی! مگر مجھے یہ قبول نہیں۔"

اس بات پر زہرہ کا سر جھک گیا۔ الیاس نے اس کی جھجک اور حیا کو محسوس کیا اور بولے۔

"یہ سب جو میں تم سے کہہ رہا ہوں تمہاری ماں زندہ ہوتی تو وہی تمہیں سمجھاتی۔ پروین میری بیوی تو بن گئی ہے مگر افسوس وہ تمہاری ماں نہیں بن سکی اور زہرہ! میں تو تمہیں بیٹی ہی نہیں اپنی حیات سمجھتا ہوں۔ تمہارے دل میں جو بھی ہے تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہو۔"

"آپ ایسا کیوں نہیں چاہتے بابا؟" اس نے دھیرے سے سوال کیا۔

"اس لیے کہ حاکمین تمہارے لائق نہیں ہے۔ اگر بات ڈگریوں کی ہے تو وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے مگر اس کے مزاج میں صرف اور صرف دولت کی گرمی اور غرور ہے۔ تعلیم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی کتے پالے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں پر ہزاروں لاکھوں لٹاتا ہے۔ شہر کے امیر اور بگڑے ہوئے لڑکوں سے دوستیاں چل رہی ہیں باپ کا لاڈلا اور بدمزاج لڑکا ہے۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا بڑوں سے بات کیسے کی جاتی ہے۔"

اگر زہرہ کو عذرا اور حاکمین کے درمیان تعلق کا علم نہ ہوتا تو وہ اس کے حق میں دلائل دیتی خاص کر یہ آخری بات کہ اسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں اس پر تو ضرور اختلاف ہوتا مگر اب تو باپ کا نہ ماننا اسے بہتر ہی لگا اور بولی۔

"میں بھی اسے پسند نہیں کرتی۔ وہ خودسر اور عیاش ہے۔"

ساتھ ہی نظر میں کل شام کا منظر گھوم گیا۔ اور زہرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی تم کبھی حاکمین کے حق میں بات نہیں کرسکتیں۔" الیاس گردیزی خوش ہوگئے۔

وہ زہرہ کو یہ نہیں بتاسکے کہ انہیں اس رشتے پر اعتراض اصل میں کس وجہ سے ہے۔ کیسے کہتے بات اتنی سی ہے۔ میں بیٹی والا ہوں اور وہ میرے سوتیلے بھائی کا بیٹا ہے۔ میرا بھائی تمہیں اپنی بہو بنا کر میری جائداد میں سے بھی حصے کا حق دار بن جائے یہ مجھے گوارا نہیں۔ بھائی کو بیٹے کا باپ ہونے پر غرور ہے اور میں نے اس کے سامنے ہمیشہ یہی تاثر دیا ہے۔ مجھے اپنی بیٹی دس بیٹوں پر بھاری ہے۔ مجھے اس کا کوئی غم نہیں کہ بیٹی ہی وارث کہلائے گی۔ انور ذہنی طور پر معذور اور جسمانی طور سے کمزور ہے۔ میں علاؤ الدین کے گھر بیٹی دے دوں۔ مطلب یہ ہوا کہ سوتیلے بھائی کے آگے سر جھک گیا۔ نہیں کبھی نہیں یہ مجھے قبول نہیں۔

☆......☆......☆

’’پتر! اب تم جوان ہو، سمجھ دار ہو، میں چاہتا ہوں اب گھر میں بہو لے آؤں۔‘‘

علاؤ الدین کی بات کا حاکمین نے کوئی جواب نہیں دیا، جیسے بیٹھا تھا بیٹھا رہا۔

’’میں نے الیاس بھائی سے پہلے بھی ایک دو بار زہرہ کے لیے بات کی تھی‘ تب زہرہ ذرا چھوٹی تھی، اور الیاس شاید وقت سے پہلے رشتہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہ رہا ہوں۔ پھر بات کروں۔ آخر پہلا حق تو ہمارا ہے۔‘‘ ’’نہیں...... بابا سائیں! آپ کوئی بات نہیں کریں گے۔‘‘

’’کیا مطلب او پتر! اب نہیں تو پھر کب، آخر کب تک یوں آزاد پھرتے رہو گے تم؟‘‘

’’بابا! میں زہرہ سے شادی نہیں کروں گا۔‘‘ وہ شکستہ نظر آ رہا تھا۔ علاؤ الدین اب چونکے اور حیران نظروں سے بیٹے کو دیکھا پھر بولے۔

’’کیسے نادان ہو۔ تمہیں زہرہ جیسی ہیرا لڑکی پسند نہیں‘ میں تو تمہیں بڑا عقل مند سمجھتا تھا۔ زہرہ خوب صورت بھی ہے اور جائداد والی بھی، سب سے بڑھ کر وہ تمہارے چچا کی بیٹی ہے تمہارا حق ہے اس پر۔ زہرہ کو ہمارے گھر ہی آنا چاہیے۔‘‘

’’نہیں بابا نہیں۔‘‘

’’کیوں نہیں۔ اگر کوئی اور پسند ہے تو بات کرو۔ بے وقوف، مرد تو چار شادیاں کر سکتا ہے، مگر پہلی بہو زہرہ ہو گی۔ اس کے بعد جسے چاہے لے آنا۔ مگر پہلا حق اس کا ہے۔‘‘

’’میں اس سے شادی نہیں کر سکتا بابا سائیں‘ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔‘‘ وہ بے بس دکھائی دے رہا تھا۔

’’وجہ؟‘‘ انہوں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

’’نہ تو زہرہ ایسا چاہتی ہے اور نہ ہی چچا الیاس‘ پھر خوامخواہ میں بات کرنے سے فائدہ۔‘‘

’’تمہیں کیسے پتا چلا کہ زہرہ ایسا نہیں چاہتی۔‘‘ وہ بے یقین تھے اور حیران۔ زہرہ کیسی عورت ہے جو حاکمین جیسے جوان کا ساتھ قبول نہیں کر رہی۔

’’بچہ نہیں ہوں اور نہ ہی بے وقوف۔‘‘

’’چلو نہیں چاہتی تو نہ سہی۔ ہم تو چاہتے ہیں نا اور پھر عورت کے دل کی کیا بات۔‘‘

’’ساری بات دل کی ہی تو ہے۔ جس کے دل میں‘ میں نہیں اسے یہاں لانا تو بے عزتی ہے میری۔‘‘

’’اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے پاگل لڑکے! عورت تو.....‘‘

’’وہ صرف عورت نہیں ہے۔ میں احترام کرتا ہوں‘ محبت کرتا ہوں اس سے‘ اور بدلے میں مجھے اس سے نفرت ملے‘ یہ میری برداشت سے باہر ہے‘ جو میرے دل میں ہے۔ میں اس کے دل میں رہنے کی خواہش رکھتا ہوں بابا!‘‘ وہ بہت الجھا ہوا اور بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

’’جب بیوی بن جائے گی تو محبت بھی کرنے لگے گی۔‘‘

’’وہ مجبور کر کے یہاں لائی جائے گی، اور مجبوری میں ہی مجھے قبول کرے گی، ایسی محبت نہیں چاہیے مجھے۔‘‘ ’’اوہ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ بڑی جائداد کی مالک ہے۔‘‘

’’جائداد آپ کس کے لیے اکٹھی کر رہے ہیں؟ میرے لیے ناں۔ تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے بابا سائیں! خدا کے لیے مجھے اس پر مجبور نہ کریں۔‘‘

وہ ان کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا، جس کی ہر فرمائش وہ پوری کرتے آئے تھے۔ اسے یوں اداس اور دکھی دیکھ کر اپنا دل ڈوب رہا تھا۔ مزید کچھ نہیں کہا۔ اس کا کاندھا تھپک کر اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئے۔

کیسے بتاتا۔ کس طرح سمجھاتا۔ اس نے تو زہرہ کے دل میں بسنے کی آرزو کی ہے، اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ اسے چاہا ہے‘ اور اس کی آنکھوں میں اپنی چاہت کا گہرا پکا رنگ دیکھنا اولین خواہش ہے زہرہ، زہرہ دل بس یہ ہی نام پکارتا ہے اور محبت ہی نہیں عزت بھی کرتا ہے اس وجود کی اور اس آنکھ میں آنسو آئیں۔ وہ بدن اس دل کی مرضی کے خلاف میری سیج پر سج جائے‘ یہ توہین ہے۔ اس کی اور میں یہ نہیں کر سکتا۔ وہ میری بنے نہ بنے مجھے چاہے نہ چاہے‘ یہ تو دل کے فیصلے ہیں کوئی زور تھوڑا ہی چلتا ہے۔ بس وہ خوش رہے۔ اس کی آنکھ کے جگنو اور ہونٹوں کی ہنسی سلامت رہے‘ بس یہ دل ایسی ہی آرزو کرتا ہے۔

جب فاطمہ نے اس کی اور زہرہ کی شادی کی بات چھیڑی تو بھی حاکمین نے وہی جواب میں کہا جو باپ سے کہہ چکا تھا۔ ’’میں خود زہرہ سے بات کروں گی۔‘‘

’’آپ کو میری قسم پھوپھو! آپ اس سے کوئی بات نہیں کریں گی۔‘‘ وہ حیران تھیں۔

’’انا ہم بھی رکھتے ہیں‘ آپ میرے حق میں دلائل دیں۔ سمجھائیں، منائیں۔ وہ انکار کرتی چلی جائے یہ قبول نہیں۔‘‘ حاکمین ہنس پڑا تھا یونہی بلاوجہ اور فاطمہ نے سر جھٹک کر کہا تھا۔

’’ایک تو میں تمہیں سمجھ نہیں پائی۔ پتا نہیں تم کیا چاہتے ہو۔‘‘

’’آپ تیار ہو جائیں۔ میں چھوڑ آؤں گا۔ آپ کو چچا کے ہاں۔ دعا ہے چچا گھر نہ ہوں۔ مجھے دیکھ کر کافی برا اثر پڑتا ہے ان کے مزاج پر۔‘‘ وہ کچھ تلخ ہوا تھا، فاطمہ خاموش رہیں۔

انہیں الیاس گردیزی کے ہاں چھوڑ کر وہ تو باہر ہی سے واپس آ رہا تھا۔ انہوں نے روک لیا اور کہا۔

’’یہ اچھی بات نہیں۔ تم چچا، چچی کو سلام تو کر لو۔‘‘

اور کچھ سوچ کر وہ چلا آیا۔ رہائشی حصے میں آتے ہی سب سے پہلے ملاقات زہرہ سے ہوئی۔ ہمیشہ سلام میں پہل حاکمین کیا کرتا تھا۔ آج وہ خاموش کھڑا رہا۔ اور اس کی خاموشی پر زہرہ کچھ ٹھٹکی۔

’’پھوپھو! اطلاع تو دی ہوتی۔‘‘ وہ جلد ہی سنبھل گئی۔

’’بس جی چاہ رہا تھا تو چلی آئی۔‘‘

’’میں چچی کو سلام کر آؤں۔‘‘ حاکمین نے فاطمہ کو مخاطب کیا۔

’’ہاں، عذرا بھی آئی ہوئی ہے‘ وہیں چھوٹی امی کے کمرے میں ہے۔‘‘ زہرہ کے انداز میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی گھل گئی۔ مگر چونکہ وجہ حاکمین کو معلوم نہیں تھی، تو اس نے زہرہ کا معمول کا لہجہ ہی خیال کیا‘ جو اس سے بات کرتے ہوئے‘ ہمیشہ ایسا ہی بے زار کن ہو جایا کرتا تھا۔

الیاس گھر پر نہیں تھے‘ وہ پروین سے ملنے کے بعد واپس چلا گیا۔

''اب تو آپ رہیں گی ناں ہمارے گھر پھوپھو؟'' زہرہ ان کی آمد سے بہت خوش ہوئی تھی۔

''زہرہ! میری بیٹے! کتنی خواہش تھی مجھے کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہتیں مگر......''

اور اس مگر نے زہرہ کو یقین دلایا۔ حاکمین نے پھوپھو کے سامنے عذرا کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کردیا ہے۔ وہ کچھ بجھ سی گئی اور کتنی دیر کوئی بات نہیں کرسکی۔ علم تو تھا ایسا ہونا ہے مگر اتنی جلدی ہوجائے گا'

''کتنا شوق تھا اسے' فاطمہ ان کے ہاں آئیں' وہ دونوں بہت باتیں کریں' اور انہیں ایک ایک چیز دکھائے اپنی، مگر دل اتنا اداس سوچ ایسی الجھی رہتی تھی کہ وہ ان سے زیادہ بات ہی نہیں کرسکتی تھی۔ پھر تیسرے روز فاطمہ بیمار ہوگئیں بخار تھا اور سر میں شدید درد کی شکایت تھی۔ الیاس گردیزی انہیں گاڑی میں ڈال کر شہر لے گئے وہ درد اور بخار کی شدت سے نیم بے ہوش ہورہی تھیں۔ زہرہ کا دل ڈوبا جاتا تھا، گھبرا کر وہ خدا خیر کرے کہہ اٹھتی۔

صبح کے گئے شام ہونے کو آئی، اور زہرہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہی۔ بار بار آنکھیں بھر آتیں، اور وہ اس بچپنے پر خود کو سرزنش کرتی۔ مگر کچھ تو تھا، جس کی خبر پہلے سے ہورہی تھی۔ آنکھیں یونہی تو نہیں بھر آرہی تھیں، دل یونہی تو اداس نہیں تھا۔ اسے تو دہرا صدمہ سہنا تھا۔ اور زہرہ کو عرش سے فرش پر آنا تھا۔ روڈ ایکسیڈنٹ ہاتھ کی لکیریں بدل گیا' وہ باپ جسے زہرہ پر فخر تھا۔ جس نے اسے شہزادی بنا کر رکھا تھا۔ نہ رہا اور وہ پھوپھو جو زہرہ کے لیے دوست بھی تھیں۔ ماں بھی، اور چھاؤں بھی، بہت دور چلی گئیں۔

آن کی ان میں دنیا اپنوں سے خالی اور بیگانوں سے پر ہوگئی۔ وہ انور کے گلے لگی چیخ چیخ کر روتی رہی اسے سمجھاتی رہی کہ ہم پر کیا قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ مگر انور اتنی سمجھ والا ہوتا تو اس کے غم کی شدت میں کچھ کمی نہ آجاتی۔

خاکی وجود بھی اٹھ گئے' اور زہرہ کو نکالے جانے والے جنازوں کے ساتھ ساتھ اس کے سر کا دوپٹہ بھی لے گئے...... وہ کمروں میں چھپتی پھرتی اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر آنسو بہاتی۔ ہائے نصیب، ہائے وقت ہائے زہرہ، کبھی سوچا تھا، ایسا کبھی اتنا برا خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا تونے۔ کیا کرے گی تو، کہاں جائے گی، کون ہوگا اب تیرا، تجھ پر کسے فخر ہوگا۔ کہاں گئے وہ ناز اٹھانے والے۔

اسے تایا علاؤ الدین کا انتظار تھا، وہ ہی اسے ان غم کے شدید موسموں میں یاد آئے تھے' مگر جب تسلی کے لیے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ اسی وقت جان گئی۔ یہ ہاتھ نرمی اور اپنائیت کی اس شدت سے یکسر خالی ہے' جو اس گھڑی زہرہ چاہ رہی ہے۔ کون کون پاس سے گزرتا رہا۔ تعزیت کے کلمات ادا کرتا رہا۔ وہ دیکھ نہیں سکی، اور سگے سوتیلے کا جھگڑا بھی اپنے ہوش میں اس نے اسی بدنصیب گھڑی میں پہلی بار دیکھا۔ جب علاؤ الدین نے یہ کہا۔

کہ ''فاطمہ کی آخری رسومات ان کے گھر میں ادا ہوں گی۔ کیونکہ وہ ہی فاطمہ کے سگے بھائی ہیں۔'' اور انہوں نے جو کہا وہ کیا بھی۔

''حاکمین! پھر تمہارا کیا فیصلہ ہے۔ کہو تو زہرہ سے تمہاری بات پکی کردی جائے۔'' وہ سوئم کے بعد ہی

بیٹے سے اس موضوع پر بات کر رہے تھے۔

''بابا! آپ اس وقت میں جب وہ تنہا ہے' غم سے نڈھال ہے' اس پر زبردستی کریں گے۔'' اسے حیرت بھی تھی' دکھ بھی۔

''زبردستی کی کیا بات ہے' اور ہم اس کی بھلائی ہی تو چاہ رہے ہیں۔ کوئی ظلم نہیں توڑ رہے اس پر۔''

''جس رشتے سے اس نے باپ کی زندگی میں انکار کیا ہے۔ اب اس پر مسلط کرنا ظلم ہی تو ہے۔''

''یعنی تم نہیں چاہ رہے کہ تمہاری شادی زہرہ سے ہو۔'' وہ جھلائے۔

''یہی سمجھ لیں، اور خدارا ناراض نہ ہوں، میں مجبور ہوں، میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔''

''ٹھیک ہے جب تم ہی جائداد کو وسیع کرنے کی خواہش نہیں رکھتے، تو پھر مجھے کیا پڑی ہے۔'' ان کے انداز میں واضح ناراضگی تھی۔

''اوہو بابا سائیں! اب میں کیسے سمجھاؤں آپ کو۔ اور دیکھیں، اگر یہ رشتہ نہ بھی ہو تو بھی ہمارے رشتے زہرہ سے ختم نہیں ہوجاتے۔ آپ یوں خفا ہو کر مت بیٹھیں۔ جائیں اور اسے اپنے ساتھ لے آئیں' وہاں اب اس کا ہے بھی کون۔''

''وہاں اس کی ماں ہے' بھائی ہے' سب سے بڑھ کر وہ اس کا اپنا گھر ہے' زمینیں ہیں، جائیدادیں، نوکر چاکر، وہ کوئی لاچار لڑکی نہیں ہے، نہ ہی ان پڑھ ہے۔ سمجھ دار اور ہوشیار ہے،

''آپ خبر گیری کو تو جاتے رہیں گے۔'' ان کی باتیں اور انداز۔ وہ کچھ رک کر پوچھنے لگا۔

''ظاہر ہے۔'' سگی نہ سہی سوتیلی بھتیجی تھی' جو اتنی بڑی جائداد سامنے نظر آرہی تھی، تو دن رات اسے ہضم کرنے کے منصوبے بن رہے تھے۔ خطرہ تھا تو صرف علاؤ الدین گردیزی کی طرف سے' وہ اگر ان کی مخالفت پر اتر آتے تو ناکوں چنے چبوا دیتے۔ بس انہی کے ڈر سے یہ لوگ کچھ ڈرے ڈرے سے تھے۔

''میرا خیال ہے علاؤ الدین اپنے بیٹے حاکمین کی شادی زہرہ سے کرکے جائداد کا مالک بننے کی کوشش کرے گا وہ انور کو بھی اپنے پاس رکھ لیں گے' اور ان لوگوں کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں کہ وہ پروین کو جائداد سے بالکل ہی بے دخل کردیں۔''

''ہاں حاکمین خود بھی اثر و رسوخ رکھتا ہے اور بڑی پہنچ ہے اس کی' ان لوگوں سے لڑائی کرنا ہمارے لیے کافی مشکل ہوگا۔''

بس ایسی ہی سوچیں تھیں جو ان لوگوں کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے روک رہی تھیں۔

وہ دیکھ رہے تھے علاؤ الدین کم کم ہی آتے ہیں' اور زہرہ سے ان کی ملاقات مختصر سی ہی ہوتی ہے مگر پھر بھی وہ ڈرتے تھے' اور یہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حاکمین نے اس جائداد کے سلسلے میں عدم دلچسپی کا اظہار کردیا ہے' اور اب علاؤ الدین کو ان زمینوں اور بھتیجی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

دو ماہ ایسے ہی گزر گئے پروین کے گھر والوں کا رویہ ان دو ماہ میں زہرہ کے ساتھ مناسب ہی رہا۔ وہ رہتی بھی اپنے کمرے میں تھی، اور کسی سے کم ہی بات کرتی تھی۔ تیسرا مہینہ شروع ہوا تو پروین کے

بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے علاؤ الدین کو نہ زمینوں سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی بھتیجی سے، ہمیں یوں ڈرنے جھجکنے میں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے مناسب موقع یہی ہے، اب کچھ کر گزرنا چاہیے۔''

''کیا خیال ہے زہرہ کو ہمیشہ کی نیند نہ سلا دیں۔'' یہ مشورہ عذرا کا تھا۔ جس کے دل میں زہرہ کے لئے شدید نفرت تھی۔

''پاگل مت بنو، خبردار جو ایسی بات آئندہ تمہارے منہ سے نکلی، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، کسی نے سن لیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔'' بڑے بھائی نے ڈانٹا بھی اور سمجھایا بھی۔

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے بھایا جی؟'' ۔پروین نے پوچھا۔

''بہتر تو یہ ہے کہ اس لڑکی کی شادی ہمارے ہی خاندان میں ہو جائے، تب پھر اس کا چچا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''ہاں، تجویز تو مناسب ہے مگر شادی ہوگی کس کے ساتھ؟'' پروین اور عذرا دونوں پوچھ رہی تھیں جبکہ چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر یقین کا رنگ آ گیا تھا۔

بڑے بھائی نے حاضرین پر ایک نگاہ ڈالی اور اپنی بیوی سے بولا۔

''یہ تم کیوں یہاں بیٹھی ہو۔ جا کر بچوں کو ہی دیکھ لو، جب سے یہاں آئی ہو، بچوں سے بالکل غافل ہوتی جا رہی ہو۔''

''بچوں کو ابھی کچھ دیر پہلے تو دیکھ کر آئی ہوں، چھوٹی سو رہی ہے اور باقی دونوں کھیل رہے ہیں۔''

''بھایا جی! آپ کچھ کہنے لگے تھے۔'' چھوٹے بھائی کو اس خوامخواہ کی بات سے الجھن ہو رہی تھی۔

''ہاں ۔ہاں کہیں ناں پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟'' سب ہی بے چین تھے۔

''بڑا سوچا ہے میں نے اس مسئلے پر اور یہ بھی دیکھا ہے لڑکی پڑھی لکھی بھی ہے، اور بہت ہوشیار بھی، کسی سیدھے سادے سے بیاہ دی، تو اس بے چارے کی تو زندگی ہی اجیرن ہو جائے گی، میں کہتا ہوں، کیا فائدہ جائدادوں زمینوں کا، جب بیوی شوہر کو منہ نہ لگائے، اسے دبا کر رکھے، زہرہ کو تو ایسا خاوند چاہیے جو سمجھ دار اور تجربہ کار ہو۔ اسے نکیل ڈال کر رکھنے کا طریقہ جانتا ہو۔''

''وہ جی چوہدری صابر حسین آئے ہیں۔'' ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی، اور سب کو یہ آمد بڑی ہی بے وقت اور بری لگی۔ سوائے بھائی سرفراز کے، وہ اس وقت یہ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

دونوں بھائی باہر چلے گئے، اور عورتوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔

''بھاجی کا فیصلہ بڑا درست ہے۔''

''ہاں اس سے بہتر اور کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور میرا تو خیال ہے اب اس مہارانی کو کہا جائے کہ کمرے سے باہر نکلے، کوئی کام کاج کیا کرے۔ آخر کب تک ہم اسے بٹھا کر کھلائیں گے۔''

''ہاں عذرا! یوں تو وہ زیادہ ہی سر چڑھتی جائے گی، میں آج ہی اس سے بات کرتی ہوں۔ پوچھتی ہوں، اس سے آخر ارادے کیا ہیں اس کے؟'' پروین کو عذرا سے پورا اتفاق تھا۔

باہر بچے کے رونے کی آواز آئی تو بھابی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

''آپا! خیال رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے چچا ناراض ہو جائیں۔'' عذرا نے ہولے سے بہن سے کہا۔

''ہائے ربا! تیرے دل میں ابھی تک وہی ہے اری عذرا ہوش کر جسے زہرہ جیسی پسند نہیں آئی۔ وہ تجھے دیکھے گا بھلا۔'' ''اب یوں تو نہ کہو آپا!'' اس نے ناراضگی سے منہ بھلایا۔

''جو بھی کہتی ہوں، تیرے بھلے کو کہتی ہوں۔ وہ بڑے اونچے مزاج والا ہے اور پھر زمینیں بھی تو یہاں سے وہاں ہیں اس کی، بھلا کوئی حیثیت ہے ہماری ان کی، کہیں سے کوئی جوڑ بنتا ہے، بول جواب دے مجھے۔''

''تم بھول رہی ہو! حاکمین اور الیاس گردیزی میں بہت فرق ہے۔ الیاس گردیزی عمر میں مجھ سے دس سال بڑے اور دو بچوں کے باپ تھے۔ جبکہ حاکمین تو شہزادہ ہے۔ تو مت خواب دیکھ، سر پکڑ کر روئے گی۔ اٹھ ذرا اس بی بی رانی زہرہ بیگم کو تو دیکھیں۔ اتنے دن ہو گئے چار پائی ہی توڑ رہی ہے۔''

جب دونوں زہرہ کے کمرے میں گئیں، تو وہ کھڑکی کھولے بظاہر تو لان میں پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کا چہرا صاف کہتا تھا، کہیں اور گم ہے۔

''زہرہ!'' پروین بیگم نے پکارا اس نے سنا نہیں وہ بالکل قریب اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں، اور پھر آواز دی۔ وہ چونک کر مڑی، اور سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''توبہ کیسے دیکھ رہی ہے بھلا بزرگوں کو یوں آنکھیں پھاڑ کر تکنے کھڑے ہو جاتے ہیں، جیسے نگل ہی لے نظروں ہی نظروں میں۔'' عذرا نے جلے کٹے انداز میں کہا تھا۔

''کیا بات ہے امی! کوئی کام ہے کیا؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

پروین تلخ سی ہنسی ہنس پڑی، اور بولی۔ ''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے گھر کے سارے کام تم ہی کرتی ہو۔''

''تو اور کیا تمہیں تو اتنا بھی احساس نہیں زہرہ بی بی کہ میری بہن بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے۔ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، ایسے وقت میں اسے آرام اور حوصلے کی ضرورت ہے، مگر وہ ہے کہ سارا دن آئے گئے کو نبٹاتی رہتی ہے اور تم کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔''

''آپ کو جو کام ہو مجھ سے کہہ دیا کریں، چھوٹی امی۔'' اس نے پروین کو مخاطب کیا۔ عذرا کا انداز سخت فصد[illegible] رہا تھا۔ مگر وہ کوئی بھی تلخ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ہونہہ چھوٹی امی تم سے کہیں اور بات سنیں لوگوں کی، تم خود سے بھی تو دیکھ سکتی ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم گھر میں کیا کام ہو سکتے ہیں۔''

''ہاں عذرا ٹھیک کہتی ہے تم کمرے سے نکلو دیکھو تو کیا کام ہیں۔ اب میں کہاں کہاں دیکھوں کس کس پر نظر رکھوں۔ ایک تو صدمہ ایسا اوپر سے میری صحت کی خرابی اور سب سے بڑھ کر کسی کو احساس ہی کب ہے میرا۔''

''نہیں..... نہیں امی میں تو.....''

"چلو بس رہنے دو۔" عذرا نے بات بھی پوری نہیں کرنے دی' پروین سے بولی۔

"آؤ آپا چلیں لوگوں کو اگر احساس ہونا ہوگا تو خود ہو جائے گا۔ ہمارے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" پروین اور عذرا چلی گئیں۔ وہ ان کے رویے پر غور کرتی رہی اور دل بیٹھنے لگا۔

وہ دن بھر کچن میں ملازماؤں کی نگرانی میں مصروف رہتی۔ یہ وہی ملازمائیں تھیں' جو کئی سالوں سے یہاں کسی نگرانی کے بغیر کام کر رہی تھیں اور کبھی کوئی شکایت نہیں ملی تھی' مالکوں کو مگر زہرہ بھی کیا کرتی' اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ کچن سے باہر نکلنا بھی مصیبت تھا کہ آج کل پروین کا چھوٹا بھائی بہت نظروں میں رکھنے لگا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز اور فضول جملے زہرہ کو اپنا وجود ہی عذاب لگنے لگا تھا۔ کتنی بے بس تھی وہ' اور کیسا دور دیکھنے کے بعد یہ وقت آیا تھا اس پر' بابا کی زندگی میں اس کی جرات نہیں تھی' جو آنکھ اٹھا کر زہرہ کی طرف دیکھ سکتا' اور اب کیسی غلیظ نظروں سے اسے دیکھتا تھا' اور اس کی زبان کیسے کیسے جملے بول جاتی تھی۔ کئی بار زہرہ کا جی چاہا اس کے منہ پر زور سے طمانچہ جڑ دے' مگر اپنی پوزیشن کا خیال اس کا ہاتھ روک لیتا تھا۔ وہ صرف اپنے کمرے میں جا کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو سکتی تھی۔ کوئی ایسا شانہ بھی نہیں تھا جس پر سر ٹکا کر آنسو بہا سکے۔ مضبوط بازوؤں کا حصار جو اسے دنیا کے ستم سے بچا سکے' کہیں نہیں۔ کہیں کوئی اپنا نہیں۔ وہ تو اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہے۔

دن بھر مہمان آتے رہتے اور پروین کے بہت سے رشتہ داروں نے تو مستقل یہیں ڈیرے لگا لیے تھے۔ سارا دن چولہے جلتے اور کھانا تیار ہوتا رہتا۔

"زہرہ بی بی! تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ کام تو یہ نوری اور رجو کر رہی ہیں۔" عذرا کی نگاہیں بھی اسی پر جمی رہتیں اور زہرہ کی سمجھ میں اس دشمنی کی وجہ نہیں آتی تھی۔

"میں سوجی کا حلوہ بنانے لگی ہوں' ابھی ابھی چھوٹی امی کہہ کر گئی ہیں۔"

"لو سوجی کا حلوہ بنانا بھی کوئی کام ہے' یہ تو کوئی بھی دیکھ لے گی' تم ذرا میرے ساتھ آؤ' کچھ کام ہے تم سے۔" اور وہ ایک لفظ بھی بولے بغیر باہر آ گئی۔

"اسٹور کی چابی کا پوچھ رہی تھیں آپا! تمہیں معلوم ہوگا کہاں ہے۔ تمہارے باپ نے ہماری آپا کو تو گھر کی مالکن کبھی سمجھا ہی نہیں۔ راج تو ہمیشہ تمہارا ہی رہا ہے۔"

"میں نہیں جانتی چابیاں کہاں ہیں؟" اس کی بات پر غصہ بہت آیا اور وہ بھی سختی سے بول گئی۔

"جانتی تو ہو، نہ بتانا چاہو تو اور بات ہے' خیر مجھے نہیں بتاؤ گی تو میرے بھائی تم سے خود پوچھ لیں گے۔" "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ارے صاف بات کا مطلب نہیں سمجھتیں۔ ویسے تو بڑی پڑھی لکھی بنتی ہو۔"

"عذرا! تم مجھ سے اس انداز میں بات مت کیا کرو۔ مت آزمایا کرو میرے صبر کو۔"

"لو باپ دنیا میں نہیں رہا۔ سر پر کڑی دھوپ ہے۔ پر دل چھل نہ گئے بی بی رانی کے۔" عذرا گہرے طنز کے ساتھ کہتی چلی گئی۔

وہ ابھی وہیں کھڑی تھی کہ پروین کا چھوٹا بھائی جانے کہاں سے نکل کر سامنے آ گیا اور بولا۔

"اسٹور کی چابیاں مانگ رہی تھی۔ تم نے انکار کر دیا بہت اچھا کیا۔ یہ تمہارے ہمدرد ہرگز نہیں ہو سکتے۔"

اور وہ خود کتنا ہمدرد ہو سکتا ہے' یہ زہرہ خوب پہچانتی تھی۔

"تم ان سے ڈرو مت۔ میں جو ہوں تمہارے ساتھ' ارے بڑی چیز ہوں میں۔ تم سمجھیں ہی نہیں مجھے' میں تو تمہیں سونے میں پیلا کر سکتا ہوں۔ میں تمہارے لیے شہر میں کوٹھی بنواؤں گا۔ میں تمہیں مہنگے کپڑے۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔" زہرہ چلا کر کہنا چاہتی تھی' مگر اس کی آواز نے ساتھ نہیں دیا۔

"کیا ہونے والا ہے میرے ساتھ' آخر ان لوگوں کی نیت کیا ہے' یہ کیوں ایسا سلوک کر رہے ہیں میرے ساتھ۔ چھوٹی امی کا یہ بھائی جو دیکھنے میں ہی اجڈ اور بدمعاش ہے۔ یہ کیوں میرے پیچھے لگا ہے' اور عذرے کے رویے میں اتنی تختی آخر کس لیے آ گئی ہے۔" آج وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ اسے لگتا تھا۔ یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ انسانیت سے گر سکتے ہیں۔ میں کیا کروں' کہاں جاؤں' اور ایسے میں اسے علاؤ الدین کا خیال آیا۔ بے شک انہوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا ہے' مگر آخر کو میں خون ہوں ان کا۔ بھائی کی اولاد ہوں' اگر میں ان کے پاس چلی جاؤں تو وہ رکھنے سے انکار نہیں کریں گے' اور میں ہمیشہ کے لیے تھوڑی جاؤں گی۔ بس ان کی منت کروں گی' مجھے دنیا کی نظر میں بے آسرا نہ رہنے دیں۔ میرے سر پر سب کے سامنے ہاتھ رکھیں' اور مجھے ان لوگوں کے ظلم سے بچا لیں۔

مگر اسے اندازہ نہیں تھا' اس کے لیے اب اس حویلی سے باہر نکلنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ وہ باہر نہیں جا سکتی۔ کیوں آخر کیوں' وہ بے بس تھی صرف چلا سکتی تھی۔

"تم جا کہاں رہی تھیں' کس یار کے پاس بھاگ رہی تھیں؟" پروین اسے کھینچتے ہوئے کمرے تک لائیں اور اپنے بڑے بھائی کے سامنے لا پھینکا۔

"الزام مت لگائیں' میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ بھڑ گئی ایسی غلط بات پر۔

"تو بتا دو ناں کہاں گئی تھیں؟" بڑے بھائی کا لہجہ کافی نرم اور دھیما تھا' اسے کچھ حوصلہ ہوا اور بولی۔

"میں چاچا کے ہاں جا رہی تھی۔"

"کیوں؟" پروین نے تیور چڑھا کر منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا۔

"ملنے کے لیے' میرا دل چاہ رہا تھا اتنے دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے۔"

"ان سے ملے یا حاکمین سے ملے ہوئے؟" عذرا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا ناں' میں ایسی لڑکی نہیں ہوں' میں اپنے چچا سے ملنے جا رہی تھی' اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ آخر کیوں آپ لوگوں نے مجھے قید کر دیا ہے کس لیے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔" وہ شدت سے رونے لگی۔

"روؤ نہیں' کیوں پریشان ہوتی ہو۔ تم پر کوئی پابندی نہیں' تم تو مالک ہو' بس جو باہر نکلنے سے منع کیا ہے

نا تو اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے' تھوڑے دنوں کی بات ہے' پھر تم ہر جگہ آزادی کے ساتھ آ جا سکو گی۔''

بڑے بھائی کا لہجہ نرم تھا' زہرہ کو سکون محسوس ہوا' وہ روتے روتے چپ ہو گئی۔

''جاؤ اپنے کمرے میں۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے دشمن کس طرح ہو سکتے ہیں ہم تو دوست ہیں۔''

زہرہ جانے کے لیے اٹھی' اس نے دیکھا اب پروین بیگم کا چھوٹا بھائی کمرے میں آ گیا تھا اور دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ بہت بچ کر اس کے قریب سے گزری اور باہر آ گئی' تو وہ بھی پیچھے ہی چلا آیا۔

''سنا ہے آج سرکار گھر سے بھاگنے کی تیاری میں تھے۔'' وہی فضول انداز تھا جس سے زہرہ کو گھن آتی تھی۔

''جواب نہیں دیا سوہنیو! کہاں کا ارادہ تھا؟'' اس کے انداز میں کاٹ بھی تھی اور لہجہ حق جتاتا ہوا

''تم سے مطلب میں کہیں بھی آؤں جاؤں۔'' بڑے بھائی کا تسلی بھرا انداز اسے ہمت دے گیا تھا۔

''او آج تو زبان بھی مل گئی ہے۔'' وہ دو قدم چل کر اس کے آگے آ کھڑا ہوا' اور چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔

''ایک بات یاد رکھو۔ تم آج نہیں تو کل پابند ہو گی' میری' ابھی سے عزت کرو گی تو اپنا ہی فائدہ ہے۔''

''ایسی بات تم سوچ ہی سکتے ہو' مگر حقیقت میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔''

''ناممکن کو ممکن بنانا میں جانتا ہوں۔'' اس نے زہرہ کے شانے پر سختی سے ہاتھ رکھے' اسی وقت کمرے میں سے بڑا بھائی باہر آیا۔ یہ منظر دیکھا تو چھوٹے کو آواز دی۔ بھائی کی آواز سنتے ہی اس نے ہاتھ ہٹا لیے۔

''او شیدے میری تو مجبوری ہے مجھے یہاں رکنا پڑ رہا ہے پر تو پیچھے جا کر اپنی زمینوں کی بھی دیکھ بھال کر' گھر کی خیر خبر بھی تو لے جا کر۔''

''اچھا بھاجی! مگر سب خیر ہی ہو گی۔''

ادھر شیدا جانا نہیں چاہتا تھا' مگر بڑے بھائی نے قائل کر لیا اور شام تک وہ اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ زہرہ نے سنا تو سکھ کا سانس لیا۔

رات کے بعد بڑے بھائی نے دونوں بہنوں کو الیاس گردیزی کی بیٹھک میں بلوایا۔ راز داری تو برتی تھی' مگر بیوی کو خبر ہو گئی۔ سوچا ایسی کیا خاص بات ہے' جو بہنوں کو بیٹھک میں بلوا کر کی جا رہی ہے' اور مجھے بلایا تک نہیں۔ وہ دبے قدموں ادھر آئی اور دروازے سے اندر جانے کے بجائے وہیں بھاری پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

اندر اس کا شوہر سرفراز اپنی بہنوں سے مخاطب تھا۔ پہلے تو وہ سمجھی نہیں ذکر کس کا ہے' سرفراز کہہ رہا تھا۔

''بڑی ہوشیار اور گہری لڑکی ہے' تم جیسی تو اسے سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ یہ مردوں کو اشاروں پر چلانا چاہتی ہے اب یہ ہی دیکھ لو۔ شیدے جیسا لڑکا جو کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ اس کے آگے چوں نہیں کرتا۔''

''ہاں بھاجی! شیدے پر تو جیسے اس چڑیل نے جادو کر دیا ہے' بڑا سیدھا سادا ہے میرا بھرا۔ مجھے تو بڑی فکر رہتی ہے اس کی' اگر زہرہ اس کی بیوی بن گئی تو سمجھو گیا کام سے۔''

''یہ بھی تو سوچو آپا' پھر ساری جائداد ہمارے قبضے میں ہو گی۔'' عذرا نے سمجھایا۔

''جائداد کو گولی مارو۔ ہمیں تو اپنا لڑکا بچانا ہے۔'' سرفراز نے عذرا کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھاجی! کیا سوچا ہے آپ نے؟'' پروین بیگم نے بے تابی سے پوچھا۔

''بہت سوچا میں نے اس مسئلے پر سچ پوچھو تو میری راتوں کی نیند ہی اڑ گئی ہے۔ دیکھو ناں اگر اس کا چاچا دعوا کر دے کہ لڑکی کا وارث اب وہ ہے' تو سمجھو پھر ساری جائداد گئی ہاتھ سے۔ وہ بڑے اثر و رسوخ والے لوگ ہیں۔ وہ پروین کا حصہ بڑی آسانی سے ہڑپ کر سکتے ہیں' اور ہم منہ دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ اس چالاک لڑکی کا نکاح کر دیا جائے' یہ ٹھکانے لگے تو اس کے چاچا کا ڈر بھی ختم ہو گا۔''

''یہی تو مسئلہ ہے کہاں کریں اس منحوس کی شادی۔'' پروین بیگم نے یوں کہا جیسے زہرہ کا بڑا بوجھ ہے اس پر......

''میں اسی بات کی طرف آ رہا ہوں۔ دیکھو نا میں خاندان کا بڑا ہوں۔ میں نے تم لوگوں کو اپنے بھائی بہن ہی نہیں بچے سمجھا ہے۔ تمہاری لیے جو بھی مصیبت آئی۔ میں اسے گلے لگانے کو تیار رہا ہوں اور اب بھی میں یہ قربانی دینے کو تیار ہوں' میں مجبوری کے تحت زہرہ کو نکاح میں لینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔''

کچھ دیر کے لیے دونوں بہنیں سناٹے میں آ گئیں پھر پروین بولی۔

''شیدا کبھی نہیں مانے گا۔ وہ مزاج کا گرم ہے' مجھے ڈر ہے' اس منحوس کی وجہ سے میرے بھائیوں میں پھوٹ نہ پڑ جائے۔''

سرفراز لاپروائی سے ہنسا' اور بولا۔

''شیدا تو ابھی بچہ ہے۔ اسے اچھے برے کی پہچان نہیں' تم اسے سمجھاؤ گی تو سمجھ جائے گا۔''

''وہ کسی کی نہ سنے گا نہ سمجھے گا بھاجی! یہ ذمہ داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔''

''تم فکر کیوں کرتی ہو شیدا چار پانچ روز کے لیے گاؤں گیا ہوا ہے، اس کے آنے سے پہلے نکاح ہو جائے گا۔''

اور اسی دم سرفراز کی بیوی پردہ ہٹا کر اندر آ گئی۔

''شیدا یہاں نہیں ہے مگر میں تو یہاں موجود ہوں' اور میرے جیتے جی تمہارا دوسرا بیاہ نہیں ہو سکتا۔'' کمر پر ہاتھ جمائے لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ وہ اٹل لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''او شہناز تو یہاں کہاں' سوئی نہیں اب تک......؟'' سرفراز نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بیوی کی طرف دیکھا۔

''یہاں میری قسمت کھوٹی کرنے کی سازش ہو رہی ہے' اور میں پڑ کے سو رہوں' ایسی پاگل بھی نہیں ہوں۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بھرجائی!'' پروین نے پورے اعتماد سے کہنا چاہا۔ شہناز نے بات مکمل نہیں

کرنے دی ہاتھ اٹھا کر بولی۔
''تو نہ بول نی۔ میں اس وقت اپنے گھر والے سے مخاطب ہوں۔ صاف کہے دیتی ہوں اگر کسی نے مجھ پر یا میرے بچوں پر ایسا ظلم توڑنے کی کوشش کی تو خون کر دوں گی۔''
''میں کہتا ہوں بکواس بند کر اور چلی جا یہاں سے۔'' سرفراز پہلا رنگ خالی دیکھ کر دوسرے میں آ گیا۔
''میں بکواس بند کر دوں' میں چلی جاؤں یہاں سے' ناں ایسے تو نہیں جاؤں گی۔ فیصلہ ہوگا یا میں رہوں گی یا وہ......'' ''تو ٹھیک ہے پھر فیصلہ ہوا۔ وہ رہے گی تو جائے گی۔'' سرفراز نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔
شہناز نے سر پر ہاتھ مار کر رونا شروع کر دیا۔ سرفراز نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے آیا۔
''پاگل عورت! عقل سے کام لے' بھلا میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں۔ تو بیوی ہی نہیں میرے تین بچوں کی ماں ہے اور رہی زہرہ تو بس اتنا سمجھ لے کہ زہرہ کسی عورت کا نہیں جائداد کا نام ہے' دیکھ ناں ابھی تو جائداد اکٹھی ہے کل کو شیدے اور عذرا کی بھی شادیاں ہوں گی۔ تب ہمارے پلے کیا بچے گا۔ ایک ننھا سا ٹوٹا' اس پر بچوں کو کیسے پالیں گے ہم' بس اس لیے میں نے یہ ترکیب لڑائی ہے اس سے پہلے کہ شیدا آ جائے' ہمیں اس پر عمل کر لینا چاہیے۔ زہرہ سے زمین کے کاغذات پر زبردستی دستخط لے کر اپنے نام کروالوں گا' اور پھر اسے طلاق دے دوں گا۔ بس اب شور نہ کرنا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے' اس میں تیرا اور تیرے بچوں کا ہی بھلا ہے۔ کمال ہے تو اپنے خاوند کو نہیں سمجھی۔ میں تجھ سے بڑی گہری محبت کرتا ہوں۔ میرے دل میں تو ہے اور تو ہی رہے گی۔'' شہناز کے رونے دھونے میں اس کے جملوں کے ساتھ کمی آتی گئی اور پھر وہ بالکل خاموش ہوگئی۔

☆......☆......☆

زہرہ خود کو محفوظ اور بہت لاچار تصور کر رہی تھی۔ اسے اس حویلی میں پابند کر دیا گیا تھا۔ وہ یہاں سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ کیوں آخر کیا خطرہ ہے اس کو جو یہ پابندی لگائی گئی ہے۔ میری دشمنی کسی سے بھی نہیں۔ ہاں مگر یہ جو اس گھر کے اندر موجود ہیں۔ یہ میرے دشمن ہو سکتے ہیں مجھے سب سے زیادہ خطرہ تو انہی کی ذات سے ہے' اور جو حویلی کے باہر ہیں' وہ تو ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ اگر وہ میری اس بے بسی کو جان لیں تو یقیناً مجھ سے ہمدردی جتائیں گے۔ یہاں پر شیدا ہے جس سے مجھے خوف آتا ہے۔ سرفراز بھائی نے اسے گاؤں بھیج دیا ہے مگر وہ چند روز کے بعد پھر یہاں ہوگا۔ عذرا اور چھوٹی امی کی آنکھوں میں میرے لیے سختی اور نفرت ہے۔ وہ تو مجھے گھر کی ملازمہ بنانے پر ہی تلی ہوئی ہیں۔ شاید یہ باتیں بڑے بھائی کے علم میں نہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ سب مجھ سے بے زار ہوں۔ کسی کو بھی ہمدردی نہیں۔ میں ان اپنوں میں بھی تنہا ہوں۔'' سرفراز کے بارے میں یہ سوچا تو ساتھ ہی اسے خیال آیا اسے باہر نہ جانے دینے کی پابندی میں سرفراز بھی شامل ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ تو نقاب اتار کر اصلی چہروں کے ساتھ سامنے آ گئے ہیں۔ جبکہ انہوں نے ہمدردی کا فریب دیا ہے مجھے' لہجے میں مٹھاس رکھ کر بے وقوف بنایا ہے۔
یہ خیال آتے ہی وہ مزید خوف زدہ ہوگئی' اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا' اور وہ کسی قیدی پرندے کی

طرح بے بسی سے کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چکر کھانے لگی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور نیند کے بدلے آنکھ میں آنسوؤں نے ڈیرہ لگایا ہوا تھا۔
وقت کیسے بدل گیا' وہ کیا سے کیا ہوگئی۔ بعض رشتے زندگی کی اساس ہوتے ہیں' اور اب وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ خدایا کب کٹے گی یہ اندھیری رات' کب سویرا ہوگا۔ ہوگا بھی یا نہیں' اگر یہ رات ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئی تو اس کا دل اس خیال سے ہی لرزنے لگا۔ ''مجھے نفرت ہے' مجھے سخت بری لگتی ہے۔ یہ نم اور تاریک رات اس کی تاریکی گہری اور مہیب ہے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس اندھیرے نے ہر آرزو ہر امنگ کو نگل لیا ہے۔ یہ رات تو کسی ڈائن کی طرح ہے۔ میلے' الجھے سیاہ بالوں والی اور گندے ہاتھوں والی' ناخن گرد آلود اور سرخ ہیں۔ جیسے کسی کے لہو میں ڈبوئے ہوں۔ اور یہ واقعی لہو ہے اور یہ لہو زہرہ کا ہے۔ مگر اس نے زہرہ کو زخمی کر کے چھوڑ دیا ہے' ناکارہ بدن میں روح باقی ہے اور جبھی تو بدن درد سے کانپ رہا ہے مگر موت نہیں آتی۔ خدا اے خدا اب اس سیاہ کالی گہری اور تاریک رات کو ختم کر دے' مالک میری آزمائش ختم کر دے۔''
''کیا بھرجائی شہناز نے آپ کی بات مان لی ہے' یا ابھی تک اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے؟'' صبح موقعہ پاتے ہی پروین نے بڑے بھائی سے پوچھا تھا۔
''میں نے اسے منا لیا ہے۔ خاندان کی بہتری کی بات کی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے۔ میں اپنے بھائی بہنوں کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں' اگر تمہیں اب بھی اعتراض ہے تو بے شک الگ ہو جاؤ۔ بس پھر وہ خاموش ہوگئی' دل ہی دل میں مان گئی ہے جبھی تو چپ ہے' ورنہ یہ عورت خاموش بیٹھنے والی نہیں ہے۔''
''ہاں' بڑی اکڑ ہے شہناز میں۔ حالانکہ ہے کیا' کچھ بھی تو نہیں۔'' پروین نے منہ بنایا۔ وہ اس کی کوشش میں تھی کہ بھائی کو شہناز کے خلاف کر دے تاکہ وہ شہناز کی کوئی بات نہ سنے۔ اور فوراً زہرہ سے نکاح کر لے۔
''سنو! تم زہرہ سے بالکل ذکر نہ کرنا' بلکہ یہاں کسی کو بھی اس معاملے کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے اس لیے تم دونوں کو بیٹھک میں بلا کر یہ بات کی تھی۔ مگر شہناز چالاک عورت ہے' اس نے چھپ کر یہ باتیں سن لیں۔''
''آپ فکر نہ کرو بھراجی! ہم تو کسی سے نہیں کہیں گے۔ بس آپ بھرجائی کو سمجھا دیں۔''
''اس کی فکر نہ کرو۔ اسے سب سمجھا دیا ہے' اور ویسے بھی یہاں اس حویلی میں جو تمہاری اور زہرہ کی ہے' ایسی بات کرنا ہنسی اڑوانے والی ہی حرکت ہوگی یہاں اس کے ساتھ بھلا کون ہمدردی کرے گا۔ سب تمہارے وفادار نوکر ہیں۔''
''ہاں یہ تو ہے۔'' پروین اطمینان سے مسکرائی' پھر بولی۔
''ایک بات اور کرنا تھی بھاجی! آپ سے۔''
''ہاں ہاں' ایک نہیں سو کہیں۔ میں سن رہا ہوں۔''
''بھاجی! میں نہیں چاہتی کہ ہمارے تعلقات علاؤ الدین گردیزی سے خراب ہوں' ہمیں ان کے ساتھ اچھی طرح ہی رہنا چاہیے۔''

"میں تو ان سے کسی بھی قسم کا کوئی رابطہ رکھنے کے خلاف ہوں۔ علاؤالدین اور اس کا بیٹا دونوں گرم مزاج کے مالک اور ٹیڑھے دماغ کے ہیں۔"

"مگر حاکمین کو موم کرنا کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔" پروین نے وہ بات کہنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کے لیے عذرا رات بہن کو مجبور کرتی رہی تھی۔

"وہ کیسے؟ تم کھل کر بات کرو پروین۔"

"ہم اگر عذرا کا رشتہ حاکمین سے کر دیں تو کیا برائی ہے۔"

اس کی بات سن کر سرفراز ہنس پڑا اور بولا۔

"برائی تو کوئی نہیں، مگر ایسا صرف خواب میں دیکھا جاسکتا ہے، حقیقت میں ناممکن ہے۔"

"کوئی ناممکن نہیں، عذرا اور حاکمین آپس میں ملتے رہے ہیں، عذرا میرے گھر آتی ہی رہتی تھی، اور حاکمین بھی کبھی کبھار چچا کے گھر آجاتا تھا۔ تو جب بھی اس کی اور عذرا کی ملاقات ہوئی، وہ بڑے ادب اور اچھے انداز میں ملا، میرا خیال ہے۔ وہ عذرا کو اچھی لڑکی سمجھتا ہے اور اگر ہم ذرا سی کوشش کریں تو رشتہ ہوسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اگر ایسی بات ہے تو سوچیں گے اس پر بھی، مگر فی الحال تو جو کر رہے ہیں۔ وہی اہم ہے باقی باتیں اس کے بعد کے لیے اٹھا رکھو۔"

"ٹھیک ہے بھاجی! جیسا آپ کہیں۔"

☆......☆......☆

شہناز کی چپ سے سرفراز اور اس کی دونوں بہنوں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور اب وہ کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالے گی۔ مگر یہ ان کی بھول تھی۔ اپنے گھر کو اتنی آسانی سے برباد ہوتے وہ بھلا کیسے دیکھ سکتی تھی۔ اس نے بہت سوچا تھا کہ وہ اس مسئلے پر کیا کر سکتی ہے، پہلے تو یہی خیال آیا کہ شیدے کو بلوائے۔ اس کی موجودگی میں سرفراز شادی کی جرات نہیں کرے گا۔ مگر یہ بھی جانتی تھی۔ سلا عورت کا ہو تو ضد بڑھ جاتی ہے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے۔ اور وہ اپنے سر کا سائیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اس نے سوچا اگر زہرہ کے چچا کو اطلاع دے دی جائے تو، مگر یہ خیال بھی رد کرنا پڑا، جو چاچا، بھتیجی کی خبرگیری کو نہیں آتا۔ اسے بھلا ان مسئلوں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے، پھر جو فیصلہ اس نے آخر میں کیا وہ یہ تھا کہ اس ساری بات سے زہرہ کو آگاہ کر دے۔ آخر وہ لڑکی اپنے گاؤں، اپنے لوگوں میں ہے، ملازم یقیناً اس کے ہمدرد ہوں گے۔ شاید زہرہ کوئی ترکیب کر سکے اور کچھ نہیں تو گھر سے بھاگ ہی جائے، وہ مرے یا جیے اس سے شہناز کو کوئی مطلب نہیں تھا، وہ بس اپنا گھر اور گھر والا بچانا چاہتی تھی۔

سرفراز حویلی سے باہر گیا ہوا تھا۔ پروین اور عذرا اپنے کمرے میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ شہناز نے یہی موقع مناسب دیکھا اور زہرہ کے کمرے میں آگئی۔ زہرہ نے اسے دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، اور سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو، کیا وہ کمی تلاش کر رہی ہو، جس کی وجہ سے میرا گھر والا دوسری شادی کی بات کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" زہرہ خاک نہیں سمجھی۔

"وہ کمی تمہیں مجھ میں نظر نہیں آئے گی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاؤ تو جواب پالو گی تم حسین تو ہو، مگر تمہارا اصلی حسن ہے تمہاری جائداد۔"

زہرہ نے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا کہ جو مفہوم اخذ کیا تھا۔ وہ بڑا خوفناک تھا۔

"ہاں سرفراز تم سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہے شیدے کے آنے سے پہلے پہلے وہ تم سے نکاح کر لے گا۔"

"مگر میں تو ایسا نہیں چاہتی۔" زہرہ نے بے بسی سے اسے دیکھا اور روتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تو پھر جو بھی کر سکتی ہو کر لو۔ وقت تو بہت کم ہے۔"

"سنو، کیا تم میری تھوڑی سی مدد کرو گی۔" ایک فیصلہ آن کی آن میں کیا۔

"ہاں، میں ہر قسم کی مدد کر سکتی ہوں۔"

"تو پھر میرا پیغام میرے چچا تک پہنچا دو۔ اگر میں کسی ملازم کو بھیجوں گی تو شاید یہ پیغام ان تک نہ پہنچ پائے۔ ملازم اس حویلی کے دروازے پر ہی روک لیا جائے، مگر تم یہ کر سکتی ہو۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی کسی سے کہتی ہوں، کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا ہے جو پروین سے زیادہ تمہارا ہمدرد ہو۔"

"ہاں ایسے بہت سے ہیں۔ میرا ڈرائیور بھی اعتماد والا آدمی ہے، تم اس کو یہ کہہ دینا کہ زہرہ بی بی نے کہا ہے تو وہ فوراً روانہ ہو جائے گا۔ ہاں اگر مجھ سے ملنے کو کہے تو منع کر دینا۔ سمجھا دینا، ایسا کرنے کے بعد وہ میرے کسی کام نہیں آسکے گا۔ پروین اسے بھی شاید گھر میں قید ہی کر دے۔"

"یہی وقت مناسب ہے، میں ابھی بات کر لیتی ہوں۔" شہناز اس کے کمرے سے چلی آئی، اور اس کے لیے نئی الجھن اور پریشانی چھوڑ گئی۔

"کیا چاچا آجائیں گے، اگر وہ نہ آئے تو کیا ہوگا۔ کیا میں اتنے لوگوں کا مقابلہ کر سکوں گی۔" کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

☆......☆......☆

فاطمہ کی موت کے بعد علاؤالدین کی حویلی تو اجڑ کر ہی رہ گئی تھی۔ علاؤالدین زیادہ تر باغ والے مکان میں ہوتے، یا پھر شہر، جبکہ حاکمین نے تو گاؤں آنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھوپھو کے بغیر اسے یہاں وحشت ہوتی تھی۔ وہ تھیں تو کیسا سکون تھا۔ یہاں کتنی اپنائیت برستی تھی۔ چہار سو، مگر اب تو بس یادیں تھیں، ان کی موت کے بعد وہ صرف تین چار بار ہی گاؤں آیا۔ وہ بھی بہت تھوڑی دیر کے لیے اور اس نے ہر مرتبہ ملازموں سے پوچھا۔

"زہرہ بی بی تو نہیں آئی تھی۔" جواب ہمیشہ نفی میں ملا۔ ایک بار اس نے علاؤالدین سے کہا بھی۔

"آپ جا کر بیٹی کی خیر خبر ہی لے لیں۔"
"اتنی فکر ہے تو خود کیوں نہیں جاتے۔" انہیں اس کی بات سن کر یہ اندازہ ہوا کہ زہرہ اس کے دل میں ہے' اور فیصلہ کرلیا۔ وہ خود زہرہ کو دیکھنے حویلی نہیں جائیں گے۔ حاکمین کو ہی جانا پڑے گا۔ دل میں محبت ہے۔ بار بار سامنا ہوگا۔ تو ہار جائے گا۔ یہ فضول کی ضد ٹوٹ جائے گی کہ جب تک محبت کا جواب زہرہ محبت سے نہیں دے گی۔ شادی نہیں کروں گا۔ بس پھر وہ بھی نہیں گئے' اور انتظار کرنے لگے' کب حاکمین اعتراف کرتا ہے کہ بس بابا سائیں میری برداشت ختم' آپ زہرہ کو میری طرف سے بتادیں۔

☆......☆......☆

اس وقت شام ہو رہی تھی' آسمان پر سرخی تھی' اور عکس زمین پر بھی اترا تھا' حاکمین ابھی ابھی شہر سے واپس آیا تھا' اور ملازموں نے بتایا تھا۔ بڑے سائیں حویلی میں نہیں ہیں' وہ کل ہی اپنے دوست اللہ دین صاحب کے ڈیرے پر گئے ہیں۔

وہ اندر جاتے جاتے رک گیا۔ اور سوچنے لگا اندر جائے یا یہیں سے واپس ہولے۔

"سائیں! وہ پکھی داس بھی آئے تھے' کتوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"مجھے کتوں سے کوئی دلچسپی نہیں' اب آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ سارے کتے تم ہی رکھ لو۔"

"سائیں' یہ تو بہت قیمتی کتے ہیں۔ آپ نے اتنی رقم خرچ کر کے۔" ملازمہ نے یاد دلانا چاہا۔ مگر اس نے سنا نہیں کہہ دیا۔

"اب آئیں تو کہہ دینا۔ سارے کتے لے لو' اور اب کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے سائیں جو حکم آپ کا۔ اور سائیں اگلے ماہ آپ کی شیرنی (گھوڑی کا نام) ریس میں حصہ لے گی' ہم نے تیاری تو خوب کروائی ہے مگر آپ بھی اگر ایک نظر دیکھ لیتے۔"

"تم نے تیاری کروائی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میرے دیکھنے نہ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔" اس کی بے زاری ہنوز تھی۔

وہ اس وقت حویلی کے بیرونی پھاٹک کے پاس جیپ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا' اور یہ فیصلہ ابھی باقی تھا' اسے یہاں رہنا ہے یا واپس جانا ہے۔ سامنے کمروں کی قطار تھی یہاں ملازم بھی دن بھر بیٹھے رہتے اور گاؤں کے جو لوگ ان سے ملنے آتے وہ بھی ادھر ہی بیٹھ کر انتظار کرتے۔ اس نے ادھر سے ایک شخص کو سر جھکائے تھکے تھکے انداز میں ادھر آتے دیکھا۔

"یہ تو الیاس چچا کا ڈرائیور ہے' زہرہ کے ساتھ ہی تو آیا کرتا تھا۔ تو کیا زہرہ بھی آئی ہے۔"

حاکمین کی ساری اداسی ساری تھکن جاتی رہی' وہ اس شخص کا نام نہیں جانتا تھا۔ ملازم نے کہا۔

"اسے بلاؤ۔" اور دوسرے سے پوچھا۔

"کیا زہرہ بی بی آئی ہیں؟"

"نہیں چھوٹے سائیں' بس یہی آیا تھا پریشان ہے' کہتا ہے بی بی نے بڑے سائیں کے لیے پیغام دیا

ہے' یہ کب سے انتظار میں بیٹھا تھا۔ کہ شاید بڑے سائیں واپس آجائیں۔ اب شاید مایوس ہو کر جا رہا ہے۔"

زہرہ نے بابا سائیں کے لیے پیغام بھیجا تھا۔ یقیناً کوئی اہم بات ہوگی وہ عجلت میں آگے بڑھا اور اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تمہیں زہرہ بی بی نے بھیجا ہے وہ ٹھیک تو ہیں' کیوں یاد کیا ہے انہوں نے بابا سائیں کو؟"

جواب میں اس دیہاتی نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی اور بولا۔

"واہ سائیں خوب خیال کیا آپ لوگوں نے اپنے خاندان کی عزت کا۔ بھلا کوئی یوں کرتا ہے جیسا آپ لوگوں نے کیا۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" حاکمین نے پریشان نگاہوں کو اس کے چہرے پر جما دیا۔

"کیا ہوا ہے یہ میں نہیں جانتا' بی بی کو حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ وہ وہاں قید ہے' اور اس نے بڑے سائیں کے لیے کہلا بھیجا ہے' چاچا خدا کے لیے ایک بار آ کر مجھ سے مل لیں۔"

☆......☆......☆

گوٹے کناری والا دوپٹہ عذرا اور پروین بیگم نے زبردستی اس کے سر پر ڈالا تھا۔

"دیکھ ری شور نہ کر۔ ہم تو عزت دے رہے ہیں بھاجی نکاح میں لا رہے ہیں تجھے' ورنہ اس زمانے میں لاوارث لڑکیوں کی عزت کی پروا بھلا کون کرتا ہے' پڑھی لکھی ہو' خوب سمجھ سکتی ہو۔ انجام کیا ہوتا ہے بہتر یہی ہے چپ چاپ ہاں کہہ دو۔"

ایسی دھمکی' اتنی گری ہوئی بات اس کا دل و دماغ سن ہوگیا۔

"ہاں یہ لوگ ایسے ہی ہیں جو کہہ رہے ہیں کر بھی سکتے ہیں۔" اس نے بے بسی سے شہناز کی طرف دیکھا' وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہوں میں بے چینی تھی' اداسی تھی' اور ایک ہی سوال تھا۔

"علاؤالدین گردیزی آئے کیوں نہیں' اب تک تو انہیں آ جانا چاہیے تھا؟"

اور زہرہ کے روتے دل نے التجا کی۔ "چاچا اب آجاؤ۔ دیر نہ کرو' اگر دیر ہوئی تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"

"روتی کیوں ہے' ہم نے کوئی ظلم نہیں توڑا تجھ پر' پناہ دی ہے تجھے۔" پروین بیگم نے بری طرح ڈانٹا۔

زہرہ نے سر اوپر کیا اور دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی۔ نگاہ کھلی کھڑکی سے باہر گئی تو روح جسم کا ساتھ چھوڑنے لگی' سرفراز کے ساتھ چار مرد تھے' اور ایک نے رجسٹر اٹھا رکھا تھا۔ اسے لگا سب مٹ گیا ہے' دنیا فنا ہوگئی ہے' مگر مصیبت تو یہ تھی کہ سب مٹا نہیں' دنیا فنا نہیں ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی' اور نہیں نہیں چلانے لگی' پروین نے آگے بڑھ کر زور کا ہاتھ اس کے چہرے پر رسید کیا اور بولی۔

"تجھے پہلے ہی بتا دیا ہے نکاح نہیں کرے گی تو انجام کیا ہوگا۔ پھر بھی بکواس کر رہی ہے۔ چپ کر جا' جو یہ نہیں نہیں سرفراز بھائی نے سن لی تو بڑی بری ہوگی تیرے ساتھ۔"

"مجھے قبول نہیں ہے' مجھے ہرگز قبول نہیں ہے۔"

وہ جیسے آپے میں نہیں تھی' اس کی آہوں سے حویلی گونج رہی تھی۔ اور پروین' عذرا حیران تھیں۔ وہ لوگ رک کیوں گئے۔ اب تک تو مردوں کو اندر آ جانا چاہیے تھا۔

پھر دروازے کے بالکل قریب بھاری قدموں کی دھمک ابھری تو پروین نے مسکرا کر عذرا کی جانب دیکھا مگر یہ مسکراہٹ جلد ہی حیرت اور گھبراہٹ میں بدل گئی۔ جب انہوں نے اپنے سامنے حاکمین کو پایا۔

زہرہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اور چیخ چیخ کر ایک ہی بات کہتی تھی۔

''مجھے قبول نہیں ہے۔''

''زہرہ!'' حاکمین نے اس کی جو حالت دیکھی تھی' مجرم خود کو' اپنے باپ کو سمجھا تھا۔ اس کی آواز میں شرمندگی اور دکھ تھا۔

زہرہ نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا اور اس کی جانب لپکی۔

''کیا یہ تم ہو؟ تم واقعی آ گئے ہو؟'' ذرا دیر کے بعد وہ اس کے سینے پر سر رکھے ہچکیوں میں رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

''میں نے بہت انتظار کیا۔ میں نے بہت دعائیں کیں۔''

''مجھے معاف کر دو زہرہ!'' اس کا لہجہ ندامت سے چور تھا۔

زہرہ نے آنسو بھری آنکھوں' مگر مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے دیکھا اور بولی۔

''معافی کیسی؟ تم تو وقت پر آ گئے ہو' اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو پھر زہرہ مٹ جاتی' رل جاتی مٹی میں۔''

''نہیں میرے جیتے جی زہرہ مٹ نہیں سکتی۔ وہ رل نہیں سکتی۔'' حاکمین اظہار سے باز نہیں رہ سکا اور زہرہ حیرت کو دبا نہیں سکی۔

''ہاں یہی سچ ہے تم تو ملکہ ہو میرے دل کی۔ جبھی تو ملکہ کی مرضی کے بغیر کچھ بولنے' کوئی قدم اٹھانے کی مجھے جرات نہ ہو سکی۔ میں نے محبت ہی نہیں کی عزت بھی کی ہے۔'' وہ آنچل زہرہ کے سر پر ڈالتے ہوئے پوری سچائی سے کہہ رہا تھا' اور زہرہ کا دل کہہ رہا تھا۔

''ہن میں' لکھیا سوہنا یار۔'' (اب میں نے سوہنے یار کو پہچانا ہے) کہ آج میں نے اس کا دل دیکھ لیا ہے' میں نے اس کے جذبوں کو محسوس کیا ہے' اس کی محبت کے بارے میں سنا ہے' اور میں خود پر مغرور ہوں' کہ اب مجھے اس کا حق ہے۔ میرا محبوب مجھے چاہتا ہی نہیں میری عزت بھی کرتا ہے' وہ مجھے میری رضا سے مانگتا ہے' اور اسے اس بات کی فکر ہے کہ میں کیا سوچتی ہوں' اور اب مجھے اس سے کہنا ہے' میں تمہیں سوچتی ہوں۔''

جب وہ حاکمین کے ساتھ اس کی حویلی جا رہی تھی تو جیسے ہر طرف ایک ہی پکار تھی۔

''ہن میں لکھیا سوہنا یار۔''

☆......☆......☆

حسن گریاں کے آبگینے

کھجور کے پتوں سے بنائی گئی نماز کی چٹائیاں، ٹوپیاں اور ٹوکریاں بیچنے کے ساتھ ساتھ دو کڑھائی والے دوپٹے اور ایک شیشے موتی والا گلا بھی بیچا تھا۔ رقم معمولی تھی۔ اتنی محنت اور زخمی انگلیوں کا معاوضہ بڑا ہی قلیل تھا، مگر جس نے کبھی زیادہ دولت دیکھی ہی نہ ہو، اس کے لیے یہی بہت تھا۔ جب سب کچھ بیچ کر تپتی دوپہر میں ٹاہلی کے نیچے کھڑی ہو کر اماں بھولی نے یہ رقم گنی تو اک طمانیت کی لہر اس کے رگ و پے میں اتر گئی۔ پیسے اتنے تھے کہ وہ امیراں کے جہیز کے لیے ایک سوٹ اور گھر کا ضروری سودا سلف خرید سکتی تھی۔ یہیں سڑک کے کنارے لگی ٹاہلی تلے کھڑے کھڑے اس نے رقم کے تین حصے کیے اور پھر کپڑوں کی دو دکانوں کی طرف چل پڑی۔

اماں بھولی کا حال حلیہ ہی بتا رہا تھا۔ کتنی رقم ہو سکتی ہے اس محنت کش مزدور عورت کے پاس۔ دکاندار پیسے والے گاہکوں کی جانب متوجہ تھے۔ ان کے سامنے بچھے جاتے تھے۔ ایک سے دوسری دوکان۔ دوسری سے تیسری۔ کئی ایک نے اسے ڈانٹا بھی۔

''جاؤ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے، پیسے ہوتے نہیں ہیں۔ آ جاتے ہیں گاہکی خراب کرنے۔''

''پترا پیسے ہیں میرے پاس۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''ہونہہ جتنے پیسے تمہارے پاس ہوتے ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ جاؤ مائی جاؤ۔ یہاں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

”اچھا پتر! جیسے تمہاری مرضی۔“

کتنا پھرنا پڑا اسے ایک سوٹ کے لیے کہ رقم قلیل تھی۔ کپڑا بہت مہنگا...... مگر آخر کار اسے کامیابی نصیب ہو ہی گئی۔ سبز رنگ کا سستا سا ریشمی سوٹ اس کے لیے بڑا قیمتی تھا...... اچھی طرح ساتھ لائے چار خانے کے رومال میں لپیٹا اور سر پر رکھا...... اس کے بعد گھر کا کچھ سودا سلف اور مزید چٹایاں، ٹوپیوں کے لیے ضروری اشیاء کی خریداری...... دوپہر اب ہونے لگی تھی...... مزاج دار لوگ اب اور بھی کڑوی زبان بولنے لگے تھے۔ اس کی معمولی حیثیت ہر جگہ راہ کی رکاوٹ بن جاتی جو بھی خریدنے جاتی۔ باری بہت دیر سے آتی۔

خدا خدا کر کے یہ کام مکمل ہوا۔ اس نے سارا سامان سر پر رکھا اور بسوں کے اڈے پر آ کھڑی ہوئی۔

”کیسا پیارا جوڑا خریدا ہے میں نے...... امیراں دیکھے گی تو خوش ہو جائے گی۔“

سارا راستہ لوگ گرمی کو کوستے رہے۔ بس جہاں رکتی بوتلیں اور شربت بیچنے والے آجاتے لوگ خرید کر پیتے۔ رقم ادا کرتے تو مہنگائی کو کوستے پیاس تو اسے بھی لگی تھی، مگر کیا ضروری ہے۔ ابھی اسی وقت اتنا مہنگا شربت یا بوتل خرید کر پیا جائے ذرا دیر کی بات ہے برداشت ہو سکتی ہے پیاس۔ وہ بس امیراں کو یہ سوٹ پہنے تصور کی آنکھ سے دیکھتی رہی...... خوشی ہوتی رہی...... لوگ گرمی کو کوستے مہنگائی کو کوستے ایک دوسرے سے بیزار لڑتے جھگڑتے رہے...... اس کے گاؤں سے باہر بڑی سڑک پر بس نے اسے اتار دیا۔ اب سے کوئی دو کوس پیدل چلنا تھا۔ ہر سو اڑتی ریت، گرم ہوا۔ دور دور کھجور کے درخت یا چند خود رو پودے...... آبادی تو ابھی دور ہے۔ اس نے چلنا شروع کیا۔

گرم ریت پھٹے ہوئے جوتوں میں گھس کر پیروں کو جلا رہی تھی مگر قدم رکے نہیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ابھی کچھ ہی دور آگے جا کر کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ ادھر زمیندار کا ڈیرا بھی ہے۔ وہاں سے پانی مل جائے گا، موسم کتنی تیزی سے بدلتے ہیں۔ ابھی گرمی ہے پھر برسات شروع ہو جائے گی۔ پھر سردی آئے گی۔ برداشت پر اسے یاد آ گیا۔ گھر کے اکلوتے کمرے کی چھت اب کچھ اچھی حالت میں نہیں ہے...... اس کی مرمت برسات سے پہلے ہو جانا چاہئے۔

”چلو کر لیں گے یہ کام بھی۔ کوئی مشکل تھوڑی ہے۔ میں اور امیراں صبح یہ کام شروع کریں تو دوپہر کی تیز دھوپ سے پہلے فارغ ہو سکتے ہیں۔ امیراں سے کہوں گی اس سوٹ پر گوٹا لگا کر اسے کالے کپڑے میں لپیٹ کر صندوق میں ڈال دے۔ ابھی شادی میں دیر ہے۔ قادر بخش کی نوکری نئی نئی ہے۔ وہ کہتا ہے ماسی کچھ جمع کر لوں پھر ہی شادی کروں گا۔ مجھے بھی کچھ ایسی جلدی نہیں۔ اللہ سائیں جو بھی کرے گا بہتر کرے گا۔ پتہ نہیں امیراں آج دن میں کیا کرتی رہی ہوگی۔ میں سر پر نہ ہوں تو کوئی کام نہیں کرتی۔ صبح کہہ کر تو آئی تھی۔ دوپٹے پر کڑھائی شروع کر دینا اور رنگ گھول کر رکھنا۔ میں آ کر چٹائیوں کا کام شروع کر دوں گی۔“

اس کا ذہن کیا کیا سوچتا رہا۔ قدم اٹھتے رہے یہاں تک کہ زمیندار کا ڈیرا آ گیا۔ وہاں زمیندار کے تین آدمی بیٹھے تھے اور ان کے پاس دو بڑے بڑے کتے تھے۔ جو گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کھا رہے تھے۔ زمیندار کے یہ آدمی چھپر کے نیچے چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں لگائے بیٹھے ٹھنڈا شربت پی رہے تھے۔

”پتر! پانی مل سکتا ہے؟“ اماں بھولی نے چہرے کا پسینہ خشک کرنے کو چادر کا کونا ہاتھ میں پکڑا پھر چہرے اور ہاتھوں پر پھیرنے لگی۔

”آ و مائی پانی ہی پانی...... وہ ادھر ٹوبہ ہے۔ پی لو۔“ بھرے جگ سے شربت گلاس میں انڈیلتے ہوئے اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔

”بڑی مہربانی پتر!“ اماں بھولی ٹوبہ کی طرف چل پڑی۔

پانی کا ذائقہ اچھا نہیں تھا مگر پیاس بجھ سکتی تھی...... اس نے پیامنہ پر بھی چھینٹے مارے اور پھر سفر شروع ہوا۔ آسمان کا رنگ آج گدلا گدلا سا تھا اور ہوا بند دھوپ تیز اور گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ بدن کو چبھنے اور میلا کرنے والی۔

”لگتا ہے زور کی آندھی اٹھنے والی ہے۔ سوہنے رب مجھے خیر خیریت سے گھر پہنچا دے۔ آندھی شروع ہو گئی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔“ دعا کے ساتھ ساتھ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے تھے۔ اماں بھولی کی دعا قبول ہوئی۔ وہ آندھی شروع ہونے سے پہلے گھر پہنچ گئی۔ ایک کمرہ اور صحن کے نام پر اماں اور امیراں کے ہاتھوں کی بنائی نیچی سی دیواریں دو درخت تھے اس صحن میں۔ ایک نیم کا اور دوسرا کھجور کا۔ درخت تو یہاں تقریباً ہر گھر میں نظر آتا ہے۔ آج کل پھل آنے کا موسم ہے۔ کھجور کا پھل بھی کسی نعمت سے کم نہیں۔ صبح، دوپہر، شام تینوں وقت کی روٹی آج کل اسی سے کھائی جاتی ہے۔ کھجوریں دھوپ میں خشک کر کے ان موسموں کے لیے محفوظ کر لی جاتی ہیں جب یہ پھل نہیں ملتا۔ نیم کے قریب چھپر تلے دو بکریاں بندھی تھیں، چند مرغیاں بھی ان کے قریب ادھر ادھر پھر رہی تھیں اور یہیں درخت کے نیچے امیراں اماں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

”آج تو بڑی دیر کر دی اماں!“ اسے دیکھتے ہی وہ لپک کر آئی۔

”دیر سویر تو سفر میں ہو ہی جاتی ہے۔ تو یہ دیکھ۔ میں تیرے لیے کیا لائی ہوں۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ساری تھکن، دھوپ کی چبھن، حلق کی پیاس بھول گئی۔ بیٹی کے چہرے پر خوشی کا رنگ دیکھنے کو وہ اتنی بے چین تھی کہ جلدی میں رومال کھولنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی جاتی تھی۔ امیراں اشتیاق بھری نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہی تھی جب دیکھا کہ اماں یہ ننھی سی گٹھری کھول ہی نہیں پا رہی تو ہاتھ سے لے لی اور خود کھولی۔

”ہائے اماں! ایسا پیارا سوٹ۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔“ امیراں کے چہرے کی خوشی بھولی کے بدن میں طمانیت بن کر دوڑ گئی، وہ مسکرا رہی تھی اور پیار بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

”اماں! دیکھ تو مجھے کیسا لگ رہا ہے؟“ وہ کپڑا اپنے اوپر لگا کر دیکھنے لگی۔

”بہت اچھا...... بہت سوہنا...... دھی رانی! اور یہی جوڑا خریدتے تو مجھے دیر ہوئی۔ میں یہ خریدے بغیر واپس نہیں آنا چاہتی تھی۔ اب کے شہر جاؤں گی۔ پیسے ملیں گے تو میں گوٹا لے کر آؤں گی۔ تو اپنے جوڑے پر گوٹا ضرور لگانا۔“

”اماں! یہ مہنگا تو بہت ہوگا۔“

”ہاں پورے سو روپے میں ملا ہے۔“ ”سو روپے اتنا مہنگا!“ امیراں کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں اب مہنگائی بہت ہے...... ہر چیز بہت زیادہ پیسے میں ملتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ہاتھ پیر سلامت رہیں۔ ہم محنت کرتے رہیں گے۔ چار جوڑے تو ہوگئے اسے ملا کر، تین اور بناؤں گی پھر اس کے بعد برتن خریدوں گی۔''

''اماں، کتنا اچھا رنگ ہے۔ ہماری نیم پر بہار میں ایسے ہی پتے نکلتے ہیں۔ ہرے ہرے آنکھوں کو بھلے لگنے والے صاف ستھرے چمک والے۔''

''اچھا اب جوڑا سنبھال لے، یہ گھر کا سودا ہے اور یہ رنگ ہیں، سب رکھ دے۔ موسم ٹھیک نہیں۔ کسی وقت بھی آندھی آسکتی ہے، اور ہاں سن کل چھت کی مرمت بھی کرنا ہے...... تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ گرمی چلی جائے گی...... سیانے کہہ رہے ہیں اس بار ہمارے صحرا میں بارش ضرور ہوگی، بارش سے پہلے چھت کی مرمت کرلینی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے اماں! کل ہم یہی کام کریں گے۔'' امیراں سوٹ اور دوسری چیزیں اٹھا کر اندر چلی گئی۔

''دھی رانی! ایک پیالہ پانی کا تو ڈال لانا۔'' بھولی آواز دے کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اور ادھر ادھر دانہ دنکا تلاش کرتی مرغیوں کو گننے لگی۔

''اب کے پوری آٹھ ہیں...... اگلی مرتبہ شہر جاؤں گی تو انڈے بھی لیتی جاؤں گی...... اچھی قیمت پر بک جائیں گے پھر کچھ موسم بدلے تو چوزے بھی نکلواؤں گی۔''

جب امیراں پانی کا پیالہ لے کر باہر آئی تو ہوا میں تیزی آچکی تھی۔ گرم ہوا کے تھپیڑے بدن کو بری طرح جلاتے تھے...... پانی پی کر دونوں اندر آگئیں...... اس روز زور کی آندھی آئی۔ بھولی شکر ادا کرتی رہی۔ وقت پر گھر پہنچ گئی اگر یہ آندھی راستے میں گھیر لیتی تو کتنی مشکل پڑتی۔ اتنی مٹی اڑاتی ہے ریت آنکھوں میں چبھتی ہے اور راستہ نظر ہی نہیں آتا۔ آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے......

یہ زور دار آندھی شام تک چلتی رہی پھر آہستہ آہستہ اس کی شدت میں کمی آتی گئی...... گرم ہوا کے تھپیڑے ٹھنڈے جھونکوں میں بدلنے لگے۔ سورج ڈھل گیا اور صحرا کی ریت گرم چولا اتار کر ٹھنڈے سنگھار کی تیاریوں میں لگ گئی۔ دوپہر سے گھروں میں گھسے لوگ باہر نکلنے لگے۔

گھر ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے مگر دل قریب تھے لوگ کھلی جگہوں پر دریاں بچھا کر اکٹھے ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ بابا بلھے شاہ کے اشعار ترنم سے پڑھے جا رہے تھے۔ بچے آپس کے کھیل کود اور پہیلیاں ڈالنے میں لگے تھے۔ عورتوں کی مردوں سے ذرا ہٹ کر محفل جمی تھی...... لوگ باتیں بھی کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ نظریں ڈہر (کچی سڑک) کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں کہ موسم گرما ہو یا سرما شکاری اور سیاح ان علاقوں میں آتے رہتے تھے۔ خاص کر شکار کے جنون میں مبتلا لوگ تو موسموں کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ سردیوں میں تلور، بھٹ، کشمیرا کی تلاش تو گرمیوں میں بھوکڑ کی کشش انہیں اس آگ برساتے تپتے علاقے میں لے آتی تھی۔ وہ لوگ جیپوں پر آتے تھے۔ اکثر مقامی لوگوں کے پاس چلے آتے تھے۔ ان سے اس علاقے کے بارے میں معلومات لیتے تھے اور کبھی کبھار یہاں کے مقامی باشندوں کے بنائے یہ گھریلو دستکاری کے شاہکار بھی خرید لیتے تھے۔

سیاح عام طور پر موسم سرما میں آتے تھے۔ ان کی زیادہ دلچسپی آثار قدیمہ میں ہوتی ہے اور وہ یہاں کے لوگوں سے ملتے تو۔ انہی ٹیلوں اور ان میں مدفن شہروں کے بارے میں پوچھتے تھے۔ ان ٹیلوں اور سرخ عمارتوں کے بارے میں بہت کہانیاں مشہور تھیں جو نسل در نسل سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔ ان ٹیلوں میں ہوا عجیب آوازیں پیدا کرتی ہے۔ مقامی لوگ ان آوازوں سے خوفزدہ اور ادھر جانے سے گریزاں رہتے تھے۔ مگر سیاح ان باتوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ یہاں رہنے والی بدروحوں کے قصے بڑے شوق سے سنتے اور پھر انہیں دیکھنے محسوس کرنے ان ٹیلوں کی طرف نکل جاتے تھے، جہاں صرف گدھ رہتے تھے۔ مقامی لوگ ان سیاحوں کی بہادری سے بڑے متاثر تھے۔ سیاح ان سے ان ویرانوں کی کہانیاں سنتے تھے اور یہ لوگ ایک دوسرے کو ان سیاحوں کی کہانیاں سناتے تھے۔ شکاریوں سے زیادہ انہیں یہ سیاح اچھے لگتے تھے جو یہاں کی ایک ایک شے کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور حفاظت کرتے تھے، جب کہ شکاری یہاں سے قیمتی پرندے پکڑ کر لے جاتے تھے۔

دین محمد بتاتا تھا۔ چرگ بہت مہنگا پرندہ ہے...... اسے جو لوگ پکڑنے آتے ہیں وہ دوسرے ملکوں اور بڑے بڑے زمینداروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ سنا ہے اس کی قیمت ہزاروں میں پڑتی ہے۔''

''مگر یہ ہمارے علاقے کا حسن ہے اگر یونہی فروخت ہوتا رہا تو ایک روز ختم ہوجائے گا۔'' غریب مقامیوں کی رائے تھی جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

رات بھیگنے لگی تھی اور دین محمد بلھے شاہ کو گانے لگا تھا، اس کی آواز میں سوز تھا اور وہ یوں ڈوب کر گاتا تھا کہ فضا بھی ٹھٹھک جاتی تھی۔ صحرا کی پرسکون، ٹھنڈی میٹھی، صاف شفاف رات جہاں آبادی بہت کم ہے اور رات کو چاند کی روشنی میں ریت چاندی کا فرش لگتی ہے ایسی رات میں یہ آواز رک جانے پر، ٹھہر جانے پر مجبور کرتی ہے سنو، سنو مسافر، بابا بلھے شاہ نے کیا کہا ہے اور مسافر صرف سنتا ہی نہیں سر بھی دھنتا ہے۔

وت نہ کرسیاں مان رنجھے یار دا دے اڑیا

آج اجو کی رات رات میرے گھر رہو کھاں دے اڑیا۔

ترجمہ: میرے رانجھن میں پھر تیری یاری کا مان نہ کروں گی۔ آج کی رات میرے یارے تم میرے ہاں قیام کرلو۔

امیراں ان اشعار کو سن رہی تھی اور اسے قادر بخش یاد آرہا تھا۔ قادر بخش، اس کی بچپن کی منگ، اس کی پھوپھی کا بیٹا۔ ماں باپ نہیں تھے اس کے۔ بابا سائیں نے کتنے پیار سے پالا اور کتنا پیار اس کے لیے امیراں کے دل میں خود بخود جانے کہاں سے پیدا ہوگیا۔ دنیا قادر بخش سے شروع ہوکر قادر بخش پر ہی ختم ہونے لگی۔ دل کی لگی ان دونوں کے ساتھ تھی۔ وہ بھی تو دیوانہ بن گیا تھا اس کا۔ امیراں کو دیکھے بغیر چین قادر بخش کو بھی کہاں ملتا تھا۔ گرمیوں کی صبح جب ہوا میں مدہوش کر ڈالنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ تب وہ پانی بھرنے ٹوبے پر جاتی۔ قادر ساتھ چل پڑتا۔ دونوں دن بھر کی باتیں صبح ہی صبح کر ڈالنے کی کوشش کرتے مگر ناکام ہی رہتے۔ پتہ نہیں ایک دوسرے کے لیے ان کے پاس اتنی باتیں کہاں سے آجاتی تھیں اور کبھی کبھی وہ دونوں دور نکل

جاتے۔ ادھر آکر چنکارہ مل جاتا تو دونوں چھپ چھپ کر اسے دیکھتے۔ یہ سنہری رنگ کا ہرن جو اپنی چھوٹی سی دم ہلاتا رہتا ہے اور جس کی آنکھیں اتنی خوبصورت ہیں کہ دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ دونوں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ جب امیراں چھوٹی تھی تو کئی بار بابا سائیں سے کہتی۔

''ہم ایک چنکارہ لے آتے ہیں بابا سائیں! میں اسے بڑے پیار سے پالوں گی۔''

''مگر بابا سائیں نے ہر بار سمجھایا ''آزاد جانوروں اور پرندوں کو پکڑ کر اپنے گھر میں رکھ لینا ظلم ہے ان کے ساتھ۔ انہیں آزاد رہنے دو۔ یہ آزاد ہی اچھے لگتے ہیں۔''

وہ ان کی بات ٹال نہیں سکتی تھی مگر اسے چنکارہ سے پیار تھا اور قادر کو بھی چنکارہ سے پیار تھا۔ اسے امیراں سے بھی بہت پیار تھا اور کہتا تھا۔

''امیراں تمہاری آنکھیں بالکل چنکارے جیسی ہیں۔ پیاری پیاری، معصوم جادو بھری آنکھیں۔''

انہی ویرانوں میں سیاہ گوش بھی ہے اور امیراں کو اس جانور سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ اب جب کہ بابا سائیں اس دنیا میں نہیں، قادر بخش نوکری کے لیے شہر چلا گیا تھا۔ وہ چنکارہ دیکھنے اکیلی نہیں جاتی کہ ادھر جھاڑیاں ہوتی تھیں، اونچے نیچے ٹیلے اور ریت بہت نرم، پاؤں جکڑنے والی پھر اسے سیاہ گوش کا ڈر ہے اور اسے شکاریوں کا ڈر بھی تھا۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے مائیں بیٹیوں کو سمجھاتی ہیں...... یہ شہری شکاری صرف جانوروں کا شکار ہی نہیں کرتے......کبھی کبھی علاقے کی جوان لڑکیاں بھی شکار کر لیتے ہیں، اسے شکاریوں سے خوف آتا تھا، وہ شکار نہیں ہونا چاہتی تھی وہ مرنا بھی نہیں چاہتی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی چرگ کی طرح اسے قید کر لیا جائے اسے اپنی آزادی پسند تھی، اسے ان گرم اور سرد صحراؤں سے محبت تھی۔ جہاں کی زمین سنہری تھی اور جہاں بابا بلھے شاہ کی شاعری دل میں میٹھا میٹھا درد جگاتی ہے...... کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی ہے۔

رات ہی اس نے اپنی ہمجولیوں کو بتا دیا تھا۔

''اماں شہر سے میرے لیے بہت اچھا ہرے رنگ کا جوڑا لے کر آئی ہے۔''

اور سبھی نے کہا تھا۔ ''صبح وہ جوڑا دیکھنے ضرور اس کے گھر آئیں گی۔''

''صبح نہیں، صبح تو ہم اپنے جھونپڑے کی چھت مرمت کریں گے۔ نئی ٹہنیاں رکھیں گے کھجور کی، یہ چھت بڑی پرانی ہو چکی ہے۔ بابا سائیں اور قادر نے بنائی تھی...... پچھلے سال ہم نے مرمت بھی نہیں کی۔''

''اڑی امیراں! تیرا قادر بخش کب آئے گا؟'' نذیراں پوچھنے لگی۔

''پتہ نہیں کب آئے۔ اب کی مرتبہ جو خط آیا۔ اس میں لکھا تھا۔ یہ موسم زیادہ مزدوری کا ہے۔ کام بہت ہے۔ آ نہیں سکوں گا۔'' اس کے لہجے میں گہری اداسی اتر آئی۔

''اڑی۔ وہ آجائے گا تو اداس نہ ہو'' اس کی عزیز سہیلی کیسری نے تسلی دی۔ اور امیراں اداس دل کے ساتھ مسکرانے لگی۔

''تم نے دیکھا امیراں! اس بار کھجور کے درختوں پر کتنا پھل آیا ہے۔ سب کہتے ہیں سچا سائیں مہربان ہے۔ اس مرتبہ بارش بھی ہوگی۔''

''ہاں سچا سائیں مہربان ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں اب پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگی ہوں۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلتا ہاتھ اتنی تیزی سے کام کرتے ہیں، دنوں میں دوپٹے کاڑھ لیتی ہوں، شیشے موتی والے گلے بنا لیتی ہوں۔''

''یہ تو لگن ہے، تو داج جمع کر رہی ہے۔ جتنی جلدی جمع ہوگا۔ اتنی ہی جلدی تیری شادی ہوگی۔'' اللہ وسائی نے چھیڑا اور سب لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی ہنس پڑی۔

☆......☆......☆

ہو، ہو، ہو آواز ہوا کے رخ پر تیرتی ہوئی ادھر آ رہی تھی۔ یقیناً صحرا کا کوئی باسی سفر میں تھا۔ شدید آندھی نے راستے سے بھٹکا دیا۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ ایک دم سے خاموشی چھائی...... صرف ہو، ہو، ہو یہ آواز ہوا کے رخ پر تیر رہی تھی، پھر سب اٹھ کھڑے ہوئے...... مرد فیصلہ کرنے کے لیے مسافر کی مدد کے لیے کون کون جائے گا۔

دین محمد چاچا نے اپنا ہاتھ بلند کیا...... سب نے تائید کی کہ دین محمد چاچا تو صحرا کا بھیدی تھا۔ وہ مسافر بہت جلد ڈھونڈ نکال لیتا۔ دین محمد اپنے جھونپڑے کی طرف گیا...... اونٹ کی رسی پکڑی اس کے گلے میں سیپیوں اور موتیوں کے درمیان بندھی ٹلی پر ہاتھ پھیرا اور مطمئن ہو کر سب لوگوں کی طرف آ گیا۔

''یہ چھاگل رکھ لو'' اماں بھولی نے رسی سے لٹکی چھاگل دین محمد چاچا کی طرف بڑھائی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر چھاگل گلے میں لٹکا لی۔

''ہم جلد آ جائیں گے۔'' آسمان دیکھ کر دین محمد نے ستارہ تلاش کیا، آسمان صاف اور تاروں سے چمکتا ہوا تھا...... اس نے مطمئن ہو کر گردن ہلائی اور اپنے اونٹ کے ساتھ چل پڑا۔ یقیناً مسافر کسی ساتھ کے علاقے کا ہوگا...... ہمارے علاقے کے تو سب موجود ہیں...... اس کے جانے کے بعد موضوع مسافر ہی تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے شہر میں مزدوری کرنے والے لڑکوں میں سے کوئی وطن واپس آیا ہو۔ ان کی باتیں سن کر امیراں کے دل میں قادر بخش کا خیال آ گیا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی یاد تھا اس نے خط میں لکھا ہے۔ جلد نہیں آ سکتا۔ شہر میں کام بہت ہے...... کتنا مختصر سا خط ہوتا تھا اس کا...... کسی سے لکھواتا تھا اور یہاں پر ہرکارہ ہی سب گھروں میں خط پڑھنے اور لکھنے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ ایک اسکول تھا تو اس علاقے میں مگر بہت دور اور پھر غریب لوگ بچے پڑھاتے یا انہیں دو وقت کی روٹی کھلاتے۔ بابا سائیں کی بڑی خواہش تھی، امیراں اور قادر بخش پڑھ جائیں، مگر آرزو کی راہ میں غربت حائل رہی اور دونوں میں سے کوئی نہیں پڑھ سکا۔

☆......☆......☆

صبح ایک مصروف دن تھا...... ماں بیٹی کو چھت کی مرمت کرنا تھی، ایک گرم دن طلوع ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے جانور لے کر دور نکل چکے تھے۔ عورتیں کڑھائی سلائی کا سامان لے کر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئی تھیں کہ یہ کڑھائی اور دوسرے ہنر ان کی روزی روٹی کا ایک ذریعہ تھے۔ بچے جو سمجھ دار تھے ماں باپ کی مدد کرتے تھے اور جو چھوٹے تھے وہ مرغیوں، بکریوں کے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

امیراں کام میں مصروف تھی اس نے نہیں دیکھا کب ایک جیپ ادھر آئی۔ سر تب ہی اٹھایا جب وہ بالکل قریب آ کر رک گئی اور دروازہ کھول کر ایک آدمی نے اسے پکارا۔ امیراں کام چھوڑ کر جلدی سے ان کی طرف آئی۔

"کیا بات ہے صاحب......؟" مگر وہ دونوں اسے دیکھتے ہی رہے۔ بولا کوئی نہیں۔

"آپ نے بلایا تھا؟" اسے ان کا یوں دیکھنا اچھا نہیں لگا۔

"پانی مل سکتا ہے۔" ایک نے آخر لب کھولے۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ اوڑھنی درست کرتی اندر چلی گئی۔

"دیکھنے کی چیز ہے، صحرا کا حسن منفرد ہے...... ہر شے میں ایک طلسم، ایک کشش ہے۔ آنکھیں دیکھی ہیں اس لڑکی کی اور چال ایسی جیسے مورنی ترنگ میں ہو۔ اور تم نے شاید غور نہیں کیا، اس کی اسکن کتنی چمکدار اور چکنی ہے۔ بے اختیار چھونے کو دل چاہتا ہے۔"

وہ دونوں بہت کھل کر اس پر تبصرہ کر رہے تھے۔ امیراں پیالوں میں پانی لے کر باہر آئی۔ اب کے اس نے اوڑھنی کو کچھ یوں اوڑھ رکھا تھا کہ چہرے کا بہت سا حصہ چھپ گیا تھا۔ دونوں کو مایوسی ہوئی۔ پانی کے پیالے پکڑنے والے نے کچھ یوں پکڑا کہ ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرا گئے...... اس نے امیراں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش بھی کی مگر وہ نظر جھکائے اور اوڑھنی گرائے کھڑی تھی، جب انہوں نے پیالے واپس کیے تو ہاتھ کو دوبارہ چھونے کی خواہش بھی ادھوری رہ گئی۔ اس نے ہاتھ بھی چادر کے نیچے کر لیے تھے۔ انہیں پیالے چادر پر رکھنے پڑے۔

"ہم لوگ شکاری ہیں۔ تم بتا سکتی ہو، چنکارہ ہرن کس طرف مل سکتا ہے۔" چنکارے کے شکاری، وہ معصوم خوبصورت جانور جس کو بابا سائیں گھر میں نہیں رکھنے دیتے تھے۔ اسے یہ شکار کرنے آئے تھے۔

"کیا کرو گے تم اسے شکار کر کے؟" بہت غصہ آیا تھا امیراں کو ان دونوں پر۔

"ہم اسے شہر لے کر جائیں گے۔" ایک نے بتایا اور دوسرا آگے ہو کر بولا۔

"کیا تم ہمارے ساتھ شہر چلو گی؟"

"نہیں نہیں...... میں کیوں جاؤں تمہارے ساتھ؟" وہ پیچھے ہٹی۔

"اس لیے کہ تم چنکارے سے زیادہ خوبصورت ہو اور اس سے کہیں زیادہ قیمتی بھی۔"

"ہاں......تم تو کسی محل میں رہنے کے قابل ہو، تم راج کرنے کے لائق ہو......" وہ باری باری بول رہے تھے۔

"کیا بات ہے دھی رانی! کون لوگ ہیں۔" اماں بھولی نے ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ خیال تھا مسافر ہیں۔ پانی پی کر گاڑی آگے بڑھا دیں گے مگر وہ رک گئے اور اس کی بیٹی سے باتیں کرنے لگے۔ تب اماں بھولی کو کام چھوڑ کر ادھر آنا پڑا۔

اماں کے ادھر آتے ہی وہ جیپ بڑھا لے گئے۔ "کیا کہتے تھے امیراں! یہ لوگ؟"

"اماں! یہ اچھے لوگ نہیں تھے۔ یہ چنکارے کو مارنے آئے ہیں اور مجھ سے بھی بڑی عجیب باتیں کر رہے تھے۔"

"چل چھوڑ تو کام کر...... آج ہمیں یہ سب ختم کرنا ہے۔"

اور امیراں بھی سر جھٹک کام میں مصروف ہو گئی۔

کام کافی تیزی سے کیا اور سہ پہر تک یہ دونوں فارغ ہو گئیں۔

ذرا موسم بدلے تو میں مرغی کے چوزے نکلواؤں گی۔ شہر میں انڈے اچھی قیمت پر بک جاتے ہیں۔"

بھولی اسے اپنے منصوبے بتا رہی تھی۔

"اماں! آج تو ہم چھت کی مرمت ہی کرتے رہے...... کوئی کام ہی نہ ہو سکا نہ تو نے چٹائی بنی۔ نہ میں نے دوپٹے کاڑھے۔ سمجھو، آج کی دھاڑی ماری گئی۔"

"رزق دینے والا اللہ ہے۔ ہمارے پاس اتنا تو ہے کہ اگر چار دن کام نہ بھی کریں تو بھی اس اوپر والے کی مہربانی سے آرام سے کھا سکتے ہیں۔"

"ہاں اماں! یہ تو ہے۔ اماں لوگ کیسے ظالم ہوتے ہیں۔ خاص کر یہ شہر کے لوگ،

اسے دوپہر والے وہ دو شکاری بھولے نہیں تھے۔ جب بھی یاد آتے سخت غصہ ہی آتا ان پر۔

"نہ سارے شہری برے ہوتے ہیں اور نہ ہی گاؤں کے سب لوگ اچھے ہوتے ہیں۔ اچھے برے یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی، میں نے سنا ہے چنکارے کو زندہ بیچا جاتا ہے اور اسے مار کر کھال میں بھس بھر کر گھروں میں سجایا بھی جاتا ہے۔"

اف اسے جھرجھری سی آ گئی۔ چنکارے کے اس انجام پر، اگر زندہ رکھ کر اس کی خوبصورتی کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے تو پھر کیوں مار دیتے ہیں...... کیوں اس کی کھال میں بھس بھرتے ہیں...... اسے زندہ ہی رہنے دیں نا......

"بس پتر! یہ پیسے والوں کی باتیں ہیں...... پیسے کے کھیل ہیں سارے۔"

"یہ پیسہ کسی اچھے کام میں بھی تو لگایا جا سکتا ہے نا اماں، پتہ ہے اماں اگر میرے پاس ڈھیر سارا پیسہ ہو تو میں......"

"بس دھی رانی! بس۔ کبھی پیسے کی حسرت دل میں نہ پالنا جتنا ہے جو ہے یہ بہت ہے...... تن بھی ڈھانپ لیتے ہیں، پیٹ بھی بھر جاتا ہے۔ سر پر چھت بھی موجود ہے اور رب کی مہربانی سے یہ سب کمائی ہمارے اپنے ہاتھ کی ہے۔ اب اور کیا چاہیے۔ اس سے زیادہ تو ہمارے کسی کام کا نہیں اور جو ضرورت سے زیادہ پیسہ مل جائے تو پھر دماغ ایسے ہی خراب ہوتا ہے۔ خوبصورت جانور قید کیے جاتے ہیں مارے جاتے ہیں۔ انسان خدا بننے کی کوشش کرتا ہے روپیہ تو آزمائش ہے۔ تو آزمائش کی آرزو کیوں کرنے لگی ہے؟"

"اماں! میں نے تو ایک بات ہی کہی تھی۔" اماں کی باتوں نے اسے شرمندہ کر دیا۔

"کبھی کہہ بھی مت کہ جو ہم کہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ دل کی آرزو بھی بن جاتی ہے۔ یونہی کہہ دی جانے

والی باتیں حسرتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ کوئی حسرت نہ پالنا...... رب جتنا دے دے اس کا شکر ادا کرتی رہنا۔

☆......☆......☆

شام کو پھر وہی معمول تھا۔ سب لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ چاچا دین محمد کل بھٹک جانے والے مسافر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ واقعی ان کے گاؤں کا نہیں تھا۔ آندھی میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ رات وہ چاچا دین محمد کے گھر میں رہا اور صبح صبح چلا گیا۔ اپنے گاؤں کی طرف، وہ کہتا تھا...... غلطی سے ٹیلوں کی طرف نکل گیا تھا۔ قسمت اچھی تھی جو بچ گیا ورنہ کسی نہ کسی بدروح کے چنگل میں پھنس سکتا تھا۔

''خدا سب کو ہر آفت سے محفوظ رکھے۔'' سب نے دعا مانگی۔

امیراں اور کیسری باتیں کرتے کرتے باقی لڑکیوں سے الگ ہو گئیں اور کچھ دور نکل آئیں...... ادھر صرف ریت کا چمکدار فرش تھا۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ریت ٹھنڈی ہونا شروع ہو گئی تھی...... ابھی تاریکی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ وہ دونوں ایک ٹیلے پر جا بیٹھیں۔

''آج سارا دن تم کیا کرتی رہیں کیسری؟''

''میں تو آج صبح ہی تمہاری طرف آنا چاہتی تھی۔ تم نے چھت کی مرمت کرنا تھی۔ میں چاہتی تھی تمہارا ہاتھ بٹاؤں...... پر اماں کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ مجھے گھر پر ہی رکنا پڑا۔''

''کیا ہوا ماسی کو؟''

''متلی ہو رہی تھی، جی بڑا خراب تھا۔ میں جنت کے گھر گئی اور اس کے ابا سے انگوری سر کے والے لے کر آئی۔ وہ اماں کو کھلائے۔ اب تو چنگی بھلی سب عورتوں میں بیٹھی ہے۔''

''اڑی کیسری! آج پتہ ہے۔ کیا ہوا؟'' امیراں کو اچانک ہی جیسے بڑی اہم بات یاد آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس کا انداز کیسری کی دلچسپی بڑھا گیا۔ وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔

''آج صبح میں کام کر رہی تھی۔ جیپ میں دو شکاری ادھر آئے اور مجھ سے پانی مانگا۔''

امیراں تفصیل سے ان کی حرکتیں اور باتیں سہیلی کو بتانے لگی، وہ سب جوان کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے محسوس کیا اور کراہیت آمیز لگا۔ وہ اماں کو نہیں کہہ سکی، مگر کیسری سے تو ہر بات کہتی آئی تھی۔ اس سے کیسے چھپاتی۔

''تجھے چاہئے تھا...... تیرے جس ہاتھ کو چھا تھا۔ وہی اس کے چہرے پر جما دیتی۔'' کیسری دانت پیس کر بولی۔

''میں ڈر گئی تھی۔ بڑی خاموشی تھی اس وقت...... مرد لوگ کاموں پر جا چکے تھے...... اور عورتیں اپنے اپنے گھروں میں بند اور ان کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا۔ جو میں ڈر گئی۔ اڑی اگر میری جگہ تو ہوتی تو تو بھی ڈر جاتی۔''

''اماں کی طبیعت بھی آج ہی خراب ہونا تھی، اگر ہم دو ہوتیں تو انہیں ایسی جرات بھی نہ ہوتی۔''

''یہ بڑے بے رحم لوگ ہیں۔ خوبصورت جانوروں کو مار دیتے ہیں اور ان کے دل کالے سیاہ ہوتے ہیں۔''

''کالے کرتوت والوں کے دل کالے ہی ہو سکتے ہیں۔ اب اگر وہ پانی مانگنے آئیں تو مت دینا۔''

''میرا خیال ہے۔ اب نہیں آئیں گے۔'' امیراں نے یقین کے ساتھ کہا۔

''کوئی پتا نہیں۔ نظر باز ہوتے ہیں یہ بدمعاش۔''

''میں نظر پہچان گئی تھی۔ اسی لیے جب دوبارہ گئی تو اوڑھنی [illegible] چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔''

لڑکیاں کچھ کھیلنے لگی تھیں۔ ہنسی کی آوازیں ادھر بھی آ رہی تھیں مگر دونوں واپس نہیں گئیں۔ ان کا دل تو باتوں میں لگا تھا امیراں کیسری سے اس کے منگیتر کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''اڑی مت پوچھ اس کی۔ وہ بھی پورا شیطان ہی ہے۔'' کیسری بڑی تنگ تھی ہاشو کی باتوں اور شرارتوں سے۔

''اڑی دیوار جتنا اونچا جوان ہے، اور تو قدر ہی نہیں کرتی۔'' امیراں نے چھیڑا۔

''قدر کروں تو کیا کروں۔ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ مجھے غصہ دلا جاتا ہے۔ اب کل ہی کی سنو...... میں شیشے لگا کر پراندہ بنا رہی تھی۔ ہاشو آیا تو اماں نے مجھے لسی بنانے بھیج دیا۔ لسی لے کر آئی۔ اس نے پی اور اٹھ کر چلا گیا۔ اب میں شیشے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہی ہوں۔ اماں سے جھڑکیاں الگ پڑیں کہ چیزیں سنبھال کر نہیں رکھتی اور شام کو ہاشو کا چھوٹا بھائی پیغام لایا۔ بھرا کہتا ہے اگر شیشے لینے ہیں تو شام کو ٹوبے کے پاس آ جانا، ہائے کیا بتاؤں...... مجھے کتنا غصہ آیا...... میں تو نہیں گئی ٹوبے پر نہ کل شام نہ آج صبح چھوٹی ہی پانی لائی۔ کہتی تھی صبح کے وقت ہاشو وہاں موجود تھا...... میں نے پوچھا بھرا تم یہاں کیا کر رہے ہو تو بولا۔ مجھے ایک پری کا انتظار ہے۔'' امیراں بے اختیار ہنستی چلی گئی پھر بولی۔

''کتنی ظالم ہے تو، ذرا بھی خیال نہیں کیا اس کا اور دیکھ تو وہ تجھ سے ملنے کے کیا کیا بہانے نکالتا ہے۔''

''چل حمایت نہ کر اس کی، کیسا خوار کیا اس نے مجھے، اماں سے جھڑکیاں اور گالیاں کھائیں، مجھے خود ایسی فکر ہوئی۔ اتنے مہنگے شیشے آخر گئے کہاں اور یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہے۔ وہ ایسی حرکتیں کرتا ہی رہتا ہے۔''

''کس کی بات کر رہی ہو؟'' اچانک پیچھے سے آ کر کسی نے کیسری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے کہا۔ مارے خوف کے وہ اچھل پڑی اور امیراں نے چیخ مار دی۔

''شش ش۔ یہ میں ہوں۔ مت چیخو امیراں بہن! ابھی تو تم میری حمایت کر رہی تھیں۔ اب چیخ کر سارا گاؤں اکٹھا کرو گی کیا؟''

''اوتو یہ تم ہو بھرا۔'' ہاشو کو دیکھ کر امیراں کی جان میں جان آئی۔

''یہ ایسے ہی مذاق کرتا ہے، کسی دن جان نکال لے گا میری۔'' کیسری شرمندہ تھی اپنے خوفزدہ ہو جانے پر۔

''ایسے نہ بول، تو مر گئی تو میری شادی کا کیا ہوگا؟'' ہاشو دونوں کے سامنے آ بیٹھا۔

''تو تو فوراً دوسری ڈھونڈ لے گا۔'' کیسری نے منہ بنا کر کہا۔

''ایسا ہوں میں۔ اڑی تو مر کے تو دیکھ تیری قبر پر مجاور بن کر بیٹھ جاؤں گا۔''

"میں کیوں مروں؟" کیسری جپ گئی اس بات پر۔

"تو اور کیا ابھی تو تو نے مجھ سے شادی کرنا ہے۔" ہاشو کی بات پر امیراں ہنس پڑی۔

کیسری نے اسے ایک ہاتھ رسید کیا اور بولی۔ "جب قادر بخش کی تجھ سے لڑائی ہوتی ہے تو میں ہمیشہ تیرا ساتھ دیتی ہوں، پھر تو کیوں اس کی باتوں پر ہنس کر اسے چڑھا رہی ہے۔"

"یہ بہن جو ہوئی میری۔" جواب ہاشو نے دیا۔

"یہ پہلے میری سہیلی ہے پھر کسی کی کچھ لگتی ہے۔" کیسری نے امیراں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں چلتی ہوں...... تم دونوں باتیں کرو۔' امیراں کو اپنی موجودگی اب کچھ بے معنی سی لگ رہی تھی۔

"تو کہیں نہیں جائے گی۔" کیسری ہاتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

"ہاتھ تو چھوڑ بے چاری کا...... چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔" ہاشو تنہائی چاہتا تھا۔

"ٹوٹ گئیں تو تم نئی لا دینا۔ آخر بھائی ہوتے ہو اس کے۔"

"ہاں مگر ایسی پیاری پتہ نہیں ملیں نہ ملیں۔"

"کیسری چھوڑ ناں۔ بس میں ابھی آتی ہوں، ذرا دیکھوں تو لڑکیاں کیا کھیل کھیل رہی ہیں۔" وہ ہاشو کا اشارہ سمجھ رہی تھی...... جانا چاہتی تھی۔

"پہلے اس سے بول، وعدہ کر لے...... میرے ساتھ کوئی الٹی سیدھی نہیں بولے گا۔"

"لے پہلے کبھی کچھ بولا ہے الٹا سیدھا جواب بولوں گا۔"

"نہیں ہاشو بھرا! واقعی وعدہ تو کرنا پڑے گا۔" امیراں کو بھی شرارت سوجھی۔

"چلو وعدہ کرتا ہوں۔ چل اب تو ہاتھ چھوڑ دے اس کا۔" وہ ہنس پڑا۔ اور کیسری نے دھیرے سے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"میں کتنی دیر میں آؤں۔" امیراں نے شرارت سے دونوں کی جانب دیکھا۔

"کیا کرو گی آ کر...... صبح اس سے مل لینا......" ہاشو نے کہا جب کہ کیسری بولی۔ "زیادہ دیر نہ کرنا۔ جلدی آ جانا۔"

"امیراں وہاں سے آ کر چھلا (گیت کی ایک قسم) گاتی لڑکیوں میں آ بیٹھی اور ان کے ساتھ آواز ملا کر گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا وہ گاتی رہیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ اور کبھی گاتے گاتے کوئی یوں ہی ہنس پڑتی اور اس کے پیچھے سب ہنسنے لگتیں۔ گیت کے بول ادھورے ہی رہ جاتے...... ہر طرف مدھر ہنسی۔ مدھ برسانے لگتی۔ کتنی دیر یونہی گزر گئی۔

"کیسری کہاں ہے؟" گاتے گاتے اچانک گلو کو اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ سب سے پوچھنے لگی۔

"وہ امیراں کے ساتھ ہی گئی تھی...... امیراں تو آ گئی...... کیسری پتہ نہیں کہاں رہ گئی۔" وہ سب سوالیہ انداز میں امیراں کی طرف دیکھنے لگیں۔

"وہ ماسی کے پاس گئی ہے۔ ادھر ہی بیٹھ گئی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر ادھر آ گئی۔" اس کو بات بنانا پڑی۔

ان سب سے تو ایسا بول دیا مگر اب اپنا دھیان گیت میں نہیں لگ رہا تھا بار بار ادھر نگاہ اٹھ جاتی۔ جہاں سے کیسری کو آنا تھا پھر اس نے کیسری کو آتے دیکھا، مگر وہ ادھر نہیں آئی۔ بچوں کی طرف چلی گئی۔

"بھلا کیا کہا ہوگا ہاشو نے کیسری سے؟" اسے کچھ بے چینی سی لگی تھی۔

رات تو اس سے نہیں مل سکی، صبح کام کاج نبٹاتے ہی بولی۔

"اماں! میں کیسری کی طرف جا رہی ہوں۔"

"کیسری کی طرف کیوں؟ اتنا کام پڑا ہے۔ شام کو مل لینا کیسری سے۔"

"نہیں اماں مجھے اس سے کام ہے، وہ پراندہ بنا رہی ہے۔ مجھے دیکھنا ہے۔"

"ہے، پراندہ نہیں دیکھا کبھی۔" اس کی بات اماں بھولی کو عجیب سی لگی۔

"اماں! وہ بڑا اچھا بنا رہی ہے۔ شیشے لگے ہیں، دھاگے کے رنگ بھی، کہتی تھی دیکھنے کے لائق ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی بس دیکھ کر آ جاؤں گی۔"

اماں بھولی پھر کچھ نہیں بولی کھجور کے تنے سوکھنے کو دھوپ میں رکھتی رہی امیراں تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل آئی۔

ان کے جھونپڑے کے بالکل سامنے مگر فاصلے پر کیسری کا گھر تھا، وہ یہاں آئی تو کیسری بھٹی پر مکئی کے دانے بھون رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی اور اشارے سے یہیں بلا لیا۔

"دانے لو، اندر سے گڑ بھی لے آؤ۔"

"ایسے ہی ٹھیک ہیں۔" اس نے مٹھی بھر کر اپنے دوپٹہ میں ڈال لئے۔

"آج کیسے، کوئی کام ہے جو اس وقت چلی آئیں؟"

"ہاں کام ہی ہے سمجھ لے، اڑی مجھے تو رات کو ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔"

"کیوں خیر تو ہے۔" کیسری نے کام سے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"میں تو تجھ سے پوچھنے آئی ہوں، خیر ہی ہے ناں۔" کہتے کے ساتھ ساتھ ہی کھل کر ہنسی اور ایک دم سے وہ ساری بات سمجھ گئی۔

"دیکھ امیراں! ایسا مذاق نہ کر، میں غصے میں آئی تو یہ لوہے کی سلاخ دے ماروں گی تجھے۔" مارے شرم کے کیسری سرخ ہو رہی تھی۔

"اچھا چل بول ناں کیا کہا ہاشو نے؟ اپنا وعدہ نبھایا یا بھول گیا۔"

"دل سے وعدہ کیا ہی کب تھا اس نے جو نبھاتا تیرے جاتے ہی بھول بھال گیا۔" وہ کہتے ہوئے ہنسی روکنا تو چاہتی تھی پر رکتی نہیں تھی۔

"بہت پیار کرتا ہے تجھ سے؟" کہتے ہوئے امیراں کو قادر بخش یاد آ گیا۔

اس کی چاہت بھی تو ایسی تھی، وہ بھی دیوانہ ہی تھا۔ امیراں کا، ہائے اتنی دور پتہ نہیں کب آئے، کیسی مجبوریاں ہیں ہمارے درمیان۔

"کہاں کھوگئی دیکھ تو میں کیا دکھا رہی ہوں۔" کیسری نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

"کھوئی نہیں۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی ہاشو بھرا ایسا وعدہ خلاف لگتا تو نہیں۔"

"یہ بندے دیئے اس نے مجھے، میرے لیے شہر سے لایا تھا کہتا تھا کتنے دنوں سے دینے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ موقعہ ہی نہیں ملا۔ میں نے کہا اس روز جب شیشے اٹھا کر لے آئے تھے مجھے بتا جاتے تو میں فوراً ٹوبے پر پہنچ جاتی، بڑا ناراض ہوا بولا، میں بلاؤں تو پروا نہیں اور جو شے لینی ہو تو فوراً آ جاؤ گی۔"

"اچھا پر تم نے کیا کہا؟" وہ پوری دلچسپی سے یہ بندے دیکھ بھی رہی تھی اور بات بھی سن رہی تھی۔

"میں نے کہا کیوں نہ آتی۔ آخر تحفہ بھی تو تمہارا ہے اور کوئی جھوٹ تھوڑی بولا تھا میں نے، اس کی دی ہوئی ہر چیز مجھے بہت سوہنی لگتی ہے اڑیئے۔"

"ہاں کیسری! جسے دل اپنا مان لے نا، اس کی ہر شے پیاری ہو جاتی ہے اور سچ ہے، تجھ پہ بندے بڑے سج رہے ہیں۔"

"ہاں سن امیراں کوئی جو پوچھتا ہے بندے کہاں سے آئے تو میں تیرا نام لے دیتی ہوں، اماں سے بھی یہی کہا ہے امیراں نے دیئے ہیں تو بھی خیال رکھنا اس بات کا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولی، "فکر نہ کر، تیری دی ہوئی بھی میرے پاس بہت سی چیزیں ہیں۔"
اشارہ قادر بخش کی طرف تھا کیسری سمجھ گئی اور دونوں ہنستی چلی گئیں۔

"آج کیا پکا ہے؟" دانے بھوننے سے فارغ ہو کر وہ پوچھنے لگی۔

"سوکھا گوشت، اماں ہانڈی چڑھانے لگی تھی۔ میں پراندہ دیکھنے کا بہانہ بنا کر آدھر نکل آئی، اصل میں تجھ سے مل کر پوچھنا چاہتی تھی کیا باتیں ہوئیں ہاشو کے ساتھ۔"

"اڑی، ہاشو کہتا ہے، وہ بھی شہر چلا جائے گا۔ ادھر گاؤں میں کوئی کام نہیں ہے اور پیسہ کمائے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔" کیسری کی آواز میں اداسی اتر آئی۔

"کام تو ادھر واقعی کوئی نہیں ملتا، تبھی قادر بخش کو جانا پڑا تب میں اور اماں کتنا روکتے رہے، پر مرد لوگ بھی کیا کریں، ہماری طرح گھر میں تو بیٹھ نہیں سکتے۔ انہیں گھر بار چلانا ہوتا ہے، اپنے علاقے سے جا کر دوسرے شہر مزدوری کرنا پڑتی ہے۔"

"دعا کرو۔ اس سال بارش ہو جائے چچا دین محمد تو کہتا ہے، میرا تجربہ بتا رہا ہے اس سال بارش ضرور ہوگی۔"

"ہاں چچا دین محمد کی بات ہمیشہ ٹھیک ہوتی ہے، وہ بڑا تجربہ کار بندہ ہے اور پھر دنیا بھی بہت دیکھی ہے اس نے۔"

"امیراں میری اماں بتاتی ہے پہلے چاچا دین محمد بھی پہلے شکاریوں کی ٹولیوں میں شامل ہو جایا کرتا تھا، وہ تو صحرا کا بھیدی تھا۔ یہاں بسنے والے جانوروں کو بھی خوب جانتا تھا، اسے پتا تھا کس جانور کی کیا عادت ہے۔ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرتا ہے اور وہ ان طریقوں کے توڑ بھی جانتا تھا جو بھی شکاری آتے ان کے ساتھ شامل ہو جاتا اور بدلے میں روپے لیتا مگر پھر اسے احساس ہو گیا، یہ جانور پرندے تو ہمارے وطن کا حسن ہیں اور یہ شکاری بنا ضرورت ہی شکار کیے جاتے ہیں۔ اپنے دل کی ذرا سی خوشی کی خاطر دھرتی کا حسن اجاڑنے چلے آتے ہیں بس پھر چاچا دین محمد نے یہ کام چھوڑ دیا۔"

"اب تو چاچا بڑی محبت کرتا ہے علاقے کی ہر شے سے، جو لوگ یہاں سیر کے لیے آتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ ہو لیتا ہے اور علاقے کی ایک ایک چیز دکھاتا ہے۔ اڑی وہ لوگ تو ہمارے گھروں کو دیکھ دیکھ کر بھی حیران ہوتے ہیں۔"

"ہاں کیسری! قادر بخش بتاتا ہے مسلمان تو وہ لوگ بھی ہیں پر ان کا رہن سہن اور طرح کا ہے اب اماں سامان لے کر شہر جانے لگی ہے، وہ بھی شہر کی باتیں کرتی ہے پر اس کی اور قادر بخش کی باتوں میں بڑا فرق ہے اماں کہتی ہے کہ شہر میں کسی کو کسی کی پروا نہیں ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو سلام بھی نہیں کرتے، ذرا سی گرمی پڑے تو مزاج گرم ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ کھاتے بہت ہیں اور بڑا مہنگا مہنگا کپڑا پہنتے ہیں، ان کے گھر ان کی ضرورت سے کہیں بڑے ہیں اگر وہ چھوٹے گھر بنائیں تو بہتوں کا بھلا ہو، اور قادر بخش تو بڑا متاثر ہے شہر سے وہ بڑی تعریف کرتا ہے۔ شہر والوں کی اور ان جیسا بننا چاہتا ہے مگر یہ بھی کہتا ہے ہم ان جیسے بن نہیں سکتے۔ ہمارے پاس تعلیم بھی نہیں ہے اور پیسہ بھی نہیں ہے۔"

"اڑی تیرا قادر بخش تو شہر جا کر پورا شہری ہو گیا ہے۔" کیسری ہنسی پھر چھیڑنے کو بولی، "اور شہری تو بڑے بے وفا ہوتے ہیں، سوچ لے جو قادر بخش کا دل پھر گیا تو کیا ہوگا؟"

"جو میری قسمت، قسمت کے لکھے کو کون روک سکا ہے بھلا۔" امیراں کا انداز اس وقت بالکل اماں بھولی جیسا ہو گیا۔

"ہائے رب نہ کرے جو بھرا قادر کا دل تجھ سے بھرے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی ورنہ یہ تو میں بھی جانتی ہوں، قادر بخش ایسا نہیں ہے، وہ تجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔" کیسری ایسے مذاق پر شرمندہ ہو گئی۔

امیراں مسکرا دی اور بولی "یہ تیرا ہاشو تو دوسرے گاؤں سے ہر چوتھے روز یہاں ہوتا ہے پر اس کی اماں کبھی نظر نہیں آتی، کیا اسے اپنی بہو کی یاد نہیں آتی۔

کیسری نے نفی میں سر ہلایا پھر منہ بنا کر بولی۔ "اسے بہو کی نہیں جہیز کی یاد آتی ہے، وہ جب کبھی آتی ہے ہماری طرف تو میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے، ایسی گہری نظر سے دیکھتی ہے، اس کی آنکھوں میں میرے لیے اچھے رنگ نہیں ہوتے، اور اماں کو تو جیسے کچھ سمجھتی نہیں۔ بھلا بتاؤ، امیراں جو میری ماں کی عزت نہیں کرتی، میں اس کی عزت کیسے کروں گی۔" "ہاشو تو بہت اچھا ہے نا۔"

"ہاں بس یہی آسرا ہے مجھے کہ وہ اچھا ہے، پر ماں کے سامنے مجبور ہے، ماں سیاہ کو سفید بھی کہہ دے تو بول نہیں سکتا۔"

"کیا کچھ جوڑ لیا ماسی نے تیرے لیے۔"

"زیور تو اماں کا اپنا ہے، کچھ مجھے دے گی کچھ باقی بھرا بہنوں کے لیے رکھ چھوڑے گی، جوڑے تین

بنے ہیں برتن ابھی پورے نہیں ہوئے، کافی کام باقی ہے امیراں! اور ہاشو کی ماں جب بھی آتی ہے نئی فرمائش کر جاتی ہے میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جاتی ہوں، کہاں سے کریں ہم یہ سب کچھ، اتنا پیسہ تو نہیں ہے میری اماں کے پاس مجھے پتا ہے بابا بیمار رہتا ہے۔ اتنا خرچ تو اس کے دوا دارو پر ہی اٹھ جاتا ہے تو باقی کی کہاں سے پوری پڑے۔''

''پتا نہیں لالچ کہاں سے آ گیا ہے ہم لوگوں میں، میری اماں کہتی ہے، پیٹ بھر کے روٹی مل جائے تن ڈھانپنے کو کپڑا ہو تو بہت ہے، اس سے زیادہ کی چاہ کیا کرنی اور یہ سب کچھ تیری ساس کے پاس ہے، اس کے تو دو بیٹے کماتے ہیں اور پھر بھی نظر بہو کے جہیز پر ہے۔ ہاشو سے بول، سمجھائے اپنی ماں کو، لالچ تو اللہ سائیں کو بھی پسند نہیں، دوسروں کو مصیبت میں ڈالنے والا خود بھی سکھی نہیں رہ سکتا اور گناہ ملتا ہے اسے۔''

''ہاشو یہ سب سمجھتا ہے، اسے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں، پر ڈرتا ہے، اپنی ماں سے۔ اسے کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' ''توبہ! ایسا اونچا لمبا جوان اور سچی بات نہیں کر سکتا۔''

''بس اس کے گھر میں ماں کا ہی حکم چلتا ہے ابا تو بس مسکین سا ہے اور تجھے پتا ہے جس گھر میں مردوں کے ہوتے ہوئے عورت کی حکمرانی ہو، وہاں تو پھر حالات ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''اڑی یو باتیں ہی کرتی رہو گی کیا۔'' ماسی نے آ کر دونوں کو دیکھا اور سر جوڑے باتوں میں مصروف پا کر ہنس کر کہنے لگی۔

''اماں دانے تو بھون دیئے، اب ہم دونوں کنڈ پر جا رہے ہیں ٹھنڈا پانی لینے۔''

''اچھا پہلے اندر فرش پر پانی چھڑک دے۔ ہوا ٹھنڈی ہو جائے، دوپہر میں یوں گزر مشکل ہوتی ہے۔''

''اماں تو فکر نہ کر، میں آ کر سب کام کر لوں گی۔''

''اڑی آتے تو تمہیں پتا نہیں کون سا پہر ہو جائے دونوں سہیلیاں اکٹھی ہوئی ہو، باتوں میں تمہیں بھلا ہوش رہتی ہے۔''

''ماسی ٹھیک کہتی ہے، ہمیں پانی چھڑک کر ہی جانا چاہئے۔''

امیراں اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں نے مل کر جلد ہی یہ کام کر لیا اب کمرے میں ٹھنڈک ہو چلی تھی۔ ماسی مطمئن تھی اور یہ دونوں بھی کہ باتوں میں دیر بھی ہو جاتی تو واپسی پر جھڑکیوں کا ڈر نہیں تھا۔ کیسری نے ایک گھڑا اسے پکڑایا، دو خود اٹھا لیے اور دونوں آہستہ آہستہ چلتی زور شور سے باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے دیکھا۔ ڈہر پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ شاید کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ وہ لوگ اسے کھول کر جھکے ہوئے تھے لڑکیوں نے توجہ نہیں دی۔

''او سنو، لڑکیوں پانی ہوگا تمہارے پاس؟'' قریب سے گزریں تو انہوں نے پکارا، دونوں نے پکارنے والے کی طرف دیکھا اور بولیں۔

''پانی نہیں ہے، ہم پانی لینے ہی تو جا رہے ہیں۔'' ''اچھا یہ تو بتاؤ اس علاقے میں ٹھیر ہے۔''

''ہوں پرا آگے جا کر۔'' کیسری نے راستہ سمجھایا۔

''اور جانور کہاں ملیں گے؟ ہم نے سنا ہے اس صحرا میں بہت خوبصورت جانور اور پرندے پائے جاتے ہیں۔''

''کیا تم شکاری ہو۔'' امیراں نے ناک چڑھا کر کہا۔

خوبصورت لڑکی کے اس انداز پر وہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور ایک بولا۔

''نہیں پیاری لڑکی ہم تو یہ علاقے دیکھنے آئے ہیں۔ ہم نے صحرا کے حسن کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور واقعی غلط نہیں سنا۔'' اس نے مسکراتی نظروں اور شریر سے انداز میں کہا اس کے لہجے میں سادگی اور سچائی تھی۔ یہ تعریف بری نہیں لگی کیسری ہنس پڑی اور امیراں نے شرما کر سر جھکا لیا۔ پھر کیسری بولی۔

''تم نے غلط نہیں سنا۔ ہمارا وطن واقعی بہت خوبصورت ہے، اس جیسا حسن تمہیں کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ یہاں خوبصورت پرندے بھی ہیں اور جانور بھی یہاں کے لوگ بڑے محنتی ہیں۔ ہم ہاتھوں سے بہت اچھی چیزیں بنا لیتے ہیں، ایسی کہ تم دیکھو تو دنگ رہ جاؤ اور ہم بڑی بہادر قوم ہیں۔''

''اور شوباز بھی۔'' اس کی اتنی تعریفوں پر وہ ہنس پڑے۔

''کیا مطلب؟'' کیسری اور امیراں سمجھیں نہیں۔

''اپنے منہ سے اپنی تعریفیں کئے جاتی ہو۔''

''میں کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی۔'' کیسری پورے اعتماد سے بولی۔

''اچھا لڑکی! ساری ہی دنیا بہت خوبصورت ہے ہر زمین کا اپنا ایک رنگ اپنا انداز ہے، ہاں تم یہ کہہ سکتی ہو تمہارا انداز چونکا دینے والا اور حیران کر دینے والا ہے۔ تم لوگوں نے تپتی زمین کو آباد کر دیا ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے اس زمین کو سجانے میں لگے ہوئے ہو۔''

''یہاں کون کون سے جانور ہوتے ہیں۔'' وہ جو سر پر نیلی ٹوپی رکھے ہوئے تھا امیراں سے پوچھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ بتاتی اس لڑکے کے دونوں ساتھی ہنسنے لگے اور بولے۔

''اسے صرف جانوروں سے دلچسپی ہے۔''

''تو پھر کیا یہ پوچھوں کہ یہاں کتنی قسم کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں۔'' اس نے ناراضی جتائی۔

''نہیں، یہ سوال احمقانہ ہوگا، لڑکیوں کی قسمیں لڑکیاں نہیں بتا سکتیں۔'' تینوں زور شور سے ہنسنے لگے۔

دونوں کچھ نہ سمجھتے ہوئے چل پڑیں۔

''سنو سنو اچھی لڑکیوں۔'' پیچھے سے پھر پکارا گیا وہ رکیں اور انہیں دیکھنے لگیں۔

''خدا حافظ تو کہتی جاؤ اور دعا کرنا، ہم خیر خیریت سے اپنی ماؤں کے پاس واپس پہنچ جائیں کہ سنا ہے، یہ صحرا بے رحم بھی بہت ہے چڑھتی جوانیوں سے خاصی دشمنی ہے اور ہماری مائیں ہماری آوارہ گردیوں سے پہلے ہی بڑی تنگ ہیں، اگر ہم مر گئے تو بہت ڈانٹیں گی ہمیں۔''

دونوں مسکرائیں اور اپنے راستے پر ہولیں کہ وہ پہلے تو نہ تھے بہت سے ایسے ہی آتے رہتے تھے اپنے اپنے مزاج کے، وہ ان لوگوں کو پہچانتی تھیں ایک سے لباس میں وہ سب ایک جیسے ہی لگتے تھے، ہاں بہت

گورے لوگ بھی آیا کرتے تھے جن کے متعلق بزرگ بتاتے تھے۔ نہ جانور مارتے تھے نہ گند ڈالتے تھے۔ خالی ٹین ڈبے گتے کے پیکٹ بھی اپنے پاس ہی رکھتے اور واپس لے جاتے۔ وہ عزت اور احترام کی ساتھ مقامی باشندوں سے بات کرتے تھے اور وہ لوگ ان کی بنائی دستکاری اچھے داموں خرید بھی لیا کرتے تھے مگر مجبوری یہ تھی کہ ان کے آنے کا کچھ پتا نہیں ہوتا تھا اور یہاں کے لوگوں کی اکثریت کا مال ٹھیکے دار کا دیا ہوا ہوتا تھا، یہ تو صرف محنت کرتے اور اس کے پیسے وصول کرتے۔ کپڑا دھاگا ٹھیکے دار شہر سے لا کر دیتا اور وہی شہر جا کر یہ دستکاری کے نمونے بیچتا تھا۔ جتنی رقم وہ دے دیتا، چپ کر کے لے لیتے کہ کچھ تو عادت میں قناعت اور کچھ ان کی تعلیم کی کمی، وہ نہیں جانتے تھے شہر جا کر یہ چیزیں کیسے اور کتنے میں بیچی جا سکتی ہیں یہی وجہ تھی اماں بھولی جو کبھی کبھار اپنی چٹائیوں کی ساتھ کوئی ایک آدھ دستکاری کا نمونہ بھی بیچنے کو شہر لے جاتی تو دوکاندار بہت ہی کم قیمت پر وصول کرتے تھے۔

☆......☆......☆

وہ گھر آئی تو اماں نے بتایا ابھی ابھی ڈاک بابو قادر بخش کا خط دے کر گیا ہے دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

''اماں! تو نے پڑھوایا تو ہوگا، کیا لکھا ہے اس نے، وہ کب آ رہا ہے۔''

''لکھتا ہے میں خیریت سے ہوں کچھ پیسہ جمع بھی کر لیا ہے، اب کے آؤں گا تو امیراں کے دو جوڑے خرید کر لاؤں گا اور مجھے لکھا ہے، اماں تو جہیز کے لیے پریشان نہ ہو، میں تو تیرا بیٹا ہوں، تجھے فکر مند نہیں ہونا چاہیے، میں تیری امیراں کا گھر بناؤں گا، اپنی محنت سے اس کے لیے خوشی خریدوں گا۔'' ڈاکیا خط سناتا رہا اماں بھولی دہراتی رہی پھر اس نے بار بار دہرایا کہ اسے قادر بخش کے خط کا ایک ایک حرف امیراں کو جو سنانا تھا۔

مگر پھر بھی امیراں کو تسلی نہیں ہوئی۔ پتا نہیں اماں کو کتنا یاد ہے اور کتنا بھول گئی۔

''اللہ جانے کل ڈاک بابو اس طرف آئے گا یا نہیں، کبھی کبھار تو ہمارے گاؤں میں کوئی خط آتا ہے اور وہ لے کر ادھر آتا ہے، ہائے میں بھی باتوں میں لگ گئی، گھر آنا بھی بھول گئی اگر گھر میں ہوتی تو ایک ایک لفظ ڈاک بابو کی زبان سے خود سنتی، اماں کو بھلا کہاں ساری باتیں یاد رہی ہوں گی۔ قادر بخش نے مجھے سلام بھی لکھا ہوگا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا اس نے مجھے سلام نہ کہا ہو اور اماں نے مجھے نہیں بتایا۔ جیسے سلام کہنا بھول گئی، ایسے ہی اور بھی بہت باتیں ہوں گی جو اماں کو یاد نہیں رہی ہوں گی۔

''قادر بخش، بہت اچھا ہے، اس نے تو بیٹے کی کمی پوری کر دی ہے، کتنی عزت دیتا ہے مجھے، کیسا خیال کرتا ہے میرا، اللہ اسے حیاتی دے، گرم ہوا نہ لگے کبھی، اسے گھر کی خوشیاں دکھائے خدا تم دونوں کے دلوں کو ہمیشہ آباد رکھے اور میرے سینے میں تم دونوں کی طرف سے ٹھنڈ ہی پڑتی رہے۔ تم ہمیشہ خوش رہو۔ شالا کوئی دکھ نہ ملے میرے بچوں کو۔'' اماں قادر بخش سے ہمیشہ خوش رہی تھی اسے بہت دعائیں دیتی تھی۔

''اماں قادر نے لکھا تو ہوگا۔ کس رنگ کے جوڑے خریدے گا میرے لیے۔'' قادر بخش کی باتیں دونوں کو خوش کر دیتی تھیں۔

''ابھی تو اسے خود بھی پتا نہیں ہوگا، بازار جائے گا تو کتنے ہی رنگ اس کے سامنے ہوں گے۔ جو اسے سب سے زیادہ اچھا لگے گا، خرید لے گا اور تو ایسی جھلی کیوں ہو رہی ہے لائے گا، تو یہیں تیرے ہی پاس۔''

''اماں؟ اس نے اور کیا لکھا ہے، وہ کب آئے گا؟''

''ایسا تو کچھ بھی نہیں لکھا جب چھٹی ملے گی تو آ جائے گا۔'' ''اچھا تو اس نے یہ نہیں لکھا کہ چھٹی کب ملے گی۔''

''یہ بھی نہیں لکھا کتنے پیسے جمع کر لیے ہیں اس نے۔''

اماں بھولی مسکرا دی۔ خوب سمجھ رہی تھی بیٹی کے جذبات، جوانی بھولی پر بھی آئی تھی۔ یہ جانتی تھی ان جذبوں اور اس آنچ کو، وہ سمجھ رہی تھی۔ امیراں دیر تلک قادر کی باتیں کرنا چاہتی ہے مگر جھجکتی رہی ہے اور سمجھ نہیں پا رہی، ماں سے کیا پوچھے۔ بھولی نے چادر کے کونے میں بندھا قادر بخش کا خط کھولا اور اسے تھماتے ہوئے بولی۔

''یہ لے، یہ خط ہے قادر کا، اسے سنبھال لے اپنے پاس جب ڈاک بابو ادھر آئے تو پڑھوا لینا خود سنے گی تو زیادہ تسلی ہوگی تجھے۔ ویسے میں نے تو حرف حرف اس کے ساتھ دہرایا تھا اور مجھے یقین ہے میں ایک لفظ بھی نہیں بھولی ہوں پر اپنی تسلی کے لیے تو خود پڑھوا لینا۔'' امیراں تو خود یہ خط لینا چاہتی تھی۔ پڑھ تو نہیں سکتی تھی مگر اس کاغذ کو قادر نے بھی چھوا ہے اور یہ خط بڑے پیار سے لکھا گیا ہے۔ پیار کی چیز بھی کبھی ضائع کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اسے تو سنبھال سنبھال کے رکھنا ہے۔ شام کو جب سب لڑکیاں اکٹھی ہوں گی تو امیراں نے اپنی چادر کے کونے میں لگائی گرہ مسکراتے لبوں اور جھکی پلکوں کے ساتھ کھولنی ہے اور بڑی آہستگی اور ناز سے سب سہیلیوں سے کہنا ہے، دیکھو قادر بخش کا خط آیا ہے۔ وہ لکھتا ہے، بہت جلد میرے لیے دو جوڑے خریدے گا۔ پھر سب قادر بخش کی باتیں کریں گی۔ اس کا نام لے لے کر امیراں کو چھیڑیں گی۔ بار بار پوچھیں گی، بتا ناں اور کیا لکھا ہے قادر نے یہ سب کتنا اچھا لگے گا، وہ ابھی سے سرشار ہے اور بار بار مسکرا اٹھتی ہے اس کا دل بھی لبوں کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں جو اس کے چہرے کا حسن ہیں آج کچھ اور بھی حسین ہو گئی ہیں، کسی کی محبت کا اظہار اور یہ خیال دور رہ کر بھی قادر بخش صرف اس کے لیے سوچتا ہے، اسے کتنا سرشار کر رہا ہے، وہ سر سے پاؤں تلک سج گئی ہے۔ حالانکہ اس نے کوئی سنگھار نہیں کیا۔ مگر چال یوں بدلی ہے جیسے پاؤں میں جھانجر پہن کر اٹھلا رہی ہو، اور بازو چوڑیوں سے بھرے ہیں، جھمکے کانوں میں جھومتے جھومتے اچانک گال چوم لیتے ہیں اور اس کے ناک میں پویا ہے، ایسا کچھ نہیں ہے مگر وہ مکمل سنگھار میں ہے۔ اور سج دھج سب کو نظر آ رہی ہے۔ اصل میں دل سجا ہے ناں اندر خوبصورتی ہے یقین ہے اور اس کی باتوں کی خوشبو ہے اور اسی خوشبو، اسی سجاوٹ نے باہر بھی سجا دیا۔ آج جو کوئی بڑی بوڑھی دیکھ لے تو سمجھ لے ضرور، قادر بخش کا خط آیا ہے یا وہ خود آیا ہے۔ بڑی بوڑھیاں بہت تجربہ کار ہوتی ہیں، وہ ایک نظر ڈالتی ہیں، سب سمجھ لیتی ہیں، جب ہی تو کنواریاں جب چوری چوری دلبروں سے مل کر آتی ہیں تو سکھیوں سہیلیوں میں بڑے آرام سے کوئی بہانہ بنا دیتی ہیں مگر ہر ممکن کوشش کرتی ہیں کسی بڑی عمر والی سے ٹکراؤ نہ ہو، یہ ڈھلے چہروں اور زرد رنگتوں والیاں جن کے ہاتھوں کی جلد پر ان سب مشقتوں کے نشان ابھر آئے ہیں جو ایک عمر انہوں نے کی ہیں، بہت

مسافتوں نے جن کے پیروں کی ساخت بدل کر رکھ دی ہے جن کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید اور اڑے اڑے سے ہیں اور جن کی آواز میں کبھی پرندوں کی چہکار ہوں گی، مگر اب یہ بولتی تو ٹھیٹر میں رہنے والے گدھ کا خیال آتا ہے یہ سب کی سب بڑی گہری ہیں ان کی نظر روح تک جاتی ہے، ان کا قیاس کبھی غلط نہیں ہوتا اور کنواریاں ان نگاہوں سے ڈرتی ہیں۔ وہ دلبروں سے ملتے ڈرتی ہیں۔ وہ ان راہوں پر جاتے بھی ڈرتی ہیں جہاں ان کی راہوں میں آنکھیں بچھائے ان کی چاہت کے گیت بنسری کی لے پر گانے والے سراپا انتظار بنے کھڑے ہوتے ہیں۔ بنسری سب چرواہے بجاتے ہیں مگر وہ لے جو کسی کی چاہت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے سب پہچان جاتے ہیں اور لڑکیاں ڈرتی ہیں ان کا نام عام نہ ہوجائے، وہ بدنام نہ ہوجائیں۔ جوانی منہ زور ہے تو قدم قدم پر ڈاکا لگانے والے بھی تو کھڑے ہیں۔ جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر لمبا بھی ہے اور بہت مختصر بھی اگر دل کی دھرتی پر دکھ کی فصل اگ آئے تو یہ لمبا، صدیوں لمبا اور جو دل میں الفت کے پھول کھلیں تو سفر مختصر بہت مختصر ہے۔ یہ جو بوڑھے ہیں کوئی ان سے پوچھے۔ تم نے جوانی کیسے بسر کی، بتاؤ تم نے دکھ کی فصل کاشت کی یا سکھوں کے پھول چنتے چنتے یہاں تک پہنچے ہو، کبھی پوچھ کر تو دیکھ، نہیں بتائیں گے۔ کبھی نہیں بتائیں گے۔ مگر ان کے انداز بتاتے ہیں کچھ تھا۔ کوئی ایسی بات تھی جو ساری زندگی پر محیط ہوگئی۔ جب ہی تو اکثر بوڑھے جب بڑھاپے میں نیند کی دیوی کو منا نہیں پاتے تو تاروں کو دیکھتے دیکھتے ان کی رہنمائی میں سفر کرتے پیچھے بہت پیچھے کہیں ماضی میں جانکلتے ہیں اور حال فراموش کر دیتے ہیں۔

تب ان کے لبوں سے کچھ ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو چونکا دیتی ہیں۔ وہ بار بار آہیں بھرتے ہیں۔ پتا نہیں کس کے لیے، یہ کوئی نہیں جان پاتا، وہ بتاتے جو ہیں بظاہر یہ ٹوٹے پھوٹے زمانے کی تلخیوں کو سہہ سہہ کر کمزور لاچار بندے اندر سے کیسے مضبوط ہوتے ہیں۔ کبھی راز نہیں کھولتے ان کے سینے میں یا ٹھیٹر ان ٹھیٹروں میں بھی تو ایسی بہت سی کہانیاں دفن ہیں۔ پتا نہیں وہاں کون آباد تھے اور وہ کہاں گئے۔ کبھی ان ویران بسیروں میں آوازیں ہوں گی۔ محبتیں ہوں گی۔ کوئی امیراں ہوگی کوئی قادر بخش ہوگا۔ کیسری ہوگی، ہاشو ہوگا اور ظالم سماج جیسی اس کی ماں ہوگی۔ جو یہ شرط عائد کرتی ہوگی جب تک اتنا ڈھیر سا جہیز نہیں ہوگا۔ میں کیسری کو ہاشو کی دلہن نہیں بناؤں گی اور جب ایسے لوگوں کی تعداد اور بڑھتی گئی ہوگی تو محبتیں مرنے لگی ہوں گی اور جب محبتیں مرجائیں تو دنیائیں بھی اجڑ جاتی ہیں۔

امیراں اوڑھنی کے کونے میں لگائی گرہ کو بار بار دیکھتی اور سوچتی جب میں شام کو سب لڑکیوں کو قادر بخش کے خط کے بارے میں بتاؤں گی تو کون کیا کہے گی، کون چھیڑے گی، کون مسکرائے گی اور کون جل جائے گی۔ میں سب سے پہلے تو یہ خط کیسری کو دکھاؤں گی۔ آج سورج ڈھلتا ہی نہیں، دن کتنا لمبا ہوگیا ہے۔ پہلے تو کبھی محسوس نہیں ہوا مگر آج تو لگتا ہے۔ کمرے میں حبس ہے، فرش پر بکھری گیلی ریت بھی آج کام نہیں کر رہی، پتا نہیں دن کب ڈھلے گا، اسے شدت سے شام کا انتظار جو تھا۔ وہ جلد از جلد کیسری کو یہ خط دکھانا چاہتی تھی۔ بس اسی لیے اسے دن لمبا بہت لمبا لگ رہا تھا۔ کاش تم لکھ دیتے۔ کب تک آؤ گے۔ میں اماں سے چھپ کر دیوار پر لکیریں لگاتی اور انہیں ہر روز گنا کرتی۔ میں ہر دم تمہاری منتظر رہتی اور جس روز تم کو آنا ہوتا،

خوب گھی ڈال کر گڑ والے چاول پکاتی۔ ان میں چنے کی دال اور بڑی الائچی ڈالتی پھر ان کی خوشبو دور دور تک جاتی۔ اور جب تم بستی میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے میرے پکائے گڑ والے چاولوں کی یہ خوشبو تمہارا استقبال کرتی۔

میں اماں سے کہوں گی، اب کے ڈاک بابو آئے تو تمہیں خط ضرور لکھوائے اور یہ لکھے کہ اپنے آنے سے پہلے ہمیں خط لکھ کر بتا دینا کہ تم کس دن پہنچ رہے ہو۔ کتنا اچھا ہے جو پہلے پتہ چل جائے میں کانوں میں چاندی کے جھمکے ڈال لوں گی اور بالوں میں وہ پراندہ ڈالوں گی جس میں گھنگھرو لگے ہیں پھر جدھر سے میں گزروں گی، قادر بخش کو پتا چل جائے گا اس کی نگاہ بے اختیار ادھر اٹھ جائے گی۔ وہ سوچ سوچ کر مزا لے رہی تھی اور اسے پتا نہیں تھا اس کے لب مسکرا رہے ہیں جو کوئی دیکھ لے تو چوری پکڑ لے منٹوں میں جان لے کیا سوچ رہی تھی۔ یہاں تنہا بیٹھی اس لڑکی کے ساتھ خیالوں کی دنیا میں اس وقت کون تھا۔

اماں صحن میں تھی وہ بکریوں کو چارا ڈال رہی تھی۔ امیراں کو آواز پڑی تو ہڑبڑا کر ”آئی اماں“ کہتی سیدھی ہو بیٹھی۔

”زیادہ انتظار نہ کروانا، قادر بخش سنا ہے انتظار اگر لمبا ہوجائے تو پھر ہمیشہ کے لیے جدائی مقدر ہوجاتی ہے۔ میرے مقدر میں ہمیشہ کی جدائی نہ ڈال دینا آجانا جلدی آجانا۔“

☆......☆......☆

”وسایا او وسایا۔“ ملک ناصر اپنی وہیل چیئر کے ساتھ برآمدے میں آگیا تھا اور سامنے والی کے ساتھ کام کرتے چودہ پندرہ سال کے ملازم لڑکے اللہ وسایا کو پکار رہا تھا۔

”جی سرکار۔“ وہ سارے کام چھوڑ کر مالک کی آواز پر چلا آیا۔

”امیراں کہاں ہے؟ تم نے اسے پانی تو پلا دیا تھا دوپہر کو، کہیں وہ پیاسی تو نہیں۔“

”سائیں! میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے پانی پلایا اور اس کے کمرے کا پنکھا بھی چلا دیا تھا۔ اب تک تو آرام سے سو رہی ہوگی سچ جتنے ناز آپ امیراں کے اٹھاتے ہو ناں سائیں تو میرا جی کرتا ہے میں بھی ہرنی ہوتا چنکارہ ہرنی پھر آپ کے گھر آتا اور آپ میرا نام امیراں رکھ دیتے۔“ اللہ وسایا بولنے کا شوقین نکلا، جو موقع ملے تو بولتا ہی چلا جاتا تھا۔

”ہونہہ! کہاں تم چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے بدصورت لڑکے کہاں امیراں، بھلا تم وہ کیسے ہوسکتے تھے۔“

”نہیں جی جب میں ہرن ہوتا تو میری آنکھیں بھی تو بڑی بڑی ہی ہوتیں۔“

”اچھا بکواس بند کرو اور دیکھو اگر امیراں جگ رہی ہے تو اسے میرے پاس لے آؤ۔“

اور ذرا دیر کے بعد وسایا چمکدار مٹیالے رنگ کی خوبصورت آنکھوں والی امیراں کو لے آیا۔

”کتنی بڑی ہوگئی ہے جب میرے پاس آئی تھی تو چھوٹی سی تھی۔“ ناصر نے اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا اللہ وسایا واپس جا چکا تھا۔ ناصر، ہرنی کی پشت پر ہاتھ پھیرتا رہا اور کچھ سوچتا رہا خوبرو چہرے والا ناصر، ملک رب نواز کا تیسرا بیٹا تھا۔ دو بہنیں اور تین بھائی تھے۔ آج سے سات برس پہلے جب وہ

کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ رش ڈرائیونگ کے شوق میں اپنی ٹانگیں گنوا بیٹھا تھا۔ معذوری کیا مقدر بنی، ہر رشتہ پرایا ہوگیا۔ تنہائی اس کی ذات سے چمٹ کر رہ گئی بہن بھائیوں کی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہ کہاں تک اور کتنا وقت دیتے اسے، ماں تھی نہیں اور باپ اپنے کاروبار کی الجھنوں میں۔ وہ صرف روپے سے دلداری کرسکتا تھا اور کر رہا تھا ناصر کے لیے دنیا میں اب کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ اس پر خود ترسی کی کیفیت طاری رہتی۔ وہ اپنے ملازموں کو بھی حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا یہ چل پھر سکتے ہیں ہر جگہ اپنی مرضی سے آجا سکتے ہیں۔ میری طرح معذور نہیں ہیں لوگ انہیں ترحم بھری نگاہوں سے نہیں دیکھتے اور لڑکیاں جو کبھی اس سے دوستی کی خواہاں ہوتی تھیں جو اس کی خوبروئی سے متاثر تھیں اب ایک کے بعد دوسری نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ وہ دنیا سے دور اپنے کمرے میں قید ہوتا چلا گیا، دل جوان تھا، امنگیں سر اٹھاتی تھیں مگر ساتھی کہاں ملتا، اس نے خیالوں میں ایک چہرہ تراش لیا۔ خوبصورت لڑکی کا چہرہ جس کی غزالی آنکھیں تھیں اور جو اسے دیکھ کر شرماتی بھی تھی اور اس سے باتیں بھی کرتی تھی، وہ لڑکی سارا دن ساری رات اس کے ساتھ ساتھ رہتی۔ ناصر نے اسے کوئی نام نہیں دیا۔ اسے پکارنے کی کبھی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ وہ تو جب چاہتا غزالی آنکھوں والی اس کے پاس آجاتی۔

''تم سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہنے لگے ہو، میں تمہاری طرف سے فکر مند ہوں بیٹا۔'' رب نواز ایک روز اس کے کمرے میں آئے اور اسے سمجھانے لگے، وہ ذہین لڑکا ہے چاہے تو بزنس میں ان کی مدد کرسکتا ہے یوں دنیا سے کٹ کر رہنا اس کی اپنی ذات کے لیے بھی سخت نقصان دہ ہے۔

''اب مجھے کسی نفع نقصان کی پروا نہیں ہے۔''

اس نے الجھن کے نمایاں رنگ کے ساتھ انہیں جواب دیا۔

''مجھے تمہاری فکر ہے اور میں نے ایک لڑکا ملازم رکھا ہے جو صرف تمہارے لیے ہے۔ وہ تمہارا ہر کام کرے گا، چوبیس گھنٹے صرف تمہارے لیے ہوگا۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے کسی کو قادر بخش کہہ کر بلایا اور ایک دیہاتی سا لڑکا کمرے کا دروازہ کھول کر بڑے مودب انداز میں اندر آکر دروازے کے قریب کھڑا ہوگیا۔

''قادر بخش! یہ میرا بیٹا ناصر ہے۔ تمہیں میں نے صرف اسی کے لیے رکھا ہے۔ تم گھر کا اور کوئی کام نہیں کرو گے اگر کوئی کہے بھی تو انکار کر دینا۔''

''جی سائیں۔'' اس نے ادب سے کہا۔ ملک رب نواز باہر چلے گئے۔ قادر اب تک یہیں کھڑا تھا۔

''مجھے کسی کی ضرورت نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔''

''میں کمرے کے باہر بیٹھا ہوں سائیں! جب کسی شے کی ضرورت پڑے بلوا لیجیے گا۔''

اور قادر بخش سارا دن کمرے کے باہر بیٹھا رہا، ناصر نے اسے نہیں بلوایا۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا ناصر کی آنکھ کھل گئی اور اس کی آنکھ جس آواز پر کھلی تھی وہ بہت مدھر، دل کے تاروں کو چھیڑتی اور اندر باہر سکون بکھیرتی ہوئی تھی۔ کوئی بنسری بجا رہا تھا۔

''کون، یہ کون ہے؟ آج سے پہلے میں نے یہ آواز کبھی نہیں سنی، وہ چاہتا تھا۔ جا کر دیکھے اور اس آواز کو قید کرلے۔ بنسری بجانے والے کو ہمیشہ کے لیے روک لے۔ اسے یوں لگ رہا تھا یہ صرف رات کا فسوں

ہے۔ صبح ہوگی تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ جادو کی چھڑی کی کارستانی ہے اور وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہے کون ہے، یہ کون ہے، اس کے لیے ڈھیل چیئر پر بغیر کسی مدد کے بیٹھنا، مشکل تھا مگر آج وہ خود ہی بیٹھ گیا اور باہر آگیا۔

اور اس نے دیکھا، اس کے کمرے سے کچھ ہی فاصلے پر لان کے قریب ٹیوب لائیٹ کی روشنی میں وہ دیہاتی لڑکا جو دن میں تو بڑا عام سا لگا تھا مگر اس وقت اس کا چہرہ کسی پری زاد کا چہرہ دکھتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بنسری تھی جسے اس نے لبوں سے لگا رکھا تھا اور یہ میٹھی تانیں وہی اڑا رہا تھا۔ ناصر نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا وہ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے سنتا رہا اور محسوس کرتا رہا اس لے میں میٹھا میٹھا سا اک درد ہے۔ یہاں تک کہ درد سے ناصر کا دل پر ہوگیا۔ اور آنکھیں چھلک پڑیں قادر بخش بنسری بجاتا رہا اور ناصر اک کشش کے ساتھ اسے دیکھتا رہا، آنکھیں آنسو برساتی رہیں پھر اس صبح ناصر کی قادر بخش سے دوستی ہوگئی۔ بہت گہری دوستی۔ وہ ملازم اور مالک نہیں رہے، دوست بن گئے۔ اپنی سب محرومیوں کے بارے میں ناصر نے اسے بتا دیا اور قادر بخش نے اسے اپنی زندگی کی واحد خوشی امیراں کے بارے میں بتا دیا۔

''تم بہت خوش نصیب ہو قادر بخش۔'' ناصر نے رشک کے جذبات کے ساتھ اس غریب لڑکے کو دیکھا تھا۔

اور پھر جب وطن سے خط آیا تو اسے پڑھوانے کے لیے قادر بخش ناصر کے پاس ہی لایا یہ خط اماں بھولی نے ڈاکیے سے لکھوایا تھا۔ مگر آخر کی چند لائنیں خود بول رہی تھیں۔ یہ امیراں نے لکھوائی ہیں یہاں اس ٹیلے کا ذکر تھا۔ جس کے بارے میں قادر بخش ناصر کو بتایا کرتا تھا، میں اور امیراں گھنٹوں وہاں بیٹھے رہتے تھے اور لکھا تھا۔ ''موسم بولتے رہتے ہیں مگر میرے لیے ایک ہی موسم ٹھہر گیا ہے۔ یہ انتظار کا موسم ہے۔''

''سائیں! آپ مجھے خط کا جواب لکھ دو گے۔'' قادر نے جھجکتے ہوئے اس سے درخواست کی تھی۔

''ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، میں ضرور تمہیں خط لکھ دوں گا اگر کہو تو اماں کے نام الگ اور امیراں کے نام الگ سے ایک لمبا سا خط۔''

''نہیں سائیں! یہ اچھا نہیں لگتا، ہمارے وطن میں منگیتر کو خط لکھا نہیں کرتے۔ بس سادہ سا خط لکھنا ہے، انہیں میری خیر خیریت کی خبر ملتی رہے یہی بہت ہے۔''

''قادر بخش کیا وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہتی ہے جتنا کہ تم اسے چاہتے ہو۔''

''ہاں سائیں! میں قسم کھا سکتا ہوں، اس کی محبت بھی اتنی ہی گہری ہے۔''

قادر کا خط اب ناصر ہی لکھنے لگا۔ سادہ سا خط ہوتا جس میں امیراں کے لیے سلام ہوتا یا کسی چھوٹی سی چیز کی اطلاع کہ میں نے امیراں کے لیے یہ خرید لیا ہے۔ اور بس، قادر کے ساتھ ناصر کو بھی گاؤں سے آنے والے خط کا انتظار رہنے لگا۔ رات کو جب قادر بخش بنسری بجاتا تو ناصر بھی لان میں آبیٹھتا۔ قادر کی بنسری بجتی تو وہ خیالی پیکر بھی ناصر کے قریب آبیٹھتا اور دونوں مل کر بنسری سے لطف اٹھاتے۔

ایک روز ملک رب نواز اس کے کمرے میں آئے، وہ اکیلا تھا اور اپنی سوچ میں گم تھا۔

”دیکھو ناصر! میں نے تمہارے لیے کیا منگوایا ہے؟“ ان کی آواز میں جوش تھا ویسے وہ خوش تھے۔ قادر بخش کی آمد نے اچھا اثر ڈالا تھا، اب ناصر کمرے تک محدود نہیں تھا۔ وہ کمرے سے باہر آنے لگا تھا۔

”کیا ہے بابا سائیں۔“ اس نے اپنے خیالات سے باہر آ کر پوچھا۔ انہوں نے کسی کو آواز دی اور ذرا دیر بعد لمبی مونچھوں والا ایک آدمی جو شاید شکاری تھا۔ ایک ننھی سی ہرنی گود میں اٹھائے اس کے کمرے میں آ گیا۔ ناصر نے ہرنی کی طرف دیکھا تو اسے جھٹکا سا لگا۔ اف اس کی آنکھیں، تو یہ وہی آنکھیں تھیں بالکل ویسی ہی جیسی اس کے خیالی پیکر کی تھیں، وہ کھو سا گیا ایک ٹک ان آنکھوں کو دیکھے چلا گیا۔

”پسند آئی تمہیں؟ یہ میں نے تمہارے لیے منگوائی ہے۔“ کچھ بولنے کے بجائے ناصر نے بانہیں پھیلا دیں اور شکاری نے ہرنی اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ چنکارہ ہے، اسے ہم گریٹر چولستان سے پکڑ کر لائے ہیں۔“

پھر اس کا باپ اور وہ آدمی چلے گئے۔ ناصر نے ان آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ ”کاش تم وہ ہوتیں اور صرف میرے لیے ہوتیں ایک لڑکی کے روپ میں۔“ قادر بخش چائے لے کر اس کے کمرے میں آیا تو ناصر ہرنی کو گود میں لیے یونہی بیٹھا تھا۔

”یہ کہاں سے آئی؟“ قادر بخش حیران ہوا۔

”بابا سائیں نے میرے لیے منگوائی ہے۔“ قادر نے چائے میز پر رکھ دی اور بہت پیار سے ننھی ہرنی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”پتا ہے صاحب چنکارہ کی آنکھیں بالکل امیراں جیسی ہیں۔“

”کیا امیراں کی آنکھیں بالکل ایسی ہیں؟“ ناصر کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”ہاں سائیں! ہو بہو ایسی ہیں۔“ قادر اس کی کیفیت سے بے خبر ان آنکھوں کو پیار سے دیکھ رہا تھا۔

”تم جاؤ قادر بخش......“ ناصر اس وقت تنہائی چاہتا تھا، اس کی حالت بہت عجیب سی ہو رہی تھی وہ جو اس کا خیالی پیکر ہے۔ کیا وہ اس دنیا میں واقعی موجود ہے۔ یہ آنکھیں کسی لڑکی کے چہرے پر بھی ہیں، ہاں غزالی آنکھوں کا ذکر شاعری میں پڑھا تو ہے امیراں کی آنکھیں غزالی ہوں گی۔ اس کے دل نے شدت سے آرزو کی۔ وہ امیراں کو دیکھے اس سے ملے مگر جلد ہی اسے یہ خیال آ گیا۔ ”امیراں قادر بخش سے محبت کرتی ہے اور یہ بھی کہ میں ایک معذور انسان ہوں۔“ شام کو جب وہ چنکارہ کے ساتھ لان میں آیا اور قادر بخش نے بنسری بجائی تو ہرنی چونک گئی۔ یہ اس صحرا کی آواز تھی۔ جہاں سے وہ لائی گئی تھی۔ وہ اپنے وطن کی اس آواز پر بے چین ہونے لگی اور قادر نے اسے گود میں اٹھا کر اپنا سر اس کے سر پر رکھ دیا۔

”ہم ایک ہی وطن کے ہیں۔ ہم دونوں اپنے وطن سے بچھڑ گئے ہیں۔“

اور ناصر کو اس دم اپنا آپ بہت اکیلا محسوس ہوا۔ وہ جو صرف اس کے لیے لائی گئی تھی۔ وہ بھی اس سے زیادہ قادر کی ہو رہی تھی۔ وطن کی آواز نے اسے ناصر سے دور کر دیا تھا۔ وہ خاموش وہیل چیئر پر بیٹھا رہا۔

مگر اس نے فیصلہ کر لیا، وہ اس امیراں کو کسی اور سے محبت نہیں کرنے دے گا۔ پھر وہ سارا سارا دن اسے ساتھ رکھتا۔ اس کی دیکھ بھال میں لگا رہتا، یہ کام اس کے لیے آسان نہیں تھا مگر ایک ہی دھن تھی اس

امیراں کو صرف مجھ سے پیار کرنا ہے۔ قادر بخش کے سامنے اس نے کبھی امیراں کے نام سے نہیں پکارا مگر تنہائی میں وہ اسے امیراں کہہ کر ہی پکارتا تھا اور پھر چنکارہ اس سے بے حد مانوس ہو گئی۔ وہ اس کو دیکھ کر خوشی کے اظہار میں دم اور بھی تیزی سے ہلانے لگتی اور چھلانگیں لگاتی۔ وہ جہاں ناصر کو دیکھ لیتی۔ اس کے پاس دوڑی چلی آتی اور ناصر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتا رہتا۔ ”یہ آنکھیں تمہاری نہیں ہیں یہ کسی انسان ہی کی ہو سکتی ہیں۔ میں نے جو چہرہ تراشا تھا اس پر سب سے نمایاں آنکھیں ہی تو تھیں اور وہ آنکھیں مجھے مل گئی ہیں۔“

گاؤں سے خط آتے رہے۔ وہ قادر بخش کی طرف سے جواب لکھتا رہا، قادر بخش تو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنی طرف سے لکھ دیا۔ ”امیراں میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”بیٹا اب زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے۔“ یہ بات رب نواز کے لیے بہت خوشی کا باعث تھی۔ ان کے خاندان میں کوئی شادی تھی۔ سب بچے وہاں جا رہے تھے۔ انہوں نے ناصر سے کہا کہ ”میری خواہش ہے ہمارے ساتھ تم بھی وہاں چلو۔“ خلاف توقع اس نے ہامی بھر لی جس روز یہ لوگ جا رہے تھے۔ قادر بخش کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ ناصر نے اس سے کہا۔ ”ڈاکٹر سے دوا لے لینا اور سنو، میری چنکارہ کا بہت خیال رکھنا۔“

وہ سات دن اپنے گھر سے دور رہا۔ یہ دن کچھ ایسے خوشگوار نہیں تھے۔ لوگوں کے وہی رویے، ترس بھری نگاہیں، اشارے اور اسے دیکھ دیکھ کر آپس میں باتیں، بس میں ہوتا تو پہلے ہی روز واپس آ جاتا مگر اسے سات روز وہاں رہنا پڑا۔ ساتویں روز واپسی ہوئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ اسے امیراں یاد آ رہی تھی۔ وہ بھی میرے لیے بہت اداس ہو گی ہر روز میرا انتظار کرتی ہو گی۔

گھر آیا تو ایک بہت بڑی اور بے حد افسوسناک خبر اس کی منتظر تھی۔ ملازم بتا رہے تھے۔ قادر بخش کا انتقال ہو گیا، وہ بیمار تھا صاحب، مگر گاؤں نہیں گیا کہ آپ اسے چنکارہ کا خیال رکھنے کو کہہ گئے تھے وہ کہتا تھا صاحب کو اس پوری دنیا میں صرف چنکارہ سے محبت ملی ہے، وہ اس کی تکلیف برداشت نہیں کر پائیں گے۔ اگر میں اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے، وہ مہربان مالک ہیں، میں انہیں ناراض نہیں کر سکتا۔ وہ خود مر گیا مگر جیتے جی اس نے چنکارہ کا خیال نہیں چھوڑا۔

ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے وہ کہاں کا رہنے والا ہے، وہ ہمارے پاس بیٹھتا کب تھا۔ سارا دن آپ کے کمرے کے باہر ہی تو بیٹھا رہتا تھا۔ ہم نے اس کے سامان میں دیکھا مگر ہمیں کوئی اتا پتا نہیں ملا، اس لیے یہاں شہر کے قبرستان میں ہی دفن کر دیا۔“

”ہاں اس کے گھر کے ایڈریس والا کاغذ تو میرے پاس میری ڈائری میں رکھا ہے، اس کی طرف سے میں ہی خط لکھا کرتا تھا۔ مجھے قبرستان لے چلو، میں اس وفادار دوست کی قبر پر دعا کرنا چاہتا ہوں اور میں امیراں کی نامراد محبت کا ماتم کرنا چاہتا ہوں۔“

قادر بخش کی قبر پر جا کر وہ رو دیا۔ اس کی اور امیراں کی معصوم محبت کی موت۔ اسے لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ بھی یہیں مر جائے گا۔ ان آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے، وہ آنکھیں جو روشن اور ناز پرور ہیں، وہ

روتیں، وہ غم میں ڈوب جاتیں۔ نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے مگر قدرت کا لکھا ٹل نہیں سکتا تھا۔ اسے امیراں کو آخری خط لکھنا پڑا، اسے بتانا پڑا۔ قادر بخش اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

☆......☆......☆

صحرا کے دن گرم اور راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں آسمان تاروں بھرا اور صاف، چاند کی آخری تاریخیں تھیں صرف تاروں کی ہلکی روشنی تھی اور امیراں نے پتا نہیں کیا خواب دیکھا۔ آنکھ کھلی تو دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بدن پسینے میں شرابور، اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ کیا دیکھا بس اتنا ذہن میں تھا، اس نے قادر بخش کو دیکھا ہے، وہ کیا کہتا تھا کیا ہوا اس کے ساتھ؟ بہت سوچنے پر بھی کچھ یاد نہیں آیا۔ بس اتنا یقین تھا۔ کچھ اچھا نہیں دیکھا۔ رب خیر کرے۔ کانپتے دل کے ساتھ وہ بستر پر بیٹھی تھی اور حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ خود میں اتنی سکت نہیں پاتی تھی کہ بستر سے اٹھے اور جا کر دو گھونٹ پانی کے ہی پی لے۔ بڑی دیر بعد اتنی ہمت ہوئی اس نے مٹی کے پیالے میں کوری صراحی کا پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں پورا پیالہ خالی کر گئی۔ پانی پی کر کچھ طبیعت سنبھلی۔ بستر پر آلیٹی اور ایک بار پھر سوچنے کی کوشش کی، ابھی اس نے کیا دیکھا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سوچتے سوچتے ہی نیند کی وادی میں اتر گئی۔

صبح جب اسے اماں نے نیند سے جگایا تو رات کا خواب اور اس خواب کا خوف اس کے ذہن سے پوری طرح محو ہو چکا تھا وہ دن بھر گھر کے کام کاج نبٹاتی رہی۔ اور اسے قادر کے خط کا انتظار بھی رہا مگر خط نہیں آیا، اس نے حساب لگایا ابھی پچھلے خط کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے، میں کچھ زیادہ ہی منتظر رہتی ہوں۔ آخر قادر کام کے لیے شہر گیا ہے۔ وہ ہر دوسرے دن مجھے خط لکھوانے تو نہیں بیٹھ سکتا اور پھر بہت ممکن ہے اب کے خط کی جگہ وہ خود آ جائے۔ بہت دن بھی تو ہو گئے اسے وطن سے دور گئے۔

''امیراں! کیا خیال ہے۔ آج گڑ والے چاول نہ پکالیں۔''

اماں اس سے پوچھ رہی تھی اور اسے خیال آیا گڑ کے چاول تو میں نے قادر بخش کی آمد پر پکانے ہیں اور اس لیے گڑ سنبھال کر رکھا ہوا ہے بولی۔

''نہ، نہ اماں! چاول کھانے کو تو جی ہی نہیں کرتا، چاول نہ پکانا ایسا کر کوئی سی دال چڑھا لے۔''

''چل ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی۔ گڑ گھر میں موجود ہے۔''

''تو کیا ہوا اماں پڑا رہنے دے نا۔''

''امیراں تو نے کئی دنوں سے دوپٹے نہیں کاڑھے، کام کی طرف دھیان نہیں دیتی اب تو۔''

''اماں! میں صبح سے کام شروع کر دوں گی اور اب کی بار ٹھیکیدار آئے تو اسے کہہ دینا تھوڑے زیادہ پیسے دیا کرے، اتنے میں گزارا کہاں ہوتا ہے۔''

''اگر میں نے ایسی بات کی تو وہ کام دینا چھوڑ دے گا، اسے ہماری ضرورت نہیں، ہم ضرورت مند ہیں۔ وہ تو ایک چھوڑ دس کام پر لگا سکتا ہے۔''

''اسی لیے تو بے ایمانی کرتا ہے پتا ہے نا ہم مجبور ہیں۔''

''چل چھوڑ ان باتوں کو۔ ہماری دال روٹی بڑی سہنی چل رہی ہے۔ ہم نے زیادہ پیسے لے کر کرنا بھی کیا ہے۔ زیادہ لالچ مت رکھ دل میں، اور میں قادر کو بھی یہی سمجھاتی رہی جو روکھی سوکھی ملتی ہے گزارا کر لو، اپنے ہی وطن میں۔ دوریاں بڑے دکھ دیتی ہیں، اپنے پاس ہوں تو دل میں ٹھنڈ پڑی رہتی ہے، دوریاں دلوں کو ترساتی ہیں۔''

''اماں! وہ کیسری بتا رہی تھی۔ ہاشو بھی شہر جانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے، یہاں کوئی کام نہیں۔ شہر جاؤں گا اور بہت سے روپے کماؤں گا۔''

''آخر اتنا روپیہ کما کر کرے گا کیا؟ کبھی یہ بھی پوچھا کیسری نے اس سے۔''

اماں بھولی بچوں کی اس ناسمجھی پر خوب ہی ہنسی۔

''اماں! کیسری کی شادی تو دیر میں ہی ہوگی۔ ہاشو کی اماں لمبا جہیز چاہتی ہے نا۔''

''اللہ سب کو ہدایت دے، لالچ بڑی بری شے ہے، اندھا کر دیتی ہے عقل مار دیتی ہے۔ بندہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا ہو جاتا ہے۔ اللہ ہمیں لالچ سے بچائے رکھے۔''

☆......☆......☆

چیتر بہار خزاں ڈسیـــے جـــے
جھوک سمھو ویران ڈسیـــے جـــے
نہ کوئی علم نہ کوئی بان ڈسیـــے جـــے
روہی ڈین ڈریندی ہے

ترجمہ: بہار کے دن بھی خزاں کے دن معلوم ہوتے ہیں۔ آبادیاں یوں لگتی ہیں جیسے ویرانے ہوں۔ جہاں سے کوئی علم حاصل ہونے یا امید بر آنے کی صورت نہیں، روہی ڈائن بن کر ڈرا رہی ہے۔

وہ کتنا اداس تھا اور کتنے درد سے گا رہا تھا، کیا ہوا ہے اس کے ساتھ، میں نے ایسا خواب کیوں دیکھا ہے، کیا وہ بیمار ہے، وہ پریشان ہے، کیا الجھن ہے اس کے ساتھ۔ امیراں کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔ کتنی دیر وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی، یہاں تک کہ ستارے رخصت ہوئے اور پو پھٹنے لگی۔

اس روز وہ دن میں بھی نہیں بہل سکی۔ اسے رہ رہ کر قادر بخش کا خیال آتا رہا پھر وہ خود کو بہلانے کے لیے کیسری کی طرف آئی۔

''اڑی میرا دل بڑا اداس ہے، میں ڈر رہی ہوں۔'' سہیلی کے سامنے، اس نے سارا خواب رکھ دیا۔ وہ دلاسے دیتی رہی، سمجھاتی رہی۔

''تم خود اداس ہو ناں، قادر کے لیے اس لیے ایسے خواب دیکھ رہی ہو۔''

مگر اس کو جو خدشہ لگا ہوا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ تیسرے دن ڈاک بابو اس اطلاع کے ساتھ آ گیا کہ امیراں! تم جیتے جی مر گئی ہو۔ تمہارے خواب راکھ ہو گئے ہیں اور تمہارے گھر کی دیواریں ڈھے گئی ہیں۔ تم

اب چھت کے نیچے نہیں، تپتا سورج تمہارے سر پر چمک رہا ہے۔ امیراں! ہر خوبصورت خیال دل سے نکال پھینکو، اور اس کی جگہ گزرے وقت کی راکھ دل میں بھرلو، اپنی باہنہ کی چوڑیاں توڑ دو، اپنے ریشمی سوٹ جلا دو کہ بہار خزاں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ تمہارا قادر اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس بدنصیب کو تو وطن کی مٹی بھی نہ مل سکی۔ وہ وطن سے بہت دور کسی اور زمین میں سوگیا ہے۔ وہ ایسا مسافر تھا جسے وطن سے دور بہت دور ہونا تھا۔ اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا اور تمہاری قسمت میں بھی یہی لکھا تھا۔ اٹھو اور ماتم کرو اپنی جوان محبت کا، اور اسے ماتم ہی تو کرنا تھا۔ ساری عمر اب ماتم میں ہی گزا نا تھی ہائے یہ کیا ہوگیا، میرے ساتھ، قادر کیوں کی بے وفائی۔ کیوں دکھائے مجھے خواب سہانے، اب میں کیسے جیوں گی۔ کیا تم میرے دل سے جاسکو گے۔ نہیں کبھی نہیں،

☆......☆......☆

''میں اگر تمہارے پاس آؤں امیراں تو کیا تم مجھے قبول کرلوگی۔ کیا تم اس محبت کو پہچان لوگی جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے تم یقین کرلوگی میں نے تمہیں دیکھے بغیر تمہارا بت تراشا تھا... اپنے دل کا ہر درد اس سے کہا تھا۔ میں نے گھنٹوں محبتوں کے گیت گائے اور اپنی وفاؤں کا یقین دلایا تھا۔ امیراں میری پیاری امیراں! تم میرے دل و ذہن پر چھا چکی ہو، میں کوشش کے باوجود تمہارے خیال کو جھٹک نہیں سکتا میں تو ایک عرصے تک یہی سمجھتا رہا کہ تم صرف میرے ذہن کی تخلیق ہو مگر قادر کی زبانی یہ جان کر کہ تمہارا جیتا جاگتا وجود اس دنیا مین موجود ہے مگر وہ میرا نہیں ہوسکتا۔ وہ قادر کی محبت ہے۔ میرے دل کی کیا حالت ہوئی۔ یہ میں ہی جانتا ہوں مگر امیراں اب تو قادر بخش اس دنیا میں نہیں اور میں تمہارا عاشق تم سے ملنا چاہتا ہوں تمہیں اپنا دل کھول کر دکھانا چاہتا ہوں، مگر ڈرتا بھی ہوں، میری معذوری کو تم بھی اور لوگوں کی طرح نفرت سے دیکھو گی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح تم بھی مجھے ٹھکرا دو گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ناصر مرجائے گا۔ یہ واحد خوشی بھی اس سے چھن جائے گی۔ یہ دکھ سہہ نہیں پائے گا۔

قادر بخش کی بنسری اس کے پاس تھی۔ اس نے کئی بار بجانے کی کوشش کی مگر وہ سر جو قادر کے پاس تھا۔ وہ اس کے پاس نہین آتے تھے۔ بڑی محنت کے باوجود اسے وہ گہرائی نصیب نہیں ہورہی تھی۔ قادر بنسری بجاتا تو اس میں وطن سے دور ہونے کا دکھ، محبوب کی یاد اور دوری کی تڑپ ہوتی تھی۔ اس کی بنسری سننے والے کے دل میں بھی ایسا ہی درد جگایا کرتی تھی۔ ایسا درد ناصر کے پاس نہیں تھا۔ اس کے پاس تو امیراں آ بیٹھتی تھی۔ اور پھر ہر نغمہ خوشی کا نغمہ بن جایا کرتا تھا۔

کئی سال ہوئے وہ تو گھر سے نکلتا ہی نہ تھا اور اب ایسے سفر پر جانے کی بات، اتنی دور اور گرمی کا سفر۔

''کیا کرو گے وہاں تپتی ریت میں تمہیں شاید اندازہ نہیں وہاں اس موسم میں ہر طرف آگ ہی آگ برستی ہے، تیز گرم آندھیاں اٹھتی ہیں تو راستے دکھائی نہیں دیتے۔ وہاں کے مقامی بھی ایسی افتاد میں راستہ بھول جاتے ہیں، تم کیسے جاؤ گے وہاں۔'' ملک رب نواز بیٹے کی فرمائش پر حیران بھی تھے اور پریشان بھی۔

''بابا! مجھے وہاں جانا ہے، مجھے کسی سے ملنا ہے، میرا دوست میرے انتظار میں ہوگا۔''

''اچھا پھر موسم ذرا بدل جائے تو چلے جانا ابھی جانا تو حماقت ہے۔''

''نہیں میں اسے اتنا لمبا انتظار نہیں کرواسکتا، آپ ڈرائیور سے کہیں جیپ تیار رکھے۔

بابا سائیں! میں نے جانے کا پکا فیصلہ کرلیا ہے، مجھے روکیے مت۔ میں تو ساری تیاری مکمل کرنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں بس مجھے اب آپ کی اجازت چاہیے۔''

''اچھا بیٹے پھر جیسے تمہاری خوشی مگر میں تمہارے لیے فکرمند رہوں گا۔ تم جلد واپس آنے کی کوشش کرنا وہاں کی گرمی برداشت کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

''کب تک آجاؤ گے۔''

''زیادہ دیر نہیں ہوگی۔ ویسے میں خط لکھوں گا آپ کو۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا کہ واپسی کب تک ہوگی۔ ہوگی بھی یا نہیں، وہ اس بارے میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ جی کہتا تھا امیراں مجھے قبول تو کرلے پھر مرضی اس کی چلے گی۔ مجھ پر حکمرانی ہوگی اس کی، وہ کہے تو وہیں ساری عمر بیٹھا رہوں اور جو وہ کہے تو اس کا ہاتھ تھام کر ساتھ لے آؤں۔ بس مجھے تو اس کا ساتھ عزیز ہے۔ دنیا کوئی سی بھی ہو۔ صحرا کی ریت اڑتی تپتی ہوئی دنیا یا پھر ہرا آسائش سے پر، یہ دنیا میرے لیے تو اس کا ساتھ اہم ہے۔

تیاری تو مکمل تھی۔ امیراں کے لیے بہت سے جوڑے، زیورات، چاندی کے بھی سونے کے بھی اور قادر بخش نے بتایا تھا۔ اسے کانچ کی چوڑیاں پسند ہیں۔ ناصر نے کانچ کی بہت نفیس چوڑیاں بھی خرید ڈالی تھیں۔ اپنا سامان تو بہت مختصر سا تھا۔ جو بھی تھا سب امیراں کے لیے تھے۔

سفر اک اضطراب اور خاموشی کے ساتھ طے ہوتا رہا نہ اس نے ڈرائیور سے کوئی بات کی نہ ہی علاقے دیکھنے کی کوشش کی وہ آنکھیں موندے اپنی سوچوں میں گم رہا اور امیراں اس کے ساتھ ساتھ رہی۔

''تم مجھے پہچان تو لوگی امیراں۔'' اس نے مضطرب ہوکر کئی بار سوال کیا اور ہر بار جواب اثبات میں پایا۔ ''کیا تم مجھے قبول بھی کرلوگی میری اس معذوری کے باوجود۔''

جواب اب بھی اثبات میں تھا مگر ناصر کو تسلی نہیں ہورہی تھی۔

پھر پکی سڑک ختم ہوئی ڈرائیور نے کہا۔

''صاحب اب ہم اپنی منزل پر پہنچا چاہتے ہیں۔''

''کون جانے منزل ملے گی بھی یا نہیں مسافر نا کام بھی تو لوٹ جایا کرتے ہیں کہ ہر نصیب میں منزل کی خوشی تو نہیں ہوا کرتی۔'' اس نے آہ بھر کر کہا اور ڈرائیور سمجھ نہیں سکا مگر اس نے وضاحت بھی طلب نہیں کی۔

اب ان کی جیپ سخت سپاٹ کچی سڑک پر اتر آئی تھی اور یہیں اس ویرانے میں اس نے ایک عورت کو دیکھا وہ اسی ڈہر کے کنارے کھڑی تھی۔ اس نے اوڑھنی بہت آگے تک اوڑھ رکھی تھی اور اس کے قریب ہی پانی کا ایک گھڑا رکھا تھا۔ گاڑی دیکھ کر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور رکنے کو کہا۔

''صاحب! پتا نہیں کون ہے، یہ ویران علاقہ ہے بھلا جوان اکیلی عورت کا اس جگہ پر کیا کام ہمیں رکے بغیر ہی آگے بڑھ جانا چاہیے۔'' یہ ڈرائیور کی رائے تھی جس سے ناصر نے اتفاق نہیں کیا۔

"تم گاڑی روک دو پوچھو تو سہی، آخر یہاں کیوں کھڑی ہے، میرا خیال ہے۔ ضرورت مند ہوگی مدد چاہتی ہوگی ہم سے۔" ڈرائیور کو نہ چاہتے ہوئے بھی ناصر کی بات ماننا پڑی۔

"او بی بی! کون ہو تم او مائی کیوں روک رہی ہو ہمیں۔" ڈرائیور نیچے اترا اور ڈانٹ کر اسے مخاطب کیا۔
وقت دوپہر کا تھا تپتی ریت اور گرم ہوا میں شدت تھی۔ جس کے باعث ریت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بکھری تھیں اور پھر نئی ڈھیریوں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں، ناصر کے لیے یہ سب انوکھا تھا اگر اس کے دل و ذہن پر صرف اور صرف امیراں کا خیال نہ سوار رہتا، وہ آنے والے وقت اور اس سے ہونے والی ملاقات کے لیے مضطرب نہ ہوتا تو یقیناً یہ سب اسے انوکھا اور دلچسپ لگتا۔

"تم لوگ ادھر والی سڑک سے آئے ہو، ہے نا اور مجھے پتا ہے یہ سڑک ایک بہت بڑے شہر کی طرف جاتی ہے وہ بڑا شہر یہاں سے دور ہے اور ہماری بستی کے بہت سے جوان محنت مزدوری کے واسطے ادھر چلے جاتے ہیں اور پیچھے ان کا انتظار کرنے والی آنکھیں رہ جاتی ہیں۔ جو خوش نصیب ہوتی ہیں ان کے پردیسی واپس آ جاتے ہیں اور جو مجھ جیسی ہوتی ہیں ان کی قسمت میں ساری عمر کا انتظار لکھا جاتا ہے۔ وہ بھی اس شہر گیا تھا جب وہ جا رہا تھا تو میں اور اماں اسے رخصت کرنے یہاں تک آئی تھیں، اس نے وعدہ کیا تھا بہت سی خوشیاں ہمارے لیے خرید کر لائے گا مگر شاید وہ خوشیاں خرید نہیں سکا۔ خود دار تھا خالی ہاتھ آنا پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ کے لیے وہیں رہ گیا، اسی دھرتی کی مٹی میں مٹی ہوگیا۔ تم اس شہر کے باسی ہو جہاں میرا قادر سوتا ہے تو پھر تمہاری سیوا تو میرا فرض ہوئی کہ نہیں۔"

ہوا تیز تھی امیراں کے سر سے اوڑھنی کھسک چکی تھی اور وہ غزالی آنکھیں، چمکدار جلد ناصر کے سامنے تھی۔ خیالوں کا تراشا پیکر اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ اس کے قریب تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ "یہ گرد اسی شہر کی ہے جہاں میرا قادر بخش سوتا ہے۔" وہ اپنی اوڑھنی سے گاڑی پر پڑی دھول صاف کرنے لگی۔

"کیا کرتی ہو بی بی! رہنے دو۔" ڈرائیور نے روکنا چاہا۔

"مجھے مت روکو۔ تم نہیں سمجھتے یہ مٹی مجھے کتنی پیاری ہے۔" اس نے بڑے پیار سے مٹی چہرے پر لگائی اور کیسی ترسی نگاہ سے اپنی اوڑھنی کو دیکھا، ہاتھ پھیرا جیسے اس گرد کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا چاہتی ہو۔

"پانی پیو گے تم لوگ؟" اس نے پہلی مرتبہ ناصر کی طرف دیکھا۔ اس میں بولنے کی سکت ہی کہاں تھی۔
ڈرائیور نے کہا "پلا دو" اس نے پیالہ بھر کر اسے تھما دیا۔

"صاحب پانی پیو گے۔" وہ پیالہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا مگر ناصر ہلا تک نہیں،

"سنو بھرا! شہر میں واپس جاؤ تو قادر بخش کی قبر پر ضرور جانا، اس کے لیے بخشش کی دعا کرنا۔" امیراں کو یقیناً احساس نہیں تھا کہ شہر کتنے بڑے اور کیسے ہوتے ہیں۔

ابھی اس نے پانی کا خالی پیالہ واپس لیا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک اور جیپ آ گئی۔ وہ اس کی طرف لپکی۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔ تم قادر بخش کے شہر سے آ رہے ہو، ہاں میرا قادر ادھر ہی گیا تھا، وہ تمہارے وطن کی خاک میں سوتا ہے۔ اس خاک میں جس سے تمہاری گاڑی اٹی پڑی ہے۔" وہ ایک بار پھر اوڑھنی سے گاڑی کی گرد

صاف کر رہی تھی "پانی پلاؤں تمہیں؟ تم میرے قادر کے شہر سے آئے ہو، تمہاری خدمت میرا فرض ہے۔"

"ڈرائیور گاڑی واپس موڑ لو۔" گہری سانس کھینچ کر ناصر نے اسے مخاطب کیا۔

"مگر کیوں سائیں، آپ تو کسی دوست سے ملنے آئے تھے۔"

وہ دکھ سے ہنس پڑا۔ اور بولا۔

"میں نے غلط سمجھا تھا وہ میرا نہیں میرے دوست کا دوست تھا۔ ہم میں جان پہچان اسی نے کروائی تھی۔ اب وہ نہیں تو کیا کہہ کر تعارف کرواؤں گا، اس لیے واپس چلو۔"

کیا کیا سوچ کر آیا تھا ناصر۔ کتنا کچھ اور کتنے شوق سے خریدا تھا اس نے امیراں کے لیے۔ مگر روڈ کے کنارے کھڑی ہر گاڑی سے اس گرد کو صاف کرنے کا عمل جہاں اس کا محبوب سو رہا ہے۔ ناصر کو بتا گیا اسے کچھ بھی کہے بغیر یہیں سے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ قادر بخش مر کر بھی امیراں کے دل میں ہے اور بڑی شان سے ہے۔ وہ کبھی بھی اس دل کو خالی نہیں کرے گا۔ اور ناصر کیوں نہ جان پاتا کہ آخر اس نے بھی تو محبت کی تھی۔ وہ اس کی شدتوں اور گہرائیوں سے خوب واقف تھا، جب امیراں جیسی کمزور عورت محبوب کو کھو کر بھی اس کی رہ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں۔ میں بھی تمہارا ہوں، تمہاری محبت میرے دل میں پھول نہیں کھلا سکتی، کوئی بات نہیں۔ میٹھی میٹھی آگ تو لگا سکتی ہے۔ اور اس آگ میں سلگنے کا کیا مزا ہے۔ یہ صرف دل والے ہی جان سکتے ہیں۔ تم قادر بخش کی ہو اور ناصر تمہارا ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک تمہارا رہے گا۔

اور اس رات جب اس نے بنسری بجائی تو دھن درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جدائی کی کسک، محبوب سے دوری کا دکھ، اور اس کی محبت میں مر مر جانے کا اظہار۔

"اتنا درد کہاں سے آ گیا۔ کیا روگ ہے میرے بیٹے کو۔" ملک رب نواز اسے راتوں کو موسم سے بے نیاز کھلے آسمان تلے بنسری بجاتے دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔

"سائیں! میں نے سنا ہے۔ صحرا میں کچھ اثر ہوتا ہے وہاں کچھ اور ہی مخلوق بھی آباد ہے راہ میں اک جوان اور بے حد حسین عورت کھڑی تھی جس کی آنکھیں اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں۔ طلسم میں گرفتار کر لیتی تھیں۔ اس نے راہ روکی تھی اور اور چھوٹا سائیں اسے ایک ٹک دیکھے گیا تھا، پھر وہیں سے واپس ہوگیا اور مجھے لگتا ہے۔ دل وہیں چھوڑ آیا ہے۔ سائیں ضرور ان پر کوئی اثر ہوگیا ہے۔"

ناصر کے بھائی بہنوں نے اپنے دوستوں میں ذکر کیا، وہ جو ہمارا معذور بھائی ہے، وہی جو اپنے کمرے سے نہیں نکلا کرتا تھا، سنا ہے وہ صحرا میں گیا تو اس پر ایک پری عاشق ہوگئی یا شاید ہمارا بھائی اس پری پر عاشق ہوگیا اور اب اس کے عشق میں ڈوب کر وہ بنسری بجاتا ہے تو بنسری سننے والی ہوتی ہے۔

دوست اکٹھے ہونے لگے۔ ناصر کو پروا کب تھی اور اسے امیراں کے سوا کچھ دکھائی کب دیتا تھا، مگر اب امیراں اکیلی نہیں اسے قادر بخش بھی اس کے ساتھ ساتھ دکھائی دیتا تھا، وہ اکٹھے آ کر اس کے سامنے بیٹھ جاتے اور اس کا دل بے چین مگر مودب رہتا۔

"وہ دو پیار کرنے والے ہیں اور میں، میں کیا ہوں، کچھ بھی تو نہیں، امیراں کی چاہت تو قادر بخش

ہے۔" اور یہیں سے بنسری کی ہر لے درد سے بھر جاتی اور سننے والے عش عش کر اٹھتے۔

"تمہارا بیٹا تو بہت بڑا فنکار ہے ملک رب نواز! تم اسے قید مت کرو۔ اسے لوگوں میں متعارف کروا ئی ٹی وی پر اس کا پروگرام آنا چاہئے۔"

"ہاں یہ معذور ہے اور تو کچھ نہیں کرسکتا، اسے عزت کی زندگی گزارنے کو اس کام میں ڈال دو۔"

اور امیراں کی محبت کی کسک اسے کہاں سے کہاں لے آئی۔

ملک، بیرون ملک اسے مختلف جگہوں پر جانا پڑتا۔ اس کے گرد فن کے قدر دانوں کا ہجوم ہوتا اور پھر لڑکیوں نے اس کی طرف محبت کا ہاتھ بھی بڑھایا۔ وہ سب دولت کی پجاری تھیں مگر ناصر نہیں پہچان سکا، وہ حیران رہ گیا کیا میں بدل گیا ہوں، میرے فن نے میرے عیب کو چھپالیا ہے اوہ، ہا، ہا، مارے خوشی کے وہ اونچے اونچے قہقہے لگاتا رہا اور اس روز جب اس نے بنسری بجائی تو وہ دھن اپنے اندر سوز نہیں رکھتی تھی۔ مگر لوگ پھر بھی سر دھنتے رہے کہ اب وہ نام کما چکا تھا، اس کی تعریف فیشن میں شامل تھی۔ پھر درد پیچھے بہت پیچھے رہ گیا۔ امیراں فسانہ ہوگئی۔ زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں۔

ناصر نے جانا یہی زندگی ہے اور ایسا ہی چلن ہونا چاہئے زندگی کا۔ وہ ہرنی جس کا نام اس نے امیراں رکھا تھا۔ وہیں ملک رب نواز کے گھر رہ گئی۔ کسی نے خیال بھی رکھا یا نہیں، وہ مرگئی یا زندہ رہی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ آگے بہت آگے بڑھتا چلا جارہا تھا ہاں مگر اپنے ہر انٹرویو میں وہ اپنی اس عجیب محبت کا ذکر کرنا نہیں بھولتا تھا، اس نے ہر انٹرویو میں یہی تاثر دیا۔ وہ لڑکی جس کی غزالی آنکھیں تھیں اور اسکن بے حد چمکدار تھی۔ وہ کوئی انسان نہیں تھی۔ وہ کچھ اور تھی۔ اسی نے مجھے یہ فن سکھایا۔ وہ ہر رات میرے سامنے بیٹھ کر مجھے یہ فن سکھاتی تھی، پھر اس نے مجھے صحرا میں بلایا۔ میں اس کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ میں اس سے ملنے گیا اور اس نے مجھ سے کہا۔

"یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ تم اب وہ بھی سیکھ چکے ہو جو میں تمہیں سکھانا چاہتی تھی۔" اور پھر وہ غائب ہوگئی، میں نے اسے بہت پکارا، بہت تلاشا مگر وہ مجھے نہیں ملی۔"

کتنی عجیب کہانی تھی اس عظیم فنکار کی۔ فسوں خیز سنسنی پھیلاتی ہوئی۔ کیا وہ کوئی پری تھی جو ناصر کے خوبصورت چہرے پر عاشق ہوگئی۔ مگر وہ واپس کیوں چلی گئی، اس کا جواب نہیں ملتا تھا۔

اور دور صحرا میں سڑک کے کنارے غزالی آنکھوں والی ایک عورت کئی سالوں سے کھڑی ہے۔ اس روڈ سے آنے والی ہر گاڑی کو ہاتھ کے اشارے سے روکتی ہے۔ ادب سے اور بڑی محبت سے سلام کرتی ہے۔ پانی پلاتی ہے۔ اور گاڑی پر پڑی گرد اپنی پھٹی ہوئی اوڑھنی سے صاف کرتی ہے۔ کوئی روکے تو کہتی ہے۔

"مجھے مت روکو، یہ گرد مجھے بڑی پیاری ہے، یہ اس شہر کی گرد ہے جہاں میرا قادر بخش سو رہا ہے۔"

وہ تو کب سے یہیں کھڑی ہے۔ ہمیشہ جدائی کی کسک کے ساتھ اور اپنی پہلی اور آخری محبت کی یاد کے ساتھ۔

☆.....☆.....☆

دل کی جھوک

لمبی سیدھی سڑک اور اس سڑک کے دونوں جانب شیشم کے درخت ہیں۔ چاندنی میں ان کے سائے بڑے عجیب سے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر مسافر ایک لمحے کے لئے اس طرف سوچے تو پسینے میں نہا جائے۔ یہ پکی روڈ مجتبیٰ کے گاؤں کے قریب سے گزرتی ہے اور گاؤں کو اترنے والے کچے راستے کا منہ چوم کر اپنے راستے پر جانے کہاں تک چلی جاتی ہے۔

مجتبیٰ کو سرشام ہی گاؤں پہنچ جانا تھا مگر راستے میں بس خراب ہوگئی اور اتنا وقت ٹھیک ہونے میں لگا کہ چاند نکل آیا اور درختوں کے سائے خوفناک ہوگئے۔ بس اسے دو فرلانگ پیچھے چھوڑ کر منڈی کی طرف مڑ گئی تھی اور اب وہ تھا۔ درختوں کے سائے تھے اور اس کے قدموں کی دھمک تھی۔ موسم میں ہلکی خنکی تھی۔ ایک روز پہلے ہونے والی بارش نے راستے کو دھو دیا تھا۔ ہوا ٹھنڈی اور صاف تھی اور راستے کے دونوں جانب درختوں کی قطار سے پرے اونچے نیچے کھڈ تھے جن میں بارش کا پانی کھڑا تھا اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔ سال پیچھے یہیں کہیں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان وارث کا قتل ہوا تھا اور چوہدری نے بیٹے کے قاتلوں کی تلاش میں سارا گاؤں تھانے بٹھا دیا تھا، پر اب تک۔ قاتل کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

مجتبیٰ نے آسمان کی طرف دیکھا اور گہری سانس کھینچ کر چلنے کی رفتار تیز کردی حالانکہ اسے گاؤں پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ پکا راستہ ختم ہوا، وہ کچے پر آگیا مگر ہمیشہ کی طرح اڑتی ہوئی دھول پیروں سے نہیں لپٹی، بارش سے مٹی بیٹھ گئی تھی۔ گھر قریب آرہا ہے۔ اس کے اندر کہیں گھبراہٹ نے کروٹ بدلی مگر وہ واپس نہیں ہوسکتا تھا اسے آگے بڑھنا ہی تھا۔ پھر گلیاں شروع ہوگئیں۔ اسحاق کی ہٹی پھر دینے کا کھوکھا اور اس سے آگے تنور اور کچے پکے مکانوں کا سلسلہ گاؤں اس وقت سو رہا تھا۔ ہوا اب تیز ہوگئی تھی اور گلیوں کے پھیرے پر پھیرے لگا رہی تھی۔ دوسری گلی کا چوتھا مکان جس کے دروازے پر سبز روغن ہوا تھا اور وہ دروازہ ہمیشہ مجتبیٰ کا

منتظر رہتا تھا جب ہی تو دوسری کے بعد کبھی تیسری دستک نہیں دینا پڑتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا کہ دوسری دستک پر ہی بلقیس نے دروازہ کھول دیا۔ چاند کی چاندنی میں بلقیس دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ پوچھ رہا تھا۔

''سب خیر خیریت سے ہیں نا؟''

''تم کیسے ہو؟'' بلقیس کی ساری فکریں اس کے لئے تھیں۔ مجتبیٰ نے جواب نہیں دیا۔ اندر آ گیا اور بیگ صحن میں رکھ دیا جسے دروازہ بند کرنے کے بعد بلقیس نے اُٹھا لیا اور کمرے میں رکھنے چل پڑی۔

''کون ہے بلو؟'' مجتبیٰ کے بابا نے نیند میں پکارا تھا۔

''میں ہوں بابا؟'' اس نے اونچی آواز میں کہا اور اس کے کمرے میں چلا آیا۔ بابا، اماں دونوں اُٹھ بیٹھے اور بیٹے کو دیکھتے ہی ساری تھکن اُتر گئی۔ نیند جو آنکھوں میں کچھ دیر پہلے بھری تھی وہ بھی ہوا ہوئی۔

''یہ تو ہے مجتبیٰ! اتنی رات کو پتر راستہ بڑا خراب ہے، اس وقت نہ آیا کر۔''

ماں کی اپنی فکریں تھیں۔ بابا جلدی جلدی گاؤں کی خبریں دے رہا تھا اور بلقیس یقیناً روٹی پکا رہی تھی۔ اس نے لکڑیاں جلائی تھیں اور اُٹھنے والے دھوئیں سے ہلکا ہلکا کھانس رہی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے روٹی یہاں بابا کے بستر پر ہی اس کے آگے لگا دی۔ گوبھی گوشت پکا تھا۔ ساتھ میں آم کے اچار کی پھانک تھی اور روٹیاں وہ اب پانی لینے گھڑونچی کے پاس گئی تھی۔ جتنی دیر وہ روٹی کھاتا رہا، اما اور ابا مسلسل بولتے رہے جبکہ بلقیس ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ وہ روٹی کھا کر فارغ ہوا تو برتن اُٹھا لے گئی۔

''چل پتر اب تو بھی جا کر آرام کر۔ تھک گیا ہوگا۔''

اور وہ ابا کے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کمرے میں آنے کے لئے جہاں بلقیس بھی تھی، ایک بار پھر ناگواری کا شدید احساس۔ کمرے میں گھٹن تھی یا اسے ایسا محسوس ہوا تھا۔ بلقیس قریب آئی تو بولا۔ ''کبھی نہا بھی لیا کرو۔ کتنی بو آ رہی ہے تم سے۔''

وہ چپ رہی بتایا نہیں آج ہی نہائی ہوں اور جو سات سمندروں میں بھی نہا لوں پھر بھی تمہیں مجھ سے بو آئے گی ہی۔

''اب کی بار بڑے دنوں کے بعد آئے ہو۔'' وہ بستر پر لیٹ گیا تھا اور بلو اس کے پاس کھڑی کہہ رہی تھی۔

''مجھے سونے دو، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گاؤں میں دن جلدی چڑھ جاتا ہے مگر وہ تو شہری ہو گیا تھا۔ پہلے پڑھنے کے لئے شہر میں رہا اور اب ملازمت کر لی تھی۔ بلو نے اُسے نہیں جگایا، اُٹھ کر باہر آ گئی اور کام کاج میں لگ گئی۔ ابا بے دار ہوا پھر اماں، اور گلی سے اُبھرتی آوازیں تقریباً ہر گھر میں بچوں کا شور۔ مجتبیٰ جب بھی آتا تھا بلو کو اپنے آنگن کے سونے پن کا احساس پہلے سے زیادہ ہونے لگتا تھا اور اماں، وہ اُٹھتے بیٹھتے ہائے ہائے کرتی تھی اور ایسی ناکارہ بہو کو کوستی تھی۔

''اری اب کیا سارا دن روٹی ہی پکاتی رہے گی۔ اُٹھ مر۔ کوئی اور کام بھی کر لے۔'' بڑھیا کی آواز بڑی

کرخت تھی اور جب وہ بلو کو کوس رہی تھی تبھی سیف آ گیا۔

''سلام چاچی! آج تو سویرے سویرے ہی دعائیں دے رہی ہو اپنی بہورانی کو؟'' وہ بلو کو نظروں میں رکھ کر بڑھیا سے مخاطب تھا۔ اُس کی آمد اور باتیں بلقیس کی دنیا ہلا جاتی تھی، اُس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی، سسرال میں سیف نہ آئے مگر وہ ضرور آتا تھا اور باتیں بھی اُسے لگا کر کرتا تھا۔

''مجتبیٰ آیا ہے۔'' بڑھیا نے مسکرا کر سیف کو بتایا۔

''ہیں، اس مرتبہ اتنی جلدی آ گیا ہے۔ خیر تو ہے۔'' سیف کی شوخی سنجیدگی میں بدل گئی اور رخ پھیر کر پراٹھے بناتی بلو کو ہنسی آ گئی۔

''لو بھلا اتنے دنوں کے بعد آیا ہے میرا لال۔ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں اور تو کہتا ہے جلدی آ گیا ہے۔''

''بلو بڑی خوش ہوگی ہے نا بلو۔'' وہ آ کر چولہے کے قریب اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا نہیں خوش ہونا چاہئے؟'' بلو نے آنکھیں دکھائیں۔

''ہاں بھئی، ایسا پیار کرنے والا سر کا سائیں ہو تو خوش کیوں نہیں ہوگی۔'' سیف نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ بلو نے گھبرا کر بڑھیا کو دیکھا۔ اچھا ہوا وہ مرغیوں کو دانہ ڈالنے میں مصروف تھی۔ گلے سے عجیب عجیب آوازیں نکال کر اُنہیں بلا رہی تھی اور سیف نے کہا تھا۔ ایسی آواز سن کر مرغیاں قریب آنے کے بجائے چیخیں مارتی بھاگ جائیں گی۔

''تم روٹی کھاؤ گے؟''

''ہاں تیرے ہاتھ کی روٹی بھی کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے۔ انکار نہیں کر سکتا۔''

''جو میں زہر ملا کر دے دوں پھر؟''

''پھر بھی کھا لوں گا بلو!'' اُس نے آگے جھک کر پورے جذب سے کہا تھا۔

''حیا کر حیا۔'' بلو نے ڈوئی اُٹھا کر دکھائی اور دانت پیستے ہوئے آہستگی سے بولی۔

''کہاں ہے تیرا شہری بابو۔ ہم بھی سلام کر لیں ہاں۔ بڑا زوردار نصیب ہے اُس کا۔''

''سیف! تو یہاں کیوں آتا ہے؟'' بلو کی آواز میں گھبراہٹ اور جھلاہٹ دونوں نمایاں تھیں۔

''تجھے دیکھنے۔'' لہجہ سچائی سے چور تھا۔

''کیا ملتا ہے مجھے دیکھ کر؟'' بلو جھک کر چولہے میں لکڑیاں ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

''یہ نہ پوچھ کہ میں بتا جو نہیں سکتا۔''

''تجھے پتہ ہے تیرا یہاں آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اگر تیری چاچی کو شک پڑ گیا کہ تو میرے لئے آتا ہے تو خون کر دے گی میرا۔''

سیف نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس کے قریب سے اُٹھ کر چارپائی پر جا بیٹھا۔ پر یوں کہ اُس کا چہرہ آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ بلو نے پراٹھے چنگیر میں رکھے۔ ساتھ مکھن اور اچار اور لا کر سیف کے سامنے رکھ

دیئے۔ اب وہ جالی سے کسی نکالنے کے لئے مڑی تھی۔

''آ چاچی روٹی کھا لے۔'' سیف نے مرغیوں میں مصروف بڑھیا کو دعوت دی۔

''تو کھا پتر! میں تیرے چاچے اور سیف کے ساتھ کھاؤں گی۔ تو کھا پھر تجھے منڈی بھی جانا ہے نا۔''

''ہاں، آج کا دن تو بڑا خوار گزرے گا۔ پچھلی مرتبہ بھی میرا جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ابا نے روک دیا ورنہ خون کر دیتا ایک دو کا۔''

''ہائے ناں وے کرماں والے، غصے پر قابو رکھ کیوں بڈھے باپ کو دکھ دیتا ہے۔ تو ہی تو دولت ہے اس کی۔ ایسے لڑائیاں نہ مول لیا کر۔''

''بس چاچی! جب مجھے غصہ آ جائے ناں۔ پھر کچھ نظر نہیں آتا۔ اندھا ہو جاتا ہوں میں۔''

ابھی وہ روٹی کھا رہا تھا کہ مجتبیٰ نیند سے بے دار ہو کر صحن میں آ گیا

''او سیف! تم آئے ہو۔'' اسے دیکھتے ہی بازو پھیلا دیئے اور سیف بھی مصافحہ کرنے کے بعد بغلگیر ہو گیا۔

''کیسے ہو بڑے دنوں کے بعد پھیرا لگایا ہے شہر سے۔''

''ہاں یار! کام کچھ زیادہ تھا۔ تم جانو۔ سرکاری بندہ ہوں تمہاری طرح اپنی مرضی کا مالک نہیں ہوں؟''

''او ہم کہاں مرضی کے مالک۔'' سیف کی نظر خود بخود بلو کی جانب اُٹھ گئی۔ جو، اب چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ رہی تھی کہ مجتبیٰ صبح اُٹھ کر چائے ضرور پیتا تھا۔

''اچھا بھائی! میں چلتا ہوں۔''

سیف کے لئے بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا مگر مجتبیٰ نے جانے نہیں دیا پھر سے بٹھا لیا اور گاؤں کے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتا رہا۔ پھر بولا۔

''تو بھی اب گھر بسا لے سیف! کب تک یوں پھرتا رہے گا۔''

سیف ہنس پڑا پھر اونچی آواز میں بولا۔ ''جیسے تو نے گھر بسایا ہے اس طرح۔''

مجتبیٰ سمجھا نہیں، تو بولا۔ ''بیوی یہاں خود وہاں۔ مہینے میں ایک بار کبھی دو روز کے لئے کبھی تین روز کے لئے آ جاتے ہو، ایسا گھر مجھ سے نہیں بسایا جائے گا۔''

''سیف! تجھے تو کئی لڑکیاں پسند کرتی ہوں گی۔ پھر کماتے بھی اچھا ہو، لڑکی والوں کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''شاید بھینس کھل گئی ہے۔'' سیف کی نظر صحن کے آخری کونے میں چھپر کے نیچے کھڑی بھوری پر تھی۔

''ہاں شاید۔'' مجتبیٰ عجلت کے عالم میں اِدھر لپکا۔

''ہائے کیسے آئے زیادہ دن کے لئے۔ گاؤں میں یہاں کون سی خوشی ہے اس کے لئے۔ دوسرا سال لگ گیا شادی کو۔ ابھی تک گود خالی ہے کرموں جلی کی۔ ہائے پتا ہوتا تو کیوں لاتی ارمانوں سے بیاہ کر۔ اس چڑیل کو۔'' بڑھیا بڑبڑانے لگی تھی اور یہ بڑبڑاہٹ اتنی آواز میں تھی کہ سب سن رہے تھے جب کہ بظاہر وہ یوں

بیٹھی بول رہی تھی۔ جیسے ساری باتیں اپنے آپ سے کہہ رہی ہے۔

سیف نے بلو کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا اطمینان جوں کا توں تھا۔ وہ چائے کپ میں انڈیل کر مجتبیٰ کی منتظر تھی۔ سیف اٹھ کر چلا آیا۔ بہانا یہ بنایا کہ ابا کھیتوں پر انتظار کر کر کے اب تو گالیاں دے رہا ہوگا۔

سیف چلا گیا۔ مجتبیٰ بھوری سے فارغ ہو کر ادھر آیا تو ماں سے پوچھا۔

''ابا چلا گیا کیا؟''

''ہاں، اسے کھیتوں پر جانا تھا پھر آج منڈی کا پھیرا بھی لگنا ہے اور مجتبیٰ پتر تو بھی اپنے ابا کے ساتھ کھیت میں چلا جا۔ دل بہل جائے گا تیرا یہاں گھر میں رکھا ہی کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے اماں روٹی کھا کر چلا جاتا ہوں یار دوستوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بابا سر پر چارے کا بڑا گٹھڑ اٹھائے چلا آیا۔ گٹھڑ کو صحن میں دیوار کے قریب پھینکا اور بیٹے کے پاس آ کر بلقیس کو آواز دی۔

''جلدی روٹی لے آ۔ مجھے کام کے لیے نکلنا ہے۔ آج تو بڑی دیر ہو گئی دن چڑھ آیا ہے۔''

''کہاں رہ گئے تھے تم؟'' اماں نے پوچھا۔

''وہ معراج بیمار ہے، اسے شہر لے جا رہے ہیں اس کے بیٹے کہتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے، اس لیے میں بھی ادھر ہی رک گیا۔ بہت سے گاؤں والے وہیں موجود تھے۔''

''ہاں اللہ حیاتی دے معراج کو۔'' اماں نے دعا کی۔

''کیا ہوا ہے معراج چاچا کو؟''

''او پتر! اگر یہ سمجھ آ جاتی تو علاج نہ ہو جاتا اس کا۔ حکیم کو سیانے بیانے کو ابھی تک یہی پتا نہیں چل سکا۔ اللہ خیر ہی کرے لگتا ہے کوئی روگ ہی پل رہا ہے۔ معراج کے اندر۔''

''فکر نہ کر ابا! شہر میں بڑے قابل ڈاکٹر ہیں۔ بیماری کا پتا بھی لگا لیں گے اور علاج بھی ہو جائے گا۔''

''ہاں پر پیسہ بھی تو بڑا مانگتے ہیں شہر کے ڈاکٹر۔''

یہ تینوں باتیں کر رہے تھے اور بلقیس نے آ کر روٹی لسی ان کے آگے رکھ دی تھی۔

''چل پتر روٹی کھا۔ کئی دنوں کے بعد گاؤں آتا ہے اور یہ سوغاتیں نصیب ہوتی ہیں، وہاں کون تیرے لیے پراٹھے بناتا ہوگا اور لسی کے گلاس بھر کے رکھتا ہوگا۔''

''لو شہر میں ان چیزوں کی کیا ضرورت، وہاں اور بہت کچھ ہوتا ہے، کھانے کو۔ کیوں پتر ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

اماں نے تصدیق چاہی، مجتبیٰ نے ہاں یا ناں میں کچھ نہیں کہا، مسکرا کر چنگیر اپنے آگے رکھ لی۔

''تجھے روٹی کی مشکل تو پڑتی ہوگی۔'' ابا کسی سوچ میں گم دکھائی دے رہا تھا۔

''ناں۔ نہیں تو بابا! شہر میں اتنے تو ہوٹل ہیں۔'' مجتبیٰ نے جلدی سے تردید کی۔

''او، پر گھر کی روٹی کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ میں تو کہتا ہوں تو بلقیس کو اپنے ساتھ ہی شہر لے جا۔''

اور نوالہ مجتبیٰ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس سے پہلے کہ کچھ کہتا۔ اماں بول اٹھی۔

''لو بھلا کیسے لے جائے شہر۔ بتا تا ہے۔ ایک کمرے کا گھر ہے اور اس میں تین دوست مل کر رہتے ہیں۔''

''ہاں ہاں، اماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ابا!'' اس کی رکی سانس بحال ہوئی۔

''الگ مکان بھی تو لیا جاسکتا ہے کہ نہیں۔'' ابا کے نزدیک یہ دلیل تو بالکل بودی تھی۔

''بہت مشکل ہے، بڑا کرایہ ہے اگر مکان لے لوں تو اسے کھلاؤں گا کہاں سے۔ اسے یہیں رہنے دو گاؤں میں۔ یہ یہاں ہوتی ہے، مجھے تم دونوں کی طرف سے بھی تسلی رہتی ہے۔ پھر تو دھیان ادھر ہی لگا رہے گا۔'' ''لو بھلا ہمیں کیا ہونا ہے تو ہماری فکر نہ کر پتر۔'' بابا ہنس کر بولا۔ لیکن اماں نے مجتبیٰ سے مکمل اتفاق کیا دل ہی دل میں وہ خوش بھی تھی کہ بیٹا زن مرید نہیں ہے۔ ماں باپ کا خیال بیوی سے کہیں زیادہ ہے اس کے دل میں۔

بلو ساری باتیں سن کر بھی کچھ نہیں سن رہی تھی۔ یہ لوگ روٹی کھا چکے تو اس نے برتن اٹھائے اور چولہے کے قریب رکھ کر خود گھڑا اٹھا کر نکلنے پر آ گئی۔

''دیکھو اسے...... پہلے برتن دھو لیتی۔ اب پانی بھرنا کیوں یاد آ گیا تجھے؟'' ساس اسے ٹوکے بنا رہ نہیں سکتی تھی۔

''اماں! گھڑا بھر کر ماسی خیراں کے گھر دے آؤں گی ان کا نلکا خراب ہے بڈھی جان کہاں پانی بھرتی رہے گی۔''

''ہا! سارے زمانے کا خیال ہے نہیں ہے تو میرا نہیں ہے۔''

''اچھا بس، اپنے رونے نہ روتی رہا کرو ہر وقت۔'' ابا نے ٹوک دیا۔ اماں اس کے ساتھ الجھنے لگی، مجتبیٰ اٹھ کر باہر گلی میں آ گیا۔

بلو پانی کا گھڑا اٹھائے خیراں کے گھر آئی، دیکھا وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو رہی ہے، جلدی سے پانی کا گلاس بھر کے منہ سے لگایا۔ کچھ دیر بعد حالت سنبھلی تو پوچھا۔

''روٹی کھائی یا یونہی پڑی ہو؟''

''روٹی تاری پکا کر دے گئی تھی۔ تو بتا سنا ہے مجتبیٰ آیا ہوا ہے رات سے۔''

''ہیں، پر تجھے گھر میں لیٹے کھانستے کیسے خبر ہوگئی؟''

''ابھی ابھی سیف آیا تھا۔ بتا رہا تھا۔''

''او، ایک تو سیف کو کوئی کام نہیں کبھی ادھر کبھی ادھر۔'' بلقیس نے منہ بنایا۔

''بڑا بیبا بچہ ہے۔ جب بھی آتا ہے کہتی ہوں شادی کر لے۔ کہتا ہے ماسی جس سے دل ملا اس سے نصیب نہیں ملا۔ اب تو یونہی عمر گزر رہے گی۔ پتا نہیں بدنصیب کس کے ساتھ......''

''ماسی! کوئی دوا بھی لی تو نے؟'' بلو نے گھبرا کر بات بدل دی۔

''ہاں، تاری کی ماں نے ایک کڑوا زہر شربت بھیجا تھا۔ اے وہی کہہ رہی تھی۔ شربت ہے۔ لو بھلا شربت بھی کڑوا زہر ہوتا ہے بھلا۔'' خیراں ہنس پڑی۔

''اب چلوں، میں، بڑی دیر ہوگئی ہے۔ اماں انتظار میں ہوگی۔''

''اماں، وہ چڑیل مرن جوگی تیری ساس، تو اسے اماں کہتی ہے۔ تجھے پتا نہیں مائیں کیسی ہوتی ہیں۔ بھلا وہ تو ڈائن ہے ڈائن۔''

بلقیس ہنس پڑی اور بولی۔

''او ماسی! میرے گھر والے کی ماں جو ہوئی تو میں اماں ہی بولوں گی اسے۔''

''گھر والا یہ بھی بھلی کہی۔ میں پوچھتی ہوں یہ کیسا گھر والا ہے جو مہمانوں کی طرح کبھی کبھی پھیرا مارتا ہے پھر تجھے ساتھ لے جاتا ہے نہ خود ملنے آتا ہے۔ دنیا دیکھ رکھی ہے میں نے مجھ سے جھوٹ نہ بول۔''

اس نے تولتی ہوئی نظروں سے بلو کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور تمسخر اڑایا۔ بلو جھینپ گئی اور اس جہاندیدہ عورت سے خود کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

''بے وقوف ہے تو نری بے وقوف۔''

''پر ماسی! میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ میرا کیا قصور۔ وہ جیسا چاہے مجھے رکھے۔ میں بھلا بول سکتی ہوں۔''

''اے جاؤنی وہ عورت ہی کیا جو اپنے مرد کو بھی قابو میں نہ رکھ سکے، اپنی ساس کی طرف ہی دیکھ لے مجال ہے جو تیرا اسسر ادھر سے ادھر ہو جائے۔ ساری عمر سر پر چڑھی رہی ہے وہ اس کے اور راج دل پر کیا ہے۔''

''اچھا ماسی! یہ بتا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔'' بلو اٹھ کھڑی ہوئی۔ خیراں نے ایکدم سے بازو پکڑ لیا اور بولی۔

''کتنے سال ہو گئے تیری شادی کو؟''

''جانے وے ماسی!'' اس نے آہستہ سے کہا اور خالی گھڑا اٹھا کر چلی آئی۔ ہاں آتے ہوئے خیراں کی بڑبڑاہٹ ضرور سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''ایک تیری فکر ہے، ایک سیف کی۔ تو شادی کر کے بھی نامراد اور وہ کرنے کو تیار ہی نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو میں تم دونوں کی شادی کرا دیتی۔ کرتے نا کوئی بک بک تو جوتے لگاتی گن کر۔''

''میرے نام کے ساتھ سیف کا نام مت لو خدا کے لیے۔'' خاموش لبوں نے التجا کی۔

گلی میں تاری کھڑی دور بچوں سے لڑتے اپنے بیٹے کو کوسنے دے رہی تھی جونہی اس پر نظر پڑی مسکرا کر بولی۔

''سنا ہے۔ مجتبیٰ آیا ہوا ہے تو تو بڑی خوش ہوگی۔ اے نی پردیسی جو گھر آیا ہے۔'' پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

بلقیس نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تجھے کیسے پتا چلا؟''

''میں ماسی خیراں کی طرف گئی تھی۔ وہاں سیف بیٹھا تھا۔ اسی سے پتا چلا۔''

ایک تو یہ سیف بھی، بلو نے سر جھٹکا اور گھر کی طرف چل پڑی تاری ایک بار پھر بچے کی جانب متوجہ ہوئی اور اسے ماں مرنے کی بددعائیں دینے لگی۔

☆......☆......☆

''سن! آج مرغ پکالے اور کہا ہے۔ تیرے چاچے سے ابھی کھیت سے ساگ بھیج دے گا۔ وہ بھی چڑھا دینا اور مکئی کا آٹا بھی گوندھ لے۔ بھلا ساگ کے ساتھ کنک (گندم) کی روٹی کیا مزا دے گی۔''

''ٹھیک ہے اماں! سب کر لیتی ہوں۔ بس ذرا کپڑے دھو کر ڈال دوں تیرے بیٹے کے۔''

اماں بڑبڑ کرتی گھر سے باہر چلی گئی کہ روز ہی اس کا وقت گھر پر کم اور ہمسائے میں رہنے والی اپنی رشتے کی بہن کے گھر زیادہ گزرتا تھا۔

اسے گئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دائی جیرن آ ٹپکی۔

اس کا آنا ہمیشہ کی طرح بلو کو الجھن میں مبتلا کر گیا۔ سلام کر کے وہ مجتبیٰ کے میلے کپڑے اٹھائے کمرے میں چلی گئی۔ بوڑھی خرانٹ دائی نیم کے نیچے ڈالی گئی کھاٹ پر بیٹھ گئی اور پیر ہلانے لگی۔ بلقیس کپڑے اٹھا کر باہر آئی تو بولی۔

''ایک گلاس دودھ کا پکڑا۔ مجھے بڑی پیاس لگ رہی ہے۔''

اس نے کپڑے وہیں چارپائی کے کنارے پر رکھ دیئے اور دودھ ڈالنے کو چلی۔ دائی جیرن نے کپڑے دیکھے تو دور بیٹھی بلو سے بولی۔

''مجتبیٰ آیا ہے کیا؟''

''ہاں!'' اس نے بھی وہیں سے جواب دیا اور دودھ میں چینی ڈالنے لگی۔

''میٹھا زیادہ ڈالنا۔ کم ہو تو میرا جی خراب ہونے لگتا ہے۔''

''اچھا!'' اس نے دو چمچ مزید ڈال دیے۔

''ہاں، تو مجتبیٰ آیا ہے۔''

''ہوں کب سے آیا ہوا ہے؟'' اس کے اسی انداز سے بلو کی جان جاتی تھی۔ گلاس اس کے ہاتھ میں دے کر وہ کپڑے اٹھا کر دھونے کے لیے نل پر لے آئی۔

''تیری ساس کہاں ہے؟''

''وہ ہمسائے میں ہیں۔''

'''اچھا پر مجھے اس سے ملنا تھا۔ بڑی اچھی طاقت ور دوا بنا کر لائی ہوں۔ مہنگی بھی بہت بنی ہے۔''

''ہونہہ لالچی عورت پیسہ بٹور رہی ہے۔ خوب سمجھتی ہوں میں۔ مجھ سے زیادہ بھلا کون سمجھے گا۔''

آنکھوں کے آگے دھند چھا گئی جسے اس نے بازو سے صاف کیا کہ ہاتھ صابن کے جھاگ سے بھرے ہوئے تھے۔ ''ذرا بلا کر لا اپنی ساس کو۔''

''ماسی! تو خود ہی جا کر مل لے نا۔ دیکھ میں بلاؤں گی تو شاید وہ نہ ہی آئے اپنی بہن کے پاس جو بیٹھی ہے۔''

''اچھا اچھا۔ میں جا کر مل لیتی ہوں اور یہ دیکھ لے۔ گلاس میں یہیں چھوڑے جا رہی ہوں پھر نہ کہنا بڑھیا گلاس بھی ساتھ اٹھا کر لے گئی۔''

''ہائے کتنا پیسہ برباد ہو رہا ہے میرا اس کالے منہ والی پر۔'' بڑھیا نے دائی سے دوا خرید لی تھی اور اب شامت بلو کی تھی۔

''اماں تو کیوں پیسہ لٹاتی ہے جو نصیب میں ہوگا وہی مل جائے گا۔'' مجتبیٰ شرمندہ تھا۔ سر جھکا کر بلقیس سے نظر چرا کر آہستہ سے کہہ رہا تھا۔

''بندہ دوا دارو بھی نہ کرے۔ شاید رب کو رحم آ جائے۔ ہو جائے علاج اس مصیبت ماری کا۔ میرے تو گھر سے خوشی چلی گئی جب سے اس نے قدم رکھا۔ اس گھر میں ماں باپ مر مرا گئے۔ اس مصیبت کو چھوڑ گئے۔ ڈال گئے ہمارے سر پر۔ پتا نہیں کب مرے گی یہ۔ بڑی ہی ڈھیٹ ہڈی ہے۔''

مجتبیٰ نے کبھی اس سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ نہ اچھی نہ بری کبھی کچھ نہیں، پر ماں جو یوں بول رہی ہے اور وہ جانتا ہے۔ بلقیس بے قصور ہے مگر پھر بھی خاموش ہے۔ قصور تو مجتبیٰ کا ہے مگر کون بول سکتا ہے کیسے کہہ سکتی ہے۔ اتنی بڑی بات وہ سب سے کیا کہے، دو سال ہو گئے شادی کو۔ اور گھر والے نے کبھی اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کیا۔ لوگ نہیں مانیں گے۔ الٹا اسے الزام دیں گے اور یہ بڑھیا یہ جو ساس ہے۔ یہ تو ایسی بات منہ سے نکالنے پر سانس پی جائے گی ـــــ چُپ رہنا ہے خاموش، آخر عزت سے زندگی گزر رہی ہے یہاں۔ وہ بیوی نہ سہی بہو تو ہے اور سر پر چھت ہے دربدر تو نہیں اور شوہر جیسا بھی ہو۔ سائیں ہوتا ہے سر کا۔ اس کا حکم تو ماننا ہوتا ہے۔ عبادت ہے یہ بھی اور اس کا کہنا یہی ہے کہ دور رہو مجھ سے۔ اس نے گہری سانس لے کر کروٹ بدلی اور سہاگ کی نشانی بازو میں بھری سرخ کانچ کی چوڑیاں چھنک اٹھیں۔ اسے مجتبیٰ کا انتظار نہیں کرنا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ پتا نہیں کب کمرے میں آتا۔ آتا یا نہ آتا کیا فرق پڑتا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

پرندے چہچہا رہے تھے۔ نمازی مسجدوں کو جانے لگے تھے۔ صبح ہو رہی تھی۔ مجتبیٰ اس کمرے میں اسی بستر پر کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ بڑھیا جاگ چکی تھی اور اس کے کھانسنے کی آواز کمرے میں آ رہی تھی۔

''اٹھ بدبخت! صبح ہو گئی ہے۔'' اس نے دروازے پر دستک نہیں دی کہ بیٹے کی نیند خراب ہونے کا ڈر تھا۔

''پتا نہیں۔ میری صبح کیوں نہیں ہوتی۔'' اس نے نم پلکوں سے سوئے ہوئے بے خبر وجود کو دیکھا اور تکیے پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر سر پر اوڑھا، پھر آہستہ سے بستر سے اتری اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ آج خنکی کا احساس پہلے کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ ہلکی ہلکی دھند بھی چھائی ہوئی تھی۔ بڑھیا نیم سے مسواک کے لیے مناسب ٹہنی تلاش کر رہی تھی۔ بلو نے جھاڑو لگانی شروع کی۔ ہمیشہ کی طرح پرسکون انداز بھلا کوئی اندازہ کر سکتا

تھا اس وقت دل کتنا رو رہا ہے۔
معمول کے کام چلتے رہے۔ سورج بلند ہوگیا اور دھوپ اب چھت سے ذرا ذرا نیچے کمروں کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ اس کی نگاہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجتبیٰ کے کمرے کی جانب اٹھ رہی تھی۔ پتا نہیں کب تک جاگے گا۔ کل تو سفر کی تھکن تھی۔ آج جلدی اٹھ جانا چاہیے تھا۔ پر پتا نہیں رات کب تک جاگتا رہا۔ میں تو سوگئی تھی۔ ماں کے کمرے سے دیر سے ہی آیا ہوگا۔ ویسے مجھ سے غلطی ہوگئی مجھے سونا نہیں چاہیے تھا۔ ایسی بھی کیا نیند پیاری ہوگئی تھی۔ اسے خود ہی غصہ آ رہا تھا وہ اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ بڑھیا روزانہ کی طرح کوستی رہی۔ بڑبڑاتی رہی۔ اس نے سنا ہی نہیں۔

مجتبیٰ جب تک اٹھا۔ اماں ابا بھی انتظار کرکے روٹی کھا چکے تھے اور بابا تو کھیتوں پر بھی جا چکا تھا۔ بلقیس جلدی روٹی کھا لینے کی عادی تھی۔

مگر مجتبیٰ سے پہلے نہیں کھا سکتی تھی۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی مگر خاموشی سے مرغیوں کو دیکھ رہی تھی۔ کل پانچ مرغیاں تھیں اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پیلے چوزے کتنے پیارے نرم نرم میٹھی آواز میں چوں چوں کرتے ہوئے وہ انہیں دیکھنے میں مگن تھی، جب مجتبیٰ کمرے میں سے باہر آ گیا۔

''آج خوب ہی سوئے پتر۔'' ماں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

وہ نل کی طرف بڑھا۔ بلقیس نے چولہے میں آنچ کم کردی تھی پر لکڑیاں بجھائی نہیں تھیں۔ وہ اس کے بے دار ہونے کی ہی منتظر تھی۔ آنچ تیز کی تو اچولہے پر رکھا اور مٹی کی کنال سے آٹا لے کر پیڑا بنانے لگی۔ جب مجتبیٰ کے سامنے روٹی رکھی تو ساتھ میں ساگ بھی تھا اور انڈے بھی۔ وہ ساگ شوق سے نہیں کھاتا تھا مگر بولا کچھ نہیں۔ بلو لسی اور اچار کے ساتھ چولہے کے قریب ہی بیٹھ کر روٹی کھانے لگی۔

''کوئی کام نہیں کرتی۔ سست ہے بہت۔ اوپر سے بیمار۔ ڈھیلی ڈھالی۔ کچھ بھی کہتی رہوں کوئی جواب نہیں ملتا۔ پتا نہیں کیا سوچتی رہتی ہے رانی۔ میں تو کہتی ہوں تو نے ڈھیل دے رکھی ہے ہڈ حرام کو۔''

بڑھیا بیٹے کو اس کے خلاف بھڑکاتی رہی مگر وہ چپ چاپ روٹی کھاتا رہا۔ کیا کہتا بلقیس کو، اگر ماں کی سب باتیں سچ بھی تھیں تو بھی وہ کچھ کہنے کا حق کہاں رکھتا تھا۔ اس نے کیا دیا تھا اسے جو رعب جماتا اور اسے حکم ماننے پر مجبور کرتا۔ وہ بلقیس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکا۔ روٹی کھائی اور اٹھ کر بھوری کے پاس آ گیا۔

''نی، اب سارا دن کیا یہیں بیٹھے بیٹھے گزار دے گی۔ اٹھ کر مجتبیٰ کا سامان باندھ دے، اسے آج دوپہر کے بعد واپس جانا ہے۔''

''اوہ آج واپس بھی چلے جانا ہے اور مجھے پتا ہی نہیں۔ واہ ری بلقیس بی بی یاد ہے اماں کیا کہا کرتی تھی؛ میری دھی کتنی سوہنی ہے راج کرے گی راج، اب آ کر دیکھ سکتی ہے تو دیکھ اماں کہ راج کر رہی ہوں۔ لائی تو دلہن بنا کر تھی۔ مجتبیٰ کی ماں مجھے، پر دولہا کو تیری سوہنی دھی بھائی نہیں تو یوں راج کرتے کرتے رہ گئی۔

اور وہ سیف کہتا ہے تیری آنکھیں جب میری طرف کبھی بھولے بھٹکے اٹھ جائیں تو سمجھتا ہوں آج دن نصیب والا ہے۔ روشنی ہی روشنی ہوگئی میرے اردگرد اور تو جو کبھی کسی بات پر ہنس لے میں کھو سا جاتا ہوں تو جادوگرنی ہے بلو۔ سیف...... بکواس کرتا ہے اسے عادت ہے باتیں بنانے کی۔ پتہ نہیں کس کس سے کیا کیا کہتا ہوگا جبھی تو شادی نہیں کرتا۔ آزادی اچھی لگتی ہے نا اسے گھر والی آ گئی پھر ہر لڑکی کو لارے پہ تو نہ رکھ سکے گا۔ بڑا کمینہ ہے۔ باتیں بنانا بہت آتی ہیں اسے مجھے کہتا ہے جادوگرنی اور جادوگر تو وہ خود ہے پر میں سیف کو کیوں سوچنے لگی۔ مجھے اٹھ کر سامان تیار کرنا ہے جس کا اتنا انتظار کرتی ہوں وہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے ہوا کے جھونکے کی طرح اور میں پھر سے انتظار شروع کر دیتی ہوں۔

وہ اٹھی اور کمرے میں آ کر اس کا سامان سمیٹنے لگی۔ ابھی وہ اس کام میں لگی ہوئی تھی کہ مجتبیٰ اندر آ گیا۔ اسے دیکھا تو وہ ٹھٹھکا یقیناً وہ نہیں جانتا تھا کہ بلقیس کمرے میں ہے اور جب واپس پلٹ رہا تھا، بلقیس نے ہمت کر کے کہا۔

''سنو جی، اتنی جلدی جا رہے ہو؟''

''میں تو ہمیشہ اسی طرح چلا جاتا ہوں۔'' انداز بیگانگی سے چور تھا۔

''کبھی لمبی چھٹی پر بھی آؤ نا۔ اماں ہر روز تمہیں یاد ہی کرتی رہتی ہے۔'' اس نے اماں کا سہارا لیا اور اپنا راز چھپالیا۔

''ہوں۔'' وہ دروازے کے کواڑ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ آگے نہیں آیا، جیسے خطرہ ہو آ گیا تو جالا بُن دیا جائے گا اس کے گرد، جس کا ہر تار ریشمی ہوگا اور پھر وہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے پر جوان گھبرو ہونے کے باوجود ریشم کے دھاگے توڑ نہیں پائے گا۔

''سب سے مل لیا گاؤں میں؟'' اتنی باتیں بلو نے کبھی اس کے ساتھ نہیں کی تھیں۔ لگتا تھا آج قسمت آزمائی کے ارادے میں ہے۔ پر مجتبیٰ پھندے میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ ہوشیار ہو کر کھڑا تھا۔

''دوپہر کو روٹی کھا کر ہی جاؤ گے نا جی؟''

''ہوں، میں تین بجے کے قریب گھر سے نکلوں گا۔''

''اچھا پھر کیا پکاؤں دوپہر کو؟'' ہاتھ روک کر وہ پورے شوق سے پوچھ رہی تھی۔

''جو تمہارا جی چاہے۔'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گیا اور اندھیرا ہوگیا۔

دوپہر کو اس نے قیمہ بھونا اور سوجی کا حلوہ بھی خوب گھی دودھ ڈال کر پکایا۔ روٹی اس کے آگے رکھ کر بغور دیکھتی رہی اندازہ لگاتی رہی کہ اسے پسند بھی آ رہا ہے یا نہیں۔ وہ معمول سے زیادہ کھا گیا۔ اس کا مطلب ہے پسند آیا ہے۔ اس کے لئے یہ خوشی ہی بڑی تھی۔

روٹی کھا کر کچھ دیر وہ اماں کے کمرے میں ہی آرام کی غرض سے لیٹ گیا کہ شاید بلو سے ڈر گیا تھا وہ ادھر ادھر کے چھوٹے موٹے کام نبٹاتی رہی۔ سوچ رہی تھی جب مجتبیٰ جائے گا تب تک سارے کاموں سے فارغ ہو کر دروازے میں کھڑی ہو کر دور تک اسے دیکھے گی۔ پر اماں نے اس کی سوچ پڑھ لی اور اسے گندم صاف کرنے پر لگا دیا۔ وہ چلا گیا۔ بلقیس گندم کے دانے چھاج میں ڈال کر صاف کرتی رہ گئی جب اس کام سے فارغ ہوئی تو سورج بھی الوداع کہنے کو تیار تھا۔ وہ اٹھی اور چولہا گرم کرنے کے جتن کرنے لگی۔

☆......☆......☆

اسے کچے سے پکے روڈ پر آ کر شیشم کی اس قطار کے نیچے کھڑے ہو کر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آج بس جلدی مل گئی اور پھر سیٹ بھی۔ وہ اطمینان سے بیٹھا اور آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کی بیک سے لگا دیا۔ اتنی تھکن کیوں ہو رہی ہے۔ گاؤں میں جتنا وقت بھی گزرا دوستوں سے باتیں کرتے یا پھر گھر پر آرام کرتے ہی گزرا۔ شاید آرام کر کر کے ہی تھکن ہو گئی ہے، شہر کی ہنگامہ خیز زندگی بھاگ دوڑ گہما گہمی اب یہ خاموشی، سکون مجھے عجیب سا لگنے لگا ہے اور پھر اس خاموشی میں کسی کی مسکراہٹوں کی نرمی نہیں ہے، یہ خاموشی مجھے بے آواز روتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہاں ان خاموشیوں میں بلقیس روتی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ ظلم تو اس پر بھی ہوا تھا۔ بابا نے مڈل کے بعد اسے شہر کے اسکول میں داخل کرا دیا پھر وہ کالج میں پڑھتا رہا اس کے بعد ملازمت مل گئی اور پھر ثمین سے ملاقات ہوئی، کتنی اچھی لڑکی تھی بااعتماد خوش مزاج اور قدم سے قدم ملا کر چلنے والی، وہ بھی سروس کرتی تھی اور پہلی ملاقات بھی آفس ٹائم آف ہونے پر اسٹاپ پر ہوئی تھی۔ اسے بہت خوب صورت ساتھی کی تلاش تو نہیں تھی۔ بس ایسی لڑکی چاہتا تھا جو دکھ سکھ میں ساتھ دے اور آج کا دور ایسا بھی نہیں کہ ایک فرد کمائے اور باقی سب کھائیں۔ وہ ایسی بیوی چاہتا تھا جو مالی مسائل کو سمجھ سکے اور اس کا ہاتھ بٹا سکے۔ وہ تو تین سال پہلے ہی ثمین سے شادی کر لیتا مگر اس کی مجبوریاں تھیں۔ بڑے بہن اور بھائی کا نمبر پہلے تھا پھر ماں بہت بیمار رہتی تھی۔ والد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ وہ اور اس کا بھائی سروس کرتے تھے اور گھر کی گاڑی کھینچتے تھے۔ اس نے مجتبیٰ سے انتظار کی درخواست کی جو اس نے قبول کر لی مگر یہ بھی کہا تھا کہا گر منگنی ہو جائے تو اچھا ہے۔ کوئی خوب صورت بندھن تو ہو ہمارے درمیان اور یہ بات ثمین نے بھی مان لی۔

مجتبیٰ کی بات بچپن سے ہی برادری کی ایک لڑکی بلقیس کے ساتھ طے تھی مگر وہ گاؤں کی لڑکی کو زندگی کا ساتھی بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے سالوں سے شہر میں تھا، وہ بھول ہی گیا گاؤں میں جب ایک بار زبان دے دی جائے تو پھر اسے نبھانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس نے تو سوچا تھا اب گاؤں جاؤں گا تو کہہ دوں گا اماں سے صاف صاف نہیں کرنی مجھے بلقیس سے شادی۔ آپ کہہ دیں اُن لوگوں سے۔ وہ جہاں چاہیں اپنی بیٹی کی شادی کر دیں۔

بہت سادگی سے اس نے ثمین کو انگوٹھی پہنائی اور ڈھیروں مٹھائی کے ساتھ اماں ابا کو اطلاع دینے گاؤں چلا آیا۔

ارے گھر میں تو آج گہما گہمی تھی رونق تھی، راستے میں اسے سیف ملا تھا سلام کیا تو صرف سر کے اشارے سے جواب دے کر خاموشی سے راستے سے ہٹ گیا۔ بتایا ہی نہیں گھر میں اتنی رونق لگی ہے مگر کس سلسلے میں ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔

مجتبیٰ کو دیکھتے ہی گھر میں موجود برادری کے لوگ اس کی طرف بڑھے تھے اور مبارک باد دے رہے تھے۔

''ہوں بھائی بہت سی مٹھائی لے کر آیا ہے۔'' ایک لڑکی نے ڈبہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کھولنے لگی۔ ''میرا پتر آیا ہے۔'' اماں کو اطلاع ملی تو بے قراری سے اس کی جانب لپکی۔

''یہ سب کیا ہے اماں؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پتر بڑا مبارک دن ہے، آج تجھ سے ملنے کو بڑا دل کر رہا تھا۔ تو بھی آ گیا اور میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔'' ''اماں! یہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اتنے سارے لوگ، یہ رونق اور تو تو آج بہت ہی خوش نظر آ رہی ہے۔''

''لو اب ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے ہی کرے گا۔ آ جا اندر آ جا۔''

اماں ہاتھ پکڑ کر سب کے درمیان سے گزارتی اندر لے آئی۔ لا کر کمرے میں بستر پر بٹھا دیا۔

''بڑی منتوں مرادوں کے بعد آج کا ویلا وقت دیکھا ہے میں نے۔ بڑی خوش ہوں آج میں۔ پتہ ہے بلقیس کل تک تو صرف زبانی کلامی ہی تیرے نام تھی، آج دو پہر میں نے اسے تیرے نام کی انگوٹھی بھی ڈال دی ہے۔''

''اماں......!'' اس کے سینے پر جیسے کسی نے گھونسہ رسید کر دیا۔

''مجھ سے پوچھے بغیر، مجھے اطلاع دیئے بغیر ہی اماں!'' وہ اضطراب میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''لو بھلا پوچھنا کیسا۔ تیرے نام پر بیٹھی ہے۔ یہ بات تو بھی جانتا ہے اور اطلاع کیا کرتے انگوٹھی تو مجھے ہی جا کر پہنانی تھی ہاں اگر شادی تجھے بلائے بغیر ہو جائے تو روٹھنے کی بات بھی ہے۔'' اماں نے ٹھٹھا لگایا آج اس کی خوش مزاجی عروج پر تھی۔

''پھر بھی اماں۔'' وہ بضد تھا۔

''پھر بھی کیا، بس شادی تو یہیں ہونی ہے تیری۔'' اب کے اماں ٹھٹکی تھی اور اسے احساس دلایا تھا۔

''کیا یہ ضروری ہے؟''

''چپ دوبارہ یہ بات نہ کرنا۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ کسی نے سن کر بلقیس کے چاچے سے جا کر کہا تو ابھی کلہاڑے چھرے نکل آئیں گے۔ پتر تو اپنی روایات بھول گیا ہے شاید، لڑکی جس کے نام پر بیٹھتی ہے اسی سے بیاہی جاتی ہے۔ اگر انکار ہو تو معاملہ قتل تک پہنچ جاتا ہے۔ تو اب نہ بولیں۔''

''پر اماں میں گاؤں میں بیاہ کرنا ہی نہیں چاہتا۔''

''چاہے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تیری قسمت میں لکھی گئی ہے آ کر ہی رہے گی اور پر برائی کیا ہے اس میں۔ رج کے تو سوہنی ہے وہ۔''

''اماں! مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ اچھی ہے یا بری ہے تو گاؤں کی دیہاتن جو میرے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔''

''کہا نا پتر چپ کر جا نہیں تو ابھی معاملہ ہی الٹ جائے گا تو بلقیس کے چاچے کو نہیں جانتا، بات بات پر لڑنے مرنے پر اتر آتا ہے اور انکار ہوا تو پھر وہ جو بھی کر گزرے کم ہوگا۔ تو چپ کر کے یہ گھٹ (گھونٹ) بھر لے۔''

اس نے سوچا شاید کوئی صورت بن جائے اور معاملہ منگنی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ درمیان میں ہی سلسلہ

ختم ہو سکے مگر ایسا ہوا نہیں۔ گاؤں میں اماں شادی کی تیاری کرتی رہی اور پھر ایک بار جب وہ گاؤں میں آیا تو اماں نے کہا۔ "اس مہینے کے آخر میں زیادہ چھٹی کے ساتھ آنا شادی کی تاریخ دے دی ہے ہم نے۔"

بہتیرا بولا۔ ہاتھ پاؤں مارے مگر عملی طور پر اس نے بھی کچھ نہیں کیا کہ بلقیس کے دونوں چاچوں سے وہ واقف تھا اور روایات سے بھی، انکار کے بعد تو شاید وہ اس دنیا میں بھی نہ رہتا۔ بہتر یہی تھا، سارا غصہ ماں کے سامنے بول بول کر ہی نکال لے اور دل پر جبر کر کے سہرا باندھ لے ایک بار وہ اس گھر میں دلہن بن کر آ جاتی پھر یہ اس کے اختیار میں تھا کہ کہاں جگہ دیتا اسے۔

اور وہ دلہن بن کر آ گئی آنکھوں میں ہزار خواب تھے اور آنکھوں پر جھکی پلکوں کا پردہ تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہی روایاتی استقبالی گیت گاتی ہنستی مسکراتی لڑکیوں سے بھرا آنگن بڑے سے صحن کے آخری کونے میں بڑی دیگیں جن میں صبح ولیمے کا کھانا پکنا تھا اور پورے گھر پر لگی رنگ برنگے کاغذ کی جھنڈیاں جو ہوا سے ہل رہی تھیں۔ اسے احساس نہیں ہوا کچھ کمی ہے۔ یہ احساس تب ہوا جب مجتبیٰ رات گئے اس کے کمرے میں آیا اور اس رات ارمانوں کی پھوار میں بھیگتی لڑکی آنسوؤں کی بوچھاڑ میں تھک کر ہار گئی ڈوب گئی۔

ولیمے کی شام ہی وہ واپس چلا گیا اور بلقیس سر میں درد کا بہانہ کر کے لڑکیوں کی باتوں ان کے سوالوں سے بچنے کے جتن کرنے لگی۔

"چاچا! اتنی جلدی چلا گیا مجتبیٰ۔" باہر سے آتی آواز یقیناً سیف کی تھی۔ کسی تیز دھار آلے نے جیسے سر سے پاؤں تک اسے چیر ڈالا۔ درد کی شدید لہر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

یہ یہاں کیوں آیا ہے۔ مجتبیٰ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، خاموشی سے کمرے میں آیا منہ دکھائی میرے آگے رکھی پر گھونگھٹ اٹھا کر شکل نہیں دیکھی، کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ میں نصیبوں کو روتی رہی، کہیں سیف نے تو کچھ کہہ نہیں دیا مجتبیٰ سے۔ ہائے کیا بگاڑا ہے میں نے اس کا، میں جانتی تھی، میں امانت ہوں مجتبیٰ کی، جو کچھ کہا سیف نے مجھ سے کہا۔ میں نے تو کبھی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا، پر کیا پتہ لگا دیا ہو۔ جھوٹ سچ۔ اس کا جی چاہا ابھی اٹھ کر صحن میں جائے اور سیف کا گریبان پکڑ کر اس سے اپنا قصور پوچھے۔

وہ دوپٹے سے بے نیاز پلنگ پر پریشان بیٹھی تھی۔ جب چاچی کے ساتھ وہ اندر آ گیا۔

"سلام کو حاضر ہوا ہوں جی۔" دروازہ چاچی نے کھولا تھا۔ وہ ذرا پیچھے تھا اور اسے یوں بیٹھے دیکھ کر وہیں سے رک کر کہا تھا۔ چاچی نے جلدی سے آگے ہو کر دوپٹہ اس پر ڈال کر گھونگھٹ نکال دیا۔

"شہر چلا گیا تھا میں۔ شادی میں شریک ہی نہیں ہو سکا۔" اس نے سلامی کی رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"میں تیرے لئے مٹھائی لاتی ہوں پتر۔"

"ہاں ہاں چاچی، مٹھائی تو میں ضرور کھاؤں گا۔" وہ سامنے والے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بڑھیا باہر نکل گئی اور بلو کا دل پسلیاں توڑنے لگا۔ پتہ نہیں اب یہ کیا کہے گا۔ اس نے بلو کے جھکے سر کو دیکھا۔ گھونگھٹ اتنا لمبا تھا کہ وہ اب تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

"ہائے جیت گئے ریت رواج اور ہار گئے ہم دل والے۔ دیکھ لینا ساری عمر تیرا نام لے کر گزار دوں گا بلو! یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔" "سیف! تو چلا جا یہاں سے۔"

منہ اوپر کئے بغیر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں التجا کی۔

"مٹھائی تو کھانے دے آخر تیری شادی ہوئی ہے بلو!" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے گھبرا کر دوپٹہ پیچھے کیا اور بولی۔

"تو میری جان چھوڑ نہیں سکتا۔" اس نے بجی سنوری بلو کو کب دیکھا تھا۔ ایک بجلی سی چمکی اور سیف کے نامراد دل پر اس زور سے گری کہ نچلا ہونٹ سختی سے لب تلے نہ دباتا تو آہ لبوں سے نکل ہی جاتی۔ اس کی آنکھوں میں کیا تھا۔ بلو جھلاہٹ برقرار نہیں رکھ سکی سر پھر جھکا لیا اور بولی۔

"یہ قسمت کا لکھا ہے اور کیا پتہ جو تیری قسمت ہو۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ سوہنی ہو۔"

"ہاہ، سوہنی میری قسمت، تجھے بتایا تو ہے اب کوئی نہیں، تُو نے ٹھکرا دیا تو بھی سیف کی محبت مری نہیں زندہ ہے اور جب تک زندہ رہوں گا میرے ساتھ ساتھ رہے گی۔ تیری محبت بھی اور تیرا سایہ بھی۔"

"پتر روٹی کھا کر جانا۔" بڑھیا مٹھائی کی پلیٹ لے کر آ گئی۔ سیف نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی پر ایک ٹکڑا بھی نہیں کھایا گیا بڑھیا بولتی رہی، وہ سنتا رہا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

وہ مجتبیٰ کی آمد کا انتظار کرتی رہتی تھی مگر وہ نہیں آتا تھا۔ سیف کے آنے پر گھبراہٹ ہوتی تھی اور وہ تھا کہ آتا رہتا تھا۔ اسے یقین تھا، سیف نے ہی کچھ کہہ دیا ہے ورنہ مجتبیٰ ایسا کیونکر کرتا اس کے ساتھ، بھلا کیا قصور ہے میرا۔

ایک روز چاچی سو رہی تھی کہ سیف آ گیا اور اسے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"مجھ سے۔" وہ حیران ہوا پھر فوراً ہی ہنس کر بولا۔

"ہائے بھاگ جاگ گئے میرے تو کہہ ناں کیا کہنا چاہتی ہے مجھ سے؟"

"شادی سے پہلے تو مجتبیٰ سے ملا تھا، ہے نا!؟"

"ہاں کئی بار، کیوں اب تو پابندی لگا رہی ہے مجھ پر؟" وہ پھر مسکرایا۔

"کیا کہا تھا تو نے مجتبیٰ سے؟" اس کے لہجے کی سختی برقرار تھی۔

"اب تو یاد بھی نہیں۔ ایسی کوئی خاص بات کی بھی نہیں تھی میں نے۔"

"میرے بارے میں کچھ کہا تھا، بول سیف! کہا تھا کچھ؟" وہ دانت پیس کر مگر دھیمی آواز میں مخاطب تھی کہ ڈر تھا بڑھیا نہ جاگ جائے۔

"تیرے بارے میں؟" اس نے حیران ہو کر بلو کی طرف دیکھا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"بھلا تیرے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا تھا اسے؟"

"تو جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے، ورنہ میں جانتی ہوں سب کیا دھرا تیرا ہی ہے۔"

"کھل کر بات کر بلو؟ کیا ہوا ہے تیرے ساتھ! یہ تو میں بھی پہچان رہا ہوں تو خوش نہیں ہے اس گھر میں۔ نئی دلہنوں والی کوئی بات مجھے تجھ میں دکھائی نہیں دیتی۔"

"وے زیادہ ہمدردی نہ جتا۔ میں اتنی بھولی نہیں ہوں۔ خوب سمجھتی ہوں اور یاد رکھ کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"میرا قصور بھی تو بتا بلو! یقین کر میں کچھ سمجھ ہی نہیں رہا کہ تو کہہ کیا رہی ہے۔"

"کیا بگاڑا تھا میں نے لاج رکھی اپنے ماں باپ کی اس میں برائی کیا ہے، پر تیرا ظرف بڑا چھوٹا نکلا سیف! تو نے بدلہ لیا ہے مجھ بے قصور سے۔" اب وہ رونے لگی تھی۔

"مجتبٰی تیرا نہیں ہوسکا، تیرا بن کے بھی نہیں بن سکا۔ اس سے زیادہ دکھ کی بات میرے لئے اور کیا ہوسکتی ہے، میں تیری خوشی میں اپنا دکھ بھلانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے سوچا تھا ہر خوشی تجھ سے ہے پھر تو خوش ہے تو کیوں آنسو بہا رہا ہوں میں، جبھی تو تیرے بیاہ کے دوسرے ہی روز پھر گاؤں پلٹ آیا اور اس دلیز پر بھی آ گیا جہاں تو کسی اور کی دلہن بن کر آئی ہے۔ پر تو نے یہ کیا سنا دیا جس کے لئے میں نے اپنا دل مار دیا، اسے خوشی نہیں ملی۔ مجتبٰی نے قدر ہی نہیں کی تیری اور بلو! تو بھی مجھے الزام دے رہی ہے۔"

کتنا دکھ تھا اس کی آنکھوں میں، چہرے پر، آواز میں۔

"یقین تو مجھے بھی نہیں تھا۔ بھلا تو میرے ساتھ کس طرح برائی کرسکتا ہے۔ پھر سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں تھا اسی لئے شک کرگئی۔ مجھے معاف کردینا اور سن جو دکھڑا میں نے تیرے آگے رویا ہے اسے کسی سے کہنا مت، ورنہ میں سارے گاؤں کے سامنے شرمندہ ہوجاؤں گی، سر جھک جائے گا میرا۔ دیکھ ہاتھ جوڑتی ہوں، پردہ رکھ لینا۔"

"فکر نہ کر، تیرا سر جھکنے نہیں دوں گا۔"

وہ چلا گیا، بلو چولہے میں آگ جلانے لگی لکڑی گیلی تھی جلتی ہی نہ تھی اور بلو کو سر سے پیر تک آنسوؤں میں بھگو دیا تھا پر پھر بھی دل میں الاؤ دہک رہا تھا، وہ ساری ساری رات جلتی تھی، سارا سارا دن سلگتی تھی، نہ نمی دور ہوتی تھی نہ آگ کم ہوتی تھی۔ وہ جلتی رہی جلتی رہی دن مہینوں میں پھر سالوں میں بدل گئے۔ وہ انتظار کرکر کے نہیں تھکی۔ آنے والا آیا نہیں اور جس سے کہتی تھی تو یہاں نہ آیا کر، وہ روزانہ ہی چکر لگا جاتا تھا اور کہتا تھا۔

"بس چلے تو یہیں ڈیرا ڈال لوں۔"

بلقیس نے کئی بار ماسی خیراں سے کہا۔

"ماسی! یہ سیف تیرے گھر اتنا آتا جاتا ہے تجھے ماں کی جگہ مانتا ہے، کہیں بات لگا اس کی کب تک اکیلا پھرتا رہے گا۔" اور خیراں کہتی۔

"بہت مرتبہ کہا ہے میں نے اسے پر مانتا ہی نہیں۔" اور ایک روز جب خیران نے آگے کو جھک کر رازداری سے کہا۔

"مجھے پتہ چل گیا ہے وہ کیوں نہیں مانتا۔" بلو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں خیراں کی طرف دیکھا کہ لگی ہے جیتے جی مارنے کی خبر سنانے۔

"آج بہت پوچھا، بڑی گالیاں دیں میں نے اسے تب بولا، مجھے محبت ہے ایک لڑکی سے، جب اسے بھی مجھ سے محبت ہوجائے گی تو کرلوں گا شادی بھی۔"

میں بولی "وے جھلیا (پاگل) شادی کرلے۔ محبت بھی ہوتی رہے گی۔"

بولا "ناں، ایسے تو وہ راضی نہیں ہوگی، کبھی نہ مانے گی۔ اب اللہ جانے کب اس کے دل میں اس جیون جوگے کی محبت پڑے تو کب ویاہ ہو۔"

ہنستے ہوئے بڑھیا کہہ رہی تھی اور بلقیس کی بھی جان میں جان آ گئی تھی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر اچانک جیسے خیراں کے ذہن میں یہ بات آئی، کہنے لگی۔

"نی تیرے گھر بھی بڑا جاتا ہے، وہ کہ آخر مجتبٰی کی برادری کا ہے۔ دیور ہوا رشتے سے تیرا، تو بڑی بھابی بن کے پوچھ ذرا اس سے۔ کون ہے وہ جس کے پیچھے رل گیا ہے، جوانی برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"ماسی! ہمارے گھر آتا ہے وہ پر میری تو کبھی زیادہ بات نہیں ہوئی۔ وہ اپنی چاچی سے ملنے ہی آتا ہے اور مل کر چلا جاتا ہے۔" بلو خوب جانتی تھی اکیلی عورت کی عزت کتنی نازک ہوتی ہے۔ شوہر پردیس میں بوڑھا سسر کھیتوں پر، اسے چوکنا رہنا تھا۔ ہر قدم سنبھل کر اٹھانا تھا۔ سیف ان کے گھر آتا تھا تو اور بھی بہت سے گھروں میں آتا جاتا تھا۔ بظاہر یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی اور نہ ہی خیراں نے اس قسم کی کوئی بات ذہن میں رکھ کر اسے یہ کہا تھا مگر اس کے اپنے دل میں چور تھا۔ وہ ڈر گئی تھی اور دل ہی دل میں سیف کو کوس رہی تھی۔ پھر وہ جب بھی خیراں کے پاس جاتی اور خیراں کی باتوں میں تو اکثر سیف کا ذکر آتا کہ وہ اس کا بیٹا بنا ہوا تھا، تب بلو ضرور اسے کہتی۔

"تو سیف کو سمجھا۔ چھوڑ دے اس لڑکی کا خیال اور اب کرلے شادی۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے وہ کسی اور کو چاہتی ہو اور یہ عمر گال (ضائع) دے اس کے انتظار میں۔"

وہ دوپہر کی روٹی ڈال رہی تھی سیف گھر میں آیا اور سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔

"یہ تو کیا ہر وقت ماسی خیراں کو پٹی پڑھاتی رہتی ہے۔" وہ خاصا سنجیدہ ہورہا تھا۔

"کیا کیا ہے میں نے؟" اس نے روٹی توے پر ڈالی۔

"ایک ہی بات۔ سیف کی شادی کردو ناں۔ تجھے کیا تکلیف ہے میرے کنوارے رہنے سے۔"

"شادی ہوگی تو روز روز یہاں نہیں آیا کرے گا۔" اس نے سچ سچ کہہ دیا۔

"جتنا مرضی زور لگا لے۔ بڑا سچا ہوں اپنی محبت میں، نہیں کروں گا کسی اور سے بیاہ۔"

"پاگل ہے تو۔" بلو جھلائی۔

"ہاں کہہ لے جو بھی کہنا ہے پر یاد رکھ میری محبت تو ہے صرف تو بلقیس! تیری شادی مجتبٰی سے ہوگئی تو کیا ہوا، میرے دل میں ہمیشہ سے یہی نام ہے اور پھر تیرا کیا دوش۔ محبت میں نے کی ہے، تو نے نہیں۔ تو تو ہمیشہ

سے مجتبیٰ کی ہے اور اس نے تیری قدر نہیں کی۔ جیسے بلو نے سیف کی نہیں کی۔ ہاں دل لگانے والے ہمیشہ روتے ہی دیکھے ہیں ہم بھی روئیں گے بلقیس مجتبیٰ کے لئے اور سیف بلقیس کے لئے۔"

"تجھے رب کا واسطہ چپ کر جا۔ اپنا نہیں تو میرا خیال کر لے۔ کیوں مجھے بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کسی نے تیری باتیں سن لیں تو میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی اور دیکھ اماں اندر بیٹھی ہے جا کر اس کے پاس بیٹھ۔ ہمسائی نے دیوار سے جھانک لیا تو میرے لئے اچھا نہیں ہوگا۔"

"چلا جاتا ہوں اماں کے پاس، ہونہہ سارے زمانے کی فکر ہے نہیں ہے تو میری نہیں ہے۔" وہ آج پہلی مرتبہ غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

مجتبیٰ گاؤں بہت کم آتا تھا، شادی کے بعد بھی معمول نہیں بدلا گاؤں میں لوگوں کے پاس وقت کھلا اور دلچسپیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ فالتو وقت وہ دوسروں کی ٹوہ میں رہ کر گزارتے ہیں، پہلے پہلے مجتبیٰ کے کم آنے پر لوگ اماں اور بلقیس سے سوال کرتے۔ یہ شہر میں بہت زیادہ کام کا بہانہ بنا کر مطمئن کر دیتیں مگر کب تک چلتا یہ بہانہ۔ آخر لوگوں نے اندازہ لگا ہی لیا کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔ سوہنی بلو مجتبیٰ کے دل کو چڑھی نہیں، حیرت ہے اور وہ کیا حور پری چاہتا تھا، ضرور کوئی چکر ہے۔ پسند کی ہوگی کوئی شہر کی اور اب عورتیں بغور بلو کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ مجتبیٰ کی ماں کو یہ گوارہ نہیں تھا۔ اس نے بلو کے خلاف محاذ باندھ لیا۔ وہ بہو میں ہزار برائیاں نکالتی اور کہتی۔

"جبھی تو میرا بیٹا شہر سے گاؤں آتا نہیں ہے۔" اب بچہ نہیں ہوا تھا، بڑھیا آئے گئے کے سامنے دکھڑا روتی تھی۔ لوگوں کو نہ بلو سے ہمدردی تھی نہ اس کی ساس سے۔ انہیں دلچسپی اس سارے قصے سے تھی جو ابھی تک کھل نہیں سکا تھا۔ وہ جاننے کو بے چین تھے کہ اصل معاملہ کیا ہے وہ کبھی کبھی کھیتوں پر بابا کو روٹی دینے جایا کرتی تھی "او بھرجائی! مجتبیٰ شہر سے آیا یا نہیں؟" پہلے پہلے انداز اپنائیت بھرا ہوتا پھر اس میں تجسس کا رنگ نمایاں ہوا اور اب وہ صاف محسوس کرتی تھی۔ اکثریت یہ سوال صرف مذاق کے رنگ میں کرتی تھی۔ ایک پوچھتا، باقی ہنس پڑتے اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی لوگوں سے بچتی بچاتی کھیتوں تک جاتی۔

"چن ماہیا تیری راہ پئی تکدی آں۔"

کسی آوارہ لڑکے نے ایک روز تان بھی اڑا دی تھی۔ اس کا دل ہوکنے لگا۔ کیا میں مجتبیٰ کے ہوتے ہوئے بھی بے آسرا ہوں۔ لوگ کس دلیری سے مذاق اڑا لیتے ہیں۔ ہاں سب سمجھ گئے ہیں میری حیثیت مجتبیٰ کے گھر میں کچھ بھی نہیں۔ میں دوہٹی نہیں نوکرانی ہوں میرے سر پر دوپٹہ نہیں ہے، میں کھلے منہ کھڑی ہوں۔ اس کا دل بھر آیا۔

"کتھے جاویں او، ہیں جی؟" وہ لڑکا پیچھے آ رہا تھا اور اس سے فاصلے پر دائیں جانب کماد کی فصل میں سیف کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے پوری آواز میں اسے پکارا۔ وہ چونکا پھر اس پر نظر پڑی تو دوڑتا ہوا اس تک آیا۔

"خیر تو ہے بلو؟" جس طرح اس نے آواز دی تھی، پریشانی ہونا ہی چاہئے تھی۔ بلو نے مڑ کر پیچھے

دیکھا، وہ لڑکا تیز قدموں پر واپس بھاگ رہا تھا۔

"میں ڈر گئی تھی۔" اس نے آنکھ میں آئے آنسو دوپٹے سے پونچھ ڈالے۔

"ڈر گئی تھی۔ پر کس سے؟" وہ سمجھ نہیں سکا۔ "اپنے آپ سے۔"

"ہاں میں اپنے آپ سے ہی ڈر گئی تھی۔ یونہی بلا لیا تھا تجھے۔ اب جا وہ جس کے ساتھ تو باتیں کر رہا تھا ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ چل پڑی۔ سیف اس کے نہ سمجھ میں آنے والے انداز پر حیران کتنی دیر وہیں کھڑا رہا۔

اس نے سوچا تھا اب وہ گھر سے نکلنا بہت کم کر دے گی، اس واقعے نے بہت ڈرا دیا تھا۔ جانتی جو تھی، بات پھیلی تو پھر اس کی حمایت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ جو لڑکی بدنام ہو جائے اسے نہ میکا قبول کرتا ہے اور نہ سسرال۔ پھر اس کی ساس تو پہلے ہی الزام لگاتے نہیں تھکتی تھی۔ اب جو یہ بات ہاتھ آ جاتی تو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتی اور پیچھے میکے کے نام پر باپ نہیں چاچے تھے۔ وہ کیوں رکھ لیتے اسے اپنے پاس، وہ بہت ڈر گئی تھی۔ رات دیر تک جاگتی رہی اور سوچا اس بار جب مجتبیٰ آئے گا اس سے اپنا قصور ضرور پوچھوں گی، اگر بیاہ کیا ہے تو پھر اپنی ذمہ داری نبھائے بھی۔ کیوں مجھے اپنے جیتے جی بیوہ بنا دیا ہے اس نے۔ ذرا بھی خیال نہیں اسے اپنی عزت کا، اگر آج کھیتوں میں سیف نہ ہوتا، اسے بہت سے قصے ایک دم سے یاد آئے۔

اب گاؤں وہ پہلے والے گاؤں کہاں رہے تھے کہ ہر عورت ماں بہن بیٹی تھی۔ گاؤں کی عزت کی حفاظت کی جاتی تھی۔ اب تو اوباش نکلے لڑکے کچھ بھی کر گزرتے تھے اور پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اماں کو یہ کہہ نہیں سکتی تھی کہ میں کھیت پر روٹی لے کر نہیں جاؤں گی۔ اتنی ہمت اس میں کہاں تھی کہ وہ کوئی کام اس کے ذمہ لگاتی اور بلو انکار کر دیتی۔ یہی سوچا، سیف تقریباً روز صبح چاچی کو سلام کرنے کے بہانے آتا ہے۔ اب آئے گا تو کہہ دوں گی۔ یا تو خود ابا کی روٹی دوپہر کو لے جایا کرے یا کسی بچے کو کہہ کر منگوا لیا کرے۔ جب وہ آیا۔ چاچی پڑوس میں گئی تھی بلو نے موقع دیکھ کر یہ بات اس سے کہہ دی۔

"ٹھیک ہے۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں مگر یہ بتا ہوا کیا تھا؟ ایکدم سے اتنی خوفزدہ کیوں ہو گئی تھی۔"

تب اس نے سچ بات کہہ دی۔

"اسی وقت بتانا تھا کھال کھینچ لیتا کمینے کی۔" مارے غصے کے اس کا چہرہ دہکنے لگا۔

"ناں میں کوئی بدنامی مول نہیں لے سکتی۔ تو سمجھ ناں میری بات کو۔"

"بلو! ایک بات کہتا ہوں دیکھ اس میں تیری بھلائی ہے، ابھی کچھ نہیں بگڑا چھوڑ دے اس کو جو تیرا نہیں ہے۔ ساری عمر کیوں جلتی بھٹی میں گزارنا چاہتی ہے۔"

"تیری تو مت ماری گئی ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی لڑکی طلاق مانگ لے۔ اس سے تو بہتر ہے زہر کھا لوں۔"

"اگر اسے بسانا نہیں ہے تو رکھا کیوں ہوا ہے۔ آخر چاہتا کیا ہے وہ؟" سیف کو اب مجتبیٰ پر غصہ آ رہا تھا۔ "تجھے کیا۔ یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے اور یاد رکھ وہ میرا گھر والا ہے، سر کا سائیں کیسا بھی ہو۔ عورت

اسے مان دیتی ہے۔ عزت کرتی ہے اس کی۔ اگر تو نے اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

سیف سر جھٹک کر چاچی کے کمرے میں چلا گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ چاچی نے بھی زیادہ دیر نہیں لگائی جلدی آ گئی اور جب وہ سیف کے پاس کمرے میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگی تب ہی بلو لسی لے کر کمرے میں گئی حالانکہ سیف نے آتے ہی کہا تھا پیاس لگی ہے پانی تو پلا مگر پھر دوسری باتیں شروع ہوگئیں۔ وہ لسی کا پیالہ لے کر گئی۔ اس کے قریب رکھ دیا اور واپس آ گئی۔ اندر کمرے میں چاچی ہی بولتی رہی۔ کام نبٹاتی بلو نے سیف کی آواز ایک بار بھی نہیں سنی۔

جب وہ کمرے سے باہر نکلا۔ تب بکری کا بچہ گود میں لیے بیٹھی تھی۔ قریب آ کر رک گیا اور بولا۔

"ساری عمر بکری کے بچے کھلائے گی۔؟"

"اور تم نے اپنے بارے میں بھی سوچا ہے۔" اس نے جل کر جواب دیا۔

"ہاں سوچتا ہوں میں اپنے بارے میں، وہ تیرا فیصلہ کرے تو میں بھی پار لگوں اب آئے تو کہہ دینا مرد ہے تو مرد بن کر سوچے۔"

"سیف! وہ میرا گھر والا ہے۔ سہاگ ہے میرا سنا تو نے۔"

وہ ایکدم سے تن کر کھڑی ہوگئی اور سیف کو افسوس کے انداز میں سر جھٹک کر جانا پڑا۔

"کیوں کرتا ہے ایسی باتیں اب جبکہ میں کسی کی گھر والی ہوں۔ یہ نکل کیوں نہیں جاتا میری زندگی سے۔"

اسے یاد تھا وہ دن جب وہ آخری بار سیف کے ساتھ گٹے کھیلتی تھی اور اماں نے آواز دے کر اسے گھر بلایا تھا۔

"میں ابھی آتی ہوں تم لوگ بے ایمانی نہ کرنا۔" اس نے سیف اور شینو سے کہا تھا۔

"کہاں تھی تو اتنی دیر سے؟" اماں نے آنکھیں دکھائیں۔

"وہ میں ادھر چاچے فضل کے گھر میں۔"

"اچھا اچھا بس چپ۔" ماں اسے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے آئی جہاں مجتبیٰ کی ماں مٹھائی کے ڈبے اور گوٹے والے سوٹ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"یہ کپڑے، یہ مٹھائی۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"آ ادھر آ کے بیٹھ بلو!" ماسی نے بڑے پیار سے اسے قریب بلایا اور دوپٹے کے پلو سے سرخ نگ والی انگوٹھی کھول کر اس کی انگلی میں ڈال دی۔

"لے بہن! دمی تو یہ میری پہلے ہی تھی اب رسم بھی پوری کر دی میں نے، یہ مٹھائی بانٹ دے سارے پنڈ میں پتا چل جائے سب کو اب بلقیس میری مجتبیٰ کی منگ ہے۔"

"مجتبیٰ کی منگ!" اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا شہر میں پڑھنے والا لڑکا اس کے تو چرچے سارے گاؤں میں ہیں اور میں گاؤں کی ان پڑھ اس کی کیفیت عجیب سی تھی۔ خوشی سے زیادہ گھبراہٹ سوار تھی اس پر۔

اماں نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد مجتبیٰ کی ماں چلی گئی اور اماں مٹھائی تھال میں ڈال کر گاؤں میں بانٹنے چلی گئی۔ وہ گھر میں اکیلی بیٹھی ہاتھ میں پڑی انگوٹھی کو دیکھ رہی تھی جب سیف آندھی وطوفان کی طرح گھر میں داخل ہوا۔

"یہ کیا ہوا ہے بلو اور تو نے بھی پہن لی چپ کر کے؟" سیف کا یہ انداز، بلو گھبرا گئی اور ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"یہ نہیں ہو سکتا تجھے یہ انگوٹھی واپس کرنا پڑے گی۔"

وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اس سے پہلے بلو کی سہیلیاں آ گئیں اور وہ واپس چلا گیا۔

"اماں! مجھے مجتبیٰ سے شادی نہیں کرنی۔" رات بڑی ہمت کر کے اس نے کہہ دیا ماں تھی تو دیہاتن پر بڑا ضبط اور صبر تھا اس میں۔ پیار سے پاس بٹھایا اور بتانے لگی یہ رشتہ کب طے ہوا تھا اور اب اگر بات ختم ہوئی تو کیا اثرات ہوں گے۔ گاؤں میں تھو تھو ہوگی اپنے پرائے سب بات کرنا چھوڑ دیں گے۔ مجتبیٰ کے گھر والے انا کا مسئلہ بنالیں گے۔ اس انکار کے نتیجے میں قتل بھی ہو سکتے ہیں اور اغوا بھی۔

"دیکھ میری دمی تیرا دل کہیں بھی تھا اب بھول جا گھر والا عورت کے سر کا تاج ہوتا ہے۔ عورت کی عزت اسی کے دم سے ہے۔ ہمیشہ عزت دینا اسے" وہ دیر تک اسے بڑے پیار سے سمجھاتی رہی۔

ماں کی کوئی بات کبھی نہ ٹالی تھی اس نے وہ سمجھاتی رہی اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی یہ مان گئی اور پھر کبھی دل کی باتوں میں نہیں آئی اس نے جب بھی یہ بات چھیڑی اس نے جھڑک دیا منع کر دیا۔

"یہ بات نہ کیا کر میں امانت ہوں اب مجتبیٰ کی۔"

اور ایک روز وہ دلہن بن کر آ گئی۔ پر سیف کی آس پتا نہیں کیسی تھی جو ٹوٹتی ہی نہ تھی، بلو ٹوکتی روکتی پر مانتا نہیں تھا۔ اماں دنیا سے چلی گئی۔ مجتبیٰ نہیں آیا۔ اسے تسلی سیف نے دی صبر کی تلقین وہ کرتا رہا۔ کبھی بیمار پڑی تو دوا اس نے لا کر دی۔ پر تھا کون وہ اس کا، کوئی بھی تو نہیں۔

☆.....☆.....☆

صبح صبح وہ آنگن میں جھاڑو لگا کر فارغ ہوئی تھی باہر گاڑی آ کر رکی تھی۔ کون ہو سکتا ہے گاڑی کس کے گھر آئی ہے تجسس نے سر اٹھایا وہ دروازے کی طرف بڑھی زنجیر ہٹائی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا مجتبیٰ اور ساتھ میں ایک عورت یہ کون ہے وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"آؤ ثمین! یہ ہمارا گھر ہے۔ آ جاؤ۔" وہ اس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"یہ بلقیس ہے۔" سرسری انداز میں تعارف کرایا دونوں آگے بڑھ گئے۔ بلو کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کون ہو سکتی ہے یہ وہیں کھڑی رہی۔ اب اندر سے اماں ابا اور ان دونوں کی باتوں کی آواز آ رہی تھی لگتا تھا۔ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ ذرا دیر بعد اماں باہر آئی۔ ادھر ادھر اسے ڈھونڈا! پھر دروازے کے قریب کھڑے دیکھ کر ادھر آ گئی اور بولی۔

"دوسری شادی ہی تو کی کوئی تجھے طلاق تو نہیں بول دی کہتا ہے۔ دونوں کو رکھوں گا اب تو کوئی سیاپا نہ ڈال دینا۔ سب جانتے ہیں۔ اولاد نہیں ہے تیری شور کر کے خود بری ہی بنے گی اور پھر تیرے پیچھے ہے بھی

کون۔ بھلائی اس میں ہے چپ کر کے پڑی رہ اس گھر میں۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ بڑھیا نے رک کر انتظار کیا پھر خود ہی کہنے لگی۔

''ہمیں بھلا تیرا کون سا سکھ ہے۔ اسے بیوی چاہیے تھی۔ اپنے جیسی پڑھی لکھی جو اس کے ساتھ سجے بھی اور اس کا گھر بھی سجا دے اور تو سوکھی نیل تجھ سے کوئی کتنی دیر امید لگاتا۔''

اس روز گاؤں کے لوگوں کا بہت آنا جانا رہا۔ ان کے گھر، ذرا سی دیر میں ہی یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ مجتبیٰ نے شہر میں شادی کر لی ہے۔ وہ دلہن لے کر آیا ہوا ہے۔ عورتیں بچے اور برادری کے تو مرد بھی آتے رہے ان سب کی خاطر مدارات بلو کو ہی کرنی تھی۔ وہ کسی کو شربت پکڑاتی، کسی کو لسی، کبھی چائے چولہے پر چڑھاتی اور سہاگ کی سرخ چوڑیاں اس کے بازو میں زور سے کھنکنے لگتیں۔

ہر آنے جانے والا نئی دلہن کے ساتھ ساتھ اسے بھی بغور دیکھ رہا تھا کہ آخر کہانیاں بھی بننا تھیں۔ ان لوگوں نے یہاں سے جا کر چپ کر کے تو نہیں بیٹھ جانا تھا۔ اس کے چہرے پر کتنا غصہ ہے، الجھن ہے یا دکھ وہ کھوج میں تھے۔ یقیناً پتا تو سیف کو بھی چل گیا ہوگا مگر وہ نہیں آیا اور بلو کو بھی اتنے کاموں میں الجھے اور سر میں ہونے والے دھماکوں میں اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ دل پر کسی نے منوں مٹی ڈال کر قبر بنا دی تھی وہ دوہری ہو رہی تھی سر میں شدید درد۔ عورتوں نے اس سے کوئی بات پوچھی بھی وہ سمجھ ہی نہیں سکی ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگی۔

رات اس کا کمرہ نئی دلہن کے لیے اماں نے تیار کر دیا۔ وہ چھپر تلے بستر ڈال کر لیٹ گئی۔ سردی بہت تھی۔ نیند ویسے بھی نہ آئی اب سردی جسم اکڑائے دیتی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔

وہ دونوں ناشتے کے بعد ہی شہر واپس چلے گئے۔ نہ مجتبیٰ نے اس سے کوئی بات کی نہ دلہن نے کوئی اہمیت دی۔ عورتیں گھروں کے کام نبٹا کر آج بھی ان کے گھر اکٹھی ہونے لگیں اور تب تک بیٹھی ہی رہیں جب تک کہ دوپہر کی ہانڈی روٹی کا وقت نہیں ہو گیا۔ دوپہر کو سیف آیا کہ اسے بابا کی روٹی کھیتوں پر پہنچانی تھی۔

''بلو'' اس کا اترا چہرہ پیلی رنگت اسے درد میں مبتلا کر گئی۔

''یہ روٹی تیار رکھی ہے۔'' بلقیس نے رخ پھیر لیا۔

''میں کل جان کر نہیں آیا کہ اگر مجتبیٰ کا گریبان پکڑ کر تیرا قصور پوچھنے لگا تو اچھا نہیں ہوگا۔ برادری کی پروا نہیں مگر جانتا ہوں تو بھی برا مان جاتی۔''

''ہاں اچھا کیا جو نہیں آیا۔'' بلو کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی۔

''اب بھی ہوش میں آ جا اسے کہہ اپنی دنیا بسا لی ہے تجھے بھی قید سے رہائی دے دے۔''

''سیف! وہ میرا گھر والا ہے۔ یہ گھر ہی میرا ٹھکانا ہے۔ عورت بار بار ٹھکانے نہیں بدلتی جو ایسا کرتی ہے اس کی عزت کوئی نہیں کرتا۔ برادری کی تھو تھو ہوتی ہے مجھے معاف کر دے۔ میں تیرا کہا نہیں مان سکتی۔ جا چلا جا۔ میں تیری آس کبھی پوری نہیں کروں گی جس کے نام پر ایک بار دلہن بنی ہوں اسی کے نام ہمیشہ رہوں گی۔''

''اتنی محبت کرتی ہو مجتبیٰ سے؟'' سیف کی آواز میں محرومیاں بول رہی تھیں۔

''یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں۔ گاؤں میں کبھی سنا کسی اچھی ذات برادری کی عورت نے طلاق کے بعد دوسری شادی کی ہو۔ جسے طلاق ہو جائے وہ مرنا پسند کرتی ہے دوجا ویاہ (بیاہ) نہیں رچاتی۔ ایسا کرے تو گالی بن جائے۔ میں گالی نہیں بنوں گی۔''

سیف نے جھک کر چارپائی پر رکھی روٹی کی پوٹلی اٹھائی اور چلا گیا۔

''اتنی محبت کرتی ہو مجتبیٰ سے؟'' سیف کی آواز ہر طرف سے ابھری۔

''محبت!'' اس نے چوڑیوں والا بازو چہرے پر رکھ کر خود سے سوال کیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

پتا نہیں سردی زیادہ بڑھ گئی تھی یا اسے ہی زیادہ لگنے لگی تھی اب تو پھر سے کمرے میں سونے لگی تھی مگر راتوں کو اٹھ بیٹھتی۔ جسم کانپ رہا ہوتا دن میں کچھ ٹھیک رہتی مگر کبھی بیٹھے بیٹھے سردی محسوس ہونے لگتی۔ اسے اس گھر سے جو اس کی پناہ گاہ تھا۔ ڈر لگتا اور جو کبھی گھر سے باہر جانا پڑتا پھر تو حالت بہت خراب ہو جاتی ہر کوئی اسے گھور رہا ہے۔ بار بار وہ چادر ٹھیک کرتی مگر لگتا سر سے ڈھلک جاتی ہے اور وہ پھر سے ننگے سر ہو جاتی ہے۔ پہلے بھی تو ان ہی گلیوں سے گزرتی تھی پتا نہیں اب لوگوں کو کیا ہو گیا تھا۔ ہر کوئی کہتا مجتبیٰ کی بیوی، انہیں اب پتا چلا ہے کہ مجتبیٰ کی بیوی ہوں۔ لوگ اب زیادہ کھل گئے تھے۔ اسے لاوارث سمجھ لیا تھا۔ خیراں بتا رہی تھی لوگوں کا خیال ہے مجتبیٰ شہری بیوی کے کہنے میں آ کر جلد ہی بلقیس کو طلاق کا کاغذ بھیج دے گا۔ شاید یہ سب لوگ اسی انتظار میں تھے۔ وہ اسے گلیوں میں بے آسرا ادھر سے ادھر سر ٹکراتے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جو دور دور سے آوازے کسا کرتے تھے اب قریب آنے لگے تھے۔

سیف اب بھی آتا تھا مگر اس روز کے بعد اس نے بلو سے یہ نہیں کہا کہ مجتبیٰ سے طلاق مانگ لو، وہ سمجھ گیا تھا۔ بلقیس کبھی نہیں مانے گی وہ ہر حال میں مجتبیٰ سے محبت کرتی رہے گی۔ جیسے سیف بلقیس سے محبت کرتا ہے۔ اس نے یہ بات نہیں دہرائی بلو کو بھی اس کی طرف سے دھڑکا نہیں رہا۔ چاچی ادھر ادھر ہوتی تو وہ حال پوچھ لیتا اور ایک روز کچھ رقم بھی اس کے ہاتھ رکھ دی۔

''یہ کس لیے سیف میں کیا کروں گی؟''

''ضرورتیں تو انسان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں تیری صحت بہت خراب گئی ہے۔ حکیم جی کے پاس جا کر دوا لے آ۔''

''اب مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں رہی۔'' اس نے رقم لوٹا دینا چاہی۔

''تجھے اپنا خیال تو نہیں رہا مگر میرا خیال کر لے میری خاطر لے آ دوائی۔''

اس کے لہجے کی سچائی، بلو کا دل کٹ کے رہ گیا۔ وہ پیسے موڑ نہیں سکی۔

اس کے جانے کے بعد دیر تک خود کو کوستی رہی۔

''تو ہے ہی منحوس چڑیل ایسا کڑیل جوان تیرے پیچھے رل رہا ہے۔ لعنت ہے اس شکل پر'' اسے خود سے بڑی نفرت ہو رہی تھی۔

اگلے روز وہ بابا کی روٹی لینے آیا تو بلقیس سے پوچھا۔

"گئی تھی حکیم جی کی طرف؟"

"نا آج جاؤں گی میں تیرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے پیچھے پیچھے چلتے رہنا۔ اکیلے اب مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اس کے جی میں آئی۔ پھر عمر اکیلے گزارنے کا فیصلہ کیوں کر بیٹھی ہو۔ پر کہا نہیں اثبات میں سر ہلا دیا۔

پہلے وہ گھر سے باہر نکلا۔ پھر بلو اور سارے راستے وہ اس سے خاصے فاصلے پر چلتا رہا اور وہ بھی خود کو حصار میں محسوس کر کے آرام سے آگے آگے چلتی رہی۔ واپسی پر پھر یہی سلسلہ تھا یہاں تک کہ گھر آ گیا۔

دوا صرف وہ سیف کی التجا کی وجہ سے لے آئی تھی اب سوچ رہی تھی اس کے پیسے ہی ضائع ہوئے۔

حکیم جی نے بڑی احتیاطیں بتائی تھیں۔ یہ کھاؤ یہ نہ کھاؤ۔ خوراک کا خاص دھیان رکھو زیادہ کام نہ کرو، وہ کہتے تھے یہ بیماری معمولی نہیں ہے اگر تو نے خیال نہ کیا تو مر جاؤ گی۔ چلو ایک فائدہ تو ہوا مجھے یہ تسلی ہوگئی ہے یہ آگ جو برسوں سے جلا رہی ہے یہ دکھ جس نے مجھے اندر سے زخم زخم کر ڈالا ہے ادھورے خواب کا درد ساری ساری رات تڑپاتا ہے اب سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ سزا زیادہ باقی نہیں ہے۔ اس نے معجون کی پڑیا بھی نہ استعمال کرنے کے ارادے سے ایک طرف پھینک دی۔

مجتبیٰ کا خط آیا تھا۔ اماں بابا کے نام اور اماں سیف کے انتظار میں تھی۔ آئے تو خط پڑھ کر سنائے۔ اس بار ابھی تک شہر سے رقم بھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہ بڑی باقاعدگی سے ہر ماہ کی پانچ تک بھیج دیا کرتا تھا۔ اماں کو اس کی فکر بھی تھی۔ وہ چاہتی تھی سیف آجائے تو خط پڑھوائے تاکہ صورتحال کا پتا چل سکے۔ پڑوس کے بچے کو بھیج کر اس نے سیف کو بلوایا۔

"کیا بات ہے چاچی! خیر تو ہے؟" وہ شاید یوں بلوانے پر پریشان ہوگیا تھا اور جلدی آگیا تھا۔

"ہاں ہاں خیر ہی ہے۔ یہ شہر سے خط آیا ہے میرے پتر کا۔ کب سے انتظار کر رہی ہوں تو آئے تو پڑھواؤں۔ پتا چلے کیا لکھا ہے اس نے۔"

سیف نے لفافہ اماں کے ہاتھ سے لے لیا اور چاک کرتے ہوئے بلو کو آواز دی وہ آ کر خاموشی سے اس کے قریب کھڑی ہوگئی۔

"میں نے سوچا تو بھی خط سن لے۔" وہ گھاؤ لگا رہا تھا زخم زخم بدن پر یہ بات کہتے ہوئے چھریاں یقیناً اس کے اندر بھی چلی ہوں گی۔

بلقیس نے چاہا۔ واپس چلی جائے۔ اتنی دور کہ خط سناتے سیف کی آواز اس تک نہ پہنچ سکے۔ وہ سننا ہی نہیں چاہتی تھی کیا لکھا گیا ہے اس خط میں مگر ایسا کوئی تاثر سیف کو نہیں دینا چاہتی تھی۔ چپ چاپ کھڑی رہی۔ وہ خط پڑھتا رہا۔ مجتبیٰ نے ثمین کی بڑی تعریفیں کی تھیں اور آخر میں لکھا تھا۔ اس ماہ رقم نہیں بھیج سکوں گا گھر بنانے پر بڑا پیسہ لگ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی چیز بھی خریدتے ہیں تو اتنی رقم لگ جاتی ہے۔ جیسے تیسے گزارا کرلو۔ اگلے ماہ باقاعدگی سے بھیجوں گا۔

"آیا کچھ سمجھ میں اور پتا بھی ہے جیسے تیسے گزارا کیسے کیا جاتا ہے۔" خط تہ کر کے لفافے میں ڈالنے کے دوران وہ چاچی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"یونہی تو نہیں لکھ دیا اس نے ہوگا ہاتھ تنگ آخر نیا گھر سو ضرورتیں۔" بڑھیا بظاہر بیٹے کی حمایت میں بول رہی تھی مگر دل ہی دل میں بہو کو نفرت سے کوسنے لگی۔

"آتے ہی قبضہ جما لیا میرے بیٹے پر۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے ماں باپ کا خیال نہ کیا ہو۔ انہیں بڑی باقاعدگی سے وقت پر پیسے بھجواتا رہا تھا۔"

"اے سیف!" کچھ سوچ کر اماں نے کہا۔

"جی چاچی حکم۔"

"وہ میں کہہ رہی تھی۔ اگر تیرے پاس کچھ پیسے ہوں تو ادھار دے دے مجھے۔ اگلے مہینے پیسے آئیں گے تو واپس کر دوں گی۔"

"ضرور چاچی میں بھلا انکار کر سکتا ہوں اپنے پاس اگر نہ بھی ہوتے تو کہیں نا کہیں سے بندوبست کر دیتا۔ یہ تو میں برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ اس گھر کے رہنے والے پریشان ہوں۔"

اشارہ بلو کی جانب تھا۔ وہ سمجھ بھی رہی تھی، بڑھیا نہیں سمجھی۔ دعائیں دینے لگی سیف کو۔

"ناں چاچی یہ لمبی عمر کی دعائیں نہ دے مجھے ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔"

"ہے پاگل کیسی باتیں کرتا ہے۔"

"ہاں چاچی ایسی کوئی تمنا نہیں ہے میری، زندگی میں ہے بھی کیا میرے لیے جسے دیکھ کر جیتا ہوں وہ بھی میری زندگی سے خوش نہیں۔"

بات کے آخر میں وہ زور سے ہنس پڑا اور اماں اس کے یوں ہنسنے کو حیران ہو کر دیکھنے لگی پھر بولی۔

"کملا (پاگل) تو نہیں ہوگیا تو"

"لو اب سے، میں تو شروع سے کملا ہوں۔ پوچھ لے بلقیس سے۔ یہ تیرے سامنے کھڑی ہے۔"

اماں صبح روٹی کھاتے ہی پڑوس میں چلی گئی۔ گلی میں پھیری والا آیا کھڑا تھا۔ اس نے سوچا چیزیں خرید لے۔ ادھار تو چلتا رہتا تھا۔ وہ بھی صرف تھیلا اٹھا کر دروازے تک آگئی اور دروازہ کھول کر پھیری والے کو آواز دی۔ وہ اس وقت دو گھر چھوڑ کر کھڑا تھا ایک بچے کے ہاتھ اس نے تھیلا بھیج دیا اور مطلوبہ چیزیں بھی بتا دیں۔

ادھر سے فارغ ہو کر اس نے بلو کے تھیلے میں مطلوبہ چیز ڈالی اور ایک لڑکے کو پکڑائی کہ جا کر بلو کو دے آئے۔ لڑکے نے قریب آ کر یوں گھور کر اس کی جانب دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گا۔ ناگواری کا احساس بلقیس کے چہرے پر پھیل گیا، تھیلا پکڑنا چاہا تو اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اچانک پیچھے سے کسی نے دبوچ لیا اور گلی میں گرا لیا۔ آنے والا سیف تھا اور وہ خوب پٹائی کر رہا تھا اس کی اگر پھیری والا اور دوسرے لوگ درمیان میں نہ آجاتے تو قتل ہی کر ڈالتا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے انہیں چھڑایا۔ سیف اندر آیا تو وہ رو رہی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا گھڑے سے پانی انڈیل کر پینے لگا۔ وہ روتی رہی۔ پھر گلاس بھر کر اس کے قریب آیا اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”فکر کیوں کرنی ہے میں جو ہوں یہیں تیرے پاس۔ بتا کبھی ایسا ہوا تجھے میری ضرورت پڑی۔ اور میں نہیں پہنچا بس اب آنسو پونچھ لے اور پانی پی لے۔ چاچی آتی ہوگی۔ یوں روتے دیکھ کر پتا نہیں کیا سمجھے۔“ اس نے گلاس پکڑ لیا وہ اتنا کہہ کر کہ روٹی تیار رکھنا میں لینے آؤں گا۔ چلا گیا۔

اس نے کھانا تیار کیا تو اماں گھر آ گئی ساتھ میں دو عورتیں اور بھی تھیں وہ ان تینوں کے لیے روٹی بنانے پھر چولہے کے پاس آ بیٹھی۔

”ہائے کیا کیا مجتبیٰ نے اتنی اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے شہری چڑیل سے شادی کر لی۔“

یہ کوئی بڑی دلیر خاتون تھی جو اماں کی موجودگی میں بیٹے کے لیے ایسا بول رہی تھی۔ جواب میں اماں نے بلقیس کے عیب گنوانے شروع کر دیے وہ جیسے کان بند کر کے بیٹھی تھی اور سارا دھیان روٹی کی طرف تھا۔ سیف بابا کا کھانا لینے آیا تو بولا۔

”کل میں نہیں آسکوں گا منڈی جانا ہے مجھے پر تم فکر نہ کر میں نے ایک بچے سے کہہ دیا ہے چاچے کی روٹی وہ لے جائے گا۔“

کچھ دیر اماں کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اماں نے اسے کچھ رقم قرض دینے کو کہا تھا وہ جیب سے نکال کر اسے تھما دی اور چلا گیا۔

اگلا دن تھا تو ویسا ہی جیسے اس موسم کے سارے دن ہوتے ہیں صبح دھند میں لپٹی ہوئی پھر دوپہریں سورج کی نرم گرم کرنوں کا لبادہ اوڑھے اور شام گہری کالی کالی اداس کر دینے والی آج تک لگتا تھا سویرے ہوتے ہی شام ہوئی ہے ایسا کیوں ہے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بولائی بولائی ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔ صبح کا کام نبٹا لیا تھا دوپہر ابھی ذرا دور تھی اور وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک بڑی زوردار تھی زنجیر نہیں چڑھی تھی دستک دیتے ہی بچہ اندر آ گیا اور بولا۔

”وہ سیف چاچا تھا ناں ادھر شیشم والی بڑی سڑک پر ایکسیڈنٹ ہو گیا اس کا وہ مر گیا ہے۔“

”ہائے ربا!“ دل ایکدم سے تڑپا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اس کی چیخیں رکنے میں نہیں آ رہی تھیں اماں اس کی پروا کیے بغیر روتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

”ربا ہائے میرے ربا یہ کیا ہو گیا۔ یہ خیال نہ آیا بلقیس کس کے سہارے جیے گی۔ اتنی جلدی بیوہ ہو گئی میں۔ میرا دل لٹ گیا سیف او سیف سن لے۔ بلو تیری تھی وہ تو ہمیشہ سے تیری تھی پھر تو کیوں چلا گیا“

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور سل پر ہاتھ رکھ کر بٹے سے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں سہاگ کی نشانی چوڑیاں ٹکڑیوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھر گئیں اور مجتبیٰ کی دلہن بننے والی بلقیس، سیف کی موت پر خالی بانہہ لیے بیٹھی تھی۔ بکھرے بالوں کے ساتھ ننگے سر ننگے منہ۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی، بہت زیادہ، دل کانپ رہا تھا اور شام آ گئی تھی ہمیشہ کے لیے۔

☆.....☆.....☆

کبھی دیکھے ہیں اہل وفا تم نے

پکی سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔ گاڑی کو کچے پر آئے سات منٹ ہو چکے تھے۔ دھول اڑاتے راستے ساتھ ساتھ بہتی نہر اور نہر پرے آموں کے باغ، بور آنے کا موسم ہے اور کوئل کوک رہی ہے۔ اس کی کوک میں چکی کی آواز بھی شامل ہے جو دیہاتی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اور ادھر ادھر نہر کے کنارے چرنے والے مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آوازیں بھی کوئل اور چکی کی آوازوں میں شامل ہیں۔

”دھول بہت زیادہ ہے۔ پچھلی مرتبہ جب میں ادھر آیا تھا تب یہ حال نہیں تھا۔“

قاسم نے گاڑی کے بند شیشے سے باہر جھانکتے ہوئے سچل کو مخاطب کر کے کہا۔

”ہاں، تب بارشوں کا موسم تھا۔ اب گرمی کی آمد آمد ہے اور ایسے موسم میں دیہاتی بارش نہ ہونے کی دعائیں مانگتے ہیں اگر آسمان پر ایک بدلی بھی دیکھ لیں تو منہ لٹک جاتے ہیں۔“

”وہ کیوں، بھلا اتنی گرمی ہو رہی ہے، بارش ہو جائے تو موسم کھل جائے۔“ قاسم کی نگاہیں مسلسل باہر کے مناظر پر تھیں۔

”گندم پکنے کو ہے، اگر بارشیں ہو گئیں تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔“

سچل شاہ نے سمجھایا، تب اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور تھوڑے توقف سے بولا۔

”بہت ہمت والے ہوتے ہیں دیہاتی۔ اتنی گرمی میں تپتے سورج تلے فصل کاٹنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“

”بس اللہ سائیں نے جو جس کا نصیب لکھ دیا۔ بندہ کیا کر سکتا ہے۔“

سچل نے رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا کہ کچے راستے پر نکل کر دو بھینسیں آ گئی تھیں، پھر وہ بالکل ہی درمیان میں آ گئیں۔ سچل نے بے زاری کے عالم میں انہیں دیکھا اور بولا۔

''جب سے گاؤں میں گاڑیاں آ گئی ہیں۔ یہ جانور بھی مانوس ہو گئے ہیں۔ ورنہ مجھے یاد ہے۔ پانچ چھ سال پہلے صرف بابا جان کے پاس گاڑی تھی اور یہ جانور دور ہی سے دیکھ کر بھاگ جایا کرتے تھے۔

''سچل اس نہر کا پانی پینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہوگا۔''

''ہاں، دیہات کے اکثر گھروں میں یہی پانی استعمال ہوتا ہے۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یار! پیاس سلگ رہی ہے۔''

''چھوڑو، اب گھر آنے ہی والا ہے۔ وہاں جا کر پی لینا۔ یہ پانی گدلا سا ہوتا ہے، تم نہیں پی سکو گے۔'' اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ذرا دیر کے بعد سچل شاہ کے گھر کی دو منزلہ عمارت دکھائی دینے لگی۔ اور کچھ دیر کے بعد سامنے آ گئی۔ گیٹ پر کھڑے ملازم نے پھرتی سے گیٹ کھولا اور اس کی آمد کا نعرہ بلند کیا۔ ذرا دیر بعد ادھر ادھر سے نکل کر کتنے ہی ملازم سلام کو حاضر ہو گئے۔ اطلاع اندر رہائشی حصے میں بھی پہنچ گئی اور شاہ بی کے پاؤں دباتی زینت ایک دم ہی پیر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر پر دھرا سبز، سرخ، پیلے پرنٹ کا دوپٹا کچھ اور آگے سرکا لیا۔

''آ گیا میرا سچل!'' شاہ بی عجلت کے عالم میں پلنگ سے نیچے اتریں اور طاہرہ، زاہدہ کو آوازیں دینے لگیں۔

''شاہ بی! سچے سائیں کے ساتھ مہمان بھی ہے وہی جو سال پہلے بھی آیا تھا۔'' کام کرنے والیاں پر جوش تھیں۔ ایک ایک خبر شاہ بی کو دے رہی تھیں۔

''اچھا اچھا قاسم آیا ہے۔ زینت! بھاگ کر جاؤ دیکھ تو مہمان خانے کی صفائی تو ٹھیک سے ہوئی ہے ناں؟''

اور زینب اثبات میں سر ہلا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

جب بڑے کمرے کے دروازے سے باہر نکل رہی تھی تو سامنے سے سچل آ رہا تھا۔ ایک دوجے پر نظر پڑی۔ دونوں ٹھٹکے اور رک گئے۔ زینت کا سر اور پلکیں جھک گئیں اور سچل کے لب اور آنکھیں مسکرانے لگیں۔

''زینی! کیسی ہو تم؟''

''سلام سائیں!'' جواب میں اس نے دھیرے سے کہا اور ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی موجود نہیں تھا۔ مگر کسی بھی وقت آ تو سکتا تھا۔

''بہت یاد آتی رہیں تم مجھے، سچ پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا۔ تمہیں سوچتا رہتا تھا میں تو۔''

''سائیں! آپ کے ساتھ کون مہمان آیا ہے شہر سے۔ شاہ بی نے کہا تھا مہمان خانے کی صفائی دیکھ لو۔''

''جی آیا نوں۔ میرا ویر آیا ہے۔'' طاہرہ کی آواز پر زینت ہی نہیں سچل بھی چونک گیا۔ فوراً ایک طرف ہو کر راستہ چھوڑ دیا اور زینت باہر نکل گئی۔

دونوں بہنوں سے مل رہا تھا جب شاہ بی بیٹے سے ملنے اپنے کمرے سے اٹھ کر ادھر آ گئیں۔

اب تو پڑھائی ختم ہو گئی ہے ناں تمہاری۔ ادھر ہی رہو گے اب تو ماں کے پاس۔ ہے ناں۔''

''ہاں اماں، اب تو ادھر ہی رہنا ہے اور وہ سب سنبھالنا ہے جو بابا جان کے بعد میری ذمہ داری ہے۔''

''ہاں پتر! میں تو تھک گئی ہوں۔ انتظار میں ہی تھی۔ تم فارغ ہو لو تو سب کچھ سپرد کر دوں۔ بچے اب میں بہت تھک چکی ہوں۔''

''ارے اماں! بیٹا آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کو تھکن کیوں ہونے لگی۔'' اس نے ماں کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور انہوں نے دعاؤں سے نوازا۔

ماں سے باتیں، بہنوں سے ہنسی مذاق کرتا وہ ان کے کمرے تک آ گیا۔ زلیخا جھٹ لسی کا گلاس بھر لائی۔ اس نے دیکھ کر منہ بنایا اور بولا۔

''اٹھا لائی ہو گرم ہی۔ برف ڈالنا تمہیں کبھی بھی یاد نہیں رہا۔''

''ہاں سائیں! واقعی بھول گئی۔'' وہ الہڑ کھلکھلائی شاہ بی نے ناگواری سے اس نوجوان ملازمہ کی جانب دیکھا، مگر بولیں کچھ نہیں۔ وہ یونہی ہنستی مسکراتی گلاس اٹھا کر برف ڈالنے چلی گئی۔

''سائیں! دودھ لاؤں آپ کے لیے؟'' ملازمائیں خاطر مدارات کو ضرورت سے کہیں زیادہ مستعد ہوا کرتی تھیں۔

''لو ایک لسی لینے گئی ہے دوسری دودھ کو پوچھ رہی ہے، بیمار کرنا ہے کیا مجھے؟'' وہ یونہی غصہ دکھا رہا تھا۔ سب کی سب ہنس پڑیں۔

پھر ایک عقلمند بن کر بولی۔ دودھ اور لسی تو اکٹھے نہیں پیتے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''او بیٹھی رہ۔ بڑی آئی پردھان۔'' اس نے اسے ڈانٹا پھر شاہ بی سے بولا۔ ''کیسے کیسے نمونے پال رکھے ہیں۔ آپ لوگ ذرا عقل دیں ناں ان کو؟''

''اب تم آ گئے ہو دینا عقل بھی۔'' چھوٹی بہن زاہدہ پلنگ پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

سچل نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر شرارت سے اسے دیکھا اور بولا۔

''میں تمہیں تو عقل دے نہیں سکا جو خیر سے آٹھویں پاس ہو۔ ان جاہلوں کو کیا سکھاؤں گا۔''

زاہدہ کو بڑا فخر تھا اپنے مڈل پاس ہونے پر اور سچل اکثر چھیڑا کرتا تھا۔

''ماموں آئے ہیں ماں؟'' طاہرہ کی آٹھ سالہ بیٹی کو اب اطلاع ملی تھی۔ سارے کھیل چھوڑ کر بھاگی آئی تھی۔

''اور ماموں کی جان! کہاں تھیں تم؟'' سچل نے بانہیں پھیلا دیں۔ وہ دوڑ کر ان میں سما گئی۔

''ماموں جی! اب تو یہیں رہو گے نا؟''

''ہاں بیٹے! میں تو ادھر ہی رہوں گا۔ تم اپنے اماں، ابا سے اجازت لے لو۔ آ جاؤ نانی کے گھر۔ میں خوب ڈھیر سارا پڑھاؤں گا تمہیں اور سیر بھی بہت کرواؤں گا۔ ماں کے پاس رہیں تو ان پڑھ رہ جاؤ گی اسی کی طرح۔''

"بس کرو بیٹیوں کو ایسے خواب نہیں دکھائے جاتے۔" طاہرہ نے ٹوک دیا۔

"شاہ بی! کمرا بالکل صاف ہے میں دیکھ کر آئی ہوں۔" زینب نے اندر آ کر اطلاع دی۔

سچل نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ بچی کو گود سے اتارا اور بولا۔

"اماں! قاسم تو بیٹھک میں بیٹھا ہے۔ آپ لوگوں سے ملنے ملانے میں ایسا مگن ہوا کہ اسے بھول گیا۔ میں اسے کمرے میں چھوڑ کر ابھی آتا ہوں۔" پھر زینب سے کہا۔ "تم منہ اٹھا کر کیا کھڑی ہو۔ ساتھ آؤ۔ اسے چائے پانی کا پوچھ لینا اور جو کہے لے آنا۔" وہ سر جھکا کر پیچھے ہو لی۔

دونوں جونہی باہر آئے۔ سچل نے گہری سانس کھینچی اور بولا۔

"ڈانٹ کا برا مت ماننا۔ مجبوری ہے سب کے سامنے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے بولی۔

"زینی! رات کا کھانا میں ادھر قاسم کے ساتھ کھاؤں گا۔ کھانا جلدی کھا کر ادھر جامن کے درخت کے پاس آ جاؤں گا۔ تم بھی آ جانا۔"

"مگر سائیں۔" وہ ہچکچائی۔

"اگر مگر نہیں بس آ جانا۔"

"دیکھیں ناں سائیں! یوں چھپ چھپ کر ملنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ ہماری روحیں مل چکی ہیں۔ دل کو دل سے راہ ہے۔ مٹی کے بت ملیں، اصل شے روح ہے۔"

"اوہ زینی! بس آ جانا اور پھر یہ سب بھی سمجھا لینا۔ سامنے بیٹھی ہوگی۔ تم بولتی رہنا۔ میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ سنتا رہوں گا۔ میرے لیے وہ لمحے بڑے قیمتی ہوا کرتے ہیں۔ جب تم میرے قریب ہوتی ہو۔"

"سائیں! ہم دور کب ہوتے ہیں۔ ہمیشہ قریب ہی تو ہوتے ہیں۔"

"زینی! دل میں محبت بس جائے تو نگاہ بار بار محبوب کا دیدار چاہتی ہے۔ کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہے؟"

"ناں سائیں! میری نگاہ میں بھی تو بس چکے ہو آپ، اب اور کیا چاہوں گی بھلا۔" وہ جیسے اس کی نا سمجھی پر ہنسی تھی۔

دیہات کی وہ ان پڑھ نیچ ذات کی کم عمر مگر بہت سنجیدہ اور سلجھی ہوئی لڑکی جو اس کی اماں کی خاص ملازمہ تھی۔ کتنی گہری باتیں کرتی تھی۔ سچل کو بس اچھی لگتی تھی۔ بات سمجھ میں آئے نہ آئے۔ دیکھے چلا جاتا۔ اور زینب کی چاہت کیسی تھی۔ کبھی جی میں یہ تمنا نہیں جاگی۔ یہ جی نہیں چاہا، وہ کچھ ایسا بول دے جو شرم سے لال گلابی ہو جاؤں۔ یہ رشتہ تو کچھ اور ہی تھا شاید۔ وہ قریب ہو تو بھی رشتہ روح سے روح تک کا ہے۔ دل میں نور اتر رہا ہے۔ آنکھیں جگمگاتی رہیں۔ کبھی ہوس کی آندھی اس کی لو نہ بجھائے۔ لبوں پر صاف شفاف لفظ ہوں اور دوستانہ مسکراہٹ ہو۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اضطراب ظاہر نہ کریں۔ سکون ہی سکون ہو ان دونوں کے اندر بھی اور باہر بھی جیسے دریا بہتے ہیں بڑی روانی اور سبک خرامی سے جیسے آسمان پر چاند اپنا سفر طے کرتا ہے۔
دھیرے دھیرے سکون اور نرمی کے ساتھ جیسے کلی پھول بنتی ہے۔

کیا سچل شاہ بھی ایسا سوچتا ہے۔ وہ جانتی نہ تھی یا شاید جاننا چاہتی نہ تھی۔ ڈر جو تھا کہیں اس کی سوچ مختلف نہ ہو، وہ کچھ اور کی چاہ نہ کر بیٹھے۔

وہ بہت چھوٹی تھی جب اس حویلی میں آئی تھی نہ ماں نہ باپ۔ سیلاب اس کا سب کچھ بہا کر لے گیا اور وہ شاہ صاحب کی حویلی میں ملازمہ بن کر آ گئی۔ وہ تو اس گاؤں کی بھی نہ تھی۔ پانی میں بہتی ہوئی یہاں آئی تھی۔ یہی کوئی چھ سات برس کی عمر تھی۔ اسے یاد تھا۔ اس کا باپ صبح اٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا اور اس کی ماں دن کا بیشتر حصہ کڑھائی بنائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ اب تو سال پر سال گزر گئے مگر محبت کرنے والی وہ آنکھیں ماں اور باپ کے ہاتھ کے لمس اس کے ساتھ رہ گئے۔ وہ محبتیں بھلائے نہ بھولتیں مگر یہ بھول گیا۔ وہ کون ہے اور وہ گھر کہاں تھا جہاں اس کے لیے محبتیں تھیں، جہاں وہ نوکرانی نہیں شہزادی تھی۔ وہ کوئی شہر تھا یا گاؤں اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔

اس کا بچپن سیلاب بہا لے گیا۔ وہ بڑی ہو گئی۔ آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا تو اس لیے اس نے آنسو بہائے ہی نہیں۔ وہ زاہدہ کا بستہ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے اسکول جایا کرتی۔ وہ کلاس میں اور یہ باہر بیٹھی رہتی مگر جو کچھ استانی جی پڑھاتیں بغور سنتی رہتی۔ گھر آ کر بھی زاہدہ کے آس پاس رہتی وہ کیسے لکھتی ہے۔ کیا پڑھتی ہے۔ بہت جستجو رہتی اسے۔

زینب کو پڑھنے کا شوق ہے، یہ بات شاہ جی اور طاہرہ زاہدہ بھی جانتی تھیں، مگر یہ خیال نہیں آیا اسے بھی اسکول میں داخل کروا دیا جائے۔ زاہدہ اگلی کلاس میں چلی جاتی تو کتابیں اس کے پاس آ جاتیں۔ وہ خود ہی سمجھنے کی کوشش میں لگی رہتی اور کبھی شہر کے اسکول میں پڑھنے والا سچل گاؤں میں چھٹیاں گزارنے آ جاتا تو بہت آسانی ہو جاتی، زینب کو۔ وہ پڑھائی میں اچھی خاصی مدد کر دیتا تھا اس کی اور حیران بھی تھا۔ زاہدہ اسکول سے پڑھ کر بھی کچھ سمجھ نہیں پاتی۔ اور یہ لڑکی جس کی راہنمائی کسی نے نہیں کی۔ کتنی ذہین ہے۔ اس کے ساتھ محنت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

وہ شروع سے بے حد سنجیدہ مزاج کی مالک تھی۔ بہت کم مسکراتی تھی۔ کھل کر ہنستے تو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ ضرورت کے تحت بات کیا کرتی تھی اور سچل کے دل میں اس کے لیے سب سے پہلے جو سوچ ابھری تھی، وہ یہی تھی۔ زینب ہنستی ہوئی کیسی لگتی ہوگی۔ اسی کھوج میں وہ اسے لطیفے سناتا۔ شہر کی دوستوں کی باتیں، اپنی شرارتیں۔ وہ بس مسکرا دیتی۔

"تم کھل کر کیوں نہیں ہنستیں؟" ایک روز ہار مان کر وہ پوچھ بیٹھا۔

"دل تک کوئی بات پہنچی ہی نہیں۔" وہ چھوٹی سی لڑکی کی اس بات پر حیران ہوا تھا۔

"کیا مطلب کیا تمہارے دل کا راستہ بند ہے؟" اس نے مذاق کے رنگ میں پوچھا تھا۔

زینب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "پانی ہی پانی ہے۔ گہرا پانی۔ کون ہے جو اس پانی میں اترے۔"

اور پانی اس روز زینب کی آنکھوں میں بھی آ گیا۔ سچل اس کے ساتھ بیتنے والے سانحہ کی نوعیت سے

واقف نہیں تھا۔ وہ بھی اتنا جانتا تھا۔ بے آسرا لڑکی ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیے۔

"اب نہ رونا۔ میں تو تمہیں ہنستے کھلکھلاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

سچل شہر میں پڑھتا تھا۔ وہ چھٹیوں میں ہی گاؤں آیا کرتا تھا۔ کئی کئی مہینوں کے بعد اور ہر بار دونوں عمر کی منزل قدم بہ قدم طے کر چکے ہوتے۔ یونہی وہ مقام بھی آ گیا، جہاں نظریں اٹھنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ قدم اور نظر محتاط ہو جاتی ہے۔ اب وہ زینب کو سب کے سامنے مخاطب نہیں کرتا تھا اور وہ کم بہت ہی کم ملا کرتے تھے مگر اب تو وہ تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ بڑے شاہ صاحب کی وفات کے بعد اسے یہ سب سنبھالنا تھا۔ طاہرہ شادی شدہ تھی جب کہ زاہدہ کی شادی چند روز کے بعد تھی اور اس موقع پر سچل کو یہ ثابت کرنا تھا۔ وہ یہ سب سنبھالنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ بزرگوں کی روایات کو بخوبی چلا سکے۔ ان کا امین بن سکے۔ روایات اسے بھی بہت پیاری تھیں، فخر تھا اسے، وہ سیّد فیملی کا سپوت ہے۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا زینب کو تیار کرنا تھا۔ شاہ بی نے بہت سے کام اس کے سپرد کیے ہوئے تھے کہ انہیں بہت اعتماد تھا اس پر۔ وہ ان کی ملازمۂ خاص تھی اور ان کا برتاؤ اس کے ساتھ کافی اچھا تھا۔ زینب بھی بہت عزت دیتی تھی انہیں اور ہر حکم بخوشی قبول کرتی تھی۔ وہ کھانا پکانے میں مصروف تھی اور اسے سچل سے کیا وعدہ پریشان بھی کر رہا تھا۔ کیا یوں چوری چھپے ملنا اچھی بات ہے جو کسی نے دیکھ لیا تو کتنا برا ہوگا۔ سب کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔ عزت بڑی پیاری تھی اسے اور ڈر رہی تھی یہ پونجی بھی نہ کھو بیٹھے گر نہ جائے شاہ بی کی نظر سے، میں سمجھاؤں گی شاہ صاحب کو، اب کے بعد ایسی فرمائش نہ کریں۔ مجھے خاردار راستوں پر ننگے پاؤں چلنے کا گمان ہوتا ہے۔

قاسم شام کو چائے پی کر سو گیا تھا۔ سچل اماں کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھا اور وہ اسے اپنی خاندانی روایات کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

"طاہرہ کی شادی ماموں کے گھر ہوئی ہے۔ زاہدہ چچا کے گھر بیاہی جا رہی تھی۔ تمہیں اس گھر کے دونوں دامادوں کو عزت دینا ہے۔ تمہیں اپنے تمام بزرگوں کا ادب کرنا ہے۔ گاؤں کے لوگوں سے شفقت کا برتاؤ ضرور رکھو مگر اپنے اور ان کے درمیان ایک فاصلہ ضروری ہے اور ہاں عید شبرات کے موقع پر اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کے گھروں میں تحائف ضرور بھیجنا ہے، یہ ہماری رسم ہے۔"

"اماں! ہمارے ہاں رسمیں کچھ زیادہ ہی ہیں؟" وہ مسکرایا۔ اور کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ جمالی۔

"تھک گئے ہو۔ ادھر بستر میں آ جاؤ۔"

"ہاں اماں! تھکن تو ہو رہی ہے، آج دوپہر کو بھی سو نہیں سکا۔ لوگ ملنے کے لیے آتے رہے؟"

"اپنے گاؤں کے ہی لوگ تھے ناں۔ کوئی کمہار تو کوئی موچی، نائی، تم سو جاتے۔ ملازم بتا دیتے شاہ

صاحب سو رہے ہیں۔ کل آ جاتے سلام کو۔" "نہیں اماں! مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"او ہو یہی تو باتیں ہیں، پتر بہت فرق ہوتا ہے گاؤں اور شہر کی زندگی میں۔ تم یہاں کے بادشاہ ہو اور ان کے پیر بھی ہو۔ یہ عزت دیتے ہی نہیں عزت کرتے بھی ہیں کہ یہ سیدوں کا گھرانہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں اماں۔"

"اور زاہدہ کی شادی سے دو روز پہلے تمہیں اپنے والد کی پگڑی پہننے کی رسم بھی ادا کرنا ہے۔ گو ہمارے ہاں پیری مریدی نہیں ہے مگر پھر بھی یہ رسم ہمارے ہاں چلی آ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے اماں! جیسا آپ کہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سنو پتر اس روز شادی ہی کی طرح کا اہتمام ہوگا بلکہ شادی سے بھی بڑھ کر، ہمارے ہاں لڑکی کی شادی پر ناچ گانا نہیں ہوتا مگر اس رسم میں یہ سب چلتا ہے۔ تمہارے چھوٹے ماموں چار پانچ روز میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ سب سمجھا دیں گے تمہیں۔"

"بہت بہتر اماں! اب میں جاؤں۔"

"کیا بہت تھک گئے بچے!"

"تھکن ہے تو مگر میں سونا نہیں چاہتا۔ بس جی چاہ رہا تھا گھوم پھر کر اپنا گھر دیکھوں۔ کتنی دیر بعد آیا ہوں یہاں۔ یہ سب کچھ مجھے شہر میں بہت اداس کر دیا کرتا تھا اماں!"

"بس پتر! اب تو وہ وقت کٹ گیا اور کیسے کٹا۔ یہ تو ماں کا دل ہی جانتا ہے اکلوتا بیٹا اور مجھ سے اتنی دور۔ کئی بار میں شاہ صاحب سے گلہ کر بیٹھتی تھی کہ کیوں بھیج دیا تمہیں اتنی دور۔" وہ مسکرایا اور بولا۔

"اماں! شہر کی ایک ہی چیز مجھے اچھی لگی اور وہ ہے قاسم۔ وہ میرا دوست بھی ہے اور بھائی بھی۔ وہ جتنی دیر یہاں رہے۔ اس کی خاطر مدارات میں کمی نہیں ہونی چاہیے۔ میری خواہش ہے، اسے غیر نہ سمجھا جائے۔ حویلی میں آنے جانے کی آزادی ہو۔"

"باقی سب تو ٹھیک ہے مگر حویلی میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ یہ ہماری روایت کے خلاف ہے پتر!"

"ٹھیک ہے اماں! اگر ایسی بات ہے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ روایات مجھے بھی بہت عزیز ہیں میں جانتا ہوں۔ ہماری بقا اسی میں ہے۔ ہم اپنی روایت پر قائم ہیں تو اونچے ہیں۔ یہ سب چھوڑ دیا تو لوگ بھی ہمارے آگے جھکنا چھوڑ دیں گے۔"

"تم بہت سمجھدار ہو، خوشی ہو رہی ہے تمہاری باتیں سن کر۔ یاد رکھو پتر! اگر اپنے رسم و رواج کو بھی چھوڑنے کا سوچو گے تو باہر کے لوگ تو بعد میں پہلے اپنی برادری ہی الگ ہو جائے گی، تم اپنوں سے کٹ کر رہ جاؤ گے اور سزا صرف تمہیں ہی نہیں تمہارے بچوں کو اور تمہاری بہنوں کی اولاد کو بھی دی جائے گی۔ یہ میں تمہیں اس لیے سمجھا رہی ہوں کہ آئندہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس بات کو ضرور دھیان میں رکھنا۔"

اس نے اور قاسم نے کھانا اکٹھے کھایا۔ پھر وہ جامن کے درخت کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ یہاں مہندی کی

گھنی باڑھ تھی اور یہ رہائشی حصے کے گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر مہمان خانے کے قریب کا لان تھا ادھر رات کے وقت تو کیا دن کو بھی کوئی نہیں آیا کرتا تھا مگر زینب کو قدم اٹھاتے ہوئے دقت کا سامنا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی اور بہت سنبھل کر یہاں تک آئی تھی۔

"اتنی دیر کردی؟" سچل نے شکایت کی۔

"عزت جانے کا ڈر پاؤں پکڑ لیتا تھا شاہ سائیں۔"

"کیا مطلب تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟" وہ بے طرح حیران ہوا تھا اس کے جملے پر۔

"اعتبار کی کیا بات کرتے ہیں سائیں! کیا روح کا رشتہ میں نے بنا اعتبار ہی جوڑ لیا ہے۔" وہ جیسے کچھ ناراض سی ہوئی تھی اس بات پر۔

"تو پھر تم نے یہ کیوں کہا۔" کچھ بوجھ سا آپڑا تھا جو زینب کی وضاحت سے دور ہوگیا۔

"شاہ سائیں! شاہ بی بڑا اعتبار کرتی ہیں، اس گھر میں کام کرنے والیاں بھی مجھ سے بات کرتے ہوئے لہجہ دھیما کرلیتی ہیں مگر آج اگر کسی نے یہاں دیکھ لیا تو سب کی ٹھوکروں میں آجاؤں گی۔ اوقات تو کچھ نہیں مگر پتا نہیں کیوں بے وقعت سمجھتی نہیں ہوں خود کو۔ یہ خوف ہی رہتا ہے عزت مٹی نہ ہوجائے۔"

"زینی! تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے، بس اسی لیے تمہیں بلالیا۔"

"مہربانی ہے آپ کی مگر سائیں! میری مجبوری بھی تو سمجھیں ناں اور جیسے میرے ساتھ ہر لمحہ آپ رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا کریں ناں جی۔" سچل نے رک کر بہت غور سے اسے دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھتے ہو سائیں؟" وہ گھبرائی نہیں کہ گھبراہٹ میں مبتلا کرنے والی، سمٹنے پر مجبور کرنے والی نگاہ یہ نہیں تھی۔ یہ نگاہ تو اسے حیران کررہی تھی۔

"تم کون ہو زینی تم کہاں سے آئی ہو؟" وہ کھویا کھویا سا تھا۔

زینب دکھی سی ہنسی ہنس پڑی اور بولی۔

"میری قسمت پانی پر پانی سے لکھی گئی تھی۔"

"تمہاری باتیں کتنی انوکھی ہوتی ہیں۔ کہاں سے سیکھی ہیں تم نے ایسی باتیں؟"

وہ اس سوال پر حیران ہوئی اور بولی۔ "بھلا باتیں بھی سیکھی جاتی ہیں۔ یہ تو دل سے نکلتی ہیں سیکھے تو لفظ جاتے ہیں جو میں نے نہیں سیکھے، جب ہی تو برتنا نہیں جانتی۔"

"تم برتنا جانتی ہو زینی۔"

"نہیں شاہ سائیں! جانتی ہوتی تو منا نہ لیتی آپ کو۔ سمجھ نہ چکے ہوتے آپ میری بات۔"

"کون سی بات؟" سچل بغور اسے سن رہا تھا۔

"کہا ہے ناں۔ نہ بلایا کریں یوں کہ جو کام چھپ کر کیا جائے۔ غلط ہوتا ہے۔ چوری ہوتی ہے یہ تو۔"

"اچھا زینی! تم جیتیں میں ہارا۔ اب نہیں بلاؤں گا یوں مگر یہ بھی بتادو پھر تم سے بات کس طرح ہو سکے گی۔" سچل کسی بچے کی طرح روٹھا روٹھا سا تھا۔

وہ مسکرادی اور بولی۔ "ایک ہی گھر میں تو ہوا کریں گے۔ بات بھی ہو ہی جائے گی۔ اب چلتی ہوں۔ مجھے شاہ بی کے پیروں کی مالش کرنا ہے وہ میرا انتظار کررہی ہوں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی اور سچل اکیلا خاصی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔

وہ شاہ بی کے کمرے میں آئی تو وہ منتظر تھیں۔ جونہی یہ کہا۔

"زیب! تم کہاں تھیں؟"

اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ فوری طور پر جواب دے نہیں پائی۔

"میں انتظار کررہی تھی۔ سنو پیروں کی مالش بعد میں کرلینا۔ زاہدہ کے کچھ جوڑے ابھی سلائی کرنے والے ہیں۔ ذرا وہ تو نکال لو۔"

اور اس کی جان میں جان آئی۔ فوراً ساتھ کے کمرے میں گئی اور ان سلے جوڑے نکال لائی۔

"اس سبز سوٹ پر کیسا کام ہونا چاہئے۔" وہ سارے مشورے زینب سے ہی لیا کرتی تھیں اور اس کا ہر مشورہ انہیں بے حد مناسب لگا کرتا تھا۔ جوڑے سامنے رکھے وہ انہی کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ پھر شاہ بی نے پروگرام بنایا۔ صبح زینب اور وہ شہر جائیں گی اور ان جوڑوں کو کام کروانے کے لیے دے آئیں گی۔

زینب نے سبز سوٹ پر شیشوں کے کام کے لیے کہا تھا جب کہ گلابی پر موتیوں کا کام ہونا تھا۔ فیروزی پر ستاروں کا اور نیلے کے دوپٹے پر کام کروانا تھا۔

"کیا یہ سب اتنی جلدی ہوسکے گا؟" شاہ بی فکرمند تھیں۔

"آپ نے پہلے مجھے یہ جوڑے دکھائے ہی نہیں ورنہ پہلے ہی شہر بھیج دیتے۔"

"یہ جوڑے آج ہی اس کے بڑے ماموں کے ہاں سے آئے ہیں۔ تین پر کام ہوا ہے اور یہ باقی سادہ ہیں۔ اور ہاں انہوں نے انگوٹھی اور جھمکے بھی بھیجے ہیں، میری الماری میں رکھے ہیں۔ دیکھو تو کیسے ہیں۔"

وہ فوراً اٹھی اور مطلوبہ چیزیں نکال کر ان کی جانب بڑھائیں۔

"ارے! میں تو دیکھ ہی چکی ہوں۔ تم دیکھو اور بتاؤ کیسے ہیں۔"

"بہت اچھے ہیں شاہ بی، اور بھاری بھی ہیں، جھمکے کے ساتھ موتیوں کے سہارے بھی صبح لے آئیں گے۔"

"ہاں۔ یہ تو خوب یاد دلایا تم نے اور بھی چیزیں دیکھ لو اور لکھ رکھو پھر بار بار کہاں چکر لگایا جائے گا ابھی چند روز کے بعد تو مہمان آنے شروع ہوجائیں گے۔"

"شاہ بی! اپنے شاہ سائیں کے دوست شہر سے آئے ہوئے ہیں۔ زاہدہ بی بی کی شادی میں وہ تو دوست کو بلائیں گے ہی اگر آپ بھی انہیں دعوت دے دیں تو اچھا رہے گا۔ میرا خیال ہے وہ شاہ سائیں کے بہت اچھے دوست ہیں۔"

"ہاں، یہ بات تم نے بہت اچھی کہی۔ واقعی قاسم کو دعوت دینی چاہئے بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بلانا چاہئے۔ تم صبح یاد دلانا بلکہ ایسا کرنا، صبح ناشتا لے کر جانا اور میری طرف سے کہہ دینا۔"

"جی بہت بہتر۔" وہ ان کے بستر پر رکھے زاہدہ کے جہیز کے کپڑے اٹھانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر پلٹی تو شاہ بی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ وہ پیروں کی مالش کو آ بیٹھی۔

"زینب!" انہوں نے کسی خیال میں کھوئے کھوئے اسے پکارا۔

"جی شاہ بی!"

"میں نے سنا ہے۔ رحمت بی بی کا بیٹا کسی باہر کے ملک چلا گیا ہے اور بہت پیسہ بھیجا ہے اس نے۔"

"جی یہ تو پتا چلا تھا کہ باہر کے ملک چلا گیا ہے۔ پیسے والی بات میرے علم میں نہیں۔"

"کہاں گم رہتی ہو۔ یہ بات تو سارا گاؤں کہہ رہا ہے۔" وہ ڈانٹ کر گویا ہوئیں۔ جواب میں زینب کیا کہتی۔ مالش کرتی رہی۔

"پہلے تو لاہور ہوتا تھا کہیں پر ملازم تھا شاید۔" "جی!" وہ مختصراً بولی۔

"تب تک تو رحمت بی بی سلام کو حاضر ہوتی رہی۔ دعا کا بھی کہتی رہی مگر وہ ملک سے باہر گیا تو دماغ خراب ہو گیا۔ نیچ ذات کا۔ صبح پیغام بھجواسے مگر اپنی طرف سے، یہ مت کہنا کہ میں نے بلایا ہے۔"

"صبح تو ہمیں شہر جانا ہے۔" انہوں نے دہرایا پھر کچھ سوچ کر پر جوش انداز میں بولیں۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ تم اسے بلواؤ۔ اس کے ساتھ یہی ہونا چاہئے۔ وہ آئے اور سارا دن صحن میں بیٹھی میری واپسی کا انتظار کرتی رہے۔"

"جی بہتر شاہ بی!" وہ اختلاف کی جرأت بہر حال نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا بات ہے، کس بے دلی سے پاؤں دبا رہی ہو؟ دھیان کہیں اور ہے کیا۔"

"نہیں نہیں تو شاہ بی!" وہ گڑبڑائی۔

اس کی مصروفیت کے دوران ہی وہ سو گئیں۔ جب اس نے پیروں سے ہاتھ ہٹائے انہیں چادر اوڑھائی اور دبے قدموں کمرے سے باہر آ گئی۔ موسم کل کی نسبت آج زیادہ گرمی لیے ہوئے تھا۔ ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ دوسرا پہر شروع ہوتے ہی ٹھنڈک محسوس ہونے لگتی تھی۔ وہ سارے گھر میں گھومی۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا۔ ملازماؤں نے تمام برتن تو دھو کر سلیقے سے رکھ دیے ہیں۔ یا یونہی پڑے ہیں، تمام کمروں کی بتیاں تو گل ہیں۔ زاہدہ اور طاہرہ بی بی کو کچھ چاہیے تو نہیں۔ سچل سائیں کو کسی شے کی ضرورت تو نہیں۔ سچل تو شاید قاسم کی طرف تھا۔ اس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اس نے آف کر کے نائٹ بلب جلایا اور کمرے سے چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر نماز ادا کی اور سو گئی۔

☆......☆......☆

صبح معمول کے مطابق اس کی آنکھ کھلی اور پھر وہی مصروفیت، نماز ادا کرتے ہی کمرے سے باہر آ گئی۔ طاہرہ کا بیٹا دو سال کا تھا۔ صبح ہی صبح اسے بھوک ستانے لگتی تھی۔ اس کے لیے کوئی پھل یا دودھ زینب کو ہی مہیا کرنا ہوتا تھا۔ بند کمروں کو کھولنا، شاہ بی کو چائے بنا کر دینا۔ موتیے کی کلیاں چن کر ان کے کمرے میں پلنگ کے قریب رکھی میز پر رکھنا، ننھی چڑیوں کو دانا ڈالنا۔ ان کے کمرے کی صفائی کروانا اور باورچی خانے میں جا کر صبح ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات جاری کرنا یہ سب اس کے معمولات میں شامل تھا۔

ناشتے کے بعد اس نے رحمت بی بی کے ہاں پیغام بھجوا دیا اور خود شہر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ جب وہ تیار ہو کر شاہ بی کے کمرے میں آئی تو سچل وہاں موجود تھا۔

"اماں! میں گاؤں آیا ہوں، آپ کے پاس، اور آپ ہیں کہ مجھے چھوڑ کر شہر جا رہی ہیں۔"

وہ کسی بچے کی طرح منہ پھلائے ناراضی دکھا رہا تھا۔ زینب کو ہنسی آ گئی جسے چھپانے کو وہ جھک کر موتیے کی کلیاں یونہی ٹھیک کر کے رکھنے لگی۔

"ہم بہت جلد واپس آ جائیں گے۔"

"ہم، کون کون جا رہا ہے آپ کے ساتھ؟" "میں، زاہدہ اور زینت۔"

"اچھا۔ زینب بھی جا رہی ہے مگر کیوں۔" زینب کی تیاری بس یہی تھی کہ کپڑے بدل لیے تھے اور بالوں کو نئے سرے سے گوندھ لیا تھا۔ سر پر ابھی دوپٹا ہی اوڑھا ہوا تھا۔ چادر نکال کر اپنے کمرے میں ہی چارپائی پر رکھ آئی تھی کہ ابھی شاہ بی کو تیاری میں مدد دینا تھی۔

"یہ تو میرے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہے۔" انہوں نے زینب کو بال بنانے کا اشارہ کیا اور سچل سے مخاطب ہوئیں۔

"اچھا تو یوں کہیں کہ مشیر خاص ہے۔" وہ مسکرایا اور زینب کی جانب دیکھا۔ اس نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ شاہ بی کے مہندی لگے بالوں میں کنگھا کرنے لگی۔

"نانی ماں! میرے لیے شہر سے اچھی سی گڑیا ضرور لانی ہے۔" طاہرہ کی بیٹی تک نانی کے شہر جانے کی اطلاع خالہ کی زبانی پہنچی تھی۔

"ننھی! کتنی گڑیاں جمع کرنا ہیں تمہیں؟" نانی کو اس کا ہر وقت گڑیا کھیلنا پسند نہیں تھا۔

"ننھی! کچھ پڑھتی بھی ہو یا ہر وقت کھیل کود میں لگی رہتی ہو۔" سچل نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"پڑھنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں بھی زیادہ نہیں کہتی کہ آخر پڑھ لکھ کر کیا کرے گی۔"

"نہیں اماں! پڑھنا ضروری ہے۔" سچل نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

"کیا ضروری ہے۔ بس ٹھیک ہے یہ ایسے ہی۔"

"اسکول تو داخل کروا دیں۔ کچھ نہ کچھ پلے پڑ جائے گا۔"

انہوں نے جیسے بیٹے کے آگے ہار مان لی اور زینب سے بولیں۔

"اس کی ماں کو تو ایسا کوئی شوق نہیں مگر یہ ماموں کی بہت چاہ ہے۔ تم کل جا کر اسے اسکول داخل کروا آنا۔"

"مگر اماں! طاہرہ آپا چند دن بعد اپنے گھر چلی جائیں گی۔ پھر یہ اتنے دور سے ادھر کیسے آیا کرے گی۔ ان کے گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے کیا؟"

"ہے تو مگر اب ننھی ہمارے ہی ہاں رہے گی۔ تم جانو۔ طاہرہ کے اوپر تلے چار بچے ہیں، تین اس سے

چھوٹے لڑکے ہیں۔ تینوں ہی شریر۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ اب زاہدہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ ننھی کو یہیں رہنے دو میرے پاس۔“

بال بن چکے تھے۔ زینب نے تلے والے کھسے لا کر ان کے پاؤں میں پہنائے پھر شیشے کے کام والی سفید چادر الماری سے نکال کر انہیں دی۔

”جاؤ۔“ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے چلی گئی۔ زاہدہ تیار تھی۔

شاہ بی بھی چادر اوڑھ کر گاڑی میں آ بیٹھیں۔ چادریں تینوں نے اوڑھ رکھی تھیں، لیکن شاہ بی اور زاہدہ نے چہرے بھی چھپا رکھے تھے جب کہ زینب کا چہرا کھلا تھا یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ ملازمہ ہے۔ اس کا درجہ ان دو معزز خواتین سے کافی کم ہے۔

شام کو واپسی ہوئی۔ زاہدہ تو آتے ہی ڈھے سی گئی۔ شاہ بی کا بھی تھکن سے برا حال تھا۔

”میرے لیے چائے بنواؤ زینب۔“

”شاہ بی! تھکن ہے آپ کو، گرم دودھ پی لیں۔“ اس نے مشورہ دیا جو تھوڑی پس و پیش کے بعد انہوں نے مان لیا۔

وہ زلیخا کو گرم دودھ لانے کا کہہ کر زاہدہ کے کمرے میں آ گئی کہ اس نے کپڑے استری کرنے کو کہا تھا۔ بہت گرمی لگ رہی تھی اسے۔ فوراً نہانا چاہ رہی تھی۔

حال تو زینب کا بھی برا تھا مگر وہ ملازمہ تھی۔ اسے سب کام ختم کر کے خود پر توجہ دینی تھی۔

زاہدہ کے کپڑے استری کر کے شہر سے خریدی ہوئی چیزیں سنبھال کر وہ نہا دھو کر شاہ بی کے کمرے میں آئی۔

”سنو زینب! معلوم تو کرو۔ رحمت بی بی آئی تھی یا نہیں؟“ رحمت بی بی ان کے ذہن پر سوار تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی، رعایا کا سر اٹھانا کون حکمران پسند کرتا ہے بھلا۔

زینب نے واپس آ کر اطلاع دی۔ رحمت بی بی آئی تھی۔ بہت دیر بیٹھی آپ کا انتظار کرتی رہی تھی۔“

سن کر بڑی تسلی ہوئی۔ اثبات میں سر ہلا کر آنکھیں موند کر سر تکیے پر ٹکا دیا۔

زینب باورچی خانے میں آ گئی اور رات کے کھانے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”شاہ سائیں بلا رہے ہیں زینب۔ وہ کہتے ہیں صبح کچھ کاغذ دیے تھے تمہیں۔ کہاں رکھ دیے جو مل ہی نہیں رہے۔“

”مجھے!“ زلیخا کی بات پر وہ حیران ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلی۔ ”اوہ ہاں صبح شہر جانے کی جلدی میں بھول ہی گئی تھی۔ ابھی دیکھتی ہوں جا کر۔“

”زینب! تم تو گاؤں میں اس گھر میں موجود ہو کر بھی مجھ سے اتنی ہی دور ہو جتنی کہ شہر میں رہتے ہوئے دور تھیں۔“ ”میں تو۔“

”پلیز، اب یہ مت کہہ دینا۔ میں تو یہیں ہوں آپ کے آس پاس۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”کیا یہ غلط ہے؟“ زینب کا انداز سوالیہ بھی تھا اور گلہ آمیز بھی۔

”شاید نہیں مگر زینی! تم سمجھتیں کیوں نہیں۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی کل ہی تو آئے ہیں آپ۔ اتنی جلدی تو گلہ نہیں کرتے، میں اسی گھر میں تو ہوں۔“

”کیا ہر روز یونہی مصروف رہتی ہو؟“

”نہیں! آج تو شہر جانا تھا ناں۔“

”زینی! کیا بات ہے تم میں جو اور کسی میں نہیں۔“ وہ قریب آیا اور سر جھکا کر مؤدب کھڑی زینب کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اونچا کیا۔

”شاہ سائیں!“ وہ جھجک کر پیچھے ہٹی اور بولی۔

”غریب کی نہ ذات ہوتی ہے نہ مذہب۔ وہ مالک کے حکم پر مجبور ہوتا ہے، مگر خدا کا گھر ہر دل میں ہے۔ مجھے میرے خدا کے سامنے شرمندہ نہ کریں شاہ سائیں!“

”میں سمجھا نہیں زینی!“ ”میں کم ذات کیا سمجھاؤں شاہ سائیں۔“

”ایسا تو نہ بولو خود کو، تمہارا کیا مقام ہے میری نظر میں۔ یہ تم نہیں جانتیں۔“

”بہت مہربانی ہے آپ کی۔“ اس کے انداز میں ہمیں عاجزی ہوا کرتی تھی۔

”زینی! میں رات کو کھانا اپنے کمرے میں ہی کھاؤں گا۔ اور کھانا تم لے کر آنا۔“

”شاہ بی پوچھیں گی آپ کا۔ میں کیا جواب دوں گی۔“

”اور آپکے دوست، وہ کیا سوچے گا بھلا۔“

”وہ آج شام کو واپس شہر چلا گیا۔ اس کی والدہ کا فون آیا تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں بس اسی لیے اچانک جانا پڑا۔“

”اوہ۔ یہ تو برا ہوا۔ اب وہ آپ سے ملیں گے تو شاہ بی کی جانب سے زاہدہ بی بی کی شادی میں شرکت کی دعوت دے دیجئے گا۔ مجھے ان سے کہنا تھا مگر وہ اچانک چلے گئے۔“

”تم آؤ گی ناں رات کو؟“

”شاہ جی! ملازمہ ہوں آپ کی۔ انکار ممکن نہیں۔“

”پھر وہی بات زینی! تم میرے لیے کیا ہو بتا نہیں سکتا۔“

”اچھا سائیں! بس ذرا باورچی خانے کا چکر لگا لوں۔“ وہ اسے مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر باہر آ گئی۔

شاہ بی اور ان کی بیٹیوں کو کھانا دیا۔ ننھی بہت نخرے کرتی تھی کھانا کھاتے ہوئے اور اسے کھانا کھلانے کی ذمے داری زینب کے سر تھی۔ وہ کافی دیر اس کے ساتھ مصروف رہی۔ پھر برتن اٹھوائے۔ اس کے بعد شاہ بی کے پیروں کی مالش اور زاہدہ نے سر میں تیل ڈلوانے کو بلوایا تو ادھر آ گئی۔ ننھی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کہانی سننے کی فرمائش کر دی۔

اس نے زلیخا سے کہہ دیا۔ ''شاہ سائیں کو کھانا دے دو۔'' اور خود جب اتنے کاموں سے فارغ ہوئی تو رات کے بارہ بجنے کو تھے اسے نماز پڑھنا تھی۔ وضو کر کے جائے نماز برآمدے میں پڑے تخت پر بچھا کر نیت باندھ لی۔

سچل سویا نہیں تھا۔ کمرے میں گرمی اور حبس تھا۔ وہ پہلے صحن میں کرسی ڈالے بیٹھا رہا۔ یوں کہ انتظار اسی کا تھا۔ کب وہ اماں کے کمرے سے نکلتی ہے اور اس کے کمرے کی طرف آتی ہے مگر گیارہ بج گئے، وہ نہیں آئی تب چوبارے پر چلا آیا۔ یہاں ہوا میں کچھ تیزی تھی مگر اسے مزا نہیں آ رہا تھا۔ دھیان جو نیچے زینب کی طرف تھا۔ زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکا، پھر نیچے چلا آیا۔ جامن کے پیڑ کے نیچے پھر موتیے کی ادھ کھلی کلیوں کے قریب اور تھک ہار کر جب کمروں کی اس قطار کے سامنے آیا تو وہ نماز پڑھ رہی تھی۔

ستون سے ٹیک لگا کر وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆......☆......☆

صبح وہ شاہ بی کو چائے دینے کے بعد موتیے کی کلیاں چننے لان کی طرف آئی تو ساری کلیاں غائب تھیں۔ کون لے گیا یہ سب کی سب۔ وہ حیران تھی اور خالی ٹوکری اٹھائے کھڑی تھی۔ آس پاس تو کوئی نہ تھا۔ شاید آج کوئی ملازمہ پہلے جاگ گئی ہوگی۔ یقیناً زلیخا ہی ہوگی۔ وہ واپس ہوئی۔ شاہ بی کے کمرے میں آئی۔ نظر بیڈ کے قریب رکھی میز پر ڈالی مگر وہاں تازہ پھول نہیں تھے۔

''کیا بات ہے زینب؟''

''کچھ نہیں شاہ بی! آپ یہ بتایئے، ناشتے میں کیا لیں گی اور آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ اب تو تھکن کا احساس نہیں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کچھ دیر کے بعد بچے کو جگا دینا۔ اب وہ گاؤں آ گیا ہے۔ شہر والی عادتیں چھوڑ دینا چاہئیں۔ اسے اب جلدی اٹھنا چاہئے گاؤں کے لوگوں کی طرح۔''

''جی ٹھیک ہے شاہ بی! میں جگا دوں گی انہیں۔'' وہ واپس آ گئی۔ زلیخا دہی بلو کر لسی بنا چکی تھی۔ رانو سے ناشتا بنانے کو کہا اور خود میز پر برتن لگانے لگی۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ سچل کے کمرے کے دروازے تک آئی۔ ہولے سے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو ذرا زور سے دستک دے کر پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ ارے وہ تو سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ چھت کو گھورتے ہوئے جانے کیا سوچ رہا تھا۔

''آپ جاگ رہے ہیں شاہ سائیں!'' وہ نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر آ گئی۔

''کیا ہر روز اتنی ہی سویرے جاگتے ہیں۔ شاہ بی تو کہہ رہی تھیں کہ اب آپ کو سویرے اٹھنا چاہئے۔ یہ شہر والی عادتیں چھوڑ دینا چاہئیں، مگر انہیں پتا نہیں پتا نہیں آپ تو پہلے ہی سویرے جاگنے کے عادی ہیں لیکن جب آپ پہلے گاؤں آیا کرتے تھے تب تو بہت دیر تک سویا کرتے تھے۔'' بولتے بولتے اچانک اسے احساس ہوا، وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس کی بات نہیں سن رہا پھر اس کی نظر میز پر پڑی موتیے کی کلیوں پر گئی۔

''اوہ تو یہ آپ نے چن لیں۔ میں بھی حیران تھی۔ صبح ہی صبح کون لے گیا۔''

''اتنی دیر سے میرے کمرے میں ہو۔ مجھ سے اتنی لمبی بات کر رہی ہو۔ وقت نہیں ضائع ہو رہا۔ اور جو کوئی آ گیا تو اسے کیا جواب دو گی؟''

اس کا لہجہ ناراض تھا۔ اس کا چہرہ بھی یہی انداز چھلکا رہا تھا۔ وہ چونکی اور خاصی بے بس دکھائی دینے لگی۔ کیا کروں کیسے سمجھاؤں۔

''شاہ سائیں! میں آنا چاہتی تھی، مگر۔'' اس سے آگے اس نے اپنے کاموں کی طویل فہرست گنوا دی۔

''زینی! سچ سچ کہو۔ کیا تم مجھ سے بھاگتی ہو؟''

''نہیں شاہ سائیں! بالکل نہیں۔ ایسا سوچیں بھی مت۔ آپ سے مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے ہاں مگر میں لوگوں سے ڈرتی ہوں، ان سب لوگوں سے جو میرے قریب تو ہیں مگر میرے اپنے نہیں ہیں، جن کی آنکھیں ہر دم نگراں رہتی ہیں، مگر ان میں صرف شناسائی ہے۔ میرے لیے محبت نہیں ہے۔ میں ڈرتی ہوں شاہ سائیں ان نگراں بے رحم آنکھوں سے۔''

''ہاں زینی! یہ گاؤں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ میں ان لوگوں کے رویوں پر حیران ہوں یار! کیسے بجھ بجھ جاتے ہیں۔ یہ سب مگر ان کی آنکھیں پر تجسس اور بے رحم ہیں۔ معصوم چہروں پر یہ آنکھیں کتنی عجیب لگتی ہیں۔ کبھی غور کیا تم نے۔''

''شاہ سائیں! آپ ناشتا کب تک کریں گے؟''

''سب کے ساتھ ہی کر لوں گا۔'' وہ میز پر رکھی کلیاں اٹھانے لگا۔ زینب اثبات میں سر ہلا کر باہر آ گئی۔

وہ کلیاں لے کر شاہ بی کے کمرے میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

ان چند دنوں میں سچل نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اسے پگڑی پہنانے کی رسم بھی ادا کی گئی تھی۔ دیہات کے سب (نچلے طبقے) لوگ آئے جھک کر سلام کیا پیروں کو چھوا دعائیں دیں اور جو لوگ اونچے طبقے کے تھے۔ انہیں شاہ بی نے بطور مہمان مدعو کیا۔ شاہوں کے خاندان کی عزت تو وہ بھی کرتے تھے آئے اور تحفے تحائف بھی دے کر گئے۔ رات گئے تک ہنگامہ ہوا تھا۔ شہر سے ناچنے والیاں بھی بلوائی گئی تھیں۔ گھر کی خواتین اور ملازمائیں چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھتی رہیں۔ زلیخا اور رانو کئی بار اسے بلانے آئیں مگر وہ نہیں گئی۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دکھ دے رہا تھا۔ ڈھولک پر تھاپ گھنگرؤں کی چھنک، سیٹیاں آوازے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں، پھر اختیار نہیں رہا تکیے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

زاہدہ کی شادی کو ایک ہفتہ باقی تھا۔ گھر میں مہمان جمع تھے۔ رونق تھی۔ ہنگامہ تھا۔ زینب تو چکرائی پھرتی تھی۔ ''پتا نہیں یہ مالک لوگ ہم جیسے لوگوں کو انسان کیوں نہیں سمجھتے۔ ایک منٹ کے لیے بھی بیٹھ جاؤ تو انہیں کام یاد آنے لگتا ہے۔'' رات کو بستر پر لیٹتی تو کمر بستر سے نہیں لگتی تھی۔

''زینب! تمہیں شاہ بی بلا رہی ہیں۔'' زلیخا تھکی تھکی اور جھنجلائی ہوئی تھی۔

"میں آتی ہوں۔" وہ دوپٹے پر گوٹا لگا رہی تھی۔ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"جی شاہ بی! آپ نے بلایا تھا مجھے۔" کمرے میں آکر پردہ ہٹاتے ہی اس نے کہا پھر نظر اٹھائی۔
یہاں شاہ بی تو نہیں تھیں۔ کرسی پر سچل بیٹھا تھا۔ "شاہ بی کہاں ہیں؟ انہوں نے مجھے بلایا تھا۔"
"تمہیں انہوں نے نہیں میں نے بلایا تھا۔" "جی حکم شاہ سائیں!"
"کیسا حکم؟" وہ جتانے کو مسکرایا پھر بولا۔ "کون حکم دیتا ہے۔ کون تابع ہے۔ یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو زینی!"
"سائیں کوئی کام تھا کیا؟" اس کمرے میں کسی بھی وقت کوئی آ سکتا ہے۔ وہ عجلت میں تھی۔
"بس اتنا کہنا ہے۔ کام کی زیادتی تمہیں بیمار نہ کردے۔ بوجھ اتنا ہی اٹھاؤ، جتنی تم میں طاقت ہے۔"
"سائیں! ہم ملازم لوگ ہیں۔ مالک کا حکم ماننا ضروری ہے، انکار کی گنجائش ہی کہاں ہے۔"
"اوہ زینی! کاش تم ملازمہ نہ ہوتیں۔ کاش تم میرے چچا کی بیٹی ہوتیں۔"
"چچا کی بیٹی۔" اسے اس خواہش پر حیرت بھی ہوئی، ہنسی بھی آئی۔
"تم عجیب لڑکی ہو زینی! نہیں تم بہت خاص لڑکی ہو۔ تم سب سے منفرد سب سے۔"
"شاہ جی! میں چلتی ہوں۔ شاہ بی نے کچھ کام میرے سر لگائے تھے۔ وہ دیکھ لوں پھر آ جاؤں گی۔" وہ تھکی تھکی سی تھی اور ایک دم سے اداس بھی ہو گئی تھی۔
"کیوں کی شاہ سائیں نے ایسی خواہش، تو کیا تمام محبتوں کے باوجود وہ مجھ میں اور خود میں کوئی فرق سمجھتے ہیں۔ وہ خود کو اعلا اور مجھے کمتر جانتے ہیں، ہاں ضرور ایسی ہی بات ہے۔ وہ مجھے اپنے برابر نہیں سمجھتے جبھی ایسی خواہش کا اظہار کیا۔" وہ چھت پر جانے والی سیڑھیوں میں آ بیٹھی۔ سر گھٹنوں پر جھکا دیا۔ آنکھیں موندے وہ اندر کی آزردگی کو کہیں اندر ہی دفن کرنے کی کوشش کرتی رہی۔
"زینب، او زینب!" اس کی پکار پڑ چکی تھی۔
اس نے سر اوپر اٹھایا۔ دوپٹہ درست کیا اور اٹھ کر ہولے ہولے سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ رنگ و نسل کے فاصلے کم نہیں ہو سکتے۔ یہ مٹائے نہیں مٹ سکتے۔
"کہاں تھیں تم؟ کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔" رانو پر تھکن اور غصہ سوار تھا۔
"کیا کام ہے مجھ سے؟"
"تمہیں کلثوم بی بی بلا رہی ہیں۔" اس نے سچل کی چچا زاد کا نام لیا۔
"کدھر ہیں وہ؟" اس نے واپس جاتی رانو کو پکارا۔
"شاہ بی کے کمرے میں ہوں گی یا پھر زاہدہ بی بی کے پاس۔"
وہ پہلے زاہدہ کے کمرے میں آئی۔ یہاں کلثوم شاہ بی کے کندھے پر سر رکھے بڑے لاڈ سے کچھ فرمائش کرتی ملی۔ شاہ بی کے لبوں پر مسکراہٹ، طاہرہ اور زاہدہ کی نظروں میں محبت اسے اسے درمیان میں بول کر ان سب کو اس ماحول سے نکالنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ کلثوم خود ہی ان کے کندھے سے الگ ہوئی اور اس سے بولی۔
"زینب! تم نے زاہدہ باجی کے دوپٹے پر ستارے بہت اچھے ٹانکے ہیں۔ تمہیں میرے لیے بھی ایسا ہی

دوپٹا بنانا ہوگا۔"
"کیوں نہیں بی بی آپ جب دوپٹا دیں گی بنا دوں گی۔"
"نہیں، دوپٹا میں لے کر دے دوں گی۔ تم رنگ بتا دو کلثوم!" شاہ بی کی نگاہوں میں بہت پیار تھا۔ کلثوم کے لیے یا شاید زینب نے ہی محسوس کیا۔
محبتوں اور نفرتوں کی ہلکی سی رمق بھی کسی نگاہ میں دیکھتی چونک جاتی تھی۔ پہچان جاتی تھی۔ بہت جلدی ان دونوں رنگوں کو۔

☆......☆......☆

آئندہ دنوں میں بھی کلثوم کا مقام باقی مہمان لڑکیوں میں خاص ہی رہا۔
وہ اچھی لڑکی تھی ہنس مکھ اور لاپروا گاؤں کی دیگر لڑکیوں کی طرح اسے نہ تو ٹولیوں میں بیٹھ کر باتیں بنانے کا شوق تھا نہ ہی وہ باپ کی دولت کی نمائش زیورات کی صورت میں کرتی تھی۔ ہنستی مسکراتی ہر ایک سے کھلے دل سے ملتی تھی۔ ملازماؤں سے بھی اس کا رویہ عموماً بہت اچھا ہوتا تھا۔ خاص کر زینب کو وہ بھی شاہ بی ہی کی طرح اہمیت دینے لگی تھی۔
کلثوم کی ماں بھی یہاں موجود تھیں۔ خاموش اور تیوری چڑھائے نظر آئیں۔ بے زار اور اداس، پہلے پہل زینب ان سے گھبرائی تھی۔ کوشش کی تھی۔ ان کے کام کوئی دوسری کر لے کہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے والے مالکوں سے بڑا خوف آتا تھا۔ مگر پھر یہیں مہمان خواتین کے کام بنٹاتے ادھر ادھر چلتے پھرتے اسے ان کی کہانی معلوم ہو گئی۔ عورتیں کہتی تھیں وہ بھی اپنی بیٹی کلثوم کی طرح ہنس مکھ ہوا کرتی تھیں مگر چند سال پہلے ان کی شوہر نے شہر والے گھر میں ایک عورت ڈال لی تھی۔ اور یہ غم کلثوم کی ماں کو گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ زینب کو حیرت تھی کسی بھی عورت کو اس لٹنے والی سے ہمدردی نہ تھی۔ اکثریت یہی کہتی۔ غیر ذات غیر برادری کی عورت گھر میں رکھی ہے۔ مگر نکاح نہیں کیا (کہ ان کے ہاں مرد غیر سید عورت کو گھر میں رکھ تو سکتے تھے مگر نکاح میں سید زادی کو ہی لاتے تھے) اولاد وہی عزت دار اور جائیداد میں حصہ دار ہوتی تھی جو سید زادی سے ہوا کرتی تھی۔
"شکر نہیں کرتی۔ کسی سید زادی کو نکاح میں لا کر اس کے مقابلے پر کھڑا نہیں کیا۔" عورتیں باتیں بناتی تھیں۔
مگر زینب نے جیسے اس کا دکھ اپنے دل میں لہریں لیتا محسوس کر لیا تھا۔ ہائے برداشت کتنی مشکل تھی۔ ارے جائیدادوں کے بٹوارے ہوں تو ہوں مگر کسی کے دل کا بٹوارہ نہ ہو۔ اس کا جی چاہا اس سید زادی کو پرسہ دے خوب روئے اس کے ساتھ مل کر۔ پھر وہ بہت خیال رکھنے لگی اس کا اور کلثوم کہتی۔
"اماں! ہم زینب کو اپنے ساتھ اپنے گھر ہی لے چلتے ہیں۔ اتنا خیال تو کبھی بیٹی ہو کر میں نے نہیں کیا، جتنا یہ رکھتی ہے آپ کا۔"
"نہیں نہیں۔ مجھے یہاں سے کہاں جانا ہے بھلا۔" اسے سچل شاہ کا خیال آ جاتا اگر میں چلی گئی تو وہ کیا

کریں گے۔ مجھے دیکھے بغیر کیسے خوش رہ سکیں گے اور انکار کرنے لگتی۔

☆......☆......☆

موسم بدل رہا تھا مگر اندر کا موسم وہی تھا۔ ٹھہرا ٹھہرا۔ یقین تھا مگر پھر بھی دل کے کسی کونے کھدرے میں بے یقینی بھی چھپی بیٹھی تھی۔ ایمان پختہ تھا مگر حویلی کی اونچی...... دیواریں جسم کی عمارت کو دھڑ دھڑانے لگتی تھیں اور شور ہنگامے کے باوجود ایک سناٹا تھا جو ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر۔ مشین کی طرح۔

''زینی کہاں رہتی ہو، ملتی ہی نہیں۔ وہ شکوہ کرتا۔

''شاہ سائیں! آپ انتظار کرتے ہیں۔'' وہ شرمندہ ہو جاتی۔ یہ نہیں کہہ سکتی اتنی مصروفیت میں کہاں سے وقت نکالوں۔

''میں انتظار کروں گا رات کو۔ میرے کمرے میں کھانا لے کر تم ہی آنا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور جب رات کو کھانا لے کر گئی تو اس کے کمرے میں رشتے دار مرد موجود تھے۔ وہ اندر نہیں جا سکی۔ خوب جانتی تھی، باعزت گھرانے کے ان آن بان والے سپوتوں کو، کھانے کی ٹرے زلیخا کو جا تھمائی اور بولی۔

''جلدی سے شاہ سائیں کے کمرے میں دے آؤ۔ انہیں انتظار ہوگا میں شاہ بی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ کچھ کام ہے مجھے۔''

صبح پھر وہ ناراض تھا۔ جتنی بار سامنے آئی منہ پھیر لیا اور اسے منانے کو ہزار کام چھوڑ کر اس کا پیچھا کرنا پڑا۔ کب وہ لوگوں سے الگ ہو اور زینب معافی مانگ سکے۔

سچل شاہ بی کے کمرے میں گیا۔ زینی سامنے برآمدے میں کھڑی رہی۔

''تمہیں صبح شاہ بی نے کسی کام کے لیے کہا تھا یاد ہے؟'' زلیخا شاہ بی کے کمرے سے باہر آ کر جتا کر یاد دلا رہی تھی۔

''اوہو میں تو بھول گئی۔ انہوں نے کپڑے استری کرنے کو کہا تھا۔'' وہ جلدی سے آگے بڑھی، دروازے پر دستک دی۔ اجازت ملتے ہی اندر آ گئی۔

''شاہ بی! معافی چاہتی ہوں۔ وہ جی کام میں، میں بھول گئی تھی۔''

''کیوں بھول گئی تھیں تم؟ یہ اہمیت ہے تمہارے نزدیک میری بات کی۔''

''نہیں نہیں شاہ بی! آپ کی بات میرے لیے حکم ہے۔ میں ابھی استری کر دیتی ہوں۔'' ان کا ناراض لہجہ اس کے ہاتھ پاؤں پھلا گیا۔ سچل ماں کے پاس بیڈ پر نیم دراز اور اس ساری گفتگو سے یکسر بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

''سچے! تمہارے چچا اب رسم کر دینا چاہتے ہیں؟'' زینب کو ڈانٹ کر بیٹے سے مخاطب ہوئیں تو لہجہ بڑا ٹھنڈا، میٹھا تھا۔ زینب الماری سے کپڑے نکال رہی تھی۔ کچھ زیادہ توجہ ان کی باتوں کی طرف نہیں تھی۔

''اماں! کیا ہیں یہ فضول رسمیں؟'' اس نے بے زاری کا بھرپور اظہار کیا۔

''فضول رسمیں کیوں تمہاری اور کلثوم کی بات تو بچپن سے طے ہے۔ اب وہ باقاعدہ منگنی کرنا چاہ رہے

ہیں۔ برائی کیا ہے اس میں؟'' کوئی چیز زینب کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر آ گری۔

وہ اس آواز پر چونکا اور سیدھا ہو کر زینب کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا توڑ دیا۔ ہاتھوں میں جان نہیں رہی کیا۔ میں دیکھ رہی ہوں اب تم بھی بہت نکمی ہوتی جا رہی ہو۔''

''کک۔ کچھ نہیں شاہ بی!'' وہ جھک کر لکڑی کا چھوٹا سا بند ڈبہ اٹھانے لگی۔

''سچے! تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جواب دو میری بات کا۔''

''اماں سچ کہتا ہوں، مجھے آپ کی بات ذرا بھی پسند نہیں آئی۔'' وہ خاصا سنجیدہ تھا اور بار بار پلکیں جھپک رہا تھا۔

''یاد رکھو۔ شادی تو تمہیں کلثوم سے ہی کرنا ہے۔ یہ برادری کا مسئلہ ہے۔ ہم برادری سے کٹ نہیں سکتے۔ اسی خاندان میں تمہاری دو بہنیں بیاہی ہیں اور یہیں ان کے اور تمہارے بچوں کی شادیاں ہوں گی۔ یاد رکھو اگر انکار کرو گے تو قطع تعلق کر لیا۔ کٹ کر رہ جاؤ گے۔ سزا صرف تمہیں ہی نہیں تمہاری بہنوں کو، ان کے بچوں کو اور تمہاری اولاد کو بھی بھگتنا پڑے گی۔ سچے یہ سزا کس قدر اذیت ناک ہے، اکیلے رہ جانے پر خوف کا کیسا حملہ ہوتا ہے۔ یہ تم اس وقت سب کے درمیان بیٹھ کر شاید محسوس نہیں کر سکو گے۔ میرے لال! ہوش سے فیصلہ کرو۔ تم صرف ایک ذات ہی نہیں تمہارے ساتھ بہت سے لوگ وابستہ ہیں۔''

زینب کپڑے نکال چکی تھی، باہر چلی گئی۔

''اماں! مجھے اعتراض تو نہیں۔ میں بھی اپنی روایات کو جانتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں، بظاہر آزاد نظر آتے ہیں مگر ہم سب ان روایات کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔''

زینب کمرے سے نکل گئی تو اس نے ماں سے کہا۔

''یہ روایات ہی ہماری زندگی ہیں۔ ہماری عزت انہی کی وجہ سے ہے۔ انہی پر چل کر تو الگ تھلگ اور باعزت ہیں۔ سچ! ان سے بے زاری کا اظہار مت کرو پتر!!''

''اماں! تھوڑا وقت تو دیں۔ ابھی دل نہیں مان رہا۔''

''دل کیوں نہیں مان رہا۔ کلثوم بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''ہاں اماں! وہ واقعی اچھی لڑکی ہے مگر۔''

''اچھا جاؤ۔ آرام کرو پھر بات کریں گے۔'' شاہ بی نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔

☆......☆......☆

''کیسی ہیں یہ ریتیں، رسمیں جکڑ لیتی ہیں، زینی! کبھی سوچا تھا میں نے کہ یوں بے بس ہو جاؤں گا۔''

اس روز وہ آمنے سامنے جامن کے اسی پیڑ تلے کھڑے تھے اور سچل رنجیدہ تھا۔

دوپہر سے اب تک کافی وقت تھا درمیان میں اور زینب نے خود کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ جبھی تو اس کی بات پر ہنس پڑی تھی۔

''شاہ سائیں! آپ کی منگنی کی رسم ہو رہی ہے۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے آپ ایسی بات کیوں کر رہے ہیں۔''

''زینی! کیا تم اداس نہیں ہو؟'' روشنی صرف چاند کی تھی۔ وہ بغور دیکھ کر بھی چہرے کے تاثرات جاننے میں ناکام تھا۔

''اداسی کس بات کی شاہ سائیں؟ آپ کا گھر آباد ہو تو مجھ سے زیادہ بھلا کون خوش ہوگا۔''

''یقین کرو زینی! میرے دل میں تم ہو اور تم ہی رہوگی۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ اس بارے میں بااعتماد تھی۔

''تم میری محبت ہی نہیں زندگی بھی ہو۔ دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔ بہت قدر ہے میرے دل میں تمہاری اور بہت عزت دیتا ہوں میں تمہیں زینی! میرے لیے تو یہ سوچنا بھی محال ہے کہ تم کبھی یہاں سے چلی جاؤ گی زینی! وعدہ کرو جب تک میں جیوں گا تم میرے آس پاس، میری نظر کے سامنے رہوگی۔''

''شاہ سائیں! مجھے بھلا کہاں جانا ہے۔ میں تو یہیں ہوں اور یہیں رہوں گی۔'' وہ اس کی بے تابی پر مسکرائی تھی۔

''ہاں زینی اس گھر کی رونق تم ہو اور میرے دل کی دنیا بھی تم ہی سے بارونق ہے۔''

''بی بی کلثوم بہت اچھی ہیں۔ عادت کی بھی صورت کی بھی۔ میری دعا ہے آپ دونوں ہمیشہ خوش رہیں۔''

☆......☆......☆

اور پھر جس رات زاہدہ کی مہندی تھی۔ اسی رات بچل شاہ اور کلثوم کی منگنی کی رسم بھی ادا ہوگئی۔ زینی بے حد مصروف ادھر سے ادھر دوڑتی رہی۔ اتنے مہمان اور دو دو تقریبیں کام بہت زیادہ تھا۔ اس کے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ کپڑے ہی بدل لے۔ بال بنالے اور نہیں تو کانوں میں جھمکے ہی ڈال لے۔ شاہ بی نے تمام ملازماؤں کو گلابی رنگ کے جوڑے بنوا کر دیے تھے دوپٹوں پر گوٹے کا کام تھا اور کنارے پر کرن ٹانکی گئی تھی۔ باقی سب تو کپڑے بدل چکی تھیں۔ رانو نے تو بالوں میں لمبا سا پراندہ ڈال کر ہاتھوں میں چوڑیاں بھی پہن لیں، مگر اسے پکار بھی تو ہر طرف سے پڑتی تھی۔ بڑی ایمانداری سے اپنے دل کا آباد کار اس نے کلثوم کو سونپا تھا مگر وہ جان رہی تھی۔ ایک اداسی اندر ہی اندر گہری ہو رہی ہے۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود دل ضدی بچہ بن رہا ہے۔ بچل کو رسم کے لیے کلثوم کے برابر بٹھایا گیا تو زینب باورچی خانے میں آ کھڑی ہوئی جب تک باہر نہیں آئی جب تک رسم ادا کرنے کے بعد وہ اٹھ کر باہر نہیں چلا گیا۔

شام کو ان دونوں کی منگنی ہوئی اور اس کے بعد زاہدہ کی مہندی کی تیاری ہونے لگی۔

''زینی!'' وہ پھولوں کے ہار لے کر برآمدے سے گزر رہی تھی جب بھی بچل نے سرگوشی میں اسے بلایا وہ رک گئی اور سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''زینی! تم نے کپڑے کیوں نہیں بدلے؟''

''وقت ہی کہاں ملا شاہ سائیں!'' وہ ہاتھ میں پکڑے سرخ گلابوں کے ہار دیکھنے لگی۔

''کیسا جوڑا بنایا تھا؟'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

''جیسا رانو، زلیخا اور دوسری کام کرنے والیوں کا تھا۔''

''کیا؟'' وہ پہلے چونکا پھر بولا۔ ''بہت اچھا کیا جو تم نے وہ جوڑا نہیں پہنا۔ وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا زینی! اور سنو اگر کل کے لیے بھی انہی جیسا بنوایا ہے تو وہ بھی مت پہننا۔''

''آپ کو بہت بہت مبارک ہو شاہ سائیں۔'' زینی نے جیسے کچھ یاد دلانا چاہا۔ بتانا چاہا۔ ''اب میرے لیے اتنے فکر مند مت رہا کریں۔''

''زینی! تم اپنے دل میں مجھے وہی جگہ دیے رکھنا جو پہلے تھی۔ دیکھو یہ نیا رشتہ کبھی ہمارے درمیان نہیں آسکتا۔''

''شاہ سائیں! روح کے رشتے جسم کی طلب کب کرتے ہیں جو پاکیزہ محبت ہوتی ہے ناں۔ وہ ان باتوں سے دور ہوتی ہے ہمارے لیے ایک دوسرے کی خوشبو ہی کافی ہے۔''

''زینی! تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟'' وہ پھر کہہ بیٹھا تھا۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

''یہ مجھے آپ نے سکھائی ہیں۔''

''میں نے۔ نہیں تو۔'' بچل نے سوچ میں ابھرتے ڈوبتے نفی میں سر ہلایا۔

''بڑے بڑے رازوں سے پردہ ہٹا دیتی ہے محبت تو پھر میں کیسے نہ کہوں کہ آپ نے سکھائی ہیں۔'' وہ مسکرائی اور بچل کی جانب نگاہ کی۔

''زینی! تو پھر اتنا یاد رکھنا۔ میں تمہاری خوشبو کو ہمیشہ اپنے آس پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ سائیں مجھے بھلا کہاں جانا ہے۔ یہیں تو ہوں آپ کے آس پاس۔''

☆......☆......☆

رات دو بجے اسے کاموں سے فراغت نصیب ہوئی تھی اور صبح بارات کی آمد تھی۔ اسے بہت جلدی اٹھنا تھا جب سونے کے لیے بستر پر آئی تو جسم پر تھکن اور آنکھوں میں نیند کا غلبہ تھا مگر لیٹتے ہی نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی۔

''اوہ پاگل ناشکری لڑکی! جان کر بھی اپنا مقام کیوں نہیں جان رہی۔ کیوں تو بھول رہی ہے خود کو، تیرے لیے تو یہی بہت زیادہ ہے کہ شاہ تجھے محبت بھری آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ہاں میں جانتی ہوں۔ واقعی یہ بہت زیادہ ہے اور سچ تو یہ کہ مجھے کچھ اور کی طلب بھی نہیں مگر اس کی نظر میں عکس اب دو ہوں گے اس کے دل میں میرے ساتھ ساتھ کوئی اور۔

کیا تم اس قابل ہو کہ ایک سید زادی کی برابری کر سکو، نہیں ہونا؟ وہ تمہیں اپنی زندگی کہتا ہے۔ وہ تمہیں ہی اپنے آس پاس چاہتا ہے زینب بی بی یہی بہت ہے سچ تو یہ کہ یہ بھی تمہاری اوقات سے کہیں زیادہ ہے۔ بس تم بھی اسی ایک نام کا ورد کرتی رہو۔ تم تو بہت زیادہ کی خواہش مند ہو۔'' خود سے سوال و جواب کرتی وہ

کروٹیں بدلتی رہی اور صبح ہو گئی۔

☆......☆......☆

''سن زینب!'' کلثوم نے اسے کمرے میں بلا کر راز داری سے کہا تھا۔ ''یہ موتیے کی کلیاں سچل کے کمرے میں رکھ آؤ اور بتا دینا کہ کس نے بھیجے ہیں۔''

''جی بہت اچھا!'' اس نے ہاتھ بڑھا کر کلیاں لے لیں۔

''سنو۔ وہ ناشتا کس وقت کرتے ہیں؟''

''شاہ بی کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی ناشتا کرتے ہیں مگر آج کل مصروفیت ہے۔ شہر سے ان کے دوست بھی بہت آئے ہوئے ہیں تو باہر بیٹھک میں بھی کر لیتے ہیں۔''

''نہیں، ان سے کہنا۔ آج ناشتا تائی ماں (شاہ بی) کے کمرے میں ہی کریں۔ کہہ دینا تائی ماں نے کہا ہے۔ میرا نام مت لینا اور میرا ناشتا بھی ادھر ہی لگا دینا۔''

کتنے خوبصورت رنگ پھیلے تھے کلثوم بی بی کے چہرے پر، ایسے پیارے کہ نظر ہٹانے کو جی نہ چاہے۔

''جا اب ایسے کیوں کھڑی ہے۔'' کلثوم نے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ وہ جیسے چونکی اور باہر آ گئی۔

کلثوم نے منع کیا تھا۔ سچل سے یہ مت کہنا کہ شاہ بی کے ساتھ ناشتا کرنے کو وہ کہہ رہی ہے۔ بات شاہ بی کی طرف سے کرنا مگر زینت، سچل شاہ سے بھلا کچھ چھپا سکتی تھی۔ سب بتا دیا۔ سن کر وہ ایک دم ہنس پڑا پھر زینب کو دیکھ کر ہنسی روک لی اور بولا۔

''اچھا دیکھوں گا۔ پتا نہیں اتنے کاموں میں ناشتے کے لیے وقت بھی ملتا ہے یا نہیں۔'' اور ہاتھ بڑھا کر کلیاں لے لیں۔

سچل نے کہا تھا، پتا نہیں ناشتے کے لیے وقت بھی ملتا ہے یا نہیں مگر جب وہ ناشتا لے کر شاہ بی کے کمرے میں آئی تو وہ اور کلثوم پہلے سے شاہ بی کے کمرے میں موجود تھے۔

''میں چلتی ہوں۔ تائی اماں آپ ناشتا کیجیے۔'' کلثوم ہلکا سا گھونگھٹ نکالے ہوئے تھی۔

شاہ بی مسکرائیں اور بولیں۔

''ناشتا میرے ساتھ ہی کرو میری رانی! جاؤ زینی میری بہو کے لیے بھی ناشتا لے کر آؤ۔''

''شاہ بی! یہ تین چار بندوں کے لیے کافی ہے۔ آپ تینوں ہی کر لیں۔ دیکھیے ناں، اپنے شاہ سائیں تو کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔ انہیں کھانے پینے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ آج کل۔'' اس کے اتنی دانشمندی سے بات بنانے پر دل ہی دل میں دونوں نے داد دی اور کلثوم نے بھی سوچ لیا، جب بیاہ کر اس گھر میں آؤں گی تو میری خاص ملازمہ یہ زینب ہی ہو گی۔

☆......☆......☆

زاہدہ کی شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو شاہ بی، سچل کی دلہن کے لیے بری بنانے لگیں۔ مشورے زینب کے ہی ہوتے۔ اکثر اسے ساتھ لے کر کپڑوں اور زیورات کی خریداری کے لیے شہر بھی چلی جاتیں۔ وہ بہت جلد سچل

کے سر پر سہرا سجانے کی آرزو مند تھیں۔ بیٹیاں اپنے گھروں کی ہوئیں۔ اب انہیں تنہائی ستاتی تھی۔ بار بار اظہار کرتیں۔ ایک بار سچل نے کہا بھی۔

''اتنے تو لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کے گرد، پھر بھی آپ خود کو تنہا محسوس کرتی ہیں۔''

''پترا! یہ ملازم...... لوگ ہزاروں کی تعداد میں بھی ہوں تو تنہائی دور نہیں ہو سکتی۔ بھلا ان سے دل کی بات کی جا سکتی ہے۔''

''شاہ بی! تیل ڈال دوں آپ کے سر میں۔'' زینی نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔

''ہاں ڈال دے اور سن۔ نرم ہاتھوں سے مالش کرنا پھر سچل سے بولیں۔'' کیسے روکھے ہو رہے ہیں تمہارے بال۔ تم بھی سر میں تیل ڈلوا لو۔''

''بخشیں، مجھے، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' وہ جیسے ڈر گیا اور اٹھ کر چلا گیا۔

''یہ عجیب فیشن ہے جو شہر میں پڑھ کر آ جاتا ہے بال روکھے رکھنے لگتا ہے۔''

''ہماری کلثوم بی بی بھی تو بال روکھے ہی رکھتی ہیں شاہ بی!'' زینب نے ہنس کر یاد دہانی کروائی۔

''ہاں اس ٹی وی نے بڑا خراب کر دیا ہے۔ بھولی بھالی لڑکیوں کا۔ شہر والیوں کی طرح الٹے سیدھے کپڑے پہن کر اسے فیشن کا نام دے ڈالتی ہیں۔ یہ نہیں سوچتیں۔ یہ پہن کر لگ کیا رہی ہوں میں۔''

زینب ہنس پڑی اور بولی۔ ''ٹی۔ وی نے گاؤں والیوں کو بھی شہر والیوں جیسا بنا دیا ہے بس یہ فرق ہے کہ زبان وہ والی نہیں بول سکتیں۔''

''اچھا ہی ہے۔''

''تائی اماں! آپ سے ملنے مہمان آئی ہیں۔ زلیخا نے بٹھا دیا ہے۔ آپ آ کر مل لیں۔''

''اس وقت کون آ گیا؟ بلاؤ زلیخا کو اور زینب! تم جلدی سے بال سلجھا دو۔''

''شاہ بی! ملکانی آئی ہیں اپنی بیٹی، بہو کے ساتھ۔'' زلیخا یہ اطلاع بڑے پرجوش انداز میں دے رہی تھی۔

''اے زینب! ملکانی اپنی بہو کے ساتھ پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آئی ہے۔ تم الماری سے کوئی اچھا سا ان سلا جوڑا نکال دو۔''

''جوڑے تو بہت رکھے ہیں شاہ بی! آپ بتا دیں کون سا والا نکالنا ہے۔''

''تم خود بھی سمجھتی ہو ان معاملات کو۔ کوئی سا بھی نکال دینا۔''

بالوں کی چٹیا بنا کر زینب نے کنگھا اور تیل اٹھا کر سنبھالا اور شاہ بی مہمان خواتین سے ملنے چلی گئیں۔

ہاتھ دھو کر وہ کپڑوں والی الماری تک آئی جس کے ایک خانے میں تحفے میں دینے کے لیے کافی کپڑے رکھے تھے کہ شاہ بی کے پاس اکثر عورتیں نئی بیاہی بیٹیوں اور بہوؤں کو لاتی رہتی تھیں اور تحائف محبت کی علامت کے طور پر نہیں اپنی بڑائی جتانے کی غرض سے دیے جاتے تھے۔

کتنے پیارے پیارے کپڑے رکھے تھے یہاں۔ اس نے ہرا جوڑا نکالا جس کے دوپٹے کے کناروں پر

ستاروں والی بیل ٹانکی گئی تھی۔ پھر نیلا جوڑا جس پر سنہری پھول تھے اور لال بھی۔ اتنے اچھے اچھے کپڑے، چند لمحوں کے لیے وہ کھو سی گئی۔ کسی ملال نے سر اٹھایا مگر سنبھلنے میں دیر نہیں لگی۔

☆......☆......☆

سہرا بندی کی رسم میں برادری کے ساتھ ساتھ سارا گاؤں بھی امڈ آیا تھا۔

بیٹے اور بیٹی کی شادی یں خوشی کا رنگ خاصا مختلف ہوتا ہے۔ اور واضح فرق نظر آتا ہے۔ دیگوں کی لمبی قطاریں اتر رہی تھیں۔ گانا بجانا، ڈھولک کی تھاپ پر لڈی اور جھومر اور پھر رات کو شہر سے بلوائی گئی مخصوص طبقے کی عورتوں کا ناچ۔ یہ سب تقریباً ایک ہفتے تک جاری رہا۔ اور اسی شور ہنگامے میں دلہن گھر لائی جاتی۔

سہرا بندی کی رات وہ رسم کے بعد اپنے کمرے میں آیا تھا۔ یار دوستوں نے مذاق ہی مذاق میں مٹھائی اس پر اچھالی تھی اور کپڑے خراب ہوگئے تھے۔ زینب نے کپڑے نکال دیے۔ وہ کپڑے اس سے لیتے ہوئے تھم سا گیا۔

''زینی! یہ رات تو خوشی کی رات ہے مگر مجھے لگتا ہے میرے اندر کوئی پچھتاوا، کوئی پیاس سر اٹھا رہی ہے۔''

''ایسی باتیں مت کریں سائیں!''

''زینی! یہ رسم و رواج بھی کیا چیز ہیں۔ کتنا بے بس کر دیتے ہیں انسان کو۔ میں چاہوں بھی تو تمہیں اپنا نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے زینی کہ اس کے ساتھ بہت سی قباحتیں ہیں۔ زندگی ہمیں بہت سے لوگوں کے ساتھ ہی بسر کرنا ہوتی ہے۔ ان سے کٹ کر ہم نہیں رہ سکتے اور یہ لوگ قدم قدم پر ہماری راہ کو کٹھن بنا دیتے ہیں زینی! معاملہ صرف میرے اور تمہارے درمیان نہیں ہے بلکہ یہ تو۔''

''میں سب سمجھتی ہوں شاہ سائیں! میں اپنی حیثیت سے بھی واقف ہوں۔ میں آپ کا مقام بھی جانتی ہوں۔ مجھے شاہ بی کی عنایتیں بھی یاد ہیں۔ مجھے کلثوم بی بی کا مہربان رویہ بھی نہیں بھولا۔ میں خوش ہوں سائیں کہ میں اتنے سارے مہربان لوگوں کے درمیان ہوں۔ میں تو بہت خوش نصیب لڑکی ہوں سائیں کہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے مجھے بہت کچھ بنا دیا ہے۔ میں تو تمام عمر اسی فخر کے سہارے بسر کرلوں گی شاہ سائیں۔''

''تم بہت عظیم لڑکی ہو۔'' سچل کے انداز میں ستائش اور بہت نرمی تھی۔

بارات کے ساتھ وہ نہیں گئی۔ شاہ بی نے اسے گھر میں رہنے کو کہا کہ یہاں بہت کام تھا۔ زلیخا بارات میں ساتھ جا رہی تھی۔ وہ روانگی سے پہلے تک شاہ بی سے ہدایات لیتی رہی۔

''ہمارے واپس آنے سے پہلے تمام بکھری ہوئی اشیاء کو سلیقے سے رکھوا دینا۔ دلہن کی آمد پر فوراً تیل کی بوتل مجھے پکڑا دینا یاد سے۔ دلہن دلہا کے لیے کھیر پکوانا۔ تقسیم کرنے والی رقم سامنے ہی رکھنا۔ دلہن کے کمرے میں ابھی کسی کو نہ جانے دینا۔''

اور بہت سے چھوٹے چھوٹے کام وہ بولتی رہیں۔ زینب دہراتی رہی۔ فکر مند تھی اتنے کام ہیں کوئی

بھول نہ جائے اور واپسی پر شاہ بی خوب ہی ڈانٹیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ تیزی سے ان ہدایات پر عمل کرتی رہی۔ رات گہری ہوگئی۔ بارات کی آمد میں خاصی تاخیر ہوگئی تھی۔ وہ شاہ بی کے کمرے میں بیٹھی رہی پھر اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی اور پتا بھی نہیں چلا کب نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

بارات کب واپس ہوئی۔ کیا کیا رسمیں ادا کی گئیں۔ کلثوم دلہن بن کر کیسی لگ رہی تھی۔ سچل کے چہرے پر کیسے رنگ تھے، وہ کچھ بھی نہ جان سکی۔

وہ تو اگلی صبح ہی بیدار ہوئی تھی اور ہڑبڑا کر بستر سے اٹھی۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' رانو بھی رات کو یہیں پڑ کر سو رہی تھی اور صبح وہ زینب سے پہلے جاگ گئی تھی اور بستر پر ہی پڑی تھی۔

''باہر جا کر کوئی نہ کوئی کام ہی کرنا پڑ جاتا۔ سوچا تھا جب تک آواز نہیں پڑتی لیٹی رہوں گی۔''

''بارات آ گئی رانو؟''

وہ خوب ہی ہنسی۔

''تو بھی کمال کرتی ہے اڑی۔ اب تو دن نکل آیا۔ ولیمہ ہے آج، بارات تو رات کو ہی واپس آ گئی تھی۔''

''ہا! میں تو ذرا کی ذرا بستر پر آئی اور سو گئی۔ شاہ بی نے میرا پوچھا ہوگا۔ وہ بہت ناراض ہوگئی ہوں گی۔ تم مجھے جگا دیتیں۔''

''تم بہت دنوں سے کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا اچھا ہے۔ سولو اور سارا کچھ تو تم نے تیار رکھا تھا۔ شاہ بی نے جو مانگا، میں نے دے دیا۔''

''کیسی لگ رہی تھی کلثوم بی بی دلہن بن کر؟''

''چھوڑو زینب، اتنا زیور ایسے پیارے کپڑے، کوئی بھی پہن لے تو رانی ہی لگے۔''

''شاہ بی تو بہت خوش ہوں گی؟''

''ظاہر ہے انہیں خوش ہونا ہی چاہیے کلثوم بی بی انہیں بہت پسند بھی ہے اور سچل سائیں بھی بہت خوش ہیں۔''

''اچھا!'' زینب کے انداز میں بے یقینی اتر آئی۔

''تو کیا نہیں ہونا چاہیے، تم آخر اتنی حیران کیوں ہوگئیں۔''

''نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' زینب اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاہ بی کو گھر میں دلہن آنے کی مبارکباد دی۔ انہوں نے مسکرا کر مبارکباد قبول کی اور جواب میں سو کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''یہ کیوں شاہ بی؟'' زینب کو دکھ ہوا۔ کیا میں نے اس لیے مبارکباد دی تھی، شاہ بی اب تک مجھے سمجھ ہی

نہیں سکیں۔

''رکھ لے۔ میں ان سب کو دے رہی ہوں بلکہ زلیخا نے تو خود کہہ کر زیادہ لیے ہیں۔''

''نہیں شاہ بی! مجھے ضرورت نہیں۔''

''ضرورت کی کیا بات ہے۔ رکھ لو۔'' شاہ بی کو اس کا انکار اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''رکھ لو زینب! دولہا دلہن کا صدقہ اتارا تھا ناں کل اماں نے۔'' زاہدہ نے بتایا اور اس نے نوٹ مٹھی میں دبا لیا، پھر کچھ نہیں کہا شاہ بی سے۔ باورچی خانے میں آ کر ان کا ناشتا بنایا اور جب دلہن کے بیدار ہونے کی اطلاع ملی تو ادھر آ گئی۔

رات کے سنگھار کے ہلکے سے نشان کلثوم کے چہرے پر تھے مگر حسن بڑھانے کو اب اسے کسی سنگھار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خوشی، خود پر فخر اور جانے کن لفظوں کے رنگ تھے کہ وہ دمک رہی تھی۔ زینب کی کیفیت اس کی اپنی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ دروازے پر ہی رک گئی اور طاہرہ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ کلثوم کو باتیں کرتا ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ جسے میں نے اپنا سب کچھ مان لیا۔ اس نے تمہیں اپنا آپ دیا اور تم سے تمہیں لیا۔ تم اس کی ہو تو مجھے بھی بہت پیاری ہو۔ وہ آگے بڑھی بیڈ کے قریب فرش پر بیٹھ گئی اور کلثوم کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اسی وقت سچل نہا کر باتھ روم سے نکلا۔ زینب کو یہاں موجود پا کر ہونٹوں کی مسکراہٹ دبا لی اور کچھ کترا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

''بہت مبارک ہو۔'' زینب نے کلثوم اور یہیں موجود اس کی بھابی کو مبارکباد دی اور جواب میں بھابی نے بھی ایک نوٹ تھما دیا، اس مرتبہ اس نے انکار نہیں کیا۔ نوٹ لے کر دوپٹے کے ایک کونے سے باندھ لیا۔

☆......☆......☆

''زینب! تو باتیں بہت بڑی بڑی کرتی ہے۔ کہاں سے سیکھی ہیں تو نے یہ باتیں؟'' کلثوم حیران ہو کر کئی بار پوچھ بیٹھتی تھی۔

''بس بی بی! یہ باتیں ہی تو آتی ہیں مجھے اور تو کچھ بھی نہیں۔'' وہ خوامخواہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''نہیں تو ہے بڑے گنوں والی۔''

''تم تعریف کرتی ہو۔ یہ تمہاری مہربانی ہے بی بی۔''

''سنو۔ سچل سائیں کو کھجور کا حلوا بہت پسند ہے۔ وہ آج شام تک شہر سے آ جائیں گے، تم بنا کر رکھنا۔''

''کھجور کا حلوہ سائیں کو؟ لیکن وہ تو میٹھا بہت ہی کم پسند کرتے ہیں۔''

''آ......اچھا مگر مجھ سے خود ایک روز ذکر کیا تھا انہوں نے۔''

''یونہی کہہ دیا ہوگا۔ ویسے بی بی! اگر آپ کو پسند ہے تو بنا دوں۔''

اور ایک روز کلثوم نے لہنگا پہنا تھا۔ خوب کام والا، وہ منتظر تھی سچل کی گھر آمد کی۔ جب یونہی زینب کے منہ سے نکل گیا۔

''شاہ سائیں کو تو یہ لباس پسند نہیں، کہتے ہیں اتنا بھاری کام اتنا سارا کپڑا آپ نہیں پہن کر چلتی کیسے ہیں۔''

اور یونہی ایک بار جب کلثوم شہر میں شاپنگ کے لیے گئی۔ سچل کے لیے نیلے رنگ کا سوٹ خریدا تو زینب بولی۔ ''یہ رنگ انہیں پسند نہیں۔''

کلثوم بولی کچھ نہیں۔ شادی کے شروع ہی دنوں مین سچل کو کراچی جانا پڑ گیا تھا۔ اس کے کسی دوست کا کام تھا۔ بزنس میں گھاٹا ہوا تھا اور پریشان سچل بھی رہا۔ کبھی ادھر ہوتا کبھی ادھر۔

جب سچل کو فرصت ہوئی تب کلثوم نے گہری نظر سے جائزہ لیا۔ نہیں وہ تو مکمل ہے کہیں یہ احساس نہیں کہ اس کے پیار میں کمی ہے۔ اس کی توجہ ادھوری ہے، وہ اپنے طور پر مطمئن ہونے لگی تھی۔ مگر اسی شام سچل نے چونکا دیا۔

زینب کسی کام سے ان کے کمرے میں آئی تھی، سچل نے پکارا تو کلثوم دروازہ کھولتے کھولتے کچھ سوچ کر رک گئی اور بخوبی سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''بہت چپ چپ ہو زینب!''

''نہیں شاہ سائیں! وہم ہے آپ کا۔'' زینب ہمیشہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ بات کیا کرتی تھی، مگر کلثوم نے دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے کافی سنجیدہ لگی۔

''میں کراچی سے ایک تحفہ تمہارے لیے بھی لایا تھا دینے کا وقت ہی نہیں ملا۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے سائیں۔'' وہ اتنا کہہ کر باہر چلی گئی اور سچل بھی پیچھے ہی چلا گیا۔

کلثوم کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ اس کے باپ نے بھی گھر میں عورت ڈال لی تھی۔ اس کی ماں کے دل کو ٹکڑے کیا تھا۔ کیا میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ میری عمر بھی روتے ہوئے گزرے گی۔ یہ زینب تو کسی دوسرے گھر میں نہیں اسی گھر میں رہتی ہے۔ دھوکا دے رہا ہے سچل مجھے بھی اور اپنی ماں کو بھی۔ وہ بھی یقیناً اس بات سے ناواقف ہیں۔

کئی روز کلثوم بہت خاموش الجھی الجھی سی رہی، سچل شاہ نے اس چپ کو یا تو محسوس نہیں کیا یا پھر اسے بیوی کے موڈ سے مطلب ہی نہیں ہوگا۔ عورت دو چار روز نخرا کرتی ہے پھر تھک کر خود ہی مان بھی جاتی ہے۔

''تم بہت دنوں سے چپ ہو کر رہ گئی ہو کلثوم!'' اس کی خاموشی کو شاہ بی نے محسوس کر لیا اور چائے پیتے سچل نے اس کی جانب دیکھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ سر میں درد رہتا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اماں بی! یہ بڑے گھروں کی لڑکیاں ہوتی بڑی نازک ہیں۔ اب زینب کو دیکھ لیں۔ پچھلے دو دن بخار آتا رہا ہے مگر مجال ہے جو کسی کام سے چھٹی کی ہو۔''

''اچھا وہ بیمار ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔'' شاہ بی نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں بیمار تھی۔ میں نے دوا منگوا دی تھی، اب ٹھیک ہے۔''

اور کلثوم چائے کا کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم کہاں چلیں، چائے تو پی لو۔'' سچل نے روکا۔

''تائی اماں! مجھے اماں بہت یاد آ رہی ہیں، میکے جانا چاہ رہی ہوں اگر اجازت دیں تو آج ہی چلی جاؤں۔''

''یہ سامنے بیٹھا ہے تمہارا گھر والا۔ اسی سے پوچھ لو۔''

''ایک دو روز رک جاؤ۔ پرسوں میں شہر چلا جاؤں گا۔ تم میکے چلی جانا۔'' اس کے پوچھنے سے پہلے بچل نے کہہ دیا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

ان دو دنوں میں اس نے زینب اور بچل کو بہت توجہ سے دیکھا اور اسے زینب پر غصہ آتا رہا۔ کتنی گہری ہے یہ۔ سب کے سامنے نظر جھکائے رکھتی ہے۔ مخاطب بھی نہیں کرتی بچل شاہ کو اور مجھے کتنی عزت دیتی ہے۔ جب کہ بچل دوسری ملازماؤں کی نسبت اس پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ اپنے ہر کام کے لیے اسے ہی آواز دیتے ہیں اور تعریف بھی بہت کرتے ہیں اس کی۔

☆......☆......☆

وہ ماں کے ہاں جانا ہی اسی سلسلے میں چاہتی تھی۔ اسے ماں کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا اور مشورہ لینا تھا۔

میکے سے واپسی پر ماں کے کہنے کے مطابق ہی اس نے بچل کو شہر میں کاروبار پر اکسایا۔ اس کا تو اپنا بہت سا وقت شہر میں گزرا تھا۔ وہاں بہت سے دوست تھے اس کے، پھر قاسم بھی اکثر یہی کہتا تھا۔ کہاں تم گاؤں کی دھول مٹی میں خود کو گنواؤ گے، شہر آ جاؤ اور کوئی بزنس کر لو، مگر بچل کا خیال تھا اماں اور کلثوم اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوں گی، مگر یہاں تو کلثوم پر زور اصرار کر رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے اماں سے بات کی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتیں، کلثوم نے کہہ دیا۔

''میری شدید خواہش ہے، میں گاؤں میں رہ نہیں سکتی۔ اماں ہم آپ کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جائیں گے اماں! یہ سچ ہے کہ گاؤں میں دل نہیں لگتا اور سجن کم دشمن زیادہ ہیں۔''

شاہ بی یہ بات کس طرح مان سکتی تھیں مگر کلثوم نے ارادہ کر لیا تھا وہ بھی منوا کر ہی دم لے گی۔

کلثوم کی ماں بظاہر شاہ بی سے ملنے مگر بیٹی سے صورتِ حال معلوم کرنے آئیں۔

''تم پتا نہیں کب تک منا پاؤ گی بچل کو۔ میں زینب کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔''

''ہاں ماں! اسے یہاں سے دور کرنا بہت ضروری ہے۔''

اور جب انہوں نے جٹھانی سے اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ انکار نہیں کر سکیں۔ بے شک زینب پر بڑا بھروسا تھا۔ اعتماد تھا اس پر مگر وہ ایک ادنیٰ...... ملازم ہی تو تھی۔ دیورانی کو انکار کیوں کرتیں اتنی سی بات پر۔

زینب نے سنا تو دھچکا لگا۔ ایک عرصہ اس گھر میں گزرا تھا۔ بڑی محنت و ریاضت سے کچھ مقام بنا تھا مگر شاہ بی اسے کسی اور کے حوالے کر رہی تھیں۔ اسے احتجاج کا حق نہیں تھا۔ ان کا حکم تھا اور اسے ماننا تھا۔

بچل سے اگلی ملاقات تب ہوئی جب وہ کلثوم کے میکے آیا اور موقع پا کر اس سے ملا۔

''زینی! تم کہیں بھی رہو مگر میرے آس پاس ہو۔ کوئی بھی موسم ہو، تمہاری یاد جوبن پر رہتی ہے۔''

''آپ مجھے واپس اپنی حویلی لے جائیں سائیں!'' اس نے التجا کی۔

''کیا کرو گی وہاں جا کر؟ اب تو ملازموں کے سپرد ہی ہو گی۔ میں، کلثوم اور اماں شہر جا رہے ہیں۔ میں نے بزنس سیٹ کر لیا ہے وہاں پر۔''

''خدا برکت ڈالے، شاہ بی کو میرا اسلام کہنا اور کلثوم بی بی کو بھی۔''

''ہاں ہاں، میں کہہ دوں گا۔ اور میرے لیے کچھ نہیں کہو گی کیا؟''

''آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کیا سائیں؟''

''اوہ زینی! تم لاجواب کر دیتی ہو۔''

''سائیں! آپ مجھے شہر ہی لے جاؤ اپنے گھر میں۔ میں وہاں سب کی خدمت کروں گی۔ یہاں میرا جی نہیں لگتا۔ میں خوش نہیں ہوں یہاں پر۔''

''ہاں کیسے خوش رہ سکتی ہو۔'' وہ معنی خیز انداز میں کہہ کر شرارت سے ہنسا تھا۔

زینب نے سر جھکا لیا اور گہری سنجیدگی سے بولی۔

''سائیں! شاہ بی یاد آتی ہیں۔ ان جیسی اچھی مالکن کہاں ملے گی مجھے۔''

''میری مجبوری بھی تو دیکھو زینی! میں تمہیں اپنے گھر میں ملازمہ کے روپ میں دیکھوں۔ لوگ تمہیں ڈانٹ دیں تو بھی منع نہ کر سکوں۔ تم سے بہت کام لیں تب بھی ٹوک نہ سکوں۔ یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے زینی!''

''بس سائیں! اب ضد نہیں کروں گی، آپ کی اس بات کی خوشی مجھے یہاں ملنے والے ہر دکھ سے بے گانہ کر دے گی۔'' زینب کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''ہم ساری عمر دور رہ کر بھی ساتھ ساتھ رہیں گے۔''

''ہاں سائیں!'' اس نے آنکھ سے آنسو پونچھتے ہوئے مسکراتے لبوں سے کہا تھا۔

''مگر ایک بات مجھے پریشان کرتی ہے زینی! عورت بے شک ٹوٹ کر محبت کرتی ہے مگر جب شادی کرتی ہے تو محبوب کا نام دل سے کھرچ دیتی ہے۔ اس کی صورت سے بھی بے زار ہو جاتی ہے۔''

''نہ سائیں نہ، آپ کا نام بھلا دوں یہ تو میرے لیے گناہ ہے۔ وہ آئے ہی کیوں جو دوریاں ڈال دے بیچ میں۔''

''آہ زینی! کس قدر خوش ہوں میں۔ کتنا مطمئن کر دیا ہے تم نے مجھے۔''

کچھ دیر کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی پھر بچل بولا۔

''زینی! تم مجھ سے کبھی بدگمان نہ ہونا۔ یہ مت سوچنا کہ میں نے تو شادی کر لی اور تمہیں منع کر رہا ہوں۔ اصل میں زینی! یہ میری مجبوری تھی۔ مجھے اماں کی خواہش پوری کرنا تھی۔ اور پھر تم سے شادی تو ممکن ہی نہ تھی۔ برادری سے کٹ کے رہ جاتا۔ صرف میں ہی نہیں میرا پورا خاندان اور میری اماں کیسے برداشت کرتیں یہ بات۔ پھر دیکھو ناں زینی اصل محبت تو یہی ہے جو بغیر کسی طمع کے ہو، محبوب کا دیدار ہو تو جی اٹھو نہ دیکھو تو جان پر بن جائے۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ سچل چلا گیا۔ وہ دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

پھر کئی سال بیت گئے۔ وہ گاؤں نہیں آیا۔ کلثوم آتی رہی۔ پہلے بچے کی پیدائش بھی یہیں ہوئی اور دوسرا ڈیڑھ ماہ کا ہوا تب آئی۔ زینی نے پہلی بار اس کی آمد پر سچل کے بارے میں پوچھا۔ اور اس نے جن نظروں سے دیکھا پھر یہ بات پوچھنے کی جرأت نہ ہوسکی۔

''میں روح نہیں ایک جسم بھی ہوں۔ پھر جسم کی پکار کیسے نظر انداز کردوں سائیں۔ مجھے آپ کا لمس بھی چاہئے۔ سائیں میرا دل کچھ اور بھی تقاضا کرنے لگا ہے۔ یہ چار برس جو آپ کو دیکھے بغیر گزارے ہیں۔ ان میں مجھے آپ کی طلب اور بھی شدت سے ہونے لگی ہے۔''

وہ اکثر خواب میں اس سے باتیں کیا کرتی اور دن چڑھتے ہی خود سے عہد کرتی نہیں۔ اب یوں نہیں سوچے گی۔ یہ تو غلط ہے۔ وہ کلثوم بی بی کے ہیں اور پھر کہاں وہ اور کہاں میں۔ اگر ایسا وقت آ بھی جائے تو مر ہی جاؤں۔ انہیں گناہ گار نہ کروں۔ سال بڑا طویل ہے مگر گزر ہی جاتا ہے۔ ایک نہیں دو نہیں تین سال۔ اب زینب کو لگتا تھا وہ بیٹھے بیٹھے کسی اور دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ اب اسے اس گھر میں رہنا بھی برا نہیں لگتا تھا۔ جہاں اس کے لیے مالکن کی آنکھ میں نفرت تھی۔ جو ہر بھاری کام زینب سے لیتی تھی۔ بات بے بات ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ مار پٹائی بھی کردیتی تھی۔ اب اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ باقی کام کرنے والی عورتوں کی نسبت اسے دونوں موسموں میں کم کپڑے دیے جاتے تھے۔ اس کے کئے ہر کام میں نقص نکالا جاتا تھا۔ پہلے پہل وہ حیران ہوا کرتی تھی مگر اب اس کے احساسات پر برف پڑنے لگی تھی۔ کئی بار مالکن پکارتی رہتی تھی۔ اسے سنائی ہی نہیں دیتا۔ پھر کوئی لڑکی بری طرح جھنجھوڑ کر اسے جاگتے میں نیند سے بے دار کرتی۔

''اڑی! کیا بات ہے، کان بند ہوگئے ہیں۔ سنتی نہیں ہو۔ کب سے پکار پڑ رہی ہے تمہیں۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھتی اور مالکن کے کمرے میں آ کر ان کی شکل دیکھنے لگتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ یہاں کیوں آئی تھی اور اسے ان سے کیا بات کرنا چاہئے۔

☆......☆......☆

گرمیوں کی وہ شام بھی گرم تھی در و دیوار سے آگ سی پھوٹتی تھی۔ مالکن ابھی ابھی نہا کر نکلی تھیں اور زینب کو اپنے کمرے میں فرش پر بیٹھے پایا تو حیران ہوئیں۔

''ارے تو تو کبھی بلانے پر بھی نہیں آتی۔ آج یہاں کیا کررہی ہے؟'' آواز پر زینب اٹھی ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے اور گلوگیر آواز میں بولی۔

''آپ سائیں کو بلادیں بی بی! ان سے کہیں، میں کچھ نہیں مانگتی۔ میں کچھ نہیں چاہتی مگر ایک نظر کو نہ ترسائیں۔''

''کون سائیں تم کس کی بات کررہی ہو۔ نیچ ذات؟'' وہ خوب سمجھ گئی تھیں مگر اس کے منہ سے وہ نام سننا چاہتی تھیں۔

''بی بی! قصور میرا نہیں ہے۔ یہ معاملہ ارادے سے تھوڑا ہی طے ہوتا ہے۔ اور قسم کھاتی ہوں نقصان بھی کسی کا نہیں کروں گی۔ بس دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس آنکھ میں اب کتنے عکس ہیں۔ ایک یا دو اور اگر دو تو ان میں سے میرا عکس کتنا دھندلا ہوچکا ہے۔ اور میں انہیں بتانا چاہتی ہوں۔ ان آنکھوں میں ایک ہی عکس ہے۔ اتنا ہی صاف اور روشن جتنا ہمیشہ سے تھا بی بی! اچھی بی بی! کسی کا میں کچھ نہیں لیتی یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔''

''زینب! تو میرے سامنے کھڑی ہوکر اس کا نام لے گی، اس کی بات کرے گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ڈائن تو میری بیٹی کی خوشیاں نگل لینا چاہتی ہے مگر میں کبھی تیری یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گی۔''

بہت مارا انہوں نے زینب کو اور کمرے میں بند کروا کر حکم دیا۔

''اسے روٹی پانی یہیں دے دیا کرو۔ اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور نگرانی رکھنا اس کی۔''

''بی بی جی! وہ زینب پاگل ہوگئی ہے۔''

'' دوسرے روز انہیں اطلاع دی گئی تھی۔ وہ خود دیکھنے کو آئیں۔ ہاں سچ کہہ رہی تھیں لڑکیاں۔ وہ واقعی پاگل ہوگئی تھی۔ وحشت ٹپکتی تھی آنکھوں سے بھی اور چہرے پر بھی۔ سب سے ایک ہی بات کہتی تھی۔

''اسے کہنا صورت ہی دکھا جائے۔ میں کچھ مانگتی تو نہیں پھر کیوں چھپ گیا سائیں مجھ سے۔ مجھے پتا ہے، روایتوں کی دیوار بڑی اونچی ہے۔ بس صورت دکھا جائے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔''

''کمرا کھول دو۔ اب یہ ہمارے۔ لیے نقصان دہ نہیں ہوسکتی۔''

''یہ پاگل ہے بی بی! کچھ بھی کرسکتی ہے۔'' کسی نے سمجھانا چاہا۔

''میرا خیال ہے، یہ ایسا کچھ نہیں کرسکے گی اب۔''

ان کی بات سچ بھی ثابت ہوئی۔ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتی تھی۔ بس بیرونی دروازے کے سامنے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی رہتی۔ جونہی کوئی آتا۔ دوڑ کر قریب جاتی پھر مایوسی سے سر نفی میں ہلا کر واپس اپنی جگہ آ بیٹھتی اور جو کوئی حویلی سے باہر جارہا ہوتا تھا تو پیغام دینا نہ بھولتی۔ اسے کہنا آ جائے۔ صورت تو دکھا جائے۔ میں اور تو کچھ نہیں مانگتی۔''

اب تو لوگ اس کے عادی ہوچکے تھے۔ اس کی بات کی جانب دھیان کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کسی کو پہچانتی بھی نہ تھی۔ ہاں مگر ہر آنے والے کو دیکھ کر مایوس ضرور ہوتی۔ نفی میں سر اب بھی ہلاتی تھی اور آٹھ سال کے بعد وہ آ گیا۔ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی دیوانی اٹھی اور گاڑی اندر داخل ہوتے ہی ہمیشہ کی طرح قریب آ گئی۔

''آ گئے آپ آ گئے سائیں۔''

دیوانی کی آنکھیں چمکنے لگیں اور لب کھل اٹھے۔ سچل نے اس میلی کچیلی عورت کو جس کا لباس پھٹا ہوا تھا اور چہرے پر بیتے وقت کی کہانی دراڑوں کی صورت میں تحریر تھی پہچانا ہی نہیں۔ استقبال کو بڑھنے والی ملازمہ سے پوچھا۔

''کون ہے یہ دیوانی؟''

"سائیں! بہت سالوں سے بے چاری یہاں رہ رہی ہے۔ پتا نہیں کون تھا۔ وہ کہاں چلا گیا۔ شاید بھول گیا اسے اور یہ انتظار ہی کرتی رہ گئی۔"

"کلثوم! اندر چلو بھئی، اتنی گرمی میں یہاں کیوں رک گئی ہو۔ آؤ بچو! نانی اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر ان سے مخاطب ہوا۔

"زینب آؤ روٹی کھالو۔" ملازم اسے چمکار رہی تھی۔ وہ رکا پلٹا اور بولا۔

"اوہ! یہ وہ ہے جو ہماری حویلی میں ہوا کرتی تھی۔ ویری سیڈ بے چاری۔"

اور پھر بچوں کو دیکھا۔ "ابھی تک یہیں ہو۔ دیکھو کتنی تیز دھوپ ہے۔ چلو اندر نانی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"انتظار تو میں بھی کر رہی ہوں سائیں! میں بھی منتظر ہوں۔" اس کی آواز بڑی صاف اور لہجہ شوق کا غماز تھا۔ ملازمہ چونکی۔

"زینب! کیا تم انہیں پہچانتی ہو؟ تم سوچ سمجھ سکتی ہو مگر اچانک یہ کیسے ہوا؟" وہ خوش بھی تھی اور حیران بھی۔

"ہٹو مجھے پھول چننے دو۔" وہ پھول پتے توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالنے لگی اور گانے لگی۔

سسی ہوئی منٹھیاں
زلیخا وانگوں کٹھیاں
عشق نے میں پھٹیاں
بند بند ہل گیا
دیکھو نی پیارا مینوں سفنے میں چھل گیا۔

ترجمہ: نیند میں ہو گئی مائل، مثل زلیخا بے دل عشق نے کر دیا گھائل، مجھ کو پیا نے خواب میں لوٹا۔

☆......☆......☆

شب کے شکستہ زینوں سے

"نی کتھاں دے نی پچیں ایں۔" اس آواز پر وسائی کے بڑھتے قدم زمین میں دھنس گئے۔ اسے مڑ کر پیچھے دیکھنے میں شدید دقت کا سامنا تھا اور اس کا بدن تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

"پکڑ کر لاؤ اسے۔" نور جہاں نے اپنی ملازمہ خاص اللہ ڈیوائی سے کہا۔

وسائی کا جی چاہا، وہ دوڑ لگا دے مگر کہاں تک دوڑتی۔ یہ ساری زمینیں تو نور جہاں کے باپ کی ملکیت تھیں اور نور جہاں ایک ظالم اور بے رحم حکمران تھی۔

ڈیوائی مالکن کا اشارہ پاتے ہی تیزی سے اس پر لپکی اور جب اس نے جھپٹ کر اسے بالوں سے پکڑا تب وسائی کے چادر کے نیچے چھپائے ہاتھ بے اختیار اپنے سر کی جانب اٹھے اور ہاتھوں میں پکڑے چادر کے نیچے چھپائے ابھی ابھی درختوں سے توڑے وہ چار کچے پکے آم مٹی پر گر گئے۔

"چوری کرتی ہے، چور کی اولاد!" ڈیوائی کا مضبوط ہاتھ چودہ پندرہ سالہ وسائی کے چہرے پر پوری طاقت سے پڑا، تب وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

"ادھر لا اسے میری طرف۔" نور جہاں کمر پر ہاتھ رکھے پوری طرح اسی طرف متوجہ تھی۔ ڈیوائی اس دھان پان سی لڑکی کو بالوں سے پکڑے گھسیٹتی ہوئی لے آئی۔

"فصل چرائی ہے۔" نور جہاں غیض و غضب کی تصویر بنی اب سامنے کھڑی تھی اور وسائی نے روتی آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"کتے چھوڑ دوں بی بی! اس پر۔" ڈیوائی مالکن سے بھی چار ہاتھ آگے تھی۔ یہ سنتے ہی لڑکی چیخنے اور فریاد کرنے لگی۔

ابھی ملزم کا فیصلہ باقی تھا کہ نور جہاں کے والد چوہدری عاشق اور بھائی قادر بخش ادھر آ نکلے۔

''کیا ہوا، شور کیسا ہے؟'' دونوں پوچھ رہے تھے۔

''کدھر ہے باغ کا راکھا لوگ فصل چرا رہے ہیں، کوئی پکڑنے والا نہیں۔'' نور جہاں کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

''کس نے فصل چرالی ہے۔'' چوہدری عاشق نے لڑکی کو دیکھ تو لیا تھا پھر بھی پوچھ رہے تھے۔

''اس شہدی نے۔ پورے چار آم تھے اس کے ہاتھ میں۔ بلاؤ راکھے کو، میں ابھی اس کا تو حساب کتاب کرتی ہوں۔''

''آپا جانے دے دیکھ تو ہمارے باغ کے درخت فصل سے بھرے پڑے ہیں اور یہ چار آم، مجھے تو لگتا ہے اس نے توڑے نہیں، زمین پر گرے ہوئے اٹھائے ہیں۔'' قادر بخش کو روتی ہوئی لڑکی پر رحم آ رہا تھا۔

''آج اسے سزا دیے بغیر چھوڑ دوں، کل کو دو اور آ جائیں گے۔ پرسوں چار آئیں گے پھر سارا باغ ہی اجڑ جائے گا۔ لوگ سمجھ جائیں گے چوہدریوں میں اتنا دم ہی نہیں ہے۔''

''ناں ناں پترا! ایسا نہیں ہوگا۔ بس اس لڑکی کے لیے اتنا سبق کافی ہے، جانے دے اس کو۔'' چوہدری عاشق نے مسکرا کر بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو کہہ رہا ہے، اس لیے چھوڑ رہی ہوں ابا۔ چل شکل گم کر۔ تیری قسمت اچھی کہ ابا سائیں ادھر آ گیا، ورنہ میں تجھے چھوڑنے والی نہیں تھی۔'' اس کا غصہ لڑکی پر کم نہیں ہوا تھا۔

جانے کا اشارہ پاتے ہی لڑکی دوڑنے کے انداز میں چل پڑی۔ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

''آپا تو کیا ہر وقت دورے پر نکلی رہتی ہے۔ گھر بیٹھا کر۔'' بھائی نے اب کے ناگواری سے کہا۔

''ابا! سمجھا لو اسے، میں کسی کی فالتو بات نہیں سنا کرتی اور جب تو مجھے منع نہیں کرتا تو یہ کون ہوتا ہے مجھے ٹوکنے والا۔''

''ایسے نہیں بولتے بھرا (بھائی) ہے تیرا اور بھرا تو مان ہوا کرتے ہیں۔''

''بس ان ہی باتوں سے ان بھائیوں کا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔ پتہ نہیں خود کو سمجھتے کیا ہیں۔'' وہ غصے سے قادر کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

چوہدری عاشق نے مسکرا کر بیٹی کو دیکھا۔ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

''جو بات میری دھی رانی کی ہے، وہ تو کسی کی بھی نہیں اور سچ تو یہ ہے قادرے! تم دونوں بھائی تو شہر میں رہتے ہو، گاؤں میں میری بیٹی ہی ہر قدم پر میرے ساتھ ہوتی ہے اور بڑے اچھے مشورے دیتی ہے۔ پورے گاؤں میں کوئی لڑکی اتنی عقل والی نہیں ہے۔ رب نے میری بیٹی کو بہت نوازا ہے۔''

باپ کی بات میں سچائی تھی اور دونوں بھائی اپنی بہن کا ادب بھی کرتے تھے، اس لیے قادر خاموش ہو رہا، مگر اس کے چہرے پر اب بھی ناگواری صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ گھر آ کر اس نے اماں سے شکایت بھی کی۔

''یہ آپا! اب بڑی ہوگئی ہے، ہماری برادری کی ہے کوئی لڑکی جو منہ اٹھا کر جب جی چاہے باغوں میں

نکل جائے، جب دل میں آئے کھیتوں میں پہنچ کر مزارعوں کے سر پر چلانے لگے ابا اس سے بے جا لاڈ کرتا ہے مگر تم تو عقل والی ہو، سمجھاؤ نا اسے۔''

''میں صدقے، میں واری! آج میرا پتر اس قابل ہوگیا ہے۔ اے مجھے تو پتہ ہی نہ چلا، میرا چن جوان تھی گیا ہے۔'' ماں ماتھا چوم کر صدقے واری جانے لگی۔

چودہ سالہ قادر بخش نے یہ بات کہہ کر اسے چونکایا بھی تھا اور خوشی بھی دی تھی۔ جوان بیٹے کا فخر کیا ہوتا ہے، اس وقت یہ بات زہرا اچھی طرح محسوس کر رہی تھی اور اس کا سر فخر سے آپ ہی آپ تن گیا تھا۔

ابھی سال پہلے ہی کی بات تھی جب دونوں بھائیوں قادر اور نادر کو شہر کے اسکول داخل کروایا گیا تھا۔ کیسے روتے بسورتے دونوں گاؤں سے شہر روانہ ہوئے تھے اور زہرا کا دل تب سے اداس ہی رہتا تھا۔

''میرے معصوم بچے اٹھا کر شہر بھیج دیے۔ بھلا انہیں اتنا پڑھنے لکھنے، جان جوکھم میں ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اپنا زمیندارہ ہے۔'' مگر چوہدری عاشق کی سوچ کچھ اور تھی اور اس کے آگے زہرہ کی چل نہ سکی۔

بیٹے چلے گئے اور پیچھے رہ گئی نور جہاں۔ شروع سے ہی اتھری تھی اور اماں کو ویسے بھی بیٹیاں کچھ زیادہ پسند نہ تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن، آنکھوں کا نور تو یہ دو بیٹے قادر اور نادر ہی تھے۔ آج جو بات قادر نے کہی۔ یہی بات کئی بار وہ بھی شوہر سے کہہ چکی تھی مگر چوہدری عاشق کا تو لگتا تھا لڑکی پر زور ہی نہیں۔

پہلے اسے گاؤں کے اسکول میں داخل کروادیا۔ وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح بجائے اسکول جا کر کھیل کود کرنے کے سنجیدگی سے پڑھنے لگی۔ دو سال پہلے آٹھویں جماعت پاس کرلی تھی۔ گاؤں کا اسکول تو بس مڈل تک ہی تھا مگر یہاں جو استانیاں تھیں، انہوں نے نور جہاں کے شوق کو دیکھتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ ہم تمہیں تیاری کروادیں گے پھر تم پرائیویٹ میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔

اسکول کی بات نور جہاں کے دل کو لگی۔ وہ اب بھی باقاعدگی سے اسکول جاتی اور استانی کوثر جسے سب لڑکیاں آپا کوثر کہتی تھیں اور جس نے بتایا تھا، وہ ملتان شہر کے سب سے اچھے کالج کی پڑھی ہوئی ہے۔ اس سے سبق لیے گئی۔ گاؤں میں وہ میٹرک تک پہنچنے والی پہلی لڑکی تھی، جو پہلے ہی فخر و غرور کا شکار تھی۔ اس اعزاز نے اور بھی اکڑ پیدا کردی تھی۔ اس کی ماں کو اس کی پڑھائی پسند نہیں تھی مگر کتابوں نے اسے بتادیا تھا۔ تعلیم بہت ضروری چیز ہے اور وہ ماں کی پسند ناپسند کے چکروں میں پڑے بغیر استانی کوثر سے سبق لیے جا رہی تھی۔

اور اس نے زراعت کی بھی کتابیں شہر سے منگوائی تھیں۔ انہیں پڑھ کر وہ باپ کو فصلوں کے لیے بہتر مشورے بھی دیا کرتی تھی۔

وہ نہا کر نکلی تھی، لان کا نیا سوٹ جو پچھلے ہفتے استانی کوثر جب شہر گئی، اسی کو پیسے دے کر منگوایا تھا۔ پہن کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ سبز، نیلے رنگ کا سوٹ اسے تب بھی اچھا لگا، جب کوثر لے کر آئی تھی۔ پہنا تو اور بھی پیارا لگنے لگا۔

''یہ رنگ مجھ پر کتنے اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر آئینے میں جھانکا۔

''میں ان کپڑوں میں اتنی اچھی لگ رہی ہوں یا پھر میں واقعی خوبصورت ہوگئی ہوں۔'' وہ آئینے کے

پاس سے ہٹتے ہٹتے بھی ٹھٹکی اور پھر مقابل آ کھڑی ہوئی۔

آج سے پہلے آئینہ دیکھنے میں کبھی ایسا سرور نہیں چڑھا تھا اور اس نے یوں گھوم گھوم کر خود کو ہر زاویے سے دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی، یہ عمر کا تقاضا ہے اور یہ نظر کا دھوکا نہیں۔ سولہواں سال نکھار لے کر آیا ہے۔ وہ جسم جو پہلے فربہ سا تھا، اب سانچے میں ڈھل رہا ہے۔

وہ آنکھیں جو پہلے عام سی تھیں، اب ایک خاص قسم کا خمار لیے ہوئے ہیں۔ اس کے ہونٹوں کا کٹاؤ واضح ہو کر اسے حسین بنا رہا ہے۔

''کیا یہ میں ہوں۔'' وہ مسکرائی اور کچھ سوچ کر دوپٹہ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

بس پھر اس روز سے اس کی چال بدل گئی اور وہ خود پر توجہ بھی بہت دینے لگی۔ کہاں تو دوسرے روز بھی بڑی مشکل سے خود کو بالوں میں کنگھی کے لیے آمادہ کرتی تھی۔ اب روز ہی ملکی سے کہتی۔

''میرے بال تو گوندھ دے اور کوئی اچھا سا نسخہ تو کہیں سے لے آ۔ میری بال لمبے تو ہیں، پر ان میں ویسی چمک نہیں ہے جیسی چمک ٹی وی پر آنے والی لڑکیوں کے بالوں میں ہوتی ہے۔

اور یہ درزن کپڑے کتنے برے سیتی ہے۔ مصیبت یہ کہ پورے گاؤں میں ایک ہی عورت ہے جو سلائی کا کام کرتی ہے۔ مجبوری ہے، اس سے سلوانے پڑتے ہیں۔ مجھے یہ ڈھیلے ڈھالے چوغے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ میں تو سوچ رہی ہوں، اب کے آپا کوثر شہر جائے تو اس کو بہت سے پیسے دے کر کہوں گی، وہیں سے اچھے اچھے کپڑے خریدے اور سلوا کر لائے۔''

''ہمارے پنڈ کے بازار میں بھی بڑے اچھے کپڑے آئے ہوئے ہیں جی!'' ملکی نے آگاہ کیا۔ اس نے منہ بنایا۔

پھر اس کی عقل پر کچھ باتیں کیں۔ اس کے بعد بولی۔

''شہر کے خریدے کپڑوں کی بات ہی اور ہوتی ہے، یہاں تو وہ رنگ ہی نہیں ملتے بس ارے سوٹ پیلے، نیلے اور لال سے ہوتے ہیں۔''

''آپ کون سے رنگ منگواؤ گی جی!'' نور بی بی نے بات کیا کر لی ملکی تو پھیلنے ہی لگی۔

''جب منگواؤں گی تو دیکھ لینا اور سن، تو نے یہ بات جا کر راجوں کی حویلی میں نہیں کرنی۔ ان کی عورتیں تو ہیں ہی شیخی خوریاں، جھٹ منگوائیں گی۔''

''نا جی ناں، میری توبہ۔ بھلا میں نے کبھی ان کی بات ادھر کی ہے۔ ویسے بھی جی جو بات آپ کی ہے، وہ راجوں کی کہاں اور ان کی عورتیں بھی کوئی آپ کی طرح پڑھی لکھی تھوڑی ہیں اور اللہ نے آپ کو رج کے سوہنا بھی تو بنایا ہے۔ راجوں کی عورتیں آپ کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتیں۔ آپ تو جی شہزادی ہو۔''

تعریفیں کرنا ملکی کی مجبوری تھی کہ اس کا رزق اسی گھر سے وابستہ تھا اور نور جہاں اس گھر کی اکلوتی کڑی تھی اور تعریف سن کر خوش ہو جانا نور جہاں کی مجبوری تھی۔ (انسانی فطرت کے مطابق)

نئے کپڑے بنوانے کے لیے پیسے اس نے ابا سائیں سے لیے۔ اماں کو ہوا تک نہیں لگنے دی۔ آپا کوثر کو

پیسے دیتے ہوئے کہہ دیا۔

''سلائی بھی وہیں سے کروانا، یہ ہمارے گاؤں کی درزن تو نری احمق ہے۔ اچھے سے اچھا کپڑا بھی خراب کر کے پکڑا دیتی ہے۔''

''اچھا اچھا..... ٹھیک ہے۔ میں سلوا دوں گی اور ایسے اچھے سلواؤں گی کہ تم بس دیکھتی رہ جاؤ گی۔ ہاں بس وہاں پر سلائی ذرا زیادہ لی جاتی ہے۔''

''اس کی تو فکر نہ کرو۔'' نور جہاں نے ہزار ہزار کے دو نوٹ مزید تھما دیے۔

''جو بچ جائیں گے، واپس کر دوں گی۔'' آپا کوثر نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں نہیں آپاں! آخر تم میرے لیے بازاروں کے چکر کاٹو گی، درزی کے پاس جاؤ گی۔ بس میں پیسے واپس نہیں لوں گی، تم ہی رکھ لینا۔'' اور آپا کوثر نے زور شور سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

زیادہ مہنگے والے نہ سہی مگر عام لان کے تین چار سوٹ، اب وہ بھی آرام سے بنوا سکتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہونے میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔

''چلو اس مہینے میں تو میں بھی نئے نئے کپڑے پہن کر اسکول آؤں گی۔ باقی استانیوں میں ذرا ٹور ہی بن جائے گی۔'' نور جہاں نے جب سے شہر سے چیزیں منگوانی شروع کی تھیں، گاؤں کی دوسری ٹیچر سے کم عمر اور فیشن ایبل استانی کوثر خاصے فائدے میں تھی۔

ایک ہفتے کے بعد ہی سوٹ سل کر آ گئے۔ اماں کو پتہ چلا تو نور جہاں کو خوب ہی سنائیں مگر وہ تو ایسے فیشن والے اور خوبصورت رنگوں والے کپڑوں میں ہی کھوئی ہوئی تھی۔ اماں بولتی رہی اور وہ آئینے کے سامنے کھڑی ایک ایک جوڑا اٹھا کر خود سے لگا کر دیکھتی رہی۔

''یہ سب تیرے اس پڑھائی کے شوق کی وجہ سے ہے۔ آج تیرا ابا آ جائے، اس سے بھی پوچھتی ہوں۔''

''اوہو، کیا ہے اماں! دیکھ تو کتنے اچھے کپڑے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں، اب تو بھی شہر سے منگوایا کر۔ خود ہی تو کہتی ہے۔ ابا اب تیرے اوپر دھیان نہیں دیتا۔ جب ایسے سوہنے سوہنے کپڑے پہنے گی تو پھر تجھے ابے سے یہ شکایت نہیں رہے گی۔'' اس کی بات پر اماں ٹھٹکی۔

نور جہاں کی عقل کو تو ویسے بھی وہ مانتی تھی اور یہ بات تو ٹھاہ کر کے جی کو لگی۔

''کیسے خوبصورت رنگ اور سلائی، وہ تو غضب کی تھی۔ واقعی اگر وہ ایسے ہی کپڑے سلوا کر پہنے تو.....''

چوہدرانی زہراں سوچ میں پڑ گئی، نور جہاں بولے جا رہی تھی۔

''دیکھ نا اماں! ابھی تیری عمر کچھ زیادہ تو نہیں ہے اور تو ٹی وی دیکھتی تو ہے پر غور سے نہیں دیکھتی۔ اب تو ایسی کریمیں ملتی ہیں، اچھی خاصی بوڑھی عورتیں انہیں استعمال کر کے جوان بن جاتی ہیں۔''

''آں ہاں..... ٹی وی والے کچھ بتاتے تو ہیں۔'' اماں نے بھی دماغ پر زور دے کر سر اثبات میں ہلایا۔

''اب کے آپاں کوثر شہر جائے گی تو میں اسے کہوں گی، تیرے لیے بھی کپڑے لے کر آئے اور وہ کریم بھی ضرور لائے۔''

پھر اس نے اپنے ان نئے سلوائے آٹھ دس جوڑوں میں سے ایک اٹھا کر بڑے پیار سے اماں کو دے دیا۔

اماں جوڑا لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور جب پہنا تو لگا، وہ اپنی عمر سے دس سال پیچھے چلی گئی ہے۔ تنگ فٹنگ والی قمیص گہرا گلا چوہدرانی کو تنہائی میں تو اچھا لگا مگر وہ سوچ رہی تھی، اسے پہن کر باہر کیسے نکلوں اور جی چاہ رہا تھا، آج تو چوہدری صاحب جلدی گھر آ جائیں۔ شرم آنے کے باوجود چوہدرانی نے یہ جوڑا اتارا نہیں بلکہ کبھی سالوں بعد استعمال میں آنے والی سرخی (لپ اسٹک) سنگھار میز کی دراز سے نکال کر ہونٹوں پر سجائی پھر کچھ خیال آیا تو آنکھوں میں سرمہ بھی لگا لیا۔

''نور جہاں ٹھیک کہتی ہے، مجھے ایسے کپڑے پہننے چاہئیں۔ چوہدری صاحب اب مجھ پر پہلے والی توجہ نہیں دیتے۔ ان کا زیادہ وقت کبھی شہر تو کبھی زمینوں پر گزرتا ہے۔'' چوہدرانی کے اپنے زخم بولنے لگے۔

''ان ہی دنوں جب نور جہاں شہر سے منگوائے کپڑے پہنے گھوما کرتی تھی اور آئینہ دیکھنے کا دورانیہ بڑھ گیا تھا، چاچی مہراں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ چلی آئی۔

زہراں کی اپنی دیورانی مہراں سے خوب بنتی تھی۔ اس کے آنے پر بڑی خوش تھی اور اس کے دونوں بچوں کو بھی ماتھا چوم کر پیار کیا۔

''بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا مہراں!''

''بس بھابھی کیا بتاؤں، سو بکھیڑے۔ حویلی سے باہر نکلنا ہی نہیں ہوتا اور پھر وہ تمہارا دیور، وہ بھی کہاں مانتا ہے مجھے کہیں بھیجنے کو۔'' اب مہراں کچھ شرما کر کہہ رہی تھی اور ان کی آنکھوں میں ایسا کہتے ہوئے جو فخر اور چہرے پر جو غرور تھا، اس نے زہراں کی محرومی کو اور بھی ہوا دے دی۔ اس نے نظریں چرالیں اور ملازمہ کو آوازیں دینے لگی۔

''نوری کہاں ہے؟ دکھائی نہیں دے رہی۔'' مہراں نے پوچھا۔

تب زہراں نے آنے والی ملازمہ سے کہا۔

''خاطر خدمت کے انتظام سے پہلے نور جہاں کو ادھر بھیج دے، چاچی آئی ہے اس کی۔''

''اماں! دونوں بھائی کدھر ہیں؟'' مہراں کا سات سالہ بڑا بیٹا قادر اور نادر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''دونوں بھرا تو شہر ہوتے ہیں پتر جب تو بھی تھوڑا اور بڑا ہو جائے گا تجھے بھی ہم شہر کے اسکول میں داخل کروا دیں گے۔ تم دونوں بھی خوب پڑھنا۔'' زہراں نے اسے گود میں لے لیا، اسی وقت نور جہاں چلی آئی۔

''سلام چاچی! کیسی ہو۔ بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا۔'' وہ پہلے چاچی سے ملی پھر بچوں کو پیار کرنے لگی اور مہراں...... وہ تو اس کی کسی بات کا جواب ہی نہیں دے سکی۔ حیرت سے وہ بدلی ہوئی نوری کو دیکھ رہی تھی۔ چند مہینوں میں یہ لڑکی کتنی بدل گئی تھی۔ اس کے تنگ کپڑے، شوخ پرنٹ، بالوں کا اسٹائل، دوپٹہ اوڑھنے کا

انداز تک بدل ڈالا تھا۔

''کیا بات ہے چاچی! اتنی چپ چپ کیوں ہو اور ایسے گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میری صورت بدل گئی ہے۔'' وہ ہنسنے لگی۔ مہراں ہنسی میں اس کا ساتھ نہیں دے سکی، بولی۔

''میں واقعی بڑی حیران ہوں، اڑی تو اتنا بدل گئی ہے۔ کہیں سے بھی تو اپنی نوری نہیں لگ رہی۔''

''اچھا لگ رہی ہوں نا! ویسی ہی جیسی لڑکیاں ٹی وی پر دکھائی دیتی ہیں۔''

''چل جھلی، ان کی ریس کرنے چلی ہے۔ نی سوائن ان کی دنیا اور ہماری اور بھلا ہم ان جیسا بننے کی کوشش کیوں کریں اور سچ تو یہ کہ ان کپڑوں میں تجھے دیکھ کر مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔''

دیورانی کی بات پر زہراں نے کچھ چونک کر بیٹی کو دیکھا۔ واقعی آج جو سوٹ اس نے پہن رکھا تھا، قمیص زیادہ ہی چست اور گلا بھی گہرا تھا۔

''نور جہاں! تیرے فیشن بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ چل جا کر کپڑے بدل۔'' زہراں شرمندہ ہوئی تو بیٹی کو ڈانٹنے لگی۔

''مجھے پنڈ میں رہنا پسند ہی نہیں، دیکھ لینا دس جماعتیں پاس کر لوں گی تو میں بھی کالج پڑھنے کے لیے شہر چلی جاؤں گی۔'' ''اچھا...... رہے گی کہاں، وہاں کون سی تیری چاچی، ماسی بیٹھی ہوئی ہے۔''

''لو یہ بھی بھلا کوئی بات ہے۔ شہر کے اسکول کالجوں میں دوسرے علاقوں سے آ کر پڑھنے والوں کے لیے جگہ بنی ہوتی ہے۔ ویسے بھی ابا سائیں نے بھائیوں کے لیے بھی تو شہر میں مکان بنا چھوڑا ہے۔ خدمت کے لیے نوکر چاکر وہاں موجود ہیں۔ میں تو وہاں رہ سکتی ہوں بھلا۔''

''ہائے ربا...... تجھے کیا ہو گیا ہے نوری! اڑی بھولی، تو لڑکی ہے، اکیلی نوکروں چاکروں کے ساتھ رہ سکتی ہے۔''

''چل رہنے بھی دے چاچی! زمانہ بدل گیا ہے۔''

''زمانہ لاکھ بدل جائے دھی رانی! پر اپنے رسم و رواج نہیں بدلنے والے۔ چل جا، شاباش کپڑے بدل اور پھر آ کر میرے پاس بیٹھ، دیکھ تو تیرے لیے کیسے پیارے دوپٹے، پراندے بنوا کر لائی ہوں۔''

''پراندے اب اس نے کیا کرنے ہیں، بالوں کو ایسے ہی گوندھنے لگی ہے۔ کہتی ہے، شہری لڑکیاں پراندے نہیں ڈالتیں۔''

''ہائے...... سارے بالوں کو ستیا ناس ہو جائے گا۔ ابھی چار چھ دن ہوں میں ادھر ہی، دیکھتی ہوں کیسے نہیں ڈالتی پراندہ۔'' چاچی بھی بڑی دھونس والی تھی اور نوری سے پیار بھی بڑا کرتی تھی۔

چاچی مہراں جس دن سے آئی تھی، بڑی خاموشی سے لیکن بغور نور جہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ نوری کو نہیں ٹوکا مگر وہ زہراں سے کہنا نہیں بھولی۔

''یہ تو بیٹی کو کن راہوں پر چلا رہی ہے۔ میں اس کی دشمن نہیں ہوں، تجھے جٹھانی سے زیادہ بڑی بہن سمجھا ہے اور نوری تو بیٹی ہے میری اور میں نہیں چاہتی، میری دھی رانی کو آگے جا کر دکھی ہونا پڑے۔ اس کی آنکھوں میں خواب نہ سجا، اس کو سادگی سے رہنے کی عادت ڈال اور پڑھائی سے بھی اٹھا لے۔ جتنا پڑھ لکھ

جائے گی، اتنا ہی اپنی سوچنے لگے گی۔"

"تو ٹھیک کہتی ہے بہن! پر میں اس کے بابا سائیں کا کیا کروں، پتا نہیں کیوں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ بہت کہتی ہوں، اسکول سے اٹھوا لے اور گھر سے زیادہ باہر بھی نہ نکلنے دیا کر۔ پر وہ سنتا ہی نہیں۔ اسے نوری کی عقل پر بھی بڑا بھروسہ ہے۔ کہتا ہے، جو مشورے میری دھی رانی کے ہوتے ہیں، وہ کسی اور کے نہیں ہوتے۔"

"اب بھرا سے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اسے سمجھانا تیرا کام ہے۔"

"میں کیا سمجھاؤں اسے، گھر آتا ہی کب ہے۔ زمینوں کے بکھیڑے، شہر کے چکر اور سچی بات ہے مہراں! مجھے تو یہ سب جھوٹ لگتا ہے۔ ایسے لگتا ہے، اصل چکر کچھ اور ہے۔ اسے اب میری پروا نہیں رہی ہے، نا ضرورت۔" زہراں سسکنے لگی اور جو بات نوری سے شروع ہوئی تھی، اب وہ اور ہی رخ اختیار کر گئی۔

جس وقت گھر میں اس کی بے جا آزادی پر تنقید ہو رہی تھی، اس وقت وہ اپنی زمینوں پر معائنہ کے لیے پہنچی ہوئی تھی۔ کالی چادر میں خود کو لپیٹے گردن تان کر چلتی وہ نوجوان چوہدرائن مزارعوں منشیوں کے لیے بڑی مصیبت تھی۔

چوہدری سے کہیں زیادہ غصہ ور اور بے رحم، قصور معاف کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ منٹوں میں بغیر چھوٹے بڑے کا لحاظ کیے مٹی پلید کر کے رکھ دیتی تھی۔ وہ اس وقت کپاس کے کھیتوں کے قریب کھڑی تھی اور فصل کا احوال دریافت کر رہی تھی۔

"بی بی! چوہدری صاحب بہت دنوں سے شہر میں ہیں، میں بس ان کے انتظار میں ہی تھا۔ فصل کچھ ٹھیک نہیں لگتی، ایسا لگتا ہے کسی دشمن کیڑے کا حملہ ہو گیا ہے۔"

"حملہ ہو گیا ہے اور تم لوگ آرام سے بیٹھے بابا سائیں کی شہر سے واپسی کا انتظار کر رہے ہو۔ جی تو چاہتا ہے، قیمہ بنوا کر اونٹوں کو پلوا دوں۔" وہ پوری آواز سے ان سب پر چلانے لگی۔

"یاد رکھنا، میں بابا سائیں نہیں ہوں کہ معاف کر دوں۔ فصل خراب ہوئی تو تم لوگوں کو دانے دانے کے لیے محتاج کر دوں گی۔ وہ اتنا کہہ کر تیزی سے کھیتوں کی جانب بڑھی۔

اور بڑے غور سے پتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اب تک نظروں میں آنے والے تمام پتے سبز اور چمک دار صحت مند دکھائی دیتے تھے مگر وہ اتنی جلدی مطمئن ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے ایک پودے کو پکڑ کر کھینچا پھر دوسرے کو۔ ان میں سے کوئی بھی زمین کی سطح سے کچھ اوپر نہیں ٹوٹا۔

"دیمک کا حملہ نہیں ہوا۔" اس نے اطمینان سے سر اٹھایا۔

"پتے چڑ مڑ بھی نہیں ہیں۔ "تھر یس" نے بھی حملہ نہیں کیا۔ "مائٹ" کا امکان بھی نہیں ہے۔ آؤ، ادھر آؤ۔ بتاؤ مجھے تمہیں یہ خیال کیوں ہو رہا ہے کہ فصل پر کیڑوں کا خطرہ ہے؟" اس نے مڑ کر کھیتوں کا انتظام دیکھنے والے کو بلایا۔ وہ تیز قدموں سے چلا آیا اور آگے بڑھ کر نشاندہی کرنے لگا۔

"واقعی یہاں "سرخ مائٹ" جگہ بنانے لگی تھی۔ کچھ پودوں کے پتے زرد ہو رہے تھے۔" پتوں پر پیلے

رنگ کے دھبے غور کرنے پر دیکھے جا سکتے تھے۔

"پھر تم لوگوں نے اس کا توڑ کیا کیا ہے؟" وہ ابرو اچکا کر پوچھ رہی تھی۔

"ہمیں ابھی کچھ دن پہلے ہی تو پتہ چلا ہے بی بی صاحب!" وہ کھسیانے لگا۔

"کیوں، اس سے پہلے کیا تم بھنگ پی کر سو رہے تھے۔ میں کھال ادھیڑ دوں گی، اتنا بڑا نقصان اور تم لوگ مفت کی روٹیاں توڑنے والے حرام خور! میں تم دونوں کے گھروں پر ٹریکٹر چلوا دوں گی۔"

"بی بی صاحب! ابھی معاملہ بگڑا نہیں ہے۔ فصل پر بیماری کا حملہ شروع ہی ہوا ہے۔ ہم اسپرے کروا دیں گے۔" اس کی دھمکیوں کے دوران بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

"کل تک مجھے رپورٹ پیش کرو، بابا سائیں نے بھی کیسے لوگوں کو رکھ چھوڑا ہے۔ نری مصیبت، نرا عذاب۔" وہ واپس پلٹی مگر گھر جانے کے بجائے اس نے ڈرائیور سے باغوں کی طرف جانے کو کہا۔

"وہ جی تھانیدار نے پیغام بھیجا تھا، اسے چار اناروں کی ٹوکریاں اور آموں کے بھی اتنے ہی کریٹ چاہئیں۔"

"ہونہہ دوزخی...... کمینہ، فقیر۔ چونسہ چاہیے ہو گا اسے۔ منہ کو ایک بار چاٹ جو لگ گئی ہے۔ بھجوا دو، یہ غریب غرباء ہمارا ہی تو کھاتے ہیں اور پھر بھی کبھی کبھی غداری کر جاتے ہیں۔"

"وہ جی...... ایک اور پیغام بھی بھجوایا تھا اس نے۔" منشی اس کے غصے کو دیکھ کر دھیرے سے بولا۔

"بک دو وہ بھی۔"

"کہہ رہا تھا۔ بچوں کو چھٹیاں ہیں، شہر سے ادھر گاؤں آ رہے ہیں۔ ایک بھوری بھینس اس کے دروازے پر باندھ دی جائے تو دودھ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"ہاں ہاں شہر میں تو ان کے باپ نے دودھ کا کارخانہ لگا رکھا ہے اتارو میرے بھائیوں کا صدقہ، آم اور انار بھی بھجوا دو۔ بھوری بھی دے دو، ہمیں کون سی کمی آ جائے گی۔"

"اے ہاں منشی! تم نے بتایا تھا، تھانیدار تبدیل ہونے والا ہے۔ کیا بنا اس معاملہ کا؟ اگر ایسا ہے پھر کچھ بھی بھجوانے کی ضرورت نہیں۔" "بی بی صاحب! سننے میں آیا ہے، اس نے بدلی رکوا لی ہے۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے، ویسے تو یہ سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں۔ منگتے، بے غیرت، بے حیا، بھیج دو جو منگواتا ہے۔ کمین کی اولاد!" پتہ نہیں کہاں کا غصہ اس وقت تھانیدار صاحب پر اتارا جا رہا تھا۔

"وہ جی ایس ڈی او صاحب بھی چوہدری صاحب کو اپنے دفتر بلا رہے تھے۔"

"نواب کے پتر، کام اپنا ہو گا مگر خود چل کر آتے ٹانگیں ٹوٹتی ہیں۔ تم بھیج دو اسے پیغام۔ ابا سائیں شہر میں ہیں، بہت دن لگا کر آئیں گے۔ وہ خود حویلی آ کر مجھ سے بات کرے یا پھر جو کام ہے، وہ تمہیں بتا دے۔"

"او جی بی بی صاحب! جو کم ہے نا، اسے وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ نویں (نئی) شادی ہوئی ہے۔ بیوی کو ساتھ رکھنا چاہ رہا ہے اور چاہتا ہے، چوہدری صاحب یا تو آموں کے باغ کے قریب جو چھوٹی کوٹھی

ہے، اس کا کچھ حصہ اسے رہائش کے لیے دے دیں یا پھر وہ نہر پار جو بنگلہ ہے، اس میں سے کچھ کمرے رہنے کو دے دیں۔“

”بس پھر تو اسے کہہ دو، خود آ کر بات کرے۔“ اس نے برا سا منہ بنا کر حکم دے دیا۔

☆......☆......☆

اب جب سے قادر میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں آیا تھا، اس کا ابا سائیں چھٹیوں میں گاؤں بلوا لیتا اور وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ زمین اور دوسرے مسئلے مسائل میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

ہاں اس کی اچانک اتنی مداخلت نور جہاں کو کچھ بے زار کر رہی تھی مگر کہا اس نے کچھ نہیں۔

وہ میٹرک کر چکی تھی، اس نے ابا سائیں سے شہر جا کر پڑھنے کی اجازت مانگی تھی۔ تب چوہدری عاشق ہنس پڑے تھے۔

”او پتر! تیرے لیے یہی پڑھائی بہت ہے۔ یہ شہر جانے کی کھیچل کیوں کرتی ہے، خوامخواہ کی مصیبت۔ نہ اچھا کھانا، نہ آگے پیچھے نوکر چاکر۔ کیا مزا ہوگا زندگی کا اور پھر پترا! میں نے تو تجھے اپنا مشیر خاص ہی سمجھ لیا ہے تو نہیں ہوگی تو یہاں گاؤں میں میرے ساتھ مدد کون کروائے گا۔“ باپ نے کچھ ایسے پیار، اتنے مان سے بات کی کہ وہ زیادہ ضد نہیں کر سکی۔

یوں بھی اب وہ چند سال پہلے والی لا ابالی شہر کے فیشن سے متاثر ہونے والی نور جہاں تو رہی نہیں تھی۔ اب اسے حکومت کرنا، سر اٹھا کر چلنا پہلے سے کہیں زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔

اور اس میں اگر کوئی رکاوٹ ڈال رہا تھا تو اس کا اپنا بھائی۔ وہ کھلم کھلا اس کی مخالفت پر اتر آیا تھا۔ اسے نور جہاں کا مردوں کی باتوں میں دخل دینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ذرا ذرا سی تفصیل پوچھنا پھر مشوروں سے نوازنا، فصلوں کا حساب کتاب، مزارعوں کے جھگڑے نبٹانا۔

”آخر یہ سب کیا ہے؟ نور آپا دوسری عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھ کر گھر کے معاملات میں دلچسپی کیوں نہیں لیتی۔“

”تمہیں بھلا کیا کہتی ہے؟“ باپ اس کے اعتراض پر ہنس دیتا جب کہ ماں، بیٹے کا پورا پورا ساتھ دیتی۔

”خود سر ہو رہی ہے۔“ وہ صاف کہہ دیتا۔

”تم دونوں بھائی کئی سالوں سے شہر میں ہو، اس نے میرے لیے بڑا کام کیا ہے اور سچ تو یہ کہ وہ واقعی عقل والی ہے۔“

”لو اور سنو، لڑکی ذات اور عقل والی۔“ زہرہ نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر بیٹے کی جانب دیکھا۔

”ابا! وہ دوسروں کے سامنے میرے کیے فیصلے کو ریجیکٹ کر کے اپنی چلاتی ہے۔ شرمندہ کر کے رکھ دیتی ہے مجھے مزارعوں کے سامنے۔“ ”اچھا اگر ایسا ہے تو میں منع کروں گا اسے۔“

”تو اور کیا، کل کو یہ سب مجھے ہی سنبھالنا ہے مگر پتہ نہیں آپا اس بات کو کیوں نہیں سمجھتی۔“

”اور پھر بھی اس کا ابا کہتا ہے، وہ عقل والی ہے۔“ اس نے چوہدری کو جتایا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کہا تو ہے، کہہ دوں گا اس سے اور تم لوگ تیاری کر لو، ساتھ کے گاؤں میں

میرے دوست کی دھی (بیٹی) کا ویاہ ہے۔ سب چلیں گے اور زہرہ دیکھ دینے دلانے میں کنجوسی مت کرنا۔“

”لو اور سنو، ہائے! میں نے کب کنجوسی کی ہے۔“ وہ سر پر ہاتھ مار کر دھپ سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

”بس بس، نخرے نہ کر۔ میں تم عورتوں کو خوب جانتا ہوں، اسی لیے پہلے سے کہہ رہا ہوں۔ جوڑے تو نور جہاں کی پسند سے بنے ہیں۔ وہ تو اچھے ہوں گے ہی، باقی روپیہ پیسہ بھی کم نہیں ہونا چاہئے۔ آج ادھر مہندی کی رسم ہوگی۔ صدقہ بھی اتارا جائے گا۔ کمی کمین کی عورتیں بھی آئیں گی۔ جہاں میرے دوست معراج دین کی بیوی ان سب کو صدقہ خیراں دے گی، وہاں تم بھی ساتھ ساتھ دیتی جانا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ہر وقت کے دکھاوے۔“ زہرہ کو واقعی مشورہ کچھ پسند نہیں آیا تھا۔

”تو جانتی ہے، جگری یار ہے معراج دین میرا۔ اس لحاظ سے اس کی بیٹی بھتیجی ہوئی میری اور بھتیجی بیٹیوں کی طرح ہی ہوتی ہے تو وہاں جا کر چوہدرائن بن کر ایک پاسے مٹھے سے بیٹھ نہ جانا، بھرجائی کے ساتھ ساتھ رہنا۔“

”اچھا جی سن لیا میں نے، ہور کچھ؟“

”ہور یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ تو بہت زبان چلانے لگی ہے۔“

”تو آہو، کیوں نہ چلاؤں۔ آخر دو دو جوان پتروں کی ماں ہوں۔“ اس نے بڑے فخر سے کہا اور چوہدری صاحب بھی مسکرانے لگے۔

آج شام کو چوہدری معراج دین کی بیٹی پروین کی مہندی تھی، ان سب کو آج ہی دوپہر کے کھانے کے بعد نکلنا تھا۔ رات ادھر ہی گزار کر اگلے روز شادی میں شرکت کے بعد واپس آنا تھا۔

نور جہاں نے پروین کے لیے تین جوڑے شہر سے منگوائے تھے اور اپنے گاؤں میں ان کی خوب نمائش کروائی تھی۔ ہر عورت کی نظروں میں ستائش اور حیرانی تھی۔ اتنا نفیس کام باریک موتی ستارے ڈیزائن اور کلر وہ تعریف کرتے نہیں تھکتی تھیں اور جب نور جہاں ایک ایک جوڑے کی قیمت بتاتی تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔

”واقعی ایسے کپڑے تو چوہدریوں کی عورتیں ہی پہن سکتی ہیں۔ ہم تو صرف دور سے دیکھ کر تعریف کر سکتی ہیں۔“

آج جب وہ چچا معراج کے ہاں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ملازمہ لڑکی ساتھ ساتھ تھی۔

”نور بی بی! جب تمہاری شادی ہوگی، تب تم بھی ایسے ہی خوبصورت جوڑے بنوانا۔ سچ کہتی ہوں، بالکل شہزادی لگو گی۔“ لڑکی تو اپنی ترنگ میں کہہ گئی تھی اور عمر کے نازک دور سے گزرتی نور جہاں کا ہاتھ کام کرتے کرتے رہ گیا تھا۔ لڑکی کہتی رہی۔

”تمہاری شادی پر میں تین جوڑے لوں گی۔ ایک ہرا جو مہندی پر پہنوں گی، ایک گلابی جو شادی کے دن پہنوں گی اور ایک نیلا اس پر ڈھیر سارے ستارے لگاؤں گی اور جب چوہدری صاحب اور چوہدرائن آپ سے ملنے سسرال جائیں گے، ضد کر کے میں بھی ساتھ آؤں گی، وہی نیلا ستاروں والا سوٹ پہن کر۔ بس جی،

میں تو دعا کرتی ہوں جلدی سے ہماری بی بی بھی دلہن بن جائے۔ میں گھڑا بجا کر گانے گاؤں گی اور ناچوں گی۔ مہندی بھی میں ہی گوندھوں گی جی! ابھی سے کہہ رہی ہوں۔'' لڑکی کے تو لمبے ہی پروگرام تھے۔

''تو جا، اب بس تھوڑے سے کپڑے رہ گئے ہیں۔ یہ خود ہی رکھ لوں گی۔'' نور جہاں نے اسے کمرے سے باہر بھیج دیا۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر وہ یونہی کھڑی آہٹیں لیتی رہی پھر آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ تسلی نہ ہوئی تو کنڈی چڑھا دی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو دیکھا پھر پروین کے لیے خریدے گئے جوڑوں میں سے سب سے بھاری سوٹ کا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

چوری کا سا احساس کہیں دل میں کروٹ لے رہا تھا، وہ خود کو مجبور پا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا یہ سارے سوٹ پہن کر دیکھے، وہ کیسی لگتی ہے مگر ایک ڈر تھا۔ اگر اماں ادھر آ گئیں، دروازے پر دستک دے دی تو پھر وہ کیا جواب دے گی۔ کپڑے تو اس نے نہیں پہنے۔ ہاں سارے دوپٹے باری باری اوڑھ کر ضرور دیکھے اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے اندر بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔

اس کے گھر میں اب تک اس کی شادی کی ا ت کیوں نہیں ہوتی۔ اس کی عمر کی لڑکیاں یا تو بیاہ دی جاتی ہیں یا پھر ان کی منگنی تو ضرور ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب وہ کسی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ مگر اندر ہی اندر یہ سوال چٹکیاں لے رہا تھا۔

اس نے بار بار آئینے میں خود کو ہر زاویے سے دیکھا اور آئینے نے گواہی دی۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین ہو رہی ہے۔ کچھ سال پہلے جب اس نے بچپن کو چھوڑا اور جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا، تب بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت کا شکار ہوئی تھی، مگر اس کیفیت میں اور آج کے جذبات میں کچھ فرق تھا۔ تب آشنائی خود سے تھی، وہ اپنے عشق کا شکار ہوئی تھی۔

وہ ایک نشے میں تھی مگر آج وہ چاہتی تھی، اب کوئی آئے اور اسے دریافت کرے۔ وہ الہڑ پن تو چوہدرانی بننے کے شوق میں زیادہ دن برقرار ہی نہ رہ سکا۔

وہ کبھی گاؤں کی غریب لڑکیوں کو دوست بنا سکی، نہ ان کے ساتھ رات کے وقت چاندنی کی ٹھنڈک میں لکن میٹی، کوکلا چھپا کر اور راجے کی بیٹی آئی کھیل سکی۔

وہ بس نور بی بی تھی اور اسے بارعب چہرہ بنا کر بات کرنا ہی اچھا لگتا تھا مگر پروین کے لیے خریدا گیا آنچل اوڑھ کر یہ خول چٹخنے لگا اور اس کا دل گداز ہونے لگا۔ سوال بار بار سر اٹھانے لگا۔ اس کے ماں باپ نے اس کے لیے ابھی تک کچھ سوچا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔

جس وقت یہ لوگ اپنی گاڑی میں سوار ہو کر چچا معراج کے گاؤں پہنچے، وہاں دیکھنے والا سماں تھا۔ معراج چاچا اس گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے، اس لیے نا صرف ان کی حویلی بلکہ گاؤں کو آنے والے راستے کو بھی سجایا گیا تھا۔ لگتا تھا، گاؤں میں جشن کا سماں اور بچہ بچہ خوش ہے۔

''ہم بھی اپنے قادر کے ویاہ پر اسی طرح ہر راستے کو سجا دیں گے۔'' چوہدرائن نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

نور...... کہنے لگی تھی۔ آج چچا معراج کے بیٹے کا نہیں، بیٹی کا ویاہ ہے مگر وہ کہہ کر کچھ جتا نہیں سکی۔ حیا آڑے آئی۔

''میں نے زیادہ دیر نہیں کرنی۔ قادر کی پڑھائی پوری ہو جائے تو وہٹی لے آؤں گی۔'' ماں نے اگلے پروگرام سے آگاہ کیا۔ ''جیسے تیری مرضی۔'' ابا بھی مسکرایا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی قادر کی عمر ہی کیا ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا تھا۔

''شیر پتر ہے میرا۔'' ماں کا انداز فخریہ تھا، جب کہ قادر مسکرا رہا تھا۔

''ایسی دلہن لاؤں گی کہ حویلی میں اس کے حسن سے چانن ہو جائے گا۔'' اماں نے اگلے پروگرام سے آگاہ کیا۔ ابا اور قادر کے چہرے کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

''چچا معراج کی حویلی میں خوب چہل پہل تھی۔ گاؤں کے رواج کے مطابق برادری والے کئی دن سے یہاں مہمان تھے اور ان کی خاطر مدارت کے لیے طرح طرح کے کھانے پک رہے تھے۔ آج بھی گنے کے رس کی کھیر بڑے بڑے پتیلے میں چولہے پر چڑھائی گئی تھی۔

دہی کی کنالیوں پر کنالیاں منگوائی گئی تھیں کہ رواد (گنے کا رس) کی کھیر دہی کے ساتھ کھانے میں ہی مزا آتا ہے۔

ایک ملازمہ ڈھیروں خشک میوہ کتر رہی تھی، اسے بھی ابھی کھیر میں ڈالا جانا تھا۔ ملازمائیں کئی دنوں سے بہت مصروف تھیں مگر جب بھی کوئی نیا مہمان آتا تھا، سارے کام چھوڑ چھاڑ اکٹھی ہو جاتیں اور آنے والوں کو پوری دلچسپی سے دیکھتیں۔

اب ان لوگوں کی آمد پر بھی یہی عمل دہرایا گیا تھا، پھاٹک سے داخل ہوئے ہی تھے، کوئی چلایا۔

''پروہنے (مہمان) آئے ہیں۔''

بس پھر گھر والوں کے ساتھ ساتھ ملازمائیں بھی اکٹھی ہونے لگیں۔ تھکے ہوئے چہرے پر شوق اور تجسس سے بھرے ہوئے آنے والوں کو سلام کرنے کے لیے بے تاب ایک دوسرے کو دھکیلتی اپنی اپنی جگہ بناتیں۔ پہلے سلام کی کوشش کرتیں۔ یہ ساری صورتیں ایک سی تو نہیں تھیں مگر ایک جیسی لگتی تھیں۔ نسلوں سے غلام، کمی کمین۔

چوہدری عاشق اور قادر کو حویلی کے باہر والے حصے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہاں کئی کمرے تھے اور آج کل تو سب ہی مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ نور جہاں ماں کے ساتھ اندر چلی آئی تھی۔

چچا معراج دین کی بیوی اور بہو نے استقبال کیا اور انہیں ان کا کمرہ دکھایا۔ موسم بدل رہا تھا۔ اب ہوا میں کچھ خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ آتی شام کا وقت جب آسمان کا کنارہ سرخ تھا اور پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

چاچی نے سبز الائچی والی چائے جس میں چینی کے ساتھ ساتھ ہلکا سا نمک بھی ڈالا گیا تھا، گھر کی بنی بہت سی چیزوں کے ساتھ پیش کی تھیں۔ بیسن کے میوے والے لڈو، گجک، سوہن حلوہ اور تازہ بھونی ہوئی گڑ والی گندم کے مزے دار دانے۔ یہ سب گاؤں کے ہر کھاتے پیتے گھرانے کی سوغاتیں تھیں۔

نور جہاں کے لیے ان میں سے کچھ بھی نیا تو نہیں تھا مگر سوہن حلوہ بہت اچھا بنا تھا۔ اس نے رغبت سے کھایا اور چائے بھی اسے اچھی لگی۔ خاص طور پر وہ پیالے جن میں ڈال کر پیش کی گئی تھی۔ یقیناً یہ شہر کی کسی بہت اونچی دکان سے خریدے گئے تھے۔ ''ہوسکتا ہے چچا معراج کی بہو کے جہیز میں آئے ہوں۔''

چچا معراج کی بہو اسی کی ہم عمر تھی۔ خاصی ہنس مکھ سی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ زیور اور زرق برق کپڑوں میں میک اپ کے ساتھ وہ بڑی شوخ اور اچھی لگ رہی تھی۔

اس کی ساس نے بتایا۔ ''آج کل پیٹ سے ہے، بس چند مہینے بعد اس کی گود میں بچہ کھیلے گا۔''

''اے نسرین! بہن کو ساتھ لے جانا، عیشاں سے ملوا دے۔ بتانا، چوہدری عاشق کی لاڈلی بیٹی نور جہاں ہے۔'' چاچی نے لاڈلی پر زور دے کر کہا تھا، نور جہاں مسکرانے لگی۔

بہو نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور جب دونوں کمرے سے نکل رہی تھیں، اس نے چاچی کو یہ کہتے سنا تھا۔

''تم بیٹی کی شادی کب کر رہی ہو، جوان ہوگئی ہو، اس کے ساتھ کی تو بیاہ گئیں یا بیاہی جا رہی ہیں۔'' وہ اماں کا جواب سننا چاہتی تھی مگر نسرین نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور جب تک اماں جواب دیتی، وہ اسے ساتھ لیے کمرے کی دہلیز چھوڑ چکی تھی۔

''تمہاری بھی منگنی تو ہوئی ہوگی۔'' باہر آ کر اس نے اسی شوخی سے پوچھا تھا جو اس کی ذات کا حصہ تھی۔

''عیشاں کا کمرہ کدھر ہے، یہاں تو کمرے ہی کمرے ہیں۔ چچا معراج کی حویلی تو بہت بڑی ہے۔''

اسے نسرین کے سوال کا جواب دینے میں سبکی محسوس ہوئی، اسی لیے تو جواب گول کر کے سوال کر ڈالا تھا۔

''ہاں، بڑی حویلی ہے۔ پہلے تو عیشاں بھی یہاں رہتی تھی۔ اب وہ تو چلی جائے گی۔ ساری حویلی میں راج کروں گی۔'' اس نے چونک کر نسرین کی جانب دیکھا۔

اور سچ تو یہ کہ اس کی بات نے نور جہاں کے اندر خوف سا بھر دیا۔ ''کیا بھابھیاں، نندوں کو راہ کا کانٹا خیال کرتی ہیں۔ یہ جو اتنی ہنس مکھ دکھائی دیتی ہے، اسے بھی اپنی نند اچھی نہیں لگتی۔ یہ اس کے بیاہ پر نہیں بلکہ یہاں سے چلے جانے پر خوش ہے۔''

''اب تو تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔''

اف پھر وہی موضوع جس پر وہ بات نہیں کرنا چاہتی، اسے اب نسرین کے وجود سے الجھن ہونے لگی۔

وہ اسے لیے ایک بڑے کمرے میں آ گئی، جہاں بہت سی عورتیں بیٹھی تھیں اور کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہیں ایک کونے میں پیلے جوڑے میں ملبوس عیشاں بیٹھی اپنی سہیلیوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

اس نے دیکھا۔ عیشاں کی اکثر سہیلیاں زیورات سے لدی پھندی تھیں۔ گویا شادی شدہ تھیں، پھر جب وہ عیشاں سے مل کر انہی لوگوں کے درمیان میں بیٹھی تو اسے الجھن ہونے لگی، ان کے مذاق کے اشارے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔

آج سے پہلے وہ گاؤں کی شادیوں میں شریک ہوا کرتی تھی، جہاں شان ہی دوسری ہوتی تھی یا پھر برادری کی شادیوں میں (اس کا موقعہ بھی کم کم آتا، زیادہ تر اماں اور ابا بھگتا آیا کرتے تھے) مگر اب یہاں برادری کے لوگ تھے، ان میں وہ اونچی ہو کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اسے ان کے درمیان ہی بیٹھنا تھا اور یہ سب سن کر دل کو خالی خالی محسوس کرنا تھا۔

اتنی عورتیں، اتنی ساری لڑکیاں مگر اس کے لیے سب اجنبی خود سے بڑھ کر کسی سے دوستی کر لیتا، اس کا مزاج ہی نہیں تھا۔ وہ ان میں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھی۔ اکتائی ہوئی بے زار سی بیٹھی سوچ رہی تھی۔ خوامخواہ چلی آئی، اپنی حویلی میں ہی رک جاتی تو اچھا تھا۔ یہاں پر اتنا سارا وقت بھلا کیسے کٹے گا۔

''بوا کدھر ہیں بھابھی نسرین!'' ایک جوان، خوش شکل سے لڑکے نے دروازے سے جھانکا۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر شور ڈالنے لگیں۔ نسرین بولی۔

''وے بوا کا بہانہ نا بنا، ہمیں پتہ ہے تو کس کو دیکھنے کے لیے بہانے بہانے سے ادھر چکر لگاتا ہے۔''

''الزام نہ لگاؤ۔ سچ کہتا ہوں، بوا سے کام ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''تم بھول رہے ہو، کام تمہیں پروین سے ہے۔'' نسرین نے شرم سے لال گلابی ہوتی ایک عام سی صورت والی کی جانب اشارہ کیا۔ لڑکے نے ذرا کی ذرا اس پر نظر ڈالی۔ لڑکیوں نے چوری پکڑ لی پھر شور مچانے لگیں اور وہ ہنستا ہوا واپس پلٹ گیا۔

''دیکھا کیسا چالاک ہے۔ بار بار چکر لگا رہا ہے۔'' لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔

اس عام سی صورت والی کو چھیڑ رہی تھیں۔ وہ شرمائے جاتی تھی، ہنسے جاتی تھی۔ کیا ہے اس کی صورت میں جو وہ دیکھنے کو بے تاب ہے۔ محبت کے بہت سے قصے سنے تھے، ٹی وی پر ڈرامے بھی دیکھتی تھی مگر حقیقی زندگی میں یا تو پہلی بار ایسا دیکھ رہی تھی یا پھر آج سے پہلے اس نے غور ہی نہیں کیا۔

اسے لگا تھا، وقت بہت تیزی سے اس کے ہاتھ سے پھسل رہا ہے۔ اسے یاد آیا، جب اس نے پہلی بار استانی کوثر کے ہاتھ شہری درزی سے کپڑے سلوائے تھے اور انہیں پہن کر وہ بار بار آئینے میں خود کو دیکھتی تھی، اس بات کو تو اب کئی سال ہونے کو آئے تھے یعنی اسے جوان ہوئے بہت سا وقت ہونے کو آیا تھا۔ وہ الہڑپن تھا، مستی کا زمانہ۔ تب لڑکیاں خود ہی اپنے آپ سے محبت کرنے لگتی ہیں۔ اب وہ درد تھا جب چاہے جانے کی طلب سر اٹھانے لگتی ہے۔

اس وقت رات ہو چکی تھی، کھانا کھانے کے بعد ڈھولکی رکھی جا چکی تھی۔ گاؤں کی میراثن لہک لہک کر ذومعنی گیت گا رہی تھی۔ نئی بیاہتا منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں مگر یہ گیت انہیں بھی بہت کچھ یاد دلا رہے تھے اور نئی شوخ جوانیاں ہر ایسے بول کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑتیں اور سامنے بیٹھی ماؤں چاچیوں پھپھیوں کی آنکھوں کی آنکھوں میں کی گئی تنبیہہ کو نظر انداز کر جاتی تھیں۔

وہ تھوڑی دیر ہی وہاں بیٹھ سکی پھر اس کمرے میں آ گئی جو ان ماں بیٹی کو دیا گیا تھا۔

''چچا معراج کے گھر لوگ اتنے اچھے نہیں ہیں، انہیں تو مہمانوں کو عزت دینا بھی نہیں آتی۔ اپنے آپ

میں گم فضول کی ہنسی ہنستے ہوئے ابا سائیں کو بھی پتہ نہیں کیا سوجھی جو شادی سے پہلے ہی چلے آئے۔''

وہ ہر جگہ اہمیت لینے کی عادی تھی، یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے تو اونچی کرسی پر بیٹھ کر تحائف بانٹنے، دعائیں لینے، التجائیں سننے کی عادت تھی۔ کسی آواز نے اسے سوچوں سے چونکا دیا۔ آواز بہت ہلکی سی تھی لیکن کہیں قریب ہی سے ابھری تھی۔ وہ ساری سوچیں جھٹک کر سن گن لینے کی کوشش کرنے لگی۔

سرگوشی میں کوئی بولا تھا اور پھر دھیمی سی ہنسی۔ نور جہاں تجسس کے مارے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آواز کھڑکی کے قریب سے ابھری تھی۔ اس نے ذرا سا پٹ کھول کر جھانکا اور جھٹکا سا لگا۔ وہی لڑکا جو دوپہر میں کسی بوا کا پوچھنے کمرے میں آیا تھا اور وہ لڑکی جو اس کی آمد پر شرما گئی تھی، ایک دوسرے سے بہت قریب۔ کچھ کہتے، کچھ سنتے ہوئے۔

وہ یہ منظر زیادہ دیر دیکھ نہیں سکی۔ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے پلنگ سے جا ٹکرائی اور اس پر بیٹھ گئی۔

''آخر میں اتنا گھبرا کیوں رہی ہوں۔ کوئی چوری تو نہیں کی میں نے۔ چور تو وہ ہیں جو زمانے کی نظروں سے چھپ کر یہاں کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔''

بے کردار لڑکی، باپ بھائی کی عزت کو روندنے والی۔ اس نے ان کے خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے سر جھٹکا مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسے کمرے سے اٹھ کر ایک بار پھر ہنگامے میں لوٹنا پڑا۔

☆......☆......☆

بارات روانہ ہوئی اور اس نے بھی واپسی کی رٹ لگا دی اور اپنے گھر آ کر ہی اسے سکون ملا۔

''ابا سائیں! بس میں نے آپ سے کہہ دیا۔ آئندہ ایسی کسی شادی میں مجھے جانے کے لیے نا کہنا۔''

''کیوں، کیا خرابی نظر آ گئی تمہیں اس شادی میں۔'' کسی نے ''چھوٹی بی بی آ گئی'' کا نعرہ نہیں لگایا ہوگا، تمہارے لیے بستر پر صاف چادر نہیں بچھائی ہوگی، ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کرنے کو تمہاری جانب نہیں جھکا ہوگا۔ ہے نا!''

''قادر! تم چپ رہو، میں تم سے بات نہیں کر رہی۔ ابا سائیں! آپ کھڑے دیکھے جا رہے ہیں، منع نہیں کرتے اسے، فضول میں بولے جاتا ہے۔''

''چپ کر جا اڑی، تجھے یہ بھی نہیں پتہ کس سے بات کر رہی ہے۔ بھائی ہے تیرا، اس گھر کا بڑا بیٹا، ہمارا مان، اس کے سامنے یوں بولنا تجھے زیب نہیں دیتا۔'' اس کی ماں نے چلا کر کہا، جب کہ چوہدری عاشق دونوں کو پیار محبت سے رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

''آپا میرے وجود کو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ بہنیں اپنے بھائیوں پر جان وار دیا کرتی ہیں اور ایک یہ ہے، شکل دیکھنے کو بھی راضی نہیں۔'' پتہ نہیں اس کے دل میں نور جہان کے لیے اتنے منفی خیالات کیوں تھے اور نور نے بھی غصے میں اس کی باتوں کے جواب میں کھری کھری سنا ڈالیں۔

''کہا تھا نا میں نے لڑکی ذات ہے، اتنا مت پڑھاؤ، اس طرح سر پر مت چڑھاؤ، مگر میری سنتا کون

ہے۔ چوہدری عاشق! یہ سب تمہارا کیا ہے۔ تم ہی بھگتو گے، دیکھ لینا۔ یہ لڑکی کس طرح تمہارے سر میں خاک ڈلوائے گی۔ توبہ توبہ یہ تو مردوں کی برابری کرتی ہے۔ بھائی کے منہ کو آتی ہے۔''

''بچی ہے، سمجھ جائے گی۔'' چوہدری عاشق نے بیوی کو سمجھانا چاہا۔

''بچی ہے...... یہ تجھے ابھی تک بچی لگتی ہے۔ ارے اس کے ساتھ کی تو خود دو دو بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔''

''فضول بات مت کرو۔'' چوہدری اس بات پر ایک دم سے بھڑک اٹھا۔

''چل نی بدنصیبے! اپنے کمرے میں جا دفع ہو۔ کم بخت ماں ہوں تیری۔ اگر تجھے روک رہی ہوں تو تیرے ہی بھلے کے لیے ایسا کرتی ہوں۔ ہائے نی، تیرے دکھ نے میرا کلیجہ ساڑھ کے سوا کر دیا ہے۔''

''زہراں بکواس بند کر دے، چل نورا! تو اپنے کمرے میں چل کر آرام کر۔'' وہ ماں کی باتوں کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ غصے میں بھری اپنے کمرے میں چلی آئی۔

بعد میں پھاپھاں سے پتہ چلا، اس کے اماں ابا کے درمیان کسی مسئلے پر زور و شور سے بحث ہوئی تھی اور اس کی اماں روتی رہی تھی۔

''بابا نے میرے حق میں کچھ کہا ہوگا، اماں تو اپنے چن پتر کے مقابلے میں میری حمایت اچھی نہیں لگی ہوگی۔

☆......☆......☆

قادر کو اس بار بہت دنوں کے لیے گاؤں میں رہنا تھا۔ ہر دوسری بات پر ان میں اختلاف پایا جاتا۔ نتیجہ جھگڑے کی صورت میں نکلتا۔ ان ہی جھگڑوں سے تنگ آ کر اماں نے اسے کچھ روز چچا کے ہاں گزارنے کا کہہ دیا۔

اسے بھی یہ بات اچھی لگی۔ چچی میراں اچھے مزاج کی مالک تھی، پھر اس کے دونوں لڑکے جو نور جہان سے کہیں چھوٹے تھے اور اس نے انہیں گود میں اٹھا کر کھلایا تھا۔ اب دونوں اسکول جاتے تھے۔ اس نے سوچا۔ چاچی کے ساتھ باتیں بھی ہوں گی، دونوں بھائیوں کو بھی پڑھایا کرے گی، جتنے دن قادر یہاں ہے، کم از کم اتنے دن کے لیے تو ضرور چلے جانا چاہیے۔

قادر پہلے ہی خودسر تھا، بہن کو کچھ نہیں سمجھتا تھا مگر اس کالج کی پڑھائی نے تو بہت ہی بدمزاج اور مغرور بنا دیا تھا۔ اب تو اسے اپنے سے زیادہ کوئی عقل والا لگتا ہی نہیں تھا۔

ہاں دوسرے کا مزاج بڑے بھائی سے مختلف تھا۔ وہ کھلنڈرا اور لاابالی سا لڑکا تھا۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا، گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کا بیٹا اور ان غریب ہاریوں کا حکمراں ہے۔

وہ جب بھی آتا، ان میں گھل مل جاتا اور نور جہاں کو اس پر ہمیشہ اعتراض رہتا، مگر وہ ایسی باتیں ہنس کر ٹال دینے والا مزاج رکھتا تھا۔ ویسے وہ گاؤں کم ہی آتا تھا، قادر ہی اکثر چکر لگاتا رہتا تھا۔

ماں کے کہنے پر وہ چچا کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اسے وہاں جا کر بھی دھاک بٹھانی تھی اور دھاک بٹھانے میں سب سے اہم کردار قیمتی لباس ہی ادا کرتا ہے اور اس کے پاس قیمتی کپڑوں کی کمی نہیں تھی۔

''آپا! چچا کے گھر جا کر انسان بن کر رہنا، ہر معاملے میں عادت کے مطابق دخل دینے مت بیٹھ جانا۔ یہ عادت کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی۔'' ناشتے پر قادر نے پھر ایسی بات کہہ دی کہ وہ بھڑک اٹھی اور ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

چچا کے ہاں اس کی آمد کا پیغام مل چکا تھا اور چچی نے پہلے ہی اس کے لیے کمرہ تیار کر دیا تھا۔ اس وقت چاچی مہراں باورچی خانے میں کھڑی کھانا پکانے والی عورت کو ہدایت پر ہدایت دے رہی تھی۔ مہراں نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کروایا تھا کہ جانتی تھی۔ نور جہاں خاصی تنگ مزاج اور نخرے والی ہے۔

کھیر صبح سویرے بنوا کر ٹھنڈی ہونے کو رکھ دی تھی۔ برابر کا گوشت ڈلوا کر چاول پکوائے تھے۔ خوب بھنے ہوئے مرغے کا سالن اور موسمی پھل، اس کے گھر باورچی خانہ سنبھالنے والی بہت اچھا کھانا بناتی تھی، اس لیے مہراں پوری طرح مطمئن تھی۔

گیارہ بجے کے قریب نور جہاں اپنی بوڑھی ملازمہ اور قابل اعتماد ڈرائیور کے ساتھ چلی آئی۔ اس کی آمد کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی، اس لیے گاؤں کی بہت سی عورتیں مارے اشتیاق کے یا پھر استقبال کے ارادے سے صحن میں موجود تھیں۔ (ویسے گاؤں میں تفریح کے کون سے مواقع ہوا کرتے ہیں۔ تو یہ عورتیں ایسی ہی باتوں میں تفریح ڈھونڈ لیا کرتی ہیں)

وہ سب تقریباً ایک گھنٹے سے اس کے انتظار میں کھڑی اور آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ نور جہاں چھ سال پہلے صرف دو روز کے لیے ماں کے ساتھ ادھر آئی تھی پھر کبھی اس کا آنا نہیں ہوا تھا۔ ہاں اماں ابا آتے رہے اور چاچا اور چاچی مہراں بھی اکثر چکر لگا لیا کرتے تھے۔

یہاں بہت سی عورتیں تھیں، جو اسے پہلی بار دیکھ رہی تھیں اور جنہوں نے چھ سال پہلے اسے دیکھا بھی تھا تو چھ سال کی مدت کوئی کم نہیں ہوا کرتی۔ وہ اندر چلی آئی، بیس پچیس کے قریب غریب محنت کش عورتوں کو دیکھ کر فخر اور غرور سے سر اونچا ہو گیا۔

وہ سب اسے سلام کر رہی تھیں، دعائیں دے رہی تھیں اور اس نے ذرا کی ذرا جوان پر بظاہر اچٹتی سی نظر ڈالی تو اسے لگا، وہ سب اس سے مرعوب دکھائی دیتی ہیں۔

واقعی اس کے قیمتی کپڑے تو چچی مہراں کو بھی تعریف پر مجبور کر دیا کرتے تھے اور یہ تو وہ عورتیں تھیں جو ایسے کپڑے خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

''آپا! ہم صبح سے تمہارے انتظار میں تھے۔'' چاچا چودھری عالم کے دونوں بچے اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے مہراں بھی استقبال کو آگے بڑھی تھی۔ یہ سب بہت اچھا تھا اور یہ آتی سردیوں کے دن تھے۔

ہلکے سے سرد اور خوشگوار، باغوں میں مالٹے کی فصل کھانے کے لیے تیار تھی۔ جب کہ کینو ابھی ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد کھانے کے قابل ہونا تھا۔ امرود بہت میٹھے ہو رہے تھے اور مکئی کی فصل زوروں پر تھی، نیا چاول تیار ہو کر منڈیوں میں پہنچ چکا تھا۔ اور گاؤں کے ہر کھاتے پیتے گھرانے میں سردیوں کے لیے خشک میوؤں والی پنجیری جسے بھانڈا کہا جاتا تھا تیار ہو رہی تھی۔

یہاں مہراں نے بھی کل ہی نشاستے کے لڈو اور السی بنوا کر بڑے بڑے ڈبوں میں محفوظ کی تھی اور ہاں یہ تازہ تازہ گڑ کا بھی موسم تھا، جس میں سونف، کھوپرا مونگ پھلی، بادام ڈالے جاتے ہیں اور گرم گرم بھنے ہوئے چنوں کے ساتھ اسے مزے لے لے کر کھایا جاتا ہے۔

''ادھر ہی بیٹھ جا نوری! دھوپ ہلکی ہے اور اچھی لگ رہی ہے پھر یہ عورتیں کب سے تیری راہ بھی تو دیکھ رہی تھیں۔''

''نا چاچی مجھے دھوپ میں بیٹھنے کی عادت نہیں۔'' وہ اپنی عادت کے مطابق وہ انہیں نظر انداز کر کے اہمیت بڑھا رہی تھی۔

مگر مہراں بالکل دوسرے مزاج کی زمیندارنی تھی اس کے مزاج میں نہ تو غرور تھا نہ سنگدلی وہ ہر عورت سے بہت اچھے طریقے سے پیش آیا کرتی تھی۔ اس نے ان عورتوں کو نرمی سے سمجھا دیا بی بی کھانا وانا کھا لے پھر تم لوگ شام کو آ جانا۔ اور وہ ایک ایک کر کے اٹھنے لگیں۔

دوپہر کے کھانے پر چاچا چودھری عالم بھی ڈیرے سے آ گیا خوشگوار ماحول میں مزے دار کھانا کھایا گیا۔ اس دوران نور جہاں ملازماؤں کے ساتھ چاچی کے رویے کا اندازہ کرتی اور اسے ناپسند کرتی رہی۔

''بھلا ان عورتوں کو اتنا سر چڑھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ انہیں ان کی اوقات میں رکھو، جب ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ اب میں یہاں آ گئی ہوں جتنے دن یہاں رہوں گی انہیں کھینچ کر رکھوں گی۔''

''مہراں! تجھے پتہ ہے میری بھتیجی پڑھی لکھی اور بڑی عقل والی لڑکی ہے اسے گاؤں کا اسکول بھی دکھانا اور ہم جو اسپتال بنا رہے ہیں وہاں بھی لے کر جانا۔'' چاچا اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بیوی سے مخاطب تھا۔

''اور چاچا! میں تمہاری زمینیں بھی دیکھوں گی۔''

''او کیوں نہیں پترا! سب دکھائیں گے۔ تجھے یہ تیرے چھوٹے بھرا تجھے ساتھ لے کر اپنی ساری زمین دکھائیں گے۔'' اور چھوٹے بھائی زور و شور سے اثبات میں سر ہلانے لگے۔

''بس چاچا! میں نہ اب ایک سے ماحول سے اکتا گئی ہوں کچھ تبدیلی چاہتی ہوں تمہارے پاس آئی ہوں تو چاہتی ہوں بہت اچھی یادیں لے کر یہاں سے جاؤں۔''

نور کی اس بات پر چچا کچھ ٹھٹک سا گیا پھر ہنکارا بھر کر بولا۔

''نہ دھیے! اکتاہٹ کیسی وہ تیرا اپنا گھر ہی نہیں تیری بادشاہی بھی ہے۔ تیرے باپ نے تجھے شہزادی بنا کر رکھا ہے۔ بھلا کبھی ملا ہوگا کسی لڑکی کو اتنا پیار، کون سی تیری ایسی خواہش ہے جو وہ پوری نہیں کرتا۔ تیرے منہ سے بات نکلنے کی دیر ہوتی ہے وہ پوری کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ فضول کی سوچیں نہ سوچا کر خوش رہا کر۔''

''وہ جو قادر ہے نا اسے میرا ہر معاملے میں بولنا پسند نہیں، وہ چاہتا ہے میں تو بس چپ چاپ ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤں۔''

''او بچہ ہے ابھی، جس عمر میں وہ ہے نا اس میں منڈے (لڑکے) فضول کی شوخیاں کرتے ہی ہیں اس کی تو کسی بھی بات کو دل پر نہ لیا کر۔''

''میرا گاؤں ہے مالک ہوں میں اس کی میری مرضی جیسے جی چاہے رہتی ہوں۔''

''واہ واہ...... میں کہتا ہوں واہ بھئی واہ آج تک ایسا بھرپور جواب مجھے کسی نے نہیں دیا طبیعت خوش کردی آپ نے۔'' اب کے اس نے ذرا غور سے دیکھا۔

چاچی مہراں کی طرح وہ خوبصورت ناک نقشے والا تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بڑا صاف اور آواز خوبصورت تھی۔ یقیناً وہ پڑھا لکھا تھا اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ شانوں پر گرے کلر کی چادر تھی۔

گاؤں کے اکثر لڑکے شلوار قمیص پہنتے تھے مگر شاید اس کا انداز کچھ مختلف تھا، وہ پڑھا لکھا اور شائستہ محسوس ہوتا تھا حالانکہ اب تک جو کچھ اس کی زبان سے ادا ہوا وہ نور جہاں کے مزاج کے لیے ناقابل قبول سا تھا مگر وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی وہ طنز کر رہا ہے یا تعریف۔

اور حیران بھی تھی اس کے اچانک ہی بے تکلف ہو جانے پر۔

''آؤ بیٹھو۔ صرف وہ گاؤں ہی نہیں تم اس گاؤں کی بھی مالک ہو کہ آخر بھائی عالم کی بھتیجی ہو۔''

''سلیم! اماں کدھر ہے تمہاری؟'' اس نے نظر انداز کرتے ہوئے چاچی کے بڑے بیٹے سے پوچھا۔

''اماں! چائے بنوا رہی ہے۔ ماما ابھی ابھی آئے ہیں نا، آتے ہی چائے کے لیے شور ڈال دیا۔'' بچہ ہنسا وہ بھی مسکرا دیا۔ نور جہاں نے چہرے کو سپاٹ ہی رکھا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

باورچی خانے میں آئی تو ملازمہ کے ساتھ ساتھ چاچی موجود تھیں۔ اور ٹرے میں بہت کچھ سجایا گیا تھا۔

''آنکھ کھل گئی تمہاری، میں بس تمہارے ہی کمرے میں جا رہی تھی۔ چائے تیار ہے تم بیٹھو میں بھجواتی ہوں۔''

''کوئی آیا ہے چاچی؟''

''ہاں ملیں تم؟''

''تمہیں ڈھونڈتے ہوئے بڑے کمرے میں گئی تھی۔''

''بھائی ہے میرا، چھوٹا بھائی شاہ زمان، بس کبھی کبھار ہی چکر لگاتا ہے اور جب آتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے، بڑا پیارا ہے مجھے اور مجھے ہی کیا اس سے تو جو بھی ملتا ہے تعریف کیے بغیر نہیں رہتا۔''

''کتنے بہن بھائی ہیں چاچی تمہارے؟''

''اللہ رکھے بھرا پرا گھر ہے میری اماں کا یہ سب میں چھوٹا ہے پڑھ لکھ گیا ہے گاؤں میں رہنا پسند نہیں شہر میں رہتا ہے، ابا سے تھوڑی رقم لے کر کاروبار شروع کیا تھا۔ زمان نے تب کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ ب کا خیال تھا اسے بھلا کیا تجربہ ہے سب ڈبو دے گا مگر اس نے ایسا جما کر کام کیا کہ سب حیران رہ گئے۔ شہر میں بڑا اچھا گھر ہے اس کا، تمہارے چاچا بچوں کو لے کر جب شہر جاتے ہیں شاہ زمان کے گھر ہی ٹھہرتے ہیں۔''

چاچی بھائی کی تعریف میں بولتی چلی گئی۔ ساتھ ساتھ کام بھی کر رہی تھی۔ اس نے ایک دوسری ٹرے لے کر اس میں بھی سامان لگانا شروع کر دیا تھا۔

ٹرے تیار ہوئی تو ملازمہ سے بولی۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

روٹی پانی سے فارغ ہو کر چاچا اور اس کے دونوں لڑکے بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئے۔ چاچی کے پاس کچھ عورتیں آ بیٹھیں۔ نور کچھ تھکن محسوس کر رہی تھی، آ کر اپنے کمرے میں لیٹی پھر پتہ ہی نہیں چلا کب سو گئی اور کسی وقت چاچی اس پر شنیل کے غلاف والی سبز رضائی (لحاف) بھی ڈال گئی۔

سورج ڈوب رہا تھا ہوا تیز اور ٹھنڈی تھی، آسمان پر اکا دکا بادل بھی تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ اور کوئی پتہ نہیں تھا یہ اکا دکا ادھر ادھر اڑنے والے بادل کب اکٹھے ہو جائیں اور آسمان کو ڈھانپ لیں۔

اس نے نیند میں کروٹ بدلی، لحاف اس پر سے سرک گیا اور سردی محسوس کر کے ہی اس کی آنکھ کھل گئی، کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا جس کی مدھم روشنی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر ذہن بے دار ہونے لگا اسے یاد آ گیا وہ چچا کے گھر میں ہے۔

پلنگ کی سائیڈ پر رکھا ٹائم پیس دیکھا شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک کپ دودھ پتی کا لیا کرتی تھی۔ عادت پختہ ہو چکی تھی اس لیے طلب بڑھ رہی تھی۔ اس نے لحاف ایک جانب ہٹایا دوپٹہ شانوں پر پھیلایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بالکل چھوٹے چھوٹے قطرے دھیرے دھیرے برس رہے تھے مگر جانے کب سے برس رہے تھے کہ ساری زمین گیلی تھی، صحن بالکل خالی تھا ہاں کمروں میں دنیا آباد تھی باتوں کی آوازیں وہ یہاں اپنے کمرے کے آگے بنے برآمدے میں کھڑے ہو کر بھی سن سکتی تھی۔

وہ بڑے خوشگوار موڈ کے ساتھ بڑے کمرے کی جانب چل دی اور ایسا کرتے ہوئے اسے دوپٹے کو اچھی طرح لپیٹنا پڑا کہ ہوا بہت ٹھنڈی تھی اور اس نے سویٹر بیگ سے نکالا بھی نہیں تھا کہ جب آئی تھی تو دھوپ تھی ہاں شام میں روزانہ سویٹر کی ضرورت اب پڑنے لگی تھی، اسی لیے وہ سامان میں رکھ کر لائی تھی۔

بڑے کمرے کے قریب پہنچ کر اندازہ ہوا یہاں خاصا شور ہے۔ باتوں اور ہنسی کی آواز بہت واضح تھی۔ شاید چاچا بھی گھر آ چکے ہیں۔ اس نے قیاس کیا اور پردہ ہٹا کر کمرے میں چلی آئی۔

سامنے بیٹھے اجنبی مرد کو دیکھ کر ٹھٹکی ضرور، مگر وہ خود اعتماد تو تھی، گھبرائی نہیں اور نا ہی واپسی کے لیے پلٹی۔

''آؤ نا آپا ادھر آ کر بیٹھو۔'' چاچی مہراں کے چھوٹے بیٹے قدیر نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا چاچی اور چاچا میں سے کوئی بھی یہاں موجود نہیں تھا اور ان کے ہاں اجنبی مرد کے سامنے جا بیٹھنے کا رواج بھلا کب تھا۔

''آؤ نا آپا! یہ میرے ماموں ہیں۔'' بچہ خوش ہو کر بڑے جوش کے ساتھ تعارف کروا رہا تھا۔

چاچی کا بھائی، میرا بھلا اس سے کیا رشتہ، اس نے آہستگی سے بچے سے ہاتھ چھڑایا اور واپس پلٹنا چاہا۔

''مجھے بچوں نے بتایا آپ آئی ہو کیا حال ہے پنڈ کا سنا ہے بڑی تڑی شڑی لگا رکھتی ہو۔''

ارے وہ تو خواہ مخواہ ہی باتیں بنا رہا تھا۔ وہ بھی اتنی بے تکلفی کے ساتھ۔

''یہ کیا کہا اس نے تڑی لگا کر رکھتی ہوں۔'' وہ تو جا رہی تھی اس کی بات پر قدم روک لیا رخ اس کی جانب پھیرا اور بولی۔

"یہ تم بی بی کے کمرے میں رکھ آؤ اور نور اگر اکیلے بیٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تو سلیم یا قدیر کو تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں چاچی! وہ اپنے ماما کے آنے پر بہت خوش ہیں انہیں ادھر ہی بیٹھا رہنے دو۔"

اس روز شاہ زمان کی آمد کی وجہ سے اسے چائے اور کھانا اپنے کمرے میں ہی کھانا پڑا۔ "پتہ نہیں کب اس کی واپسی ہوگی، میں تو اس طرح اپنے کمرے میں ہی بند ہوکر رہ جاؤں گی۔" یہ اس نے سوچا تھا لیکن صبح جب وہ سلیم کے ساتھ گاؤں کی سیر کے لیے جارہی تھی تب چاچا نے کہا تھا۔

"پیدل کہاں تک پھرو گی۔ شاہ زمان گھر کا بچہ ہے اچھا لڑکا ہے گاڑی ہے اس کے پاس تم دونوں بچے اس کے ساتھ گاڑی میں گاؤں کی سیر کرو۔" چاچا کی بات وہ کیسے ٹال سکتی تھی۔ اور دونوں بچے اس کے ساتھ آگے بیٹھے تھے۔ وہ پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ اور شاہ زمان کو اس پر اعتراض بھی نہیں تھا کہ آخر وہ بھی ان ہی بستیوں کی پیداوار تھا اور یہاں کے رواجوں کو خوب سمجھتا تھا۔

اس روز اس نے اسکول دیکھا اور جھٹکا لگا۔

"یہاں میٹرک تک اسکول ہے چاچا نے کسی کو روکا نہیں، بچے اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں جب کہ ہمارے گاؤں میں ایسا نہیں ہے۔ بابا سائیں مزارعوں کے بچوں کو پڑھوانے کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر کسی مزارے کا بچہ اسکول جاتا ہے تو بابا اس پر ناراض ہوتے ہیں اور وہ اچھا ہی کرتے ہیں یہ لوگ پڑھ لکھ گئے تو پھر برابری پر اتر آئیں گے۔ شہر کا رخ کریں گے اور ہماری زمینوں کو سنبھالنے والا تو کوئی نہیں رہے گا۔ زمیندار کی شان تو تب ہی ہوتی ہے جب اس کے آس پاس مزارعوں کا ہجوم ہو، پڑھ لکھ کر بھلا یہ لوگ ہمارے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں گے کیا۔"

"تمہارے گاؤں میں بھی اسکول ہے۔" شاہ زمان کی آواز نے اسے خیالوں سے نکالا۔

"ہاں ہے۔" مختصر جواب دے کر وہ اسکول میں نئے تعمیر کیے گئے پکے کمروں کو دیکھنے لگی۔

"کبھی ہمارے گاؤں بھی آؤ نا۔" پشت پر ہاتھ باندھے چند قدموں کا فاصلہ رکھ کر وہ اس کے پیچھے ہی تھا۔

"کیوں، کس لیے؟" نور نے تیوری چڑھا کر استہزائیہ سی ہنسی ہنس کر اسے یہ بات احمقانہ ہونے کا احساس دلانا چاہا۔

"معائنے کے لیے۔" وہ ہنس پڑا۔ ایسی ہنسی جو نور کو پسند نہیں آسکتی تھی۔

"میں معائنہ کروں یا نہ کروں یہ کون ہے یوں مذاق میں ہنسی اڑانے والا؟ مجھے اس کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

یہاں پڑھانے والی استانیاں بڑی کلاسوں کی لڑکیاں سب اسے اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں وہ اس کے پاس آنا چاہتی تھیں اور خود نور بھی ان سے بات کرنا چاہتی تھی۔ انہیں بتانا چاہتی تھی۔ وہ بھی پڑھی لکھی ہے اور اسے ان کے اسکول میں بہت سی خامیاں دکھائی دے رہی ہیں، مگر یہ جو ساتھ ساتھ ہے ایک ایک حرکت پہ نظر

رکھتا اور بظاہر عام سی بات کہتا مگر تنقید کرتا ہوا بھلا اس کے سامنے کسی سے کوئی بات کی جاسکتی ہے، وہ غصے کو دباتی اسکول سے باہر آگئی۔

"چلو اب مالٹے کے باغ میں چلتے ہیں یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے ہم پیدل بھی تھوڑی سی دیر میں پہنچ جائیں گے۔" یہ فرمائش سلیم کی تھی نور نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد پانی کا کھال شروع ہوگیا۔ فصلوں کو پانی دینے کے لیے بنائی گئی یہ چوڑی سی نالی جس میں پانی کا بہاؤ تیز تھا اور اس کے پاٹ کی چوڑائی اتنی تھی کہ پار اترنے کے لیے اس پر ایک لمبے اور مضبوط درخت کا تنا کاٹ کر بطور پل رکھا گیا تھا۔

یہاں بہت سبزہ تھا اور خنکی بھی اسی حساب سے زیادہ تھی، رات کو ہونے والی بارش نے درختوں اور پودوں کو دھو دیا تھا نکھری نکھری ہریالی اچھی لگ رہی تھی۔

وہ چاروں آگے پیچھے تنگ سے راستے پر چلے جارہے تھے۔ پھر بچے کسی پرندے کو دیکھ کر پودوں کی طرف چلے گئے وہ دونوں اسی تنگ راستے پر کھڑے ان کا انتظار کرنے لگے۔

اچانک فضا نامانوس سے شور سے بھر گئی۔ "ہٹنا بچنا سانڈ بپھر گیا ہے۔ اگر کوئی راستے پہ کھڑا ہے پیچھے ہٹ جائے۔" آوازیں تھیں اور ان کے سامنے دھمک تھی۔ یقیناً بپھرا ہوا سانڈ اسی راستے پر آرہا تھا۔ نور آگے اور شاہ زمان اس کے پیچھے تھا۔ لمحوں کی بات تھی اس نے بس ایک بگولے کو اپنے سامنے دیکھا تھا۔ پھر شاہ زمان نے بازو سے پکڑ کر اسے دائیں سائیڈ پر کھینچ لیا، راستے کے دونوں جانب گہرائی تھی اور راستہ ڈھلوانی تھا۔ دونوں ہی لڑھکتے ہوئے نیچے گرے تھے۔

پہلے سانڈ اور اس کے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم گزر گیا۔ ان کے ہاتھ میں لوہے کے خول والے ڈنڈے برچھے اور دوسرے اوزار تھے مگر بپھرا ہوا سانڈ جس رفتار سے دوڑ رہا تھا اس کو جالینا فی الحال تو بس کی بات نہیں تھی۔ ہاں اسی رفتار سے بھاگتے ہوئے جب وہ تھک جائے گا تب یہ اسے جالیں گے پتہ نہیں اتنی دیر میں وہ کیا کیا نقصان کر ڈالے؟ کس کس کو روند ڈالے؟

شاہ زمان گرتے ہی سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر نور کے حواس چند لمحوں کے لیے جیسے معطل سے ہوگئے دل کی دھڑکن خوف سے بڑھ گئی تھی اور اس نے اپنے حلق کو بالکل خشک ہوتا محسوس کیا تھا۔

"کیا تمہیں کوئی چوٹ لگ گئی ہے؟" شاہ زمان قریب کھڑا ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔

تب اس نے محسوس کیا اس کے دائیں بازو میں تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر اس نے یہ بات شاہ زمان کو نہیں بتائی۔ نفی میں سر ہلا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ چونکہ ڈھلان تھی اٹھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

شاہ زمان نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور سہارا دے کر اسے کھڑا کر دیا۔ اتنے قریب یوں کہ اس کا ہاتھ شاہ زمان کے ہاتھ میں ہے یہ وہ ہے جس نے ابھی ابھی اس کی جان بچائی ہے۔

ہوا خنک ہے دھوپ نرم ہے ہر سو دھلی دھلائی نکھری نکھری ہریالی اور پہلی بار اس کا ہاتھ یوں کسی غیر مرد نے تھاما، مرد بھی کیسا اونچا پورا اور دل میں کھب جانے والی شخصیت رکھنے والا۔

یہ عورت کا دل بھی کیا ہے اچانک ہی دھڑک اٹھتا ہے۔اور جس کے نام پر دھڑکتا ہے بس پھر اسی کا ہو جاتا ہے اس کے پورے بدن نے اس ہاتھ کا لمس محسوس کیا تھا اور ایسی کہ بس وہ اب انہی میں قید رہنا چاہتی تھی۔ اس نے شاہ زمان کے چہرے کی جانب دیکھا، وہ بھی اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔اسے سنبھلتے دیکھ کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانے والا تھا مگر نور کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جو اس کا حوصلہ بڑھا گیا اور اس نے نور کے ہاتھ کو تھامے ہی رکھا وہ اسی طرح اسے ساتھ لیے ڈھلان پر چڑھا اور راستے پر آ گیا۔ گھنے پودوں میں انہیں دونوں بچوں کے ہنسنے کی آوازیں تو آ رہی تھیں مگر وہ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''آؤ کہیں بیٹھ جائیں۔'' شاہ زمان کے انداز میں بے تکلفی بھی تھی اور نور کو یوں لگا تھا وہ بیٹھنے کا فیصلہ تو کر چکا ہے اور وہ انکار نہیں کر سکی۔

☆......☆......☆

چاچا نے ایک دن اسے شاہ زمان کے ساتھ سیر پر جانے کی اجازت دی تھی مگر اس نے اس اجازت کو کافی سمجھ لیا تھا اب وہ روزانہ ہی اکٹھے نکلتے تھے۔

چاچی مہراں ان دنوں بہت مصروف تھی۔اس کی کوئی سہیلی بیمار تھی اور مہراں کو نا صرف اس کے لیے کھانا پکوانا ہوتا تھا بلکہ وہ تیمار داری کے لیے روزانہ اس کے گھر بھی جاتی تھی۔ پھر شاید اسے اپنے بھائی پر بھروسہ بھی بہت تھا اور جب اس کے سامنے ہی چودھری عالم نے بھتیجی کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دی تھی تو پھر وہ کیوں روک دیتی۔

دوپہر میں وہ دونوں اور بچے جب گھر واپس آتے چاچی سہیلی کی طرف جا چکی ہوتی تھی اور کھانا بھی اکٹھے کھاتے باتیں بھی خوب ہوتیں، مرد اتنی خوبصورت باتیں بھی کر سکتے، یوں ہنسا بھی سکتے ہیں۔ یہ بہت خوشگوار اور حیرت انگیز تھا۔

اور وہی تو تھا جس نے اسے بتایا تھا۔

''نوری! تم پر نیلا رنگ بڑا جچتا ہے۔'' وہ مسکرائی تھی اور سوچ رہی تھی آج سے پہلے کبھی کسی نے بتایا ہی نہیں۔

''اور تم ہنستی ہوئی بھی بہت خوبصورت لگتی ہو۔''

''ارے آج سے پہلے کہاں کسی نے اتنی توجہ سے دیکھا تھا مجھے۔'' اس کے چہرے پر یہ سن کر خوشگوار تاثر تھا وہ بڑی مطمئن اور مکمل دکھائی دی تھی۔

''کسی روز میرے ساتھ شکار پر چلو گی۔''

''کیا، شکار پر۔'' یہ وہ کام تھا جو آج تک اس نے نہیں کیا تھا۔ بابا کے دوست جب کبھی شہر سے آتے تو پھر وہ شکار کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔

یہاں سے چناب کا کنارہ دور نہیں تھا صبح صبح وہاں پر مرغابیاں اترتی تھیں اور شوقین رات ہی سے اہتمام شروع کر دیتے، ابھی اندھیرا ہوتا کہ شکارگاہ کی راہ لیتے۔

زمین زرخیز تھی۔ سبزہ بھی خوب تھا خود رو درختوں کی بہتات تھی دریا سے ہٹ کر ان جنگلوں میں شکار

کھیلنے کے شوقین کی تعداد کافی تھی۔

''مگر میں تمہارے ساتھ بھلا کس طرح جا سکتی ہوں؟'' اسے اس پیش کش پر ہی حیرت تھی۔

''ہم اکیلے تھوڑی جائیں گے۔تمہارے چاچا اور چاچی اور دونوں بچے بھی تو ساتھ ہوں گے۔''

''ہاں پھر تو ٹھیک رہے گا۔'' وہ پرجوش ہو کر بولی۔

''بندوق چلانا تو جانتی ہو نا!''

''تو تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ بندوق بھی چلا لیتی ہوں، نشانہ بھی بڑا ہے میرا۔''

''چلو پھر ہو جائے گا مقابلہ۔''

''میں یہ دن کبھی نہیں بھلا سکوں گی شاہ زمان! سب کچھ نیا نیا ہے نا بہت انوکھا اور خوبصورت بھی۔'' اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پتا ہے جب میں آپا کی زبانی تمہارے قصے سنا کرتا تھا تو حیران ہوتا تھا اور اب جب تم سے ملا ہوں تمہیں دیکھا ہے تو اور بھی حیران ہوں۔''

''کیوں بھلا اب کیوں حیران ہیں؟''

''بالکل بھی یقین نہیں آتا کہ تم جیسی خوبصورت ذہین اور شرمیلی سی لڑکی کسی کے لیے اتنی سخت اور غصیلی بھی ہو سکتی ہے۔''

''تم نے مجھے بدل دیا ہے شاہ زمان! مجھے لگتا ہے اب میں کبھی وہ پہلے والی نور جہاں نہیں بن سکتی۔''

''چلو یہ تو بڑا اچھا ہوا میری وجہ سے کتنے غریبوں کا بھلا ہو جائے گا۔''

''محبت انسان کو کتنا بدل دیتی ہے۔ ہے نا!'' وہ اس کے برابر چلتی ہوئی دوپٹے کا کنارہ انگلی پر لپیٹے اور کھولتے ہوئے ایک جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

''مجھے کیا پتہ جب محبت ہو گی اس بات کا جواب تو تب ہی دے سکوں گا۔'' اور چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی۔

''ارے رے.....'' اس کے کڑے تیوروں سے گھبرا کر وہ الٹے قدموں چلنے لگا تھا اور برابر ہنس بھی رہا تھا۔

''ابھی کیا کہا تم نے؟''

''کچھ نہیں بابا، مذاق کیا ہے ورنہ کیا تم نہیں جانتیں تمہارے عشق میں پورا کا پورا غرق ہو چکا ہوں۔''

''اگر آئندہ ایسا مذاق کیا تو۔''

''تو کیا۔'' وہ قریب آ گیا اور اب کے بڑی سچائی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔''

''تمہارے جواب نے خوش کر دیا مجھے۔ واقعی بے وفائی کرنے والے کو جینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ مگر اللہ دے واسطے زمیندارنی مارنے سے پہلے یہ ضرور پوچھ لینا کہیں میں نے عادت کے مطابق تم سے مذاق تو

نہیں کیا تھا!''

''بالکل نہیں کچھ نہیں پوچھوں گی بس ایسے مذاق سے پرہیز کرنا۔''

''جو حکم سرکار۔'' پھر دونوں ہنس پڑے۔

''اب تھوڑے دنوں میں مجھے واپس جانا ہے۔'' ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''واپس تو مجھے بھی جانا ہے صرف تین دن کے لیے آیا تھا تم نے قدم ہی نہیں اٹھانے دیے۔ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔''

''شہر میں تو بہت پڑھی لکھی خوبصورت لڑکیاں ہوں گی۔''

''لڑکیاں گاؤں کی ہوں یا شہر کی خوبصورت ہی ہوا کرتی ہیں۔''

''بڑے حسن پرست ہو۔''

''ہر مرد ہوا کرتا ہے۔''

''لیکن عورت تو بس جس کو دل دیتی ہے اس کے علاوہ کوئی خوبصورت لگتا ہی نہیں۔''

''ہاں عورت اور مرد میں بہت فرق ہے۔ یہ محبت ہے جو دونوں کو یکجا کر دیتی ہے۔''

''کیا تم بہت پڑھے لکھے ہو؟''

''بہت زیادہ میرا خیال ہے دنیا میں سب سے زیادہ۔''

''مذاق نہیں کرو باتیں بڑی عقل والی کرتے ہو اس لیے پوچھ رہی تھی۔''

پھر ایک روز ابا سائیں کا ڈرائیور اسے لینے آ گیا۔ اور یہاں سے جاتے ہوئے وہ بہت اداس تھی۔

''تم پھر کب آؤ گی نوری! مجھے بتا دو تا کہ میں بھی ان ہی دنوں آپا کے گھر پر دھاوا بول سکوں۔''

''میں ابھی سے کیسے کہہ سکتی ہوں؟''

''میرا نمبر لے لو فون کر لینا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی۔ فون مردانے حصے میں ہوتا موبائل صرف قادر کے پاس ہے مگر پھر بھی میں پوری کوشش کروں گی۔''

''اب کے آپا تم لوگوں کی طرف آئے تو خاص خاطر خدمت کرنا کیونکہ اب وہ خاص مقصد کے لیے ہی آئے گی۔''

''چاچی ہمیں ویسے بھی پیاری ہے۔ وہ جب بھی آتی ہے ہم تو خاطر خدمت کرتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے یہ خاطریں خدمتیں مستقبل میں کام آئیں گی۔''

''تم کبھی میرے ابا سائیں سے ملے ہو؟'' اس کی بات پر ذرا کی ذرا ہونٹ دبا کر اسے دیکھا پھر پوچھنے لگی۔

''بس سلام دعا تک ویسے وہ بھرا عالم سے بالکل الٹ مزاج رکھتے ہیں۔''

''کیوں ایسا کیا دیکھ لیا؟''

''بھرا عالم ہنس مکھ اور نرم مزاج والے ہیں۔ تمہارے ابا رعب و دبدبہ رکھ کر بات کرتے ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''تمہیں تو اچھی لگے گی تم خود بھی تو ایسا ہی مزاج رکھتی ہو مگر یاد رکھو میرے گھر آ کر تمہیں میرے ملازموں سے بہت اچھی طریقے سے بات کرنا ہوگی، وہ شہری ملازم ہیں صاف کہیں گے صاحب تو بڑا اچھا ہے مگر بیگم صاحبہ نک چڑھی اور بدمزاج ہے خواہ مخواہ اتراتی ہے۔''

''توبہ اللہ سائیں! ہر وقت اپنی تعریفیں۔'' وہ ہنس کر جتا رہی تھی۔

☆......☆......☆

واپس آئی اس کی جھولی میں خواہشوں کی کلیاں تھیں، جنہیں بس تھوڑے عرصے میں کھل کر پھول بن جانا تھا۔ اس کے رنگ میں ایک خاص چمک آ گئی تھی وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوش مزاج ہو چکی تھی اور ہر وقت ملازموں کے سر پر سوار رہنے والی ان پہ کڑی نظر رکھنے والی نور جہاں کو اب تنہائی اچھی لگنے لگی تھی۔

''چاچے کے گھر جا کر تو بالکل بدل گئی ہے نور!'' اماں نے کہا تو وہ چونک اٹھی یوں جیسے ماں ابھی وہ سب بیان کر دے گی جو وہ چھپا رہی ہے۔

''لگتا ہے مہراں کے ساتھ تو نے کافی وقت گزارا ہے۔ اسی کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔ میرا تو خیال تھا وہاں دو چھوٹے لڑکے ہی تو ہیں، مہراں گھر گرہستی والی عورت تیرا بھلا کیا دل لگے گا اس کے گھر جا کر۔''

''نہیں اماں! چاچی بہت اچھی ہے میرا تو واپس آنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔''

اس کی بات سن کر پتہ نہیں اماں کیوں رنجیدہ سی ہو گئی آہ بھر کر بولی۔ ''چل یہ تو اچھی بات ہے تجھے وہاں رہنا اچھا لگا۔''

''مگر اماں ایسا تو نہیں کہ میں نے وہاں جا کر تجھے بھلا دیا، مجھے تمہاری بھی بہت یاد آتی رہی۔'' اس نے ماں کی سنجیدگی کا یہی سبب جانا اور وضاحتیں دینے لگی۔

''ماؤں کو زیادہ یاد نہیں کیا کرتے دھی رانی!'' یقیناً یہ اتنے دنوں کی دوری کا اثر تھا، آج کل اماں کو اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔

قادر شہر جا چکا تھا، تھوڑے دنوں تک چھوٹے بھائی نادر کی آمد متوقع تھی، نادر بڑے بھائی کے مقابلے میں دھیمے اور کھلنڈرے مزاج کا لڑکا تھا اور نور جہاں کے ساتھ اس کا برتاؤ قادر سے بالکل مختلف تھا اس لیے اس کی آمد نور جہاں کے لیے کسی تشویش کا باعث نہیں تھی۔

دسمبر کی یخ بستہ ہواؤں نے زندگی کو منجمد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شام ہوتے ہی دھند (کہر) اترنا شروع ہو جاتی تھی۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر صحن میں جھانکو تو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا جوں جوں رات بھیگتی یہ دھند صحن سے جست لگا کر برآمدے میں آ جاتی۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب ڈرا سہما سا سورج ہلکی سی شکل دکھاتا تو پھر اس کہر کے مقابلے میں خود کو بے بس جان کر دوبارہ منہ چھپا لیتا۔

انہی دنوں میں نادر کو آنا تھا اور اماں کو دھڑکا سا لگا تھا، دھند کی وجہ سے سڑکوں پر حادثات بڑھ جاتے ہیں۔ ''سوہنا رب میرے بچے کو خیر خیریت سے لے کر آئے۔''

''ایسے موسم میں جب کہ کمرے ہر دم آباد رہتے ہیں نور کے لیے شاہ زمان کو فون کرنا بے حد کٹھن مرحلہ تھا ایک بار بہانے سے وہ مردانے حصے میں گئی تھی مگر ناکام لوٹنا پڑا۔ اس پر ایک بے چینی سوار تھی۔

''وہ میرے فون کا منتظر ہوگا۔ اسے بہت انتظار ہوگا مجھ پر غصہ بھی آتا ہوگا۔ اف میں کروں تو کیا کروں۔'' وہ اس کی ہر ممکن کوشش کیا کرتی۔

انہی دنوں چاچا اور چاچی مہراں کی آمد ہوئی اور وہ انہیں دیکھ کر بے پناہ خوشی کے اظہار سے خود کو باز نہ رکھ سکی۔ ہاں اپنی خوشی میں اسے یہ دھیان نہیں رہا کہ اس بار ان دونوں کا انداز کچھ رکا رکا سا ہے اور وہ کچھ گم سم سے بیٹھے ہیں۔ اس نے محسوس نہیں کیا تو وجہ کیا جانتی۔ ہاں جب اماں نے اس کے کمرے میں آ کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''نی اڑی یہ کیا کر آئی ہے تو؟'' تب وہ ٹھٹکی۔ ''اس لیے بھیجا تھا تجھے تیرے چاچے کے گھر باپ کی عزت کا خیال نہ کیا تو نے کیسا مان دیا چودھری عاشق نے تجھے، تو دھی ہے مگر اس نے بیٹوں کی طرح پیار دیا ہے تجھے مگر تو وہ ڈائن ہے جو اپنے ہی باپ کی عزت کو کھا گئی ہے۔ داغ لگا دیا تو نے میری تربیت کو۔'' کمرے کا دروازہ بند کر کے اماں اس پر چلا رہی تھی۔

اور وہ سمجھ رہی تھی بھید کھل چکا ہے اچھا ہے سب جان لیں وہ بالکل شرمندہ یا خوفزدہ نہیں تھی۔

''میں پوچھتی ہوں تجھے یہ جرأت بھی کیسی ہوئی۔''

''آخر میں نے کیا کیا ہے اماں!''

''ہائے ربا کس دیدہ دلیری سے پوچھتی ہے میں نے کیا کیا ہے، میں کہتی ہوں تیرا باپ تیرا کچھ کرے نہ کرے میں تجھے زمین میں زندہ دفن کر دوں گی۔ تیرے انداز مجھے چونکا تو رہے تھے پر یہ میں نہیں سوچ سکی تو ہمارے سر میں، ''سوا'' ڈال کر آئی ہے''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' ماں نے آگے بڑھ کر زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور بولی ''ایک جو غیر مرد تیرا نام لے رہا ہے تجھے مانگ رہے ہیں اور تو کہتی ہے تو نے کچھ نہیں کیا؟''

''ہاں اماں میں پھر کہتی ہوں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ جس پر مجھے کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔''

''تجھے نہیں پتہ بدنصیب تجھے نہیں پتہ۔'' اس کی ماں اپنا ماتھا پیٹنے لگی۔

''کیا نہیں پتا مجھے آخر تم بتاتی کیوں نہیں؟''

''سننا چاہتی ہے تو سن، چودھری عاشق کے خاندان میں لڑکیاں برادری سے باہر نہیں دی جاتیں کہ لوگ زمین کو ماں مانتے ہیں بیٹی دینے کی صورت میں اس کے حصے کی زمین کا بھی مطالبہ اٹھایا جاتا ہے اور یوں دھرتی ماں کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں جو زمین داروں کو کسی طرح گوارا نہیں۔ اپنی برداری میں لڑکا ہو تو ٹھیک ورنہ لڑکی کنواری بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اسی حساب سے مہراں کے بھائی کے ساتھ تیرا رشتہ بالکل نہیں ہوسکتا۔''

''یہ تو ظلم ہے اماں! لڑکی ذات کے ساتھ زیادتی ہے۔ گناہ ہے یہ۔''

''جو بھی ہے، یہ برادری کا اصول ہے۔ اور ہم حیران ہیں مہراں اور عالم یہ رواج جاننے کے باوجود اس لڑکے کا رشتہ ڈالنے کی نیت سے کیوں چلے آئے ہیں؟ تمہارا باپ بہت غصے میں ہے اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہے تو اب کچھ دنوں تک اس کے سامنے مت آنا۔''

''میں اس ظلم کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گی اماں!''

''تو پھر یہ سر کاٹ دیا جائے گا۔ یاد رکھ نور! زمین دار اپنے اصولوں کا پکا ہوا کرتا ہے۔ تو مرد سے ٹکر لینے کی بات نہ سوچ۔''

''اماں! تو بتا بیٹی پر یہ ظلم چپ چاپ دیکھتی رہے گی۔'' اس نے لجاجت سے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''عورت کی تقدیر اس کے خاندان کے مردوں کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتی مگر مجھے یہ مشورہ ضرور دوں گی۔ باپ کے سامنے بولنے کی غلطی مت کرنا۔ ایک مرد کی نظر سے گر جانے والی عورت چاہے وہ رشتے میں اس کی کچھ بھی ہو۔ دوبارہ پہلے والا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ جب ہار مقدر ہی ہے پھر بات کر کے کھوٹی کیوں کرتی ہے۔''

''اماں! وہ اچھا لڑکا ہے۔ تم ایک بار اس سے مل تو لو۔''

''نام نہ لے اس کا اور یہ خیال بھی دل سے نکال دے۔''

''تم خود ہی میرا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہو، ورنہ ابا سائیں سے بات تو کر سکتی ہو؟''

''میں نے کہا ہے نا، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔''

''میں جائیداد میں سے حصہ نہیں لوں گی۔ جائیداد ہی کی خاطر مجھے تباہ کرنے پر تلے ہو ناں تم لوگ۔ نہیں چاہیے مجھے کچھ بھی۔ سب رکھو اپنے پاس بس مجھ پر مہربانی کر دو۔ میری زندگی سے مت کھیلو۔''

''تیرے یوں کہہ دینے سے کہ جائیداد نہیں لوں گی، مسئلہ حل نہیں ہوا کرتا۔ تو نہیں مانگے گی مگر کل کو تیری اولاد اٹھ کھڑی ہوگی۔ بزرگوں نے اس بات کو جڑ سے ہی ختم کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہے۔ بس یہ ہماری روایت ہے تو سمجھ لے لڑکی برادری سے باہر دینا شان کے خلاف ہے اور تو پہلی تو نہیں ہے اس حویلی میں۔ تیری اکلوتی پھوپھی نے بھی جوانی گال دی تھی۔ خاموشی اور عزت کے ساتھ۔ تیری طرح سیاپا نہیں ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔''

''کون پھوپھی؟'' اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''تو بہت چھوٹی تھی جب وہ عین جوانی میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔''

''ہاں، اس کے لیے دنیا سے رخصت ہو جانا ہی بہتر تھا۔ میں پوچھتی ہوں اماں! میرے ساتھ یہ سلوک ہونا تھا۔ تو مجھے زندہ کیوں رکھا، پیدا ہوتے ہی میرا گلا گھونٹ کر مار کیوں نہیں دیا مجھے؟''

''اے ہے، مریں تیرے دشمن۔ تیری پھوپھی کے لیے تو کوئی راضی ہی نہیں ہوا، اس کے لیے کوئی برادری میں، تھا ہی نہیں پر تیرے لیے تو موجود ہے تیرا ویاہ ہم کریں گے۔''

''کون کس کے ساتھ؟'' وہ چونکی۔

"خیر سے تیرا چاچا لڑکوں والا ہے۔ سلیم ابھی چھوٹا ہے۔ کل کو جوان ہوگا دودھ مکھن کھانے والے زمین داروں کے منڈے، جوان ہونے میں دن تھوڑے ہی لگتے ہیں۔"

"اماں، اماں! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یا پھر مجھے ہی سننے میں غلطی لگ رہی ہے۔"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تیرے لیے سلیم ہی ہوگا۔"

"وہ تو ابھی بچہ ہے بہت چھوٹا ہے مجھ سے۔ یہ ہم دونوں کے ساتھ ظلم ہوگا۔"

"یہ سوچنا تیرا کام نہیں ہے۔"

"میں نہیں مانوں گی، میں قبول ہی نہیں کروں گی۔ شادی ہوگی تو صرف شاہ زمان کے ساتھ۔"

"نی ہولی بول نی!" ماں نے گت پکڑ کر کھینچی۔

"کیوں ہولی بولوں؟ اس حویلی کی عزت کی خاطر جو مجھے برباد کرنے پر تلی ہے جس نے میرا خیال نہیں کیا، میں بھی اس کا خیال نہیں کروں گی۔ میں چیخوں گی۔ چلاؤں گی۔ میں اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤں گی۔"

"بڑی ہی ڈھیٹ ہے تو میں چاہتی تھی تیری آواز مردوں تک نہ پہنچے مگر تو خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کرنا چاہ رہی ہے۔ دیکھ نورا! میں دشمن نہیں ہوں تیری، پہچان مجھے۔ میں تیری ماں ہوں۔ تیری جھولی میں تیری خوشی ڈالنے کا اگر کوئی بھی راستہ ہوتا تو میں اسی راستے پر چل پڑتی پر ایسا کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ دیکھ لے رشتہ ڈالنے شاہ زمان کے ماں پیو نہیں آئے وہ جانتے ہیں۔ ہم لوگوں میں لڑکی صرف چاچے کے گھر جاتی ہے۔ یہ تیرے چاچے کی سوچیں کچھ بدلی ہوئی ہیں۔ اسے اور مہراں کو پنڈ میں رہتے ہوئے بھی نئے زمانے کی ہوا لگ گئی ہے جو انہوں نے ایسی بات منہ سے نکالی ہے۔ تیرا باپ تو سنتے ہی آگ بگولا ہوگیا ہے۔ اس نے کہہ دیا ہے بیٹی کو اپنے ہاتھوں ماردوں گا پر پرکھوں کی روایت میں نہیں توڑوں گا۔"

"میرا باپ اتنا ظالم بھی ہوسکتا ہے۔"

"اس کے نزدیک یہ ظلم ہے ہی نہیں۔ ہمیشہ ہی ان حویلیوں نے یہاں ایسی عورتوں کو دیکھا ہے جن کی شادی نہیں ہوئی یا پھر جو اپنے سے کم عمر مردوں سے بیاہ کر گھر کے ایک کونے میں چپ چاپ جوانی گزارتی رہی ہیں۔"

"ان مردوں کے نزدیک شریف عورت کو شوہر اور شادی کی ایسی کچھ خاص ضرورت نہیں ہوتی بس اس کے لیے رشتوں کا تحفظ کافی ہے۔ ایسا ہی تحفظ وہ تمہیں بھی دینے کی سوچ رہے ہیں۔"

"میں اپنی حفاظت خود کرسکتی ہوں۔ مجھے کسی تحفظ کی ضرورت نہیں سلیم، میرا چھوٹا بھائی ہے، میں اس کے لیے ایسا مر کر بھی نہیں سوچ سکتی اور مجھے صرف شاہ زمان سے شادی کرنا ہے۔"

"نورا! اب تک میں تجھ سے نرمی برت رہی ہوں پر سچ کہتی ہوں جب ایک غیر مرد کا نام تیری زبان پر آتا ہے تو میں شرم سے کٹ جاتی ہوں اگر تو نے باپ کے سامنے اس بے شرمی سے یہ نام لیا تو باپ بعد میں کچھ کرے گا میں پہلے ہی تیری زبان پر جلتا ہوا کوئلہ رکھ دوں گی۔ اڑی بے غیرت! تو نے وہ کام کیا

ہے جو حویلی کی کسی عورت نے کبھی نہیں کیا۔ ایسا ہی بے قابو ہو رہی ہے تو جا جا کر نہر میں چھلانگ لگا دے اور ڈوب مر۔"

"اکیلی نہیں مروں گی۔ میں اپنے مارنے والے کو ساتھ لے کر مروں گی۔ میں آگ لگا دوں گی، اس حویلی کو، راکھ کر دوں گی، کھڑی فصلوں کو، ان کے لیے تم نے میرے دل کو روندا ہے۔ میں کچھ بھی باقی نہین رہنے دوں گی۔" وہ چیخ رہی تھی۔ جب کواڑ کھلا اور اس کا باپ کمرے میں آگیا۔

تاثرات چہروں کو بدل ڈالتے ہیں۔ یہ وہی تو بابا سائیں تھے جن سے وہ بڑے مان کے ساتھ ہر فرمائش کیا کرتی تھی اور آج وہ چہرہ کتنا اجنبی تھا۔ ان آنکھوں، میں اس کے لیے بے گانگی اور سرد مہری تھی اور نور کو کہیں سے بھی اپنائیت کی ایک رمق بھی اس چہرے پر دکھائی نہیں دی تھی۔

"مہراں تیار کردے اسے۔ آج شام سلیم کے ساتھ نکاح ہے اس کا۔"

"نہیں نہیں بابا سائیں! میں سلیم سے نکاح نہیں کرسکتی۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"میں ولی ہوں تمہارا۔ مجھے اس سلسلے میں تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے تم پہلے ہی بہت من مانی کر چکی ہو۔ میرے دل میں اس وقت غصے کا طوفان ہے۔ میں نہیں چاہتا، میرا غصہ تم پر الٹ پڑے۔ اس لیے خاموش رہو۔"

"تم غصہ کرو مجھ پر۔ مار ڈالو مجھے مگر یہ ظلم نہیں مجھ پر نہیں تو اس بچے پر ہی رحم کرو، ایسا ظلم مت توڑو۔" وہ زور زور سے فریاد کر رہی تھی۔ جب چاچا عالم اور چاچی مہراں چلے آئے۔

"بھاجی! بچی ہے۔ غلطی ہوگئی اس سے۔ معاف کردو اسے۔ فوراً ہی ایسا فیصلہ تو مت سناؤ۔"

"تم درمیان میں مت بولا عالم! پہلے ہی جو کچھ ہوا تم دونوں میاں بیوی کی وجہ سے ہوا۔ تم لوگوں کے گھر بھیجا تھا اسے۔ یہ امانت تھی میری اور تم میری امانت کی حفاظت ہی نہ کرسکے، اب تمہیں کچھ بھی بولنے کا کوئی حق نہیں۔"

"بھاجی! زمانہ بدل رہا ہے میرا سلیم پڑھ لکھ رہا ہے۔ آج بچہ ہے، کل کو جوان ہوگا اور اپنے سے آٹھ دس سال بڑی بیوی کو بھی قبول نہیں کرے گا۔ یہ سوچو تب تک پتہ نہیں ہم زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔ کیا بنے گا اس لڑکی کا۔" "مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے عالم کہ تم خود بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہو۔"

"ایسا ہی ہے بھاجی! میں واقعی اس پر راضی نہیں ہوں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ اب وہ پہلے والے ریت رواج نہ ہی چلائیں تو بہتر ہے۔"

"بس خاموش۔ تم دونوں چلے جاؤ یہاں سے اور آئندہ مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا۔"

"مگر بھاجی! ہمارا یہ مطلب تو نہیں۔ ہم تو آپ کو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ......"

"میں نے کہا۔ چلے جاؤ یہاں سے اور کبھی مڑ کر پیچھے مت دیکھنا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آج کے بعد تمہیں بھائی نہیں سمجھوں گا۔"

چاچا اور چاچی فریاد کرتے رہے۔ چودھری عاشق نے ایک نہیں سنی انہیں حویلی سے جانا پڑا۔

”میں نافرمانوں سے کسی رعایت کا عادی نہیں ہوں۔“ یقیناً اس کا باپ یہ بات اسے ہی سنا کر نکلا تھا۔ پیچھے ہی ماں بھی کمرے سے نکلی اور اس کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے اپنے ہاتھوں کمرے کو تالا لگا دیا۔

☆......☆......☆

وہ دو روز سے بھوکی تھی نہ کھانا پانی۔ اس کا باپ تو تالا ڈال کر بھول ہی گیا تھا۔ ماں نے بھی چکر نہیں لگایا۔ نقاہت سے اس کا ذہن ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ کیا وہ یونہی بھوکی پیاسی ماری جائے گی۔ اس خوف نے اسے بالکل ہی ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ باہر کی آہٹوں پر کان لگائے ہوئے تھی۔ کوئی تو آئے ایک گھونٹ پانی پلا دے۔

”شاید یہ تیسرا دن تھا یا تیسری صدی۔ نقاہت اور غنودگی کے عالم میں اسے محسوس ہوا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ کچھ عورتیں جو گھر کی ملازمائیں ہی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوئی ہیں۔ ان کے پاس زرق برق کپڑے ہیں۔ آتے ہی انہوں نے نور کا منہ ہاتھ دھلایا۔ بال بنائے پھر اس کے کپڑے تبدیل کرنے لگیں۔

”مجھے کھانا چاہیے اور کچھ نہیں تو تھوڑا پانی ہی پلا دو۔“ اس کی مزاحمت پوری طرح دم توڑ چکی تھی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ انہوں نے تھال پر سے کپڑا ہٹایا اور...... دودھ کا پیالہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ دودھ پی کر اس کی رہی سہی بے دار حسیں بھی سونے لگیں اور جب اسے پوری طرح دلہن بنا دیا گیا۔ اس وقت وہ خود کو زمین پر نہیں آسمان پر محسوس کر رہی تھی۔

کسی اور ہی دنیا کی باسی۔ کوئی اور ہی مخلوق۔ ارے میرے تو پر نکل آئے ہیں۔ میں تو آسمانوں کی سیر کر رہی ہوں۔

جب یہ ملازمائیں سہارا دے کر اسے بڑے کمرے تک لائی تھیں۔ اس کے پیر بری طرح ڈول رہے تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسے لا کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے دیکھا، ماں سامنے ہی بیٹھی تھی اور بری طرح رو رہی تھی۔ یہیں تخت پر سبز غلاف میں لپٹا قرآن پاک کا نسخہ رکھا تھا اور سامنے مولوی صاحب بیٹھے تھے۔

جب مولوی صاحب نے اس کا قرآن کے ساتھ نکاح پڑھایا تب اس کی ماں کی سسکیاں بلند ہوگئی تھیں۔ جب کہ چودھری عاشق اور قادر سینے پر ہاتھ لپیٹے خاموش باوقار انداز میں کھڑے تھے۔ رسم پوری ہوئی۔ اسے سخت نیند آ رہی تھی۔

وہ شور میں سونے کی عادی کبھی نہیں رہی تھی مگر آج اسے کوئی آواز محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یہیں بڑے سکون کے ساتھ تخت پر لیٹی اور سوگئی۔ (صرف وہی نہیں اس کے ساتھ ساتھ اس کی قسمت بھی ہمیشہ کے لیے سوگئی)

☆......☆......☆

موسم اب بھی بدلتے رہتے تھے، ہر موسم کا اپنا حسن اپنا جادو تھا۔ گاؤں میں رہ کر فطرت بہت قریب ہو جاتی ہے۔ مگر یہ سب محسوس کرنے کے لیے ایک دل بھی تو چاہیے، زندہ سلامت، امنگوں بھرا دل جو اب نور جہاں کے پاس نہیں تھا اسی لیے اب اسے موسموں کے آنے جانے کی کچھ خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔

یہ کیا کر دیا تقدیر نے اس کے ساتھ۔ ایسا کاری وار جب تک جیے گی کراہتی ہی رہے گی۔ اور تب ہی اسے پتہ چلا تھا، اس کی ماں اس کے ساتھ کتنی محبت کرتی ہے۔ عمر کے کئی سال اس نے اس دھوکے میں گزار دیے وہ اپنے بابا سائیں کی لاڈلی بیٹی ہے اور اماں صرف بھائیوں کو چاہتی ہے مگر اب اسے اندازہ ہوا، ماں اور بیٹیوں کے دل تو ایک ساتھ دھڑکا کرتے ہیں۔

بیٹی کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں اس کے سکھ کی دعائیں مانگنے لگتی ہے اور اس کے آباد آنگن کا خواب دیکھا کرتی ہے۔

اس کی ماں وہ بدنصیب عورت تھی جسے بیٹی کی پیدائش کے ساتھ ہی بتا دیا گیا تھا دعائیں رائیگاں جائیں گی اور اس کا آنگن کبھی آباد ہی نہیں ہوگا۔ وہ ایسی بیٹی ہے جسے دلہن بن کر اپنے دولہا کے ساتھ رخصت نہیں ہونا۔ اس نے ساری عمر اپنی تمناؤں کو تھپکتے ہوئے اسی طرح گھر میں گزار دینی ہے۔ اتنا بڑا قدم اٹھا لینے کے بعد بھی، اسے ہر طرح سے برباد کر دینے کے باوجود اس کے باپ نے اسے دھی رانی، کہنا نہیں چھوڑا تھا۔

وہ اب بھی مسکراتے ہوئے اس کے کمرے میں آتا اور سر پر ہاتھ رکھ کر خیر خیریت پوچھتا۔ مگر نوری کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ان میں جذبے نہیں ابھرتے تھے۔ باپ کی مسکراہٹ، اس کا مطمئن چہرہ اسے مزید کچوکے لگاتا اور اس نے چودھری عاشق کو ابا سائیں کہنا چھوڑ دیا تھا وہ اب اسے چودھری صاحب کہتی تھی اور قادر کو چھوٹا چودھری۔

”بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ ابا ہوں میں تمہارا۔“ پہلی بار اس کے منہ سے اپنے لیے چودھری صاحب سن کر وہ چونکا۔

”ایسے ہوتے ہیں باپ، میرا کوئی باپ نہیں تم صرف قادر اور نادر کے باپ ہو۔“ اس کے لہجے میں حد سے زیادہ سرد مہری تھی۔ چودھری کا ماتھا ٹھنکا۔

اس نے کچھ سوچ کر ملازمہ کو بلایا اور اس کی ڈیوٹی لگا دی۔ ”نور جہاں پر تم نے ہر وقت نظر رکھنی ہے۔ اتھری کڑی ہے مجھے ڈر ہے کہیں کچھ کر نہ بیٹھے۔“ ملازمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اس کی ہر وقت نگرانی کی جانے لگی۔

”آ میری دھی! ادھر پچھواڑے جو ہم نے گلاب کے پودے لگائے تھے۔ پھوٹ رہے ہیں۔ ذرا چل کر تو دیکھیں۔“ ماں اس کا دھیان بٹانے کو کہتی۔

”میں گلاب دیکھ کر کیا کروں گی اماں!“

”ایسے نہیں بولتے بچے! میں تیرے ساتھ ہوں۔ تیری ماں بھی ہوں، سہیلی بھی ہوں، دیکھ تو اب گھر کی چار دیواری سے نہیں نکل سکتی تو میں نے بھی باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔“

”میری خاطر خود پر پابندیاں نہ لگاؤ اماں! بس تم جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ سچ کہتی ہوں اماں! میں اب تنہائی کی عادی ہو جانا چاہتی ہوں۔“

☆......☆......☆

آج گاؤں میں حجام کی بیٹی کی شادی تھی۔ ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ کیوں کہ لڑکیاں تیار ہو کر پہنچ چکی تھیں اور زور سے ڈھولک بجائی جا رہی تھی اس کی آواز یہاں حویلی کی موٹی موٹی دیواروں کو چیرتے ہوئے یہاں کے مکینوں کے کانوں میں آ رہی تھی۔ اماں سوچ رہی تھی یہ آواز نور جہاں پر کیا اثر ڈالے گی۔ اسے کس قدر اذیت میں ڈالے گی بس اسی بات سے اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی مگر اسے احساس ہو رہا تھا نور کے کان ڈھولک کی آواز پر ہی لگے ہیں۔

ڈھولک کی تھاپ اسے کہیں سے کہیں لے گئی، اس نے اس راہ پر شاہ زمان کے ساتھ خوبصورت انجانی دنیاؤں کی سیر کی۔ اس کے شانے پر سر رکھ کر اس سے ڈھیروں باتیں کیں اور ان باتوں میں دل کو دکھ دینے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ تو رنگوں کی، تتلیوں اور پھولوں کی باتیں کرتے رہے تھے۔

ڈھولک سات دن پہلے رکھی گئی تھی۔ سات دن تک بجتی رہی اور نور کی بے آباد دنیا کو آباد کرتی رہی۔ پھر حجام کی لڑکی تو بیاہ کر اپنے دولہا کے ساتھ چلی گئی۔ ڈھولک کی تھاپ رک گئی مگر ان سات دنوں میں جو دنیا نور جہاں نے دریافت کی تھی۔ وہ اسے کھو نہیں سکی۔

اب تنہائی کاٹنے کو نہیں دوڑتی تھی، بلکہ مزا دیتی تھی کہ شاہ زمان جو اس کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ اس کا تصور اس کی ذات پر چھاتا چلا جا رہا تھا اور دیکھنے والے سمجھ رہے تھے نور نے اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔

اس عرصے میں قادر بھی گاؤں آیا۔ وہ نور جہاں کے بارے میں کچھ اور سوچتا ہوا آیا تھا مگر اپنے کمرے میں بیٹھی رہنے والی اس مطمئن صورت کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔

''بہت اچھا ہے جو اس نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے قسمت کے لکھے کو قبول کر لیا ہے۔''

''ہاں پتر! سیانی لڑکی ہے۔ تھوڑے دن شور ڈالا تھا پھر چپ ہوگئی اور سکون میں بھی ہے۔'' باپ بیٹے کو بتا رہا تھا۔ قادر نے سن کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

چودھری عاشق نے کہا۔

''پتر! اب تم گاؤں آ جاؤ، اپنی زمینیں سنبھالو۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ یہ سب کچھ دیکھنا میرے بس کی بات نہیں رہی۔''

''ٹھیک ہے ابا سائیں! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں اور شہر کی زندگی ہم زمین داروں کے مزاج کے مطابق ہے بھی نہیں۔ وہاں پر ہر دوسرا بندہ پیسے کی نمائش کرتا پھر رہا ہے۔ ہر کسی کے پاس اسلحہ سجائے محافظ ہیں، ایسے میں بھلا کیا رعب ہو سکتا ہے۔ مزا تو گاؤں میں ہے جدھر نکل جاؤ، لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ ذرا گرج کر بات کر لو، قدموں میں آ گرتے ہیں۔ ابا سائیں میں اپنے کچھ دوستوں کو کہہ کر آیا تھا۔ اگلی بار تم لوگوں کو اپنے ساتھ گاؤں لے کر جاؤں گا اور دکھاؤں گا وہاں پر میری کیا ٹور ہے۔''

''او کیوں نہیں۔ تو مالک ہے یہاں کا جسے چاہے بلا اور جب تک چاہے مہمان رکھ۔''

''میں سوچ رہا تھا۔ آموں کا سیزن شروع ہو جائے پھر بلاؤں۔ ہمارے علاقے کا چونسہ تو یوں بھی بڑا مشہور ہے۔''

''اللہ کا بڑا فضل ہے۔ یہاں ہر موسم میں ہی کوئی نہ کوئی باغ پھلوں سے لدا ہوتا ہے۔ تو جب

چاہے بلا لے۔''

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر کمرے میں اماں اسے بار بار نہا کر کپڑے بدلنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

''کیوں اماں! کیا ہو گیا ہے ان کپڑوں کو۔'' اس نے الجھ کر کہا تھا۔

''بہت میلے ہو رہے ہیں، گرمی آ رہی ہے اب تو روز نہا لیا کر۔ پتہ نہیں کس دنیا میں گم رہتی ہے۔ تجھے تو کھانے پینے کا بھی شوق نہیں رہا۔''

''ہاں تو ٹھیک کہتی ہے اماں! میں نے ایک دنیا بسا لی ہے اور میں اب اسی دنیا میں جی رہی ہوں۔''

''اچھا اچھا اٹھ جا۔ شہر سے بھرا آیا ہے تیرا۔ تجھے اس حلیے میں دیکھے گا تو دل دکھے گا اس کا۔''

''کون سا بھرا۔''

''قادر آیا ہے نا۔''

''وہ میرا بھائی نہیں ہے، یاد رکھنا اماں! آئندہ اسے میرا بھائی مت کہنا۔'' وہ کتنے دنوں کے بعد آپے سے باہر ہوئی تھی۔

''اچھا اچھا نہیں کہتی۔ اگلے ہفتے نادر آ رہا ہے۔ اس سے تو ملے گی ناں۔''

''ہونہہ! کیا کروں گی مل کر۔ یہ سب ایک جیسے ہیں، تینوں باپ بیٹا ظالم، خود غرض، مطلبی چال باز۔''

''بس بس اڑی سنبھل کے۔ وہ تیرے اپنے سر کی چادر ہیں، تجھے کیا پتہ مرد کیسا بھی ہو۔ اس کا ہر رشتہ عورت کے لیے چھاؤں ہوتا ہے زمانہ بڑا خراب ہے نورا! اکیلی عورت کی تو کوئی زندگی نہیں، تو سر کی چادر کی سلامتی کی دعا مانگا کر۔ تو اب اللہ کے قریب آ گئی ہے۔ بڑا رتبہ مل گیا ہے تجھے اس بات کو سمجھ دعا مانگا کر۔''

''مجھے کچھ نہیں مانگنا۔ جاؤ اماں چلی جاؤ اور میں کہہ رہی ہوں اگر قادر میرے کمرے میں آیا میں اس کے سر پر کچھ دے ماروں گی۔''

جتنے دن قادر گاؤں میں رہا۔ اس نے اپنے کمرے کے دروازے کی کنڈی چڑھائے رکھی اور قادر، اس کے پاس فرصت ہی کہاں تھی کہ دو گھڑی بہن کے پاس آتا یا اس کا حال دریافت کرتا، جتنے روز گاؤں میں رہا مصروف رہا، پھر شہر واپس چلا گیا۔

☆......☆......☆

وہ بہت دنوں کے بعد کمرے سے نکلی اور برآمدے کی سیڑھیوں میں آ بیٹھی۔ شام ہو رہی تھی۔ کھلا صحن جو برآمدے سے آگے چند فٹ تک پکا تھا اس کے بعد کچا حصہ تھا جہاں درخت اور پھل دار پودے۔ لگے تھے۔ ملازم عورتیں پکا فرش دھو رہی تھیں اور کچے پر پانی کا چھڑکاؤ کر رہی تھیں۔

وہ بظاہر تو ان پر نظر جمائے تھی مگر اس کی آنکھیں اور چہرہ بتا تا تھا وہ اس وقت یہاں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی سوچ کہیں اور ہے۔

''سلام بی بی صاحب!'' آنے والی نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کیا اور کلائی کی چوڑیاں کھنک اٹھی تھیں۔ اس نے سر ہلا کر اشارے سے جواب دیا۔

آنے والی سیڑھیوں سے نیچے فرش پر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ اوپر آ کر میرے پاس بیٹھو۔'' اب وہ پہلے والی نور جہاں کہاں رہی تھی۔ مگر آنے والی جھجک گئی بولی۔

''ناں بی بی صاحب! میں ادھر ہی ٹھیک ہوں، آپ کے برابر بیٹھنے کی بے ادبی بھلا کس طرح کر سکتی ہوں۔''

''رتبے مرتبے مردوں کے لیے ہوا کرتے ہیں۔ عورت حویلی کی ہو یا جھونپڑے کی۔ ایک ہی ہوا کرتی ہے بے بس لاچار، غریب مسکین۔'' پتہ نہیں وہ تیکھے نقوش والی لڑکی جس نے بڑے بڑے جھمکے پہن رکھے تھے اس کی بات سمجھی یا نہیں، بولی۔

''ہم نے تو جی ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے۔ آپ کو اپنی بی بی سمجھا ہے اور اب تو آپ کو اور بھی بڑا رتبہ مل گیا ہے۔''

''کیا تم اسی گاؤں کی ہو۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔''

''ہاں جی۔ آپ بڑے لوگ ہم غریبوں کو کیسے پہچان سکتے ہو۔ آپ کو ہم سب کے چہرے ایک ہی جیسے لگتے ہوں گے اور میرے تو بیاہ کو بھی تیسرا چوتھا سال ہو گیا ہے، بیاہ کر بستی راواں چلی گئی ہوں۔''

''بستی راواں۔'' وہ چونکی۔ ''ارے یہ تو شاہ زمان کا گاؤں ہے۔''

''تم، تم وہاں کے زمین داروں کے گھر میں تو جاتی ہو گی۔''

''ہاں جی بڑے بڑے زمین دار ہیں ادھر۔''

''وہاں میری چاچی مہراں کا میکہ بھی ہے۔ اس کے بھائی کا نام شاہ زمان ہے۔ وہ ادھر کم رہتا ہے۔ ملتان شہر میں کاروبار کرتا ہے۔''

''ہاں، ہاں جی۔ بالکل جانتی ہوں، میرا گھر والا ان ہی کی زمینوں پر تو کام کرتا ہے۔ بادشاہ لوگ ہیں جی، اور آج کل تو بڑی رونق ہے ان کی حویلی میں۔ اپنے چودھری شاہ زمان کی شادی ہو رہی ہے نا۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں جی۔ پہلے تو بڑا اداس رہتا تھا۔ سنا ہے کسی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اسے ملی نہیں پھر آپ تو جانتی ہو جی۔ مرد ذات کب تک سوگ مناتا۔ شہر سے دلہن لایا ہے۔ اس کے کسی دوست کی بہن ہے۔ سنا ہے بہت پڑھی لکھی ہے اور رج کے سوہنی ہے۔'' کتنے بھاری بھاری برآمدے کے ستون اور ان پر ڈالی گئی چھت سب کے سب ایک جھٹکے سے نور کے سر پر آ گرے۔

درد اتنا تھا کہ برداشت سے باہر تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

☆......☆......☆

بہت دن تک اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ کہاں ہے کیوں ہے، شدت کے بخار میں چلاتی تھی۔ روتی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ سننے والے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور پتا چلتا تھا وہ کسی سے گلہ کر رہی ہے کوئی ہے جس نے مان توڑا ہے اور یہ صدمہ نور کی برداشت سے بہت زیادہ ہے۔

''سب تمہارا کیا دھرا ہے قادر کے ابا! میں کہتی رہی لڑکی ذات ہے اتنا نہ پڑھاؤ۔ جب ایک دن قید ہی کرنا ہے تو اتنی آزادی نہ دو، مگر تم نے ایک نہیں سنی، یہ اس کی پڑھائی ہی ہے جو اسے چین نہیں لینے دے رہی۔ تمہاری بہن کی طرح تقدیر کے لکھے کو قبول کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں تم نے اس کو مان دینے، پیار کرنے کی غلطی کیوں کی، ہائے میری دھی کس طرح تڑپ رہی ہے۔''

''بس بس۔ تو یہ بین ڈالنا بند کر دے۔ کچھ نہیں ہو گا اسے۔ جلدی سنبھل جائے گی۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی برا نہیں کیا۔ میں تو سمجھا یہ میری محبت کا احسان مانے گی اور ساری عمر ہنسی خوشی اس حویلی میں گزارے گی۔ جب باپ اور کڑیل جوان بھائیوں کا ساتھ ہو تو عورت کے لیے میکے میں زندگی گزارنا کوئی مشکل بات نہیں۔ جسمانی تقاضے مرد کی ضرورت ہوا کرتے ہیں۔ عورت اگر ایسی بات کرتی ہے تو وہ آوارہ ذہن کی ہوا کرتی ہے۔''

زہراں کو شوہر کی اس رائے سے اختلاف تو تھا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی یہ صرف اس کے شوہر کی نہیں اس دھرتی پہ رہنے والے ہر مرد کی سوچ ہے۔ کنواری عورت کی تو بات ہی کیا اگر کوئی بیوی بھی جذبات سے مغلوب ہو کر شوہر سے کوئی اشارہ کر بیٹھے تو شوہر کی نگاہ میں معتوب ٹھہرتی ہے۔

☆......☆......☆

ان ہی دنوں قادر گاؤں آ گیا تھا۔ وہ اب ہمیشہ کے لیے گاؤں سیٹ ہونے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے حویلی میں اپنی پسند کے مطابق کئی تبدیلیاں کروا ڈالیں اور اپنے کمرے میں تو اس نے سارا سامان شہر سے نیا خرید کر ڈلوایا۔ شہر سے اس کے دوست بھی اکثر گاؤں میں آنے لگے۔ لمبی دعوتیں ہوتیں۔ کبھی باغوں میں شکار کھیلا جاتا۔ کبھی مچھلی یا مرغابی کے شکار کے لیے دریا کے کنارے پر جایا جاتا، غرض ایک گہما گہمی رہنے لگی تھی۔

قادر نے شہر میں رہتے ہوئے دوستیاں خوب بنائی تھیں۔ تعلیم میں اس کی دلچسپی واجبی ہی رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں نادر پڑھائی میں سنجیدہ تھا اور اس نے ادھر ادھر کی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

''ابا سائیں! مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔'' دوپہر کے کھانے پر جب چودھری عاشق اور زہراں اس کے ساتھ موجود تھے اس نے صرف باپ کو مخاطب کر کے سنجیدگی سے کہا۔

''کہو پتر! میں سن رہا ہوں۔''

''میں شادی کرنا چاہتا ہوں ابا سائیں۔''

''ارے کیا اچھی خبر سنائی ساڈے چن پتر نے۔'' ماں تو سن کر جھوم اٹھی، ابھی وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر قادر کی بات...... مکمل کہاں ہوئی تھی بولا۔

''شہر میں میرا ایک دوست ہے۔ بڑا اچھا خاندان ہے ان لوگوں کا۔ ماں باپ، بہن بھائی سب پڑھے لکھے ہیں۔ مجھے ان کی بڑی لڑکی رخشندہ اچھی لگتی ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو کیا کہہ رہا ہے قادر! برادری میں کتنی لڑکیاں ہیں اور تو برادری سے باہر ایک شہری لڑکی سے شادی کرے گا۔'' ماں حیرت اور غصے سے چلائی۔

''تم تو چپ کرو ناں اماں! میں ابا سائیں سے بات کر رہا ہوں۔''

''کہتی تو تمہاری ماں ٹھیک ہے، برادری میں بہت سی لڑکیاں تمہارے جوڑ کی موجود ہیں۔ باہر کی لڑکی لا کر ان کی ناراضی مول لو گے اور یاد رکھو بغیر برادری کے بندہ کچھ نہیں ہوا کرتا۔''

''اوہو ابا سائیں! چھوڑیں اس بات کو۔ برادری والوں کو تو یوں بھی جھگڑے اٹھانے کی عادت ہے آپ خود کہہ رہے ہو۔ بہت سی لڑکیاں ہیں اب شادی تو میں ایک سے ہی کروں گا۔ آپ خود سوچ کر بتاؤ۔ باقی سب ناراض ہوں گے کہ نہیں۔ تو بہتر یہی ہے میں اپنے لیے شہر سے پڑھی لکھی بیوی لاؤں جو میری سوچ کو سمجھ سکے۔ میری پسند کے مطابق نظر آ سکے۔ آپ لوگ تیار رہنا پرسوں شام کو ہم ان لوگوں کے ہاں چلیں گے۔'' اس نے فیصلہ بھی سنا دیا اور چند سالوں سے اس کا لہجہ ایسا ہی ہونے لگا تھا، برابری کرتا ہوا اور صرف اپنی سناتا ہوا۔

چودھری عاشق کسی سوچ میں گم خاموش تھا مگر زہراں دکھ چھپا نہیں پا رہی تھی۔ وہ برابر ناگواری کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے تمہارے لیے کب سے بہن فاطمہ کی لڑکی شمشاد پسند کی ہوئی ہے۔

''شم شاد، نام ہی سے پتہ چل جاتا ہے۔ کس طرح کی لڑکی ہوگی۔'' وہ مذاق اڑاتے ہوئے طنزیہ سی ہنسی ہنسا۔ پھر ہنسی روک کر ناگواری سے بولا۔

''آپ اپنی پسند نادر پر تھوپ دیں۔ مجھے تو اپنی پسند سے ہی شادی کرنا ہے اور میں سمجھتا ہوں۔ رخشندہ سے بہتر لڑکی میرے لیے کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔''

''ناں کیا بہتر ہے اس لڑکی میں نہ شرم نہ حیا، پرائے لڑکے کو پھانستے اسے لاج نہ آئی اور میں ایسی ویسی کو بہو مان لوں۔ ایسا قیامت تک نہیں ہو سکتا۔''

''آپ رخشندہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس دیہاتی سوچ کو ذرا پرے رکھیں۔ میں اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس نے پلیٹ پٹخ کر کہا۔

''ناں تو کیا کر لے گا میرا۔ اس چلتر کے بارے میں اس طرح بات کروں گی تو کیا مجھے گولی مار دے گا۔ لے پھر مار گولی۔ آج دنیا بھی دیکھے۔ ایک پرائی بیگانی کے لیے پتر نے ماں کا خاتمہ کر دیا۔ کھڑا کیوں ہے مار گولی۔'' ''ابا سائیں! سمجھاؤ اماں کو۔ خوامخواہ بات بڑھا رہی ہے۔''

''میں کیا سمجھاؤں۔ میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

☆......☆......☆

مگر انہیں بیٹے کی بات مانتے ہی بنی۔

نور جہاں نے بھی سن لیا تھا۔ قادر اپنی پسند سے شادی کر رہا ہے۔ برادری سے باہر وہ کوئی شہری لڑکی لا رہا ہے۔ ابا نے کڑھائی والا سفید کرتا اور نئی چادر کے ساتھ پگڑی بھی خوب کلف لگی پہنی تھی، پاؤں میں سچے

تلے والا ملتانی کھسہ تھا۔

اماں نے بھی نیا سوٹ پہنا تھا۔ بالوں کو دھونے کے بعد خوشبو دار تیل ڈال کر چوٹی بندھوائی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ بھی ڈالا تھا کانوں میں سونے کی بالیاں کلائیوں میں چھ چھ سونے کی چوڑیاں (سونا تو وہ ہمیشہ پہنے رہتی تھی مگر ہلکا پھلکا) اس کے کرتے کے بٹن بھی سونے کے تھے۔

نور اسی کے کمرے میں بیٹھی بڑی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

''آؤ پتر! کوئی صلاح کوئی مشورہ۔ ایسے بیٹھی ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہے۔'' چودھری عاشق نے بڑے خوشگوار موڈ میں اسے مخاطب کیا تھا۔

محبت بھرے لہجے میں بات تو خیر وہ اس سے کیا ہی کرتے تھے مگر اس وقت جب کہ اس کے اندر بھانبڑ جل رہے تھے چودھری کا یوں مخاطب کرنا شعلوں کو ہوا دے گیا۔ ذہن بے قابو ہو گیا۔ وہ چیخنے چلانے لگی۔

ایسے دورے اب اسے پڑتے ہی رہتے تھے۔ اس لیے کسی نے اس وقت اس کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔

''پاگل سمجھتے ہیں سب مجھے مگر میں پاگل نہیں ہوں۔'' ان کے جانے کے بعد وہ برآمدوں میں چکراتی رہی اور خود سے یہی بات کہتی رہی۔

پھر جنون کچھ کم ہوا۔ وہ تھک کر بیٹھ گئی اور اس کا ذہن غصے اور دباؤ کی حالت سے نکل کر ایک بار پھر کام کرنے لگا۔ اب اس حویلی میں ایک نیچ ذات، بے حیا فیشن کی ماری عورت بہو بن کر آ جائے گی۔ وہ اس کی ماں کی گدی سنبھالے گی۔ پھر میں کہاں ہوں گی۔

میرے باپ نے، میرے بھائیوں نے مجھے کونے میں پھینک دیا ہے۔ بڑے آرام سے انہوں نے مجھے یہ سمجھا دیا ہے۔ بیٹی کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ مگر کیا میں بھی اس بات کو مان لوں۔ نہیں۔ میں اس آنے والی سے زیادہ حیثیت کی مالک ہوں۔ میں اس کو حکمرانی نہیں کرنے دوں گی۔

جب وہ لوگ واپس آئے۔ وہ بڑے کمرے میں ہی بیٹھی تھی ابا سائیں اور اماں بالکل خاموش تھے۔ قادر خوب چہک رہا تھا۔

''تم پوچھو گی نہیں اماں سے۔ تمہاری ہونے والی بھرجائی کیسی ہے۔'' آج قادر بہت خوش تھا تا اس خوشی میں وہ سب کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

''ہونہہ بھرجائی، ایسی راہ والی بھیڑ بنی (برے کردار والی) چھیل چھدری (بے حیا) کو میں بھرجائی مانوں گی۔ کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔''

''دیکھ رہی ہے اماں اس کی زبان۔ یہ رخشندہ کے لیے، اس گھر کی ہونے والی مالکن کے لیے کیا کیا لفظ استعمال کر رہی ہے۔''

''ہاں سن لیا ہے میں نے اور میں حیران ہوں۔ اس نے اس چالاکو کو دیکھا تک نہیں۔ یہ کیسے ٹھیک بول رہی ہے۔'' ''اماں تو بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب تیری شہ ہے تو نے اسے سر چڑھا رکھا ہے پر کوئی بات نہیں۔

میں سیدھا کرلوں گا اسے۔"

"زبان سنبھال کر قادر! یہ دھی ہے میری اور یہ عزت آبرو ہے میری حویلی کی، یہ جس مرتبے پر بیٹھی ہے ایسی عورت کی صرف عزت کی جاتی ہے اس کی تو دعائیں لی جاتی ہیں۔" اس کا باپ بھی یقیناً وہاں سے بہت بد دل ہوکر آیا تھا۔

"یہ جس مرتبے پر بیٹھی ہے وہاں زبردستی بٹھائی گئی ہے اور یہ آج بھی باغی ہے۔ یہ ان میں سے نہیں جن کی عزت کی جاتی ہے اور جن کی دعائیں لی جاتی ہیں۔"

"کوئی بھی لڑکی اس مرتبے پر خوشی سے نہیں بیٹھا کرتی مگر تم کیا جانو۔تم کیا جانو۔" اس کی ماں رونے لگی تھی۔

"بس ہر وقت اس گھر میں سیاپے ہی پڑے رہتے ہیں۔خوشی کا موقع ہے مگر یہ صرف میری خوشی ہے اور میری خوشی کا یہاں کسی کو کوئی احساس نہیں۔" وہ پوری آواز سے چلا رہا تھا۔

"اور تو نے کی ہے میری خوشی کی پروا، تیری پسند دیکھ کر کلیجہ سڑ کے سوا ہوگیا تھا۔ جس دل سے شگن ڈالے ہیں۔ میں ہی جانتی ہوں، وہ سوکھی سڑی نک چڑھی فیشن کی ماری اس خاندان کی بہو بن کر آئے گی۔ اس سے پہلے قیامت کیوں نہ آگئی میرے ربا۔"

قادر پیر فرش پر غصے کے اظہار میں مار کر کمرے سے چلا گیا اور شہر سے لائے مٹھائی کے ٹوکرے دوسرا سازوسامان یونہی پڑے رہ گئے۔

نور جہاں کے قہقہے نے دور تک قادر کا پیچھا کیا۔ بڑے دنوں کے بعد اس نے کھلے دل سے قہقہہ لگایا تھا۔ جلتے توے پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے تھے۔

والدین سر پکڑے یہیں بیٹھے تھے۔ یہ کس مشکل میں ڈال دیا اس اتھرے منڈے نے۔ کہاں ہم عزت دار اونچی پگڑی والے زمیں دار آگے پیچھے نوکر چاکر اور وہ تین مرلے کے چوہے دان میں رہنے والے دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔ نیچے والی منزل پر بھی ماچس کی ڈبیاں اوپر ہی اوپر چڑھائی ہوئی ہیں اور نخرے دیکھو۔ ایسے لوگوں کو تو میں منہ ہی نہیں لگایا کرتا۔ صرف اس قادر کی وجہ سے وہاں بیٹھنا پڑا۔ باتیں سننا پڑیں ان لوگوں کی۔"

"کیوں سننا پڑیں باتیں، میں نے تو کسی کو منہ نہیں لگایا۔ کڑی کی ماں اور بہن بیٹھی رہی میرے پاس۔ خود ہی سوال کرتی رہیں۔ میں نے ہوں ہاں میں جواب دیے تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں اور میں تو جی صاف کہہ آئی ہوں۔ قادر کے لیے میں تو اپنی بھانجی لانا چاہتی تھی۔ وہ اونچی لمبی صحت مند ہے۔ تمہاری لڑکی تو مجھے فاقوں کی ماری لگتی ہے۔ بس جی غصے سے منہ پھول گئے ان کے پر مجھے کچھ کہہ سکتی تھیں بھلا۔"

اماں اپنا کارنامہ بیان کر رہی تھی، ابا کے ہونٹوں پر یہ سب سن کر مسکراہٹ پھیل گئی بولا۔

"شاباش۔ جی خوش کردیا۔ ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔"

"پر کیا فائدہ جی۔ کڑی تو ہمیں بیاہ کرلانی ہی پڑے گی۔" اماں نے آہ بھری۔

نور بالکل خاموش لاتعلق بیٹھی یہ سب سنتی رہی پھر انہیں یونہی باتیں کرتا چھوڑ کر باہر آگئی۔

☆......☆......☆

ایک مہینے بعد ان لوگوں نے قادر کی پسند رخشندہ کو انگوٹھی پہنانے جانا تھا۔ برادری کے بہت سے لوگوں کو ساتھ چلنے کی دعوت دے دی گئی تھی اور لڑکی والوں کو بھی کہلوا دیا گیا تھا۔

"ہم برادری کے ساتھ آرہے ہیں اور تمہارے اس چوہے دان میں برادری کو لاکر باتیں نہیں بنوانی۔ کسی اچھی جگہ ہم لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کرواؤ۔"

بھائی کی خوشی کا موقع تھا، نادر بھی آیا تھا۔ وہ اب جوان ہوچکا تھا۔ قادر کے مقابلے میں اس کا مزاج سنجیدہ اور شائستہ تھا اور وہ ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر اپنی رائے دینے کا عادی نہیں تھا۔ قادر کو اپنے زمین دار فیملی بیک گراؤنڈ پر فخر تھا۔ وہ شہر میں بھی ایک بڑے زمین دار کے اسٹائل میں رہنا پسند کرتا تھا۔

اس کے مقابلے میں نادر خاصا شہری اور رکھ رکھاؤ والا ہوچلا تھا اور جب اسے یہ پتا چلا کہ نور جہاں بھائی کی اس خوشی میں شرکت کے لیے نہیں جارہی تو اسے خاصی حیرت ہوئی تھی۔

"یہ تو رواج ہے پتر! وہ باہر نہیں نکل سکتی۔" اس کی اماں نے آہ بھر کر بتایا تھا۔

"تو کیا وہ ساری عمر اس حویلی کی چار دیواری میں قید رہے گی۔"

"کیا بات کرتے ہو، ان حویلیوں کی عورتیں عمریں ان ہی دیواروں کو دیکھتے گزار کر مٹی کا ڈھیر ہوجاتی ہیں۔ نور کی تو یہ خوش قسمتی ہے۔ اس نے پھر بھی کئی سال باپ کے ساتھ زمینوں کو سنبھالا ہے اور آزادی سے ہر جگہ آتی جاتی رہی ہے اور اس کا باپ اب بھی ہر بات میں اس کا مشورہ چاہتا ہے۔ پر وہ اب ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتی اور سچ تو یہ کہ اب اس کا دماغ پہلے کی طرح کام بھی نہیں کرتا۔"

"یہ بہن ہے میری جس کی عقل و ذہانت کے قصے میں اپنے دوستوں کو بڑے فخر سے سنایا کرتا تھا اور اس سے ملے بغیر ہی وہ میری آپا سے متاثر رہتے تھے۔"

"ہاں پتر! قسمت نے اس کے ساتھ کچھ چنگا نہیں کیا۔ بس کیا کہیں ہم، رب کی رب جانے۔"

ماں سے بات کرنے کے بعد وہ نور کے کمرے میں آگیا۔ پچھواڑے کھلنے والی کھڑکی کھولے وہ ایک ہی پوزیشن میں کھڑی پتا نہیں کیا دیکھ رہی تھی اور اتنی محو تھی کہ اسے نادر کے آنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ نادر بھی خاموشی سے کھڑا اس کی محویت نوٹ کرتا رہا پھر واپس لوٹ آیا۔

☆......☆......☆

چار مہینوں کے بعد رخشندہ دلہن بن کر اس حویلی کی ہونے والی مالکن بن کر یہاں آئی۔ وہ دیہاتی زندگی صرف فلموں اور ڈرامے کی حد تک ہی دیکھتی آئی تھی۔ حقیقت ان فلموں ڈراموں سے مختلف اور پھیکی سی تھی۔

"کیا ہم شہر میں گھر بنا کر نہیں رہ سکتے۔" شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے شوہر سے کہا۔

"بالکل نہیں، یہ خیال بھی اپنے دماغ سے نکال دو۔ یہ زمینیں، یہ جائیدادیں میری ہیں۔ ان مزارعوں کا

میں مالک ہوں اور تم کہتی ہو، میں حویلی چھوڑ کر شہر جا بیٹھوں۔"

"شہر یہاں سے اتنا دور تو نہیں، ہم یہ سب وہاں بیٹھ کر بھی کنٹرول کر سکتے ہیں۔"

"بس بس، اپنے مشورے اپنے پاس ہی رہنے دو۔ تم لوگوں کو کیا پتہ زمین کی ملکیت کیا ہوتی ہے۔ جتنا تم لوگوں کا گھر ہے، اتنا تو ہماری مرغیوں کا ڈربہ ہے۔"

"قادر......" اس نے احتجاج کیا۔

"سچ سننے کی ہمت ہونا چاہیے اور پھر وہ تو تمہارا ماضی تھا۔ اب تو تم میری بیوی، اس حویلی کی مالکن، اس گاؤں کی بھی مالکن ہو اور تمہیں کیا چاہئے۔"

"میرا یہاں جی نہیں لگتا۔"

"جی لگانے کی کوشش کرو اور یہ بھول جاؤ کہ تم یہ سب چھوڑ کر شہر جا کر بیٹھ سکتی ہو۔ اس جائیداد کا میں اکیلا وارث ہوں۔ نادر بھی حصے دار ہے۔ اگر وہ یہاں آ گیا اور یہ سب اس نے اپنے ذمہ لے لیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"یہ کمی لوگ اسی کو آقا مانتے ہیں جو ڈنڈا اٹھائے ان کے سر پر سوار رہتا ہے۔ تمہیں یہاں کوئی کمی نہیں آئے گی جو چاہے کھاؤ پیو، عیش کرو۔ اپنے گھر والوں کو بھی بلا کر مہمان کرو تا کہ انہیں بھی پتہ چلے کہ ان کی بیٹی کا نصیب کتنا اونچا ہے اور تم دل چھوٹا نہ کرو، کبھی کبھار ہم شہر کا چکر لگا لیا کریں گے میں تمہاری پسند کا خیال رکھوں گا مگر اس کے لیے تمہیں بھی میری مرضی پر چلنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، تمہاری خاطر مان رہی ہوں، ورنہ سارا دن خالی بیٹھ بیٹھ کر میں تنگ آ جاتی ہوں۔ ٹی وی آخر کتنی دیر دیکھا جا سکتا ہے۔ تمہاری اماں کی اپنی مصروفیات ہیں اور وہ تمہاری بہن...... وہ نجانے خود کو کیا سمجھتی ہے۔ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"چھوڑو اس کی، اس کا دماغ تھوڑا کھسک گیا ہے۔ اب نہ تو وہ کسی کی سمجھتی ہے، نہ سنتی ہے۔ تم چھوڑو اسے اور حکومت کرنے کی عادت ڈالو۔ گاؤں کی عورتیں جب اماں کے پاس آتی ہیں تو تم بھی جا کر اماں کے برابر میں بیٹھ جایا کرو۔ میری باتیں سمجھنے کی کوشش کرو، کل کو نادر کی بیوی نے بھی اس گھر میں آنا ہے اور اس کے لیے اماں یقیناً برادری کی کوئی لڑکی لائیں گی جو ان سب باتوں سے پہلے ہی واقف ہوگی۔ ایسا نہ ہو، وہ آ کر حویلی پر چھا جائے اور تم پیچھے رہ جاؤ۔" یہ بات اس کی بیوی کے بھی دل کو لگی۔ کچھ سوچ کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور آنے والے دنوں میں اس نے اس نصیحت پر عمل بھی خوب کیا۔ اماں کی جگہ بڑی تیزی سے اس نے سنبھال لی اور قادر نے ابا سائیں سے زمینوں کے تمام بکھیڑے اپنے سر لے لیے۔ اب عورتیں مسئلے مسائل کے حل کے لیے رخشندہ کے پاس آتی تھیں۔ اماں کو راج گدی اسے یوں آرام سے سونپ دینا کبھی گوارا نہ ہوتا۔ اگر بیٹا اور شوہر ساتھ دیتے۔

آنے والے دنوں میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ نادر شہر سے بہت جلد، جلدی گاؤں آنے لگا۔ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی، وہ بڑی خاموشی سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔

اس نے گھر کے کسی فرد سے اس بدلی ہوئی صورتحال پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ ہر ایک سے اچھے طریقے سے بات کرتا تھا اور بہت پرعزم دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نور سے بھی بات کرنے کی کوشش کی مگر نور کو مرد سے متعلق کسی رشتے پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ اس کو بھی باپ اور قادر کی طرح ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہیں دیا کرتی تھی۔

"ہاں، اب اس نے ماں کی محبت کو پہچان لیا تھا۔ جب اپنی سوچوں سے گھبرا جاتی تھی، ماں کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیتی تھی۔

پھر چوہدری عاشق بیمار پڑ گیا اور اماں کی حیثیت بھی ابا کی بیماری کے ساتھ ہی معزول ملکہ کی سی ہو گئی۔ اب اس کا کام صرف اور صرف ابا کی دیکھ بھال اور بیٹی کی دلجوئی رہ گیا تھا۔

اماں اب رخشندہ کے سامنے بھی کم ہی آتی۔ وہ اماں کو ایسی ڈائن لگنے لگی تھی جس نے آتے ہی یہاں کی ہر خوشی کو نگل لیا۔ رخشندہ امید سے ہوئی تو قادر نے سارے پنڈ میں مٹھائی بانٹی۔

شہر کی بہت اچھی ڈاکٹر کے پاس اس کا نام لکھوایا اور ماں سے بولا۔ "اب تمہیں میری بیوی کے ساتھ اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔ تم لوگوں کی وجہ سے وہ بہت اداس رہتی ہے۔"

"ہم لوگوں کی وجہ سے؟" زہراں چپ نہیں رہ سکی۔

"ہاں۔ تم لوگوں نے ہمیشہ سے اسے ناپسند کیا ہے۔ وہ اہمیت دی ہی نہیں جو بڑی بہو کی ہوا کرتی ہے۔ وہ بے چاری بہت حساس، پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ دل پر لیتی ہے یہ سب۔ اب جو اس کی حالت ہے، اس کے لیے خوش رہنا اور آرام کرنا بہت ضروری ہے۔ تم اس کے ساتھ اپنا رویہ بدلو اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کا بہت خیال بھی رکھا کرو۔"

"سن وے قادر! تیرے جیسے مرد ہی ہوا کرتے ہیں، جنہیں ان کی گھر والیاں بندروں کی طرح اشاروں پر نچاتی ہیں۔ تو اس کے ہاتھوں پاگل بن گیا، بس یہی کافی ہے۔ سارے گھر پر وہ چھائی ہے تو اس لیے کہ تیری شہ اس کے ساتھ ہے۔ تو نے مجھے اور اپنے ابے کو ہر معاملے سے پرے کر دیا ہے۔"

"اماں! آخر یہ سب ایک دن بڑے بیٹے اور بڑی بہو کی حیثیت سے ہمیں ہی سنبھالنا ہے۔ آج آپ دونوں ہمارے سر پر ہو، ہم آپ کے سامنے یہ سب سیکھ جائیں گے تو کیا یہ اچھا نہیں۔"

"مجھے پاگل نہ بنا پتر! جا چلا جا، جا کر بیوی کے ہاتھ پاؤں دبا، تیرے جیسوں کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔"

اور قادر ادب لحاظ بھول کر اونچی آواز میں انہیں باتیں سناتا اٹھ کر چلا گیا۔

رخشندہ کو اس نے واقعی ہتھیلی کا چھالہ بنا ڈالا۔ یہاں اتنی ملازمائیں تھیں پھر بھی تسلی نہ تھی۔ شہر سے بھی اس کی اماں رہنے کے لیے آ جاتی، کبھی بہن اور خوب عیش تو کرتی ہی تھیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ حکمرانی جوان کے لیے کسی خواب سے کم نہیں تھی، انہیں بہت اچھی لگتی۔ وہ گاؤں کی ہر عورت کے ساتھ رعب اور نخرے سے کچھ اس طرح بات کرتیں کہ دیکھنے والے کو ہنسی چھپانا مشکل ہو جاتی۔

نادر کے چکر لگتے ہی رہتے تھے ابا کو شہر لے کر جانا، ڈاکٹر سے چیک اپ کروانا سب اس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

ان ہی دنوں جب رخشندہ کی بہن شمسہ ادھر آئی ہوئی تھی، وہ بھی آ گیا۔ شمسہ بھی بڑی بہن کی طرح چھوٹے قد اور بے حد دبلے جسم اور سانولے رنگ کی مالک بظاہر عام سی مگر بہت طرار لڑکی تھی۔ ان دونوں کو حویلی میں اکٹھا رکھ کر قادر کے ذہن نے ایک بات سوچی۔ وہ بیوی سے بولا۔

''اگر میرے چھوٹے بھائی نادر کی شادی شمسہ سے ہو جائے تو یہ بڑا اچھا ہوگا۔ حویلی میں کوئی برادری کی عورت نہیں آئے گی۔ تم دونوں بہنیں ہی رہو گی اور اس سے ہمارے لیے بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔''

''تمہاری اماں تو کبھی نہیں مانے گی۔''

''اماں تو میری اور تمہاری شادی پر بھی راضی نہیں تھی، پر ہماری ضد پر اسے ایسا کرنا ہی پڑا۔ اب اگر نادر بھی ایسی ضد شروع کر دے تو بھلا پھر اماں بے چاری کیا کر لے گی۔''

''لو بھلا نادر ایسی ضد کیوں کرنے لگا؟''

''میری بھولی، میری معصوم بیوی! یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم ہو کہ سمجھ ہی نہیں رہیں۔ آج کل شمسہ ادھر آئی ہوئی ہے۔ نادر بھی موجود ہے۔ اسے کہہ دو، ذرا تیار ہو کر رہا کرے۔ نادر کے لیے کھانا وغیرہ خود نکالا کرے۔ اس سے دور دور رہنے کے بجائے دوستی کرلے۔ جوان منڈا ہے پھر شمسہ ذہین لڑکی ہے۔ میرا خیال ہے، ہمیں زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا گا۔''

''ہاں واقعی، یہ سب تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ آپ بڑی عقل والے ہو، دور کی سوچتے ہو۔''

''حکمرانی کرنا اتنا آسان نہیں ہے، ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے خصوصاً اس وقت جب آدھی جائیداد کا مالک کوئی دوسرا ہو۔''

رخشندہ نے تو اسی روز بہن کے سامنے ساری بات رکھ دی اور اسے اعتراض بھلا کیوں ہو سکتا تھا۔ نادر تو قادر سے زیادہ خوبصورت، خوش مزاج اور پڑھا لکھا تھا۔

☆......☆......☆

اس کے سامنے ایک لڑکی بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی، رنگوں سے سجی خوشبوؤں میں نہائی۔ اس لڑکی میں کوئی خوبصورتی تو نہیں تھی مگر وہ پھر بھی خوبصورت دکھائی دیتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں خواب تھے، اس پر کسی کی محبت کا شفق رنگ تھا اور اس کا انگ انگ خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ اس کی بھاوج بن کر آئی تھی، وہی بھائی جو کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا، دیوانہ تھا بیوی کا۔ بہت کچھ ایسا نہ چاہتے ہوئے بھی نور جہاں دیکھ لیتی کہ پھر بستر پر لیٹنا مشکل ہو جاتا۔ وہ تو سمجھی تھی۔ شاہ زمان کی بے وفائی کے بعد اس کا جسم اب کوئی تقاضا نہیں کرے گا مگر یہ اس کی بھول تھی۔ وہ جوان لڑکی تھی اور جسم کے تقاضے اپنی جگہ تھے پھر اس کے پاس کوئی کام بھی تو نہ تھا۔ وہ اس چار دیواری کے ساتھ ساتھ اس کمرے میں بھی قید ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا، ان دیواروں پر چہرے ابھر آئے ہیں اور وہ چہرے اس کی جانب اشارے کر کے

باتیں کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ قہقہے جب زیادہ بلند ہو جاتے تو وہ ہاتھ میں آئی کوئی بھی چیز اٹھا کر دیوار پر دے مارتی۔ اونچی آواز میں ان شکلوں کو برا بھلا کہتی اور اس کے کمرے میں ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔

کوئی پانی پلانے کی کوشش کرتا تو کوئی گرم دودھ کا پیالہ منہ سے لگاتا۔ اماں جھٹ حکیم جی سے بنوایا معجون اس کے منہ میں ڈالنے لگتی۔

''کچھ نہیں ہوا مجھے، میں بیمار نہیں ہوں۔ بس جب یہ شکلیں میرا مذاق اڑاتی ہیں پھر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔''

''اچھا اچھا......بس بس چپ۔'' اماں ان ملازم عورتوں کے سامنے اسے بولنے بھی نہ دیتی کہ یہ بات اپنے تک رکھتی کہ ملازمائیں، ابھی حویلی سے باہر نکلیں گی، سارے گاؤں میں مشہور کریں گی۔ نور جہاں کا دماغ اس کے قابو میں نہیں رہا اور اماں اس دن سے بڑا ڈرتی تھی۔

نادر شہر سے آیا۔ اماں نے یہ ذکر اس کے سامنے بھی رکھ دیا۔

''اسے کمرے سے نکالا کرو۔ تم لوگوں نے تو پتہ نہیں اسے کن گناہوں کی سزا دے ڈالی ہے۔''

''مجھ پر الزام نہ رکھ پتر! میں تو ایک مجبور، بے بس ماں ہوں اور اس کے لیے تب سے رو رہی ہوں جس دن یہ پیدا ہوئی تھی۔ میرا بس چلتا، میں اسے اسی دن سے کمرے میں قید کر ڈالتی اور کبھی باہر نہ نکلنے دیتی پھر یہ ان دیواروں کی عادی ہو جاتی، یوں کرلاتی تو نہ رہتی۔ پر تیرے باپ نے میری ایک نہیں سنی۔ اسے اڑنا سکھایا پھر پر کاٹ کر ادھر قید میں ڈال دیا۔''

اماں رو رہی تھی، نادر یہ سب سنتے ہوئے ماں کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''تیرے بڑے بھائی نے بھی ظلم میں باپ کا پورا ساتھ دیا ہے۔ اسے تو پہلے دن سے ہی نور جہاں سے چڑ سی رہی ہے۔ کبھی بہن سمجھا ہی نہیں۔ بس اس کو ایسا لگتا تھا، وہ اس کے زمین داری میں دخل دیتی ہے، اپنی عقل کا استعمال کرتی ہے۔ بس یہ بات ہی اس کو پسند نہ آئی۔ دیکھ لو اس حویلی میں رہتے ہوئے کبھی اس کے کمرے میں جھانکتا بھی نہیں۔''

''اس کا دماغ پہلے ہی خراب تھا، بیوی آئی تو ایسی جس نے ساری کسر ہی پوری کر دی۔

بس ہاتھ جوڑ کر تم سے اتنا کہنا ہے، تم مجھے یہ دکھ نہ دینا، تم ایسا نہ کرنا۔''

ماں جس نے جنم دیا تھا، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے ہر شے سے قاصر وجود کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ پاؤں پاؤں چلنا سکھایا، اپنا لہو پلا کر اس کے جسم کو پروان چڑھایا۔ آج روتی آنکھوں کے ساتھ التجا کر رہی تھی۔

''اماں! تم ادھر بیٹھی ہو'' نادر کے کچھ کہنے سے پہلے قادر بڑی عجلت میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''تو پھر کہاں بیٹھوں۔'' ماں نے کچھ زچ ہو کر کہا۔

''اوہو، میں کہہ رہا ہوں۔ رخشندہ کو ابھی شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ حالت اچھی نہیں ہے، اس کا خیال رکھو۔ اماں! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا مگر تم میری سنتی ہی نہیں۔ اس کی ماں بہنیں ہی ہیں جو آ کر دیکھ بھال کرتی ہیں۔ تم اور تمہاری وہ مہارانی بیٹی جسے اپنے کمرے سے نکلنا ہی پسند نہیں

ہے، اس نواب زادی سے بھی کہہ دو۔ بھابھی کا خیال رکھا کرے رخشندہ کئی بار گلہ کرتی ہے۔ تم ماں بیٹی نہ اسے عزت دیتی ہو نہ اس سے محبت کرتی ہو۔"

"اس سے محبت کرنے کے لیے تم کافی نہیں ہو کیا۔"

"اس وقت تو لڑائی جھگڑے چھوڑ دو، ایسے وقت میں تو دشمن بھی پگھل جاتے ہیں۔"

"قادر! تو نے ہماری طرف سے آنکھوں پر پٹی کیوں باندھ لی ہے۔ کیا تجھے یہ دکھائی نہیں دیتا۔ تیری بیوی کو مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں۔ تیری موجودگی ہی میں ایسا ہوا کہ میں تیرے کمرے میں آئی اور جس کی باتوں کی آواز کمرے سے باہر تک آرہی تھی، وہ مجھے دیکھ کر سوتی بن گئی۔"

"پتہ نہیں کیسے کیسے وہم پال رکھے ہیں۔ سچ کہتی ہے رخشندہ، اس حویلی کی عورتیں نارمل ہی نہیں ہیں۔" وہ دانت پیس کر بولا اور واپس مڑ گیا۔

اس کے کمرے میں رخشندہ کے علاوہ رخشندہ کی ماں اور بہن شمسہ بھی موجود تھیں۔ ابھی ابھی وہ اسے شہر سے لایا تھا۔ بچے کی پوزیشن ڈاکٹر نے بتایا تھا ٹھیک نہیں ہے، اسی باعث وہ جنس بتانے سے بھی قاصر تھی۔ ویسے قادر کو پورا یقین تھا اس کے گھر بیٹا ہوگا۔

اس نے کچھ تعویذ بھی منگوا کر بیوی کو دیے تھے اور ایک عالم سے دعا بھی کروائی تھی جس نے لکیریں کھینچ کر کوئی نقشہ سا بنایا تھا اور کہا تھا، تو فکر ہی نہ کر بچہ، تیرے گھر میں لڑکے ہی لڑکے آئیں گے۔" اور قادر ہزار ہزار کے کئی نوٹ نذرانہ دے کر چھاتی چوڑی کیے اس کے حجرے سے باہر آیا تھا۔

جب رخشندہ کو آخری مہینہ لگا تو اسے میکے میں بھیج دیا گیا کہ وہاں سے بروقت ڈاکٹر کے پاس پہنچنا آسان تھا۔ دو ملازمائیں بھی خدمت کے لیے ساتھ کر دی گئیں اور کھانے پینے کا کوئی مسئلہ تو تھا نہیں، قادر نے اسے اتنے پیسے دیے تھے کہ وہ ہی نہیں، اس کے گھر والے بھی ان پیسوں پر دو تین ماہ عیش کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر کی دی ہوئی تاریخ میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ رات کو اچانک ہی شہر سے فون آ گیا۔ رخشندہ اسپتال میں تھی۔ ڈاکٹر نے آپریشن کا فیصلہ کیا تھا۔

اماں بھی یہ سن کر ساتھ چلنے کو بے چین ہو رہی تھی مگر قادر نے کہا تھا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں، بس میں جلد ہی آپ کو پوتا آنے کی خوش خبری فون پر دے دوں گا اور پھر خود گاؤں آ کر آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

ساری رات اماں صحن اور برآمدے کے چکر کاٹتی رہی، جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ جی بیٹھا جا رہا تھا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے، اللہ خیر ہی کرے۔ اب تک قادر نے فون کیوں نہیں کیا۔" ماں کو یوں پریشان دیکھ کر نور جہاں بھی برآمدے میں آ بیٹھی تھی۔

فون تو نہیں آیا، صبح سویرے قادر خود چلا آیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چال میں تھکن ہی تھکن تھی۔

"خیری صلا۔ قادر! کیا ہوا ہے۔ تو ایسے کیوں آیا ہے پتر! جلدی بتا، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ وہ ہٹی تو ٹھیک ہے نا۔"

"اسے کیا ہونا ہے، اماں! حرام زادی کھا کھا کر لال سرخ ہو رہی ہے۔" وہ پھٹ پڑا تھا۔

"پھر...... پھر تو ایسے کیوں آیا ہے۔"

"کڑی جنی ہے ماں اس نے۔"

"ہائے میں مر گئی۔" اماں نے دل تھام لیا اور وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔

"کیا منہ دکھاؤں گا میں گاؤں والوں کو۔ سر نیچا کر دیا میرا۔ ہر کوئی ہنسے گا۔ چوہدری کے گھر پہلی پہلی وار ہی کڑی پیدا ہوئی ہے۔" وہ بولتا جا رہا تھا۔

اماں اس کی سن کہاں رہی تھی، اسے اپنا وقت یاد آ رہا تھا۔ اس کے ہاں بھی پہلی پہلی وار میں ہی کڑی پیدا ہوئی تھی، وہ شہر نہیں لے جائی گئی تھی۔ یہیں ایک کمرے میں دائی نے اس کی مشکل حل کر کے اسے ایک اور آزمائش کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی ساس یہ سنتے ہی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے، کمرے میں آئی تھی اور زہراں کی حالت نظر انداز کرتے ہوئے اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔

اگر زہراں کی ماں اس موقعہ پر موجود نہ ہوتی تو یہ عورت شاید اسے جان ہی سے مار دیتی جو دو بیٹوں کی ماں تھی اور اسے فخر تھا، اس نے کسی بیٹی کو جنم نہیں دیا۔ نور جہاں کی پیدائش کے بعد حکم ملا تھا کہ زہراں اب اس حویلی میں نہیں رہ سکتی۔ اپنی ماں کے ساتھ واپس چلی جائے اور اب اس کے شوہر کی دوسری شادی کروائی جائے گی۔

پورے دو مہینے بچی کے ساتھ میکے میں رہی تھی اور یہ سارا عرصہ اس نے روتے ہوئے گزارا تھا۔ اور ساس نے اس شرط پر اسے اپنے گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھنے کی اجازت دی تھی کہ آئندہ برس وہ بیٹے کی ماں بنے گی۔ دوسری صورت میں اسے پھر واپس جانا ہوگا۔

اور یہ عرصہ جس طرح زہراں نے سولی پر ٹنگے گزارا، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا، پوتی تو اپنی بھولی صورت کی وجہ سے ان کے دل میں اتر گئی۔ باپ اور دادی کی لاڈلی بن گئی مگر زہراں کو اس گھر میں جگہ تب ہی ملی جب قادر اس کی گود میں آ گیا۔

وہ بچہ جس کی آمد نے اسے فرش سے اٹھا کر ایک بار پھر عرش پر بٹھا دیا۔ اسے بہت عزیز نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ وہ تو ہر دم اس کے واری صدقے جاتے نہ تھکتی تھی۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرنا زہراں نے اپنا ایمان بنا لیا تھا۔ وہ اس کی جان اس کی زندگی تھا۔

آج پھر اس حویلی کی ایک بہو نے پہلی پہلی وار ہی بیٹی پیدا کرنے کا جرم کیا تھا اور اس کا شوہر جو ابھی سال پہلے اسے بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لایا تھا اور جس نے آج کے دن سے پہلے تک اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔

آج اس کے لہجے میں اس عورت کے لیے بے زاری اور نفرت اس قدر بھری کہ وہ گالیوں پر اتر آیا۔

"کیا میں بھی اپنی ساس کی طرح کروں گی۔" زہراں نے سوچا اور سر خود بخود نفی میں ہل گیا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ ایک لفظ بھی بولے بغیر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی جب کہ غصے اور شرمساری کے احساس میں بیک وقت بھیگتا قادر یہیں کھڑا ماتم کرتا رہا۔

نور جہاں اسے بغور دیکھ رہی تھی اور کچھ ایسا سوچ رہی تھی کہ چہرے کے زاویے بار بار بدل رہے تھے
پھر قادر بھی اپنے کمرے میں چلا گیا مگر وہ یہیں برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی، ماں کے ساتھ وہ بھی ساری رات جاگی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆......☆......☆

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اماں اور ابا سائیں نماز سے فارغ ہونے کے بعد صحن میں نکل آیا کرتے تھے، ملازمائیں جاگ چکی ہوتی تھیں اور زندگی کی گہما گہمی شروع ہو جاتی تھی مگر آج ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر سو سوگ کی کیفیت تھی اور یہ سوگ کیوں تھا، اس لیے کہ آج ایک لڑکی اس دنیا میں آئی تھی۔

وہ جو نسلوں کی امین تھی جس کے دم سے کائنات میں رنگ تھے جو ہر ہر قدم پر مرد کی ضرورت تھی۔ اس کی طاقت تھی اور اس کے لیے سرور کا پیغام تھا۔ آج وہ دنیا آئی تھی اور ہر شے سوگوار تھی اور نور جہاں نے ایک بار پھر مرد کی سنگ دلی اور بے وفائی کو دیکھا تھا۔

بیٹے کی آس تھی تو وہ عزیز تھی جس کی کوکھ میں بیٹا پل رہا تھا۔ وہ آس ٹوٹی تو آج دس دن ہونے کو آئے، وہ شہر اس کی خبر لینے بھی نہیں گیا تھا۔

گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی اور یہ تو ہر کوئی دیکھ چکا تھا۔ چوہدری قادر بیٹے کے لیے کس قدر بے تاب تھا۔ اب بیٹی کی اطلاع سن کر جو بھی آتا ماتمی صورت بنائے ہی آتا اور قادر ماں پر چلاتا۔

''تم ان عورتوں کو منع کیوں نہیں کرتیں، کیوں یہ تماشے کے لیے یہاں اکٹھی ہو جاتی ہیں، کوئی انہونی تو نہیں ہوئی۔ آخر دنیا میں لڑکیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔'' (پتہ نہیں یہ بات خود اس کی اپنی سمجھ میں کیوں نہیں آتی تھی)

ان دنوں نور جہاں جو پہلے ماں سے کچھ نہ کچھ بات کر لیا کرتی تھی، بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ وہ کچھ سوچتی رہتی تھی اور بے چین دکھائی دیتی تھی۔ خصوصاً جب قادر چیختا چلاتا، بات بات پر غصہ کرتا تو اس کی بے چینی اور بھی بڑھ جاتی۔

سوا مہینہ پورا ہوا تو اماں ابا اور قادر جا کر رخشندہ اور بچی کو گاؤں لے آئے۔ تھکی تھکی شرمندہ سی وہ عورت جس نے پچھلے کئی ماہ شوہر کے دل پر اور اس گھر پر حکومت کی تھی۔ بچی کو ملازمہ نے اٹھا رکھا تھا اور اس کا سر بھی جھکا ہوا تھا کہ وہ مالکوں کے رویے کے مطابق چلنے کی عادی تھی۔

نادر کسی کمرے سے نکلا اور اس نے بڑھ کر بچی کو ملازمہ کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس کی پیشانی کو چوما اور نور کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''دیکھو تو آپا! اس کی صورت تو بالکل تم جیسی ہے۔''

نور جہاں جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی اور بچی کی صورت دیکھے بغیر ہی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

وہ جو وجود آیا تھا، وہ ابھی بہت معصوم اور بے خبر تھا۔ اسے پتا نہیں تھا، اس کی آمد نے اس کی ماں کی

زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ وہ بھوک لگنے پر بلک بلک کر روتی تھی، ماں کی گود کی گرمی، کسی کا شفقت بھرا لمس اسے مسکرانے اور ہاتھ پاؤں چلانے پر مجبور کر دیتا۔

نور نے اس کی صورت دیکھی تھی، اس روز بچی کے پیٹ میں کچھ تکلیف تھی، وہ درد سے رو رہی تھی۔ ملازمہ اسے اٹھائے برآمدے میں چکر لگا رہی تھی، اس کے رونے سے بے چین ہو کر نور کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

واقعی نادر نے سچ کہا تھا، اس کی صورت واقعی نور جہاں سے ملتی تھی اور ملنی بھی چاہیے تھی۔

ملازمہ کچھ دیر اسے لیے ٹہلتی رہی پھر اماں کے برابر والے کمرے میں رکھے، اس کے جھولے میں ڈال دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ننھی گڑیا سو گئی جس کا نام ابھی تک نہیں رکھا گیا تھا ملازمہ کے وہاں سے جاتے ہی نور نے ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ دیر سن گن لینے کی کوشش کی پھر دبے قدموں اس کمرے کی طرف بڑھی۔

چند لمحوں کے فاصلے پر وہ بچی کے جھولے پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی لیکن وہ جو عزم لے کر آئی تھی، وہ متزلزل نہیں ہوا تھا۔

''اب اس حویلی میں ایک اور نور جہاں نہیں آنی چاہیے۔ جو اذیت میں اٹھا رہی ہوں، وہ تم کیوں اٹھاؤ۔ ننھی گڑیا جاؤ، اس دنیا سے دور چلی جاؤ۔ اس دنیا کو تمہاری ضرورت نہیں۔ تم زندہ رہیں تو میری طرح دکھ اٹھاؤ گی۔ جاؤ تم موت کی آغوش میں، ہمیشہ کے لیے سو جاؤ۔'' اس نے بچی کے گلے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کا گلا گھونٹ کر اسے دکھ بھری زندگی سے نجات دلا دینا چاہتی تھی۔ جب ہی اس کے شانے پر کسی نے سختی سے ہاتھ رکھا اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

''یہ کیا کرنے چلی تھیں آپا!'' آنے والا نادر تھا اور بہت حیرت اور دکھ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

''تم ایک اور لڑکی کو اذیت بری زندگی بخشنا چاہتے ہو۔ تم ایسا کر سکتے ہو کیونکہ تم مرد ہو۔ تم ہمارے دکھوں کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے مگر نادر! یہ زندگی کانٹوں بھری ہے۔ یہ آگ کا جلتا بھانبڑ ہے۔ اللہ کا واسطہ دیتی ہوں رحم کرو اس بچی پر، اسے اس دنیا سے جانے دو۔'' وہ بھائی کے سامنے کھڑی ہاتھ جوڑے فریاد کر رہی تھی۔

قادر نے اسے گلے لگا لیا۔ اس کے سر پر بوسہ دیا اور بولا

''اب ایسا نہیں ہو گا آپا!''

''ایسا ہی ہو گا۔ اس کے جوڑ کا بھی کوئی نہیں۔ تمہاری بھی شادی نہیں ہوئی۔ کب تمہارا بیٹا پیدا ہو گا جو اس کا حق دار کہلائے گا اور وہ اس سے کئی برس چھوٹا ہو گا۔ جب تک جوان ہو گا، یہ اس کے نام پر بیٹھی رہے گی وہ جوان ہو کر اپنی پسند سے کم عمر بیوی لے آئے گا اور اسے کوئی بھی ظلم نہیں سمجھے گا۔ تو بس نادر! تم رحم کرو اس پر۔''

''آپا...... آپا...... میں آ گیا ہوں نا، میں وعدہ کرتا ہوں، ہم دونوں مل کر جہالت کے یہ اندھیرے دھو ڈالیں گے۔ تم پڑھی لکھی ہو آپا! ایک فرسودہ رسم کی بنا پر حویلی میں قید کر دی گئی ہو مگر میں تمہاری آواز کے ساتھ آواز ملاؤں گا۔ ہم دونوں مل کر جہالت کی اس سوچ کو بدل ڈالیں گے۔''

”کیا یہ ممکن ہے نادر!“ وہ ٹھٹکی تھی۔

”یہ تو بہت آسان ہے آپا! پتہ ہے مرد ہر رشتے میں عورت کا محتاج رہا ہے مگر عورت نے اس بات کو سمجھا ہی نہیں، وہ اس کے ساتھ جڑے رشتوں سے ہی خود کو محفوظ سمجھتی رہی ہے۔ تم بتاؤ آپا! کیا بچی کی پرورش ماں نہیں کیا کرتی اور ماں عورت ہوتی ہے، وہ پہلے دن سے مرد کو یہ کیوں نہیں سمجھاتی کہ عورت ہر رشتے میں محترم ہے، وہ خود ہی اپنے حسن کو بے مول کیوں کر دیتی ہے، ہم نے اس بات کو ختم کرنا ہے، ہم نے عورت کو سمجھانا ہے، اپنی عزت کروانا سیکھے اور اپنے اسکول میں آنے والے ہر لڑکے کو یہ سبق دینا ہے کہ عورت تم سے کمتر نہیں ہے، اس کی عزت اور حرمت تم پر فرض ہے۔“

وہ کہے جا رہا تھا، نور جہاں حیرت سے سن رہی تھی۔ یہ حقیقت ہی تو تھی، مرد کو اعلا رتبے کا احساس یہ عورت ہی تو دلاتی ہے، بیٹے کو بیٹی پر فوقیت عورت ہی تو دیتی ہے۔

”پتا ہے آپا! میری سوچ کو اس رخ پر ڈالنے والی بھی عورت ہے، میری پروفیسر میری محترم مس ثریا ربانی انہوں نے مجھے...... ایک عام سطحی سی سوچ رکھنے والے نوجوان سے ایک اچھا انسان بنا دیا، انصاف کی جو شمع انہوں نے مجھ میں روشن کی ہے، میں اسے بجھنے نہیں دوں گا۔“

آپا! مجھے بہت سے کام کرنے تھے، اس لیے میں خاموش تھا مگر مجھے یہ سب تم سے کہنا تو تھا، شکر ہے ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ ہم دونوں بہن بھائی مل کر انسانیت کے لیے کام کریں گے، آپا! میں تمہیں تمہاری جائداد میں سے حصہ بھی دلاؤں گا اور تمہاری شادی بھی میں ضرور کراؤں گا۔“

”نہیں نادر! سب سے پہلے تو مجھے اس تعلیم کو عام کرنا ہے جس کے بارے میں ابھی ابھی تم نے بات کی ہے۔ نادر! تم نے ٹھیک کہا ہے، عورت نے کبھی دوسری عورت کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اس قیامت کے ٹوٹنے سے پہلے جب میں آزاد تھی، تب غریب، بے بس مزارعوں پر حکمرانی ہی میری زندگی کا مقصد تھی، میں بہت کچھ کر سکتی تھی، میں نے پھر بھی کچھ نہیں کیا، مگر اب مل کر نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور جب مہتاب بڑی ہوگی تو یہ بھی ہمارا ساتھ دے گی۔“ اس نے بھتیجی کو گود میں اٹھالیا۔

”کیا اس کا نام رکھا جا چکا ہے؟“

”ہاں، ابھی ابھی میں نے رکھا ہے۔ یہ مہتاب جس کی روشنی ٹھنڈی اور میٹھی ہوتی ہے۔ یہ روشنی اب ساری دنیا کو روشن کرے گی، اپنے چچا کی بخشی ہوئی طاقت اور اپنی ہمت سے کہ سچ ہے بیٹا تو وہ گیلی مٹی ہوا کرتا ہے جسے ماں کو ہی صورت میں ڈھالنا ہوتا ہے پھر یہ غلطی کیوں ہو جاتی ہے؟“

☆......☆......☆

دل کا جلتا شہر

”اب کیا ہوگا ویرا، یہاں تو دور دور تک آبادی کا نام ونشان نہیں۔“ میراں نے پریشان ہو کر گاڑی کے انجن پر جھکے عابد سے کہا۔

”آرام سے بیٹھی رہو، خرابی ادھر ہی ہوگی۔ ابھی ٹھیک کر لوں گا۔“

یہ بات تو عابد خود بھی جانتا تھا کہ خرابی دور کرنا بس کی بات نہیں، مگر بہن کو تسلی دینا بھی ضروری تھا۔ رات لحہ بہ لحہ کالی ہو رہی تھی۔ سنسان علاقہ اور اس کے ساتھ جوان بہن، پریشانی اسے بھی ہو رہی تھی۔

”مجھے پیاس بھی لگ رہی ہے۔“ میراں نے پسینہ اپنی سیاہ اوڑھنی سے پونچھتے ہوئے کہا۔

”کیا، پیاس لگی ہے۔ دیکھ نہیں رہیں میں ادھر الجھا ہوا ہوں۔ تمہیں اپنی پڑی ہے۔ بیٹھی رہو آرام سے۔ تھوڑی دیر پانی نہیں پیو گی تو قیامت نہیں آجائے گی۔“

بھائی کا انداز میراں کو بتا گیا کہ گاڑی ٹھیک ہوتی نظر نہیں آرہی اور اس خوف سے دل بیٹھنے لگا۔

”میراں۔!“ کچھ دیر بعد عابد نے پکارا۔

”کیا ہے؟“ پیاس سے برا حال تھا۔ اور غصہ بھی آرہا تھا۔ سو منہ بنا کر جواب دیا۔

”گرمی لگ رہی ہوگی تمہیں۔ باہر آجاؤ۔“ عابد کا پیار بھرا انداز اسے شرمندہ کر گیا۔ وہ چپ چاپ دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آئی۔

”پریشان نہ ہو۔ یہ رستہ ہے۔ کوئی نہ کوئی تو ادھر آئے گا ہی۔“ اس نے بہن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی۔

"تم نے گاڑی تو رکھ لی۔ پر یہ نہیں سیکھا کہ اگر کوئی خرابی ہو جائے تو ٹھیک کیسے کرتے ہیں؟"

"ہاں بھئی، اب تو مجھے بھی غلطی کا احساس ہو رہا ہے، یہاں سے نکلتے ہی اب گاڑی ٹھیک کرنے کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

وہ اپنی پریشانی اور اس کا خوف دور کرنے کے لیے ہنس پڑا تھا۔ "یہ ادھر جنگل ہے۔" میراں نے پوچھا۔

"ہوں!" اس نے اس جانب دیکھے بغیر بس یونہی کہہ دیا۔

"جانور بھی ہوتے ہوں گے۔" میراں کا خوف سوا ہو گیا۔

"نہیں، کوئی خطرناک جانور ادھر نہیں ہوتا۔"

"نہیں کیا پتا ہو بھی سکتا ہے۔"

"اچھا بابا! ہوتا ہے پھر۔"

"وہ ہماری بو سونگھ کر ادھر بھی تو آ سکتا ہے۔" میراں کی آواز لرز رہی تھی۔

"تم سے آ رہی ہوگی بو، میں تو نہا کر آیا تھا۔" عابد ہنس کر بولا۔

"ڈاکو بھی ہو سکتے ہیں۔" میراں بھائی کے اور قریب آ گئی۔

"تمہیں اگر خوامخواہ میں ڈرنے کا شوق ہو رہا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں لڑکی۔"

اس سے پہلے کہ میراں جواب میں کچھ کہتی۔ دور سے آتی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ پتا نہیں آنے والا دوست نکلے گا یا دشمن۔ عابد کو فکر اس لیے تھی کہ بہن ساتھ تھی، اس نے پستول ہاتھ میں لے لیا اور آنے والوں کو انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد وہ سڑک کا موڑ کاٹ کر سامنے آ گئے اور پھر بہت جلد قریب بھی۔

"اوہ! شاید گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ لڑکی بھی ہے ساتھ۔" ان میں سے ایک نے قہقہہ لگایا اور عابد نے جان لیا یہ لوگ دوست نہیں ہو سکتے۔

"کون ہو تم؟" اس نے گونج دار آواز میں انہیں للکارا۔

"آرام سے، اوئے آرام سے۔ علاقہ ہمارا ہے۔" وہی گھڑسوار کڑک کر بولا جب کہ باقی افراد...... خاموش تھے۔ چاند ابھی پوری طرح نہیں نکلا تھا۔ روشنی کم اور تاریکی زیادہ تھی۔ انہیں شاید عابد کے ہاتھ میں پستول ابھی نظر نہیں آیا تھا۔ اور اس نے ہاتھ بھی نیچے کر رکھا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ گولی چلانے کی نوبت نہ آئے مگر وہ لوگ ارادہ کچھ اور رکھتے تھے۔ وہ مرد گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اور ان کی طرف بڑھنے لگا۔ میراں چیخ مار کر پیچھے ہٹی اور عابد کو نشانہ لینا پڑا۔ اس نے گولی چلا دی کہ سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ گولی اس مرد کے سینے میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ نکلنے نہیں دینا...... تینوں اپنے اپنے ہتھیار نکال چکے تھے۔ ان کے پاس لمبے پھل والے چاقو تھے اور یہ عابد کی بدقسمتی کہ پستول میں گولی ایک ہی تھی۔ اب کیا ہوگا۔ اس نے خوف سے کانپتی بہن کی طرف دیکھا۔ اور اسی وقت ان میں سے کسی ایک نے چاقو کا نشانہ لے کر عابد پر پھینکا۔

دائیں شانے پر لگا اور درد کی شدت سے وہ بیٹھتا چلا گیا۔ اب ان سواروں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ میراں کی چیخیں دور تک جنگلوں میں گونجتی رہیں۔ مگر مدد کو آنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا دلیر، غیرت مند بھائی قتل ہو گیا...... وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

پتا نہیں بہت دنوں بعد آنکھ کھلی تھی یا بے ہوشی چند گھنٹوں کی تھی۔ ہوش میں آتے ہی اسے عابد کا قتل یاد آ گیا۔ وہ چیخیں مارنے لگی۔ آواز سن کر ایک عورت نے کمرے میں جھانکا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ جب دوبارہ دروازہ کھلا تو اندر آنے والا ایک ادھیڑ عمر مضبوط جسم کا مالک مرد تھا۔ اور پیچھے چند خاص ملازم ٹائپ کے لوگ تھے میراں انہیں دیکھ کر ایک دم سے اٹھ بیٹھی اور خوف سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہارے ساتھ وہ جو کوئی بھی تھا۔ اس نے میرے بھائی کا قتل کیا تھا۔ اور قاتلوں کو ہم معاف نہیں کرتے۔"

اس مرد کی زبان اور لباس اجنبی تھا شاید وہ اپنے علاقے سے بہت دور لائی جا چکی تھی۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کے بھائی نے میراں کی طرف میلی نظر سے دیکھا تھا۔ ایسی میں غیرت مند بھائی گولی نہ چلاتا تو اور کیا کرتا مگر خوف اور نقاہت سے وہ ایک لفظ بھی نہیں بول پائی۔

"تمہارے ساتھ وہ جو کوئی بھی تھا۔ اسی وقت قتل ہوا مگر اس سے ہمارے اندر کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ تمہیں ساری عمر یہاں رہنا ہوگا۔ اور اس جرم کی سزا کاٹنی ہوگی۔" میراں کو لگا اس کا دل بند ہو گیا۔

☆......☆......☆

ابھی اس کی زندگی باقی تھی، آرزو مر چکی تھی مگر پھر بھی زندہ رہنا تھا۔ موت پر اختیار جو نہ تھا۔ ایک مرد مار قسم کی عورت اس پر نگران تھی۔ وہ زبردستی اسے کھانا کھلاتی تھی۔ انکار پر سزا اتنی سخت ہوتی تھی کہ میراں کو کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑتا تھا۔ اسے یہاں آئے مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ اب وہ اس کمرے کے علاوہ حویلی میں بھی آ جا سکتی تھی کہ دروازہ کھل چکا تھا مگر اس کے لیے اس حویلی سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے تمام عمر یہاں قید رہنا تھا۔

عابد کے قتل کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر گیا تھا۔ وہ راتوں کو چیخیں مارنے لگتی اور بھائی کو پکارتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنا گھر، اپنی ماں، چھوٹا بھائی ساجد اور بہن گڈی بہت یاد آتے تھے۔ انہیں کیا پتا ہم پر کیا گزری، وہ شاید اب بھی ہمارے منتظر ہوں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے، ان لوگوں نے عابد کی لاش وہیں سڑک پر چھوڑ دی ہو، ہائے میری ماں پر کیا گزری ہوگی۔ بیٹے کی لاش دیکھ کر دل نہ پھٹ گیا ہوگا اس کا۔ گڈی اور ساجد کتنا روئے ہوں گے اور ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ میں کہاں چلی گئی۔

دن رات اس کی کھلی آنکھوں کے سامنے اپنوں کے چہرے رہتے تھے۔ وہ انہی پیاروں میں گم رہتی، خیالوں میں ان سے مخاطب رہتی تھی۔ اسے اس حویلی اور یہاں کے ہر مکین سے نفرت تھی۔ اس نے کبھی کسی پر توجہ نہیں دی، اتنے دن ہو گئے اسے یہاں رہتے ہوئے۔ یہ تک معلوم نہیں تھا کہ یہاں کتنے لوگ رہتے ہیں اور آپس میں ان کی کیا رشتہ داریاں ہیں۔ یہاں اس کی حیثیت ملازم جیسی نہیں تھی۔ اس سے کام نہیں لیا جاتا

تھا۔ اچھا کھانا اور اچھا پہننے کو ملتا تھا۔ وہ سوچتی، میرے بھائی کا خون کر کے بھی پیاس نہیں بجھی، مجھے قید کر لیا ہے۔ ساری عمر کے لیے یہ تک نہیں پوچھتے کہ وہاں ہوا کیا تھا۔

وہ ادھیڑ عمر مضبوط جسم کا مالک شخص حویلی میں کم ہی دکھائی دیتا تھا۔ ملازم اسے سرکار کہہ کر پکارتے تھے اور اس کا نام چوہدری مالک تھا۔ حویلی میں رہنے والی ایک معمر اور دوسری صحت مند ادھیڑ عمر کی عورتوں سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ یہ لڑکے لڑکیاں آپس میں کیا لگتے ہیں۔ میراں نے کبھی نہیں سوچا۔ اس کا بس چلتا تو سب کی گردن پر چھری چلا دیتی۔ شدید گرمی کا موسم گزر گیا تھا۔ برسات آ گئی تھی۔ اب اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ آسمان بھی برسنے لگا تھا۔ فرق اتنا تھا وہ بے آواز روتی تھی اور آسمان کی گھن گرج دلوں کو ہلا دیتی تھی۔ کبھی وہ بجلی کی کڑک سے خوفزدہ ہو جایا کرتی تھی، جس روز آسمان پر بادل ہوتے۔ وہ اپنی چارپائی اماں کے پلنگ کے ساتھ لگا لیتی۔ عابد کتنا مذاق اڑاتا تھا اس کا۔ اور اب آج اس کو ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس کی دعا تھی کہ بجلی زور سے کڑکے اور اس حویلی پر گر پڑے۔

آج شام وہ بڑے کمرے کے باہر کھڑی تھی اور اس نے سنا تھا، ان عورتوں میں سے ایک چوہدری مالک سے کہہ رہی تھی۔

''یہ جو نسرین ہے نا اسے بجلی کی کڑک سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''ہے نا بے وقوف چوہدری مالک کی بیٹی ہو کر ڈرتی ہے۔'' وہ بولا تھا۔

''کیوں تم کیا چیز ہو اور تمہاری بیٹی کیا باقی دنیا سے الگ ہے، یہ بھی سب لڑکیوں جیسی ہے۔ اسے بھی کوئی اٹھوا کر حویلی میں قید کر سکتا ہے۔'' میراں کے اندر نفرت اور غصے کا طوفان اٹھ آیا۔ وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی کہ اب تک عزت محفوظ تھی۔ اور وہ عزت بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ اسے چوہدری مالک کی سرخ سرخ آنکھوں سے خوف آتا تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھ پاؤں اور جسم اور چہرے پر قہر کا تاثر، وہ حویلی میں آتا تو میراں کی روح کانپنے لگتی۔

ساری رات ایک بارش باہر کھلے آنگن میں ہوتی رہی۔ اور ایک میراں کے اندر ہوتی رہی۔ اپنی بیٹیوں کے ناز اٹھاتے ہو اور دوسروں کی بیٹیوں کو اٹھوا لیتے ہو۔ یہ خیال نہیں آتا یہ بھی کسی کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں، دل کا سکون ہیں۔ سب مجھے یاد کرتے ہوں گے۔ اماں پیاری اماں تم برستی بارش اور کڑکتی بجلیوں کو دیکھ کر پریشان نہ ہونا! اب مجھے ان سے ڈر نہیں لگتا، تم نہ رونا میری ماں! تم نہ رونا۔

وہ خیالوں ہی خیالوں میں ماں کے گلے میں بازو ڈالتی رہی، اس کا منہ چومتی رہی۔

رات کی بارش کے بعد صبح تیز چبھتی ہوئی دھوپ نکل آئی۔ اور حبس ہونے لگا، وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی ناشتا جو اس کے سامنے رکھا گیا، وہ بھی جوں کا توں تھا۔ اور میراں گھٹنوں پر چہرا ٹکائے کہیں گم تھی۔

''روٹی کھا لو اور پھر نہا کر یہ کپڑے پہن لینا۔ آج تمہارا نکاح ہے چوہدری مالک سے۔''

اسے لگا ایک پہاڑ ہے جو اس کے وجود پر آ گرا ہے پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ ملازمہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو نکاح کر رہا ہے تم سے۔ یہ تو اس کی نیکی ہے ورنہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی بیوی اور ماں تمہیں اچھا نہیں سمجھتیں۔ پر چوہدری کے سامنے بول نہیں سکتیں۔''

وہ حویلی کی مالکن بننے والی تھی۔ اور اسی وجہ سے ملازمہ کا لہجہ بھی آج بدل گیا تھا۔

''کیا تم گونگی ہو؟'' وہ جب سے آئی تھی خاموش تھی اور کسی نے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ آج پتا نہیں کیا خیال آیا جو وہ پوچھ بیٹھی تھی۔ میراں نے سنا ہی نہیں وہ سخت اذیت میں مبتلا بظاہر بت کی طرح بیٹھی تھی۔

''تم نہا لینا!'' ملازمہ دوبارہ کہہ کر چلی گئی۔

چوہدری مالک جس سے میراں نفرت کرتی تھی، شدید نفرت اب وہی تقدیر کا مالک تھا۔ خدا نے کیا چیز بنائی ہے عورت بھی۔ دل دے دیا مرد سے زیادہ حساس بنا دیا مگر دل کی بات کہنے کی اجازت اسے نہیں ہے۔ وہ اتنی مجبور بنائی گئی ہے کہ جانتے بوجھتے بھی کانٹوں بھری راہ پر چل پڑتی ہے۔ جس سے نفرت کرتی ہے، اسی کے لیے سجتی ہے۔ اسی کے پیروں میں سر رکھنا پڑتا ہے۔ جس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوتی۔ عزت کی خاطر وہ بھی سولی پر چڑھ گئی تھی۔ اسے سر کا سائیں بنا لیا تھا۔ اور ہر رات دل روتا تھا۔ مگر اب بھی وہ چپ تھی۔ اسے بڑی بیوی کے ظلم کا سامنا تھا۔ چوہدری مالک کی ماں اسے گالیاں دینے سے بھی گریز نہیں کرتی تھیں۔ بچے اس سے دور دور رہتے تھے، وہ پھر بھی چپ تھی۔ سارا دن ساس اور سوکن اسے مختلف کاموں میں الجھائے رکھتیں اور یہاں سب اسے گونگی کہتے تھے۔ اس کے نام کا کسی کو پتا نہیں تھا۔ شروع دنوں میں چوہدری مالک کچھ زیادہ مہربان ہو گیا تھا۔ تب اس نے اس سے نام پوچھنا چاہا تھا۔ وہ نہیں بولی تو وہ کہنے لگا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم گونگی نہیں ہو۔ تم گونگی ہو بھی نہیں سکتیں آج نہیں تو کل تم خود ہی بولنے لگو گی۔''

مگر اب وہ اس کی مسلسل چپ اور برف کی سل تلے دبے جذبات سے تنگ آ گیا تھا اسے میراں لاش کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس کی طرف سے غافل ہونے لگا تھا۔ حویلی میں اس کا آنا کم ہو گیا تھا۔ مگر جب کبھی آ جاتا، تو میراں کی شامت آ جاتی۔ گھر کے سب افراد کی نفرتیں ان دنوں اور بھی شدت اختیار کر جاتی تھی۔

نسرین کی شادی ہو رہی تھی۔ گھر میں تیاریاں تھیں۔ ماں دوپٹوں پر گوٹا لگاتی، نسرین ان کپڑوں پر ہاتھ پھیر کر آپ ہی آپ مسکرائے جاتی اور میراں کے خاموش لب تھرتھرانے لگتے۔ اسے اپنی ماں یاد آنے لگتی اور وہ گوٹے ستاروں والے کپڑے جو شاید اب تک صندوق میں بند ہوں گے، کبھی مجھے بھی ماں کی دعاؤں تلے رخصت ہونا تھا۔ مگر میرا ایسا نصیب نہیں تھا۔ میں اپنے بھائی کے قاتلوں کے گھر گھٹی ہوں، کیا زندگی ہے اللہ، ایسا کیا گناہ تھا میرا۔ مگر شاید اس ساری کہانی میں تیرا لکھا شامل ہی نہیں۔ یہ مردوں کی دنیا کے قانون ہیں۔ جہاں عورت کی عزت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ ماں، بہن، بیٹی یا کبھی بیوی ہو۔ اس کے علاوہ وہ کھلونا ہے، اپنی چار دیواری کی حفاظت اور دوسروں کی دیواریں ڈھا دینا مرد کا شیوہ ہے۔ اور پھر بھی عورت بدنام ہے، وہ فساد کی جڑ ہے۔ دے لو جو بھی نام چاہتے ہو۔ دے لو مگر یاد رکھو۔ یہ قانون تمہارے لیے بھی

پھندا بن جاتے ہیں جب اپنی دیوار گرتی ہے تو پھر تمہیں احساس ہوتا ہے مگر کاش ایک چادر اترنے سے باقی کے مرد بھی سبق سیکھیں۔

وہ میٹرک پاس تھی۔ اسے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ بڑے خوش نما بڑے پر بہار دنوں کے خواب دیکھا کرتی تھی وہ سمجھتی تھی علم نے اسے اتنی طاقت دی ہے، اس کے ذہن کو اس طرح منور کر دیا ہے کہ اب جس گھر جائے گی چاندنی بکھیر دے گی اور اب تو اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ کیا ہے، کون ہے اور یہ کیسی زندگی ہے جو وہ بسر کر رہی ہے۔ کیا انسان یوں رہا کرتے ہیں۔ نسرین مایوس بیٹھی پھر اسے مہندی لگی، سکھیوں نے گیت گائے اس کی بارات حویلی میں اتری، دولہا اندر آیا۔ رسمیں ہوئیں اور نسرین اپنوں کی دعاؤں میں ایک نئے گھر کے لیے رخصت ہوئی۔ اسے تو اتنے سارے دنوں میں کسی نے رسم میں شریک ہونے کو بھی نہیں کہا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی، حالانکہ وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی قدم مضبوطی سے یہیں کھلی کھڑکی کے سامنے جم گئے تھے۔ وہ اپنی سسکیوں کو روکتی رہی اور آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں سے بے خبر یونہی کتنی دیر کھڑی یہ سب دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک روز دلہن رخصت ہوگئی اور پھر مہمان بھی ایک ایک کر کے چلے گئے۔

چوہدری مالک جو اب اس کے جسم کا مالک تھا جو اس پر پورا اختیار رکھتا تھا اور جس نے یہ سمجھنے اور سوچنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ یہ احساسات سمجھ بوجھ کر رکھنے والی لڑکی اس کے بارے میں کیسے جذبات رکھتی ہے۔ کیا اس کی روح بھی میرے لیے ہے۔ اس کا دل میرے لیے ہی دھڑکتا ہے۔ اس نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی، کرتا بھی کیوں اسے روح سے کیا مطلب تھا اور سب کچھ ایسے بھی ٹھیک تو چل رہا تھا۔

اس شام بڑے زور کی آندھی آئی تھی، صحن میں کھڑے درختوں کی شاخیں یوں لرزتی تھیں کہ ابھی ٹوٹ جائیں گی، بچوں نے روٹی کھا کر برتن باہر چار پائی پر ہی رکھ دیے تھے، وہ آندھی کے زور سے ادھر ادھر لڑھک رہے تھے اور شور پیدا کر رہے تھے۔ دوپہر کو ملازمہ نے کپڑے دھو کر تار پر پھیلائے تھے۔ اب اگر آندھی چلتے ہی اتار نہ لیتی تو ان میں سے بہت سے اڑ کر اتنی دور نکل جاتے کہ پھر کبھی نہ ملتے۔

بجلی تو آندھی کا زور بڑھتے ہی چلی گئی تھی چوہدری مالک کی حویلی میں اندھیرا ہو گیا تھا مالک کی ماں نے ملازمہ سے کہا کہ دیکھے مٹی کا تیل ہو تو لالٹین میں ڈال دے۔ تیل اتنا ہی تھا کہ اب لالٹین رات بھر جل سکتی تھی۔ یہ لالٹین میراں کے کمرے میں رکھ دی گئی۔ رات بھر افراتفری رہی۔ چوہدری مالک کی بڑی بیوی اور ملاقاتی جاگتی رہیں جو چوہدری نے سونے کی کوشش کی مگر نیند نہیں آئی وہ بھی کمرے میں ٹہلنے لگا اور صبح اذانوں سے کچھ پہلے میراں نے ایک بچے کو جنم دیا۔

''لڑکا ہوا ہے۔'' دائی کی آواز میں جوش تھا کہ لڑکا ہونے کی صورت میں اسے بہترین سوٹ، رقم اور سونے کی ایک آدھ چیز ملنے کی پکی امید تھی۔

''لڑکا!'' چوہدری مالک کا سر اونچا ہو گیا اور چوڑے شانے مزید چوڑے ہو گئے اسے لگا جب وہ دھرتی پر پاؤں رکھتا ہے تو دھرتی اس کے دبدبے سے کانپنے لگتی ہے۔ اس نے مسکراتے ہونٹوں اور طنز برساتی نظروں

سے اپنی بڑی بیوی کی طرف دیکھا جس سے اس کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھے۔ لڑکیاں تینوں ہی دماغی اور جسمانی لحاظ سے صحت مند تھیں مگر لڑکوں میں ایک کی دماغی حالت کچھ درست نہیں تھی اور دوسرا پولیو کا شکار ہو کر معذور ہو گیا تھا۔ بیوی جو رات بھر اس امید پر جاگتی رہی تھی کہ لڑکی ہوگی اب سر جھکا کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور مالک پشت پر ہاتھ باندھے سر اونچا کیے اک شان سے چلتا میراں کے کمرے میں آ گیا۔

''مبارک چوہدری جی مبارک.....'' دائی خوشی کا بھرپور اظہار کر رہی تھی، بچے کو دعائیں دے رہی تھی اور آخر میں یہ فرمائش کی تھی کہ میں سونے کے جھمکے ضرور لوں گی۔

''ہاں بھئی ضرور ملیں گے تمہیں جھمکے۔ اللہ رکھی او اللہ رکھی۔'' اس نے ملازمہ کو پکارا وہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''جاؤ شیدو سے کہو۔ حلوائی سے کہے خالص گھی کے لڈو تیار کرے۔ سارے گاؤں میں بانٹے جائیں گے۔''

''چوہدری جی میں جوڑا لوں گی۔'' اللہ رکھی نے مالک کا موڈ خوشگوار دیکھ کر جھٹ کہہ دیا۔

''ہاں سب کو جوڑے ملیں گے۔ فکر کیوں کرتی ہو اور ہاں سنو شیدے سے کہہ دو، نائی سے بھی بات کرتا آئے، آج دیگیں چڑھیں گی۔'' بات کے دوران اس نے مسکرا کر میراں کی طرف دیکھا جو آج بھی خاموش تھی اور اس کی نظریں چھت پر تھیں شاید کڑیاں گن رہی تھی، وہ بیٹے کو دیکھنے لگا۔

بچہ بے حد خوبصورت تھا۔ اس نے ایک ایک نقش اپنی ماں کا لیا تھا چوہدری کی ذرا سی شباہت بھی نہیں تھی مگر دائی اور ملازم عورتیں اس کو یہی باور کرا رہی تھیں کہ بچہ چوہدری صاحب کی تصویر ہے۔ اس کا ہر نقش باپ سے ملتا ہے اور باپ کی طرح دلیر، غریب پرور جوان ہوگا۔ مالک کا سر کچھ اور بلند ہو گیا اور لگا دھرتی پہلے سے بھی زیادہ کانپنے لگی ہے۔

یہ سب لوگ تو اسے گونگی سمجھتے تھے جو نہ بولتی تھی اور نہ عام انسانوں جیسے احساسات کی مالک تھی مگر بچے کی آمد نے اس گونگی اور احساس سے بے بہرہ عورت کو جذبات سے بھر دیا تھا وہ بچے کو دیکھ کر مسکرانے لگتی تھی۔ اس کے گال چوم لیتی تھی اور ایک روز وہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ اللہ رکھی نے خود سنا تھا، وہ اسے کوئی کہانی سنا رہی تھی۔

''وہ گونگی نہیں ہے بول سکتی ہے۔'' اس نے یہ خبر سب کو سنائی اور جس نے بھی سنا حیرت کا اظہار کیا اور تصدیق کی خاطر اس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس چلا آیا اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''یہ اتنے عرصے تک گونگی کیوں بنی رہی، اس نے یہ ڈھونگ کیوں رچایا؟'' سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا اور سب کو شک تھا کہ وہ اچھی نیت سے یہاں نہیں آئی، اس کے نہ بولنے میں کوئی بھید چھپا ہے، آج مالک آئے تو بات ضرور کریں گے۔ وہ سب ...... اس بات میں سنسنی محسوس کر رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا...... جب شام کو چوہدری مالک گھر آئے گا اور اسے یہ خبر ملے گی کہ اس کی بیوی گونگی نہیں ہے بلکہ گونگی بنی رہی ہے تو بیوی سے یہ بات ضرور معلوم کرے گا اور پھر وہ کہانی اور کسی کو سنائے۔ نہ سنائے اپنی ماں کو ضرور بتائے گا اور اس کی ماں کوئی بات اپنے تک رکھنے کی عادت کبھی خود کو نہ ڈال سکی تھی۔ شام کو چوہدری مالک گھر آیا تو اسے

سخت بخار تھا۔ سر میں بھی درد ہو رہا تھا اس نے روٹی بھی نہیں کھائی جا کر میراں کے کمرے میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔

☆......☆......☆

چوہدری مالک کا بخار اترنے میں نہیں آتا تھا۔ حکیم کب سے علاج کر رہا تھا پر پتا نہیں یہ کیسا بخار ہے جو اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ رات کو اسے زیادہ تکلیف ہوتی تھی اور میراں ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی ہے کبھی سر دباتی، تو کبھی پیر، کبھی اسے سہارا دے کر بٹھاتی اور کوئی ہلکی پھلکی غذا کھلانے کی کوشش کرتی۔ چوہدری مالک کا صحت مند جسم گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ بڑی بیوی کو اس سے گلہ تھا کسی صلے کی امید بھی نہیں۔ اس نے بیمار شوہر کی طرف دیکھا تک نہیں، کبھی دو دن بعد گھڑی دو گھڑی کے لیے کمرے میں آتی، حال پوچھتی اور چلی جاتی۔

صلے کی تمنا تو میراں کو بھی نہ تھی، اسے مالک سے کیا چاہیے تھا بھلا، مگر پھر بھی وہ دن رات ایک کیے ہوئے تھی، اس کے لیے راتوں کو جاگ جاگ کر اس کا خیال رکھتے رکھتے وہ خود بھی کمزور ہوگئی تھی، سردیوں کی آمد آمد تھی اور مالک کے کمزور جسم کو سردی کچھ زیادہ ہی لگتی تھی حکیم نے کہا تھا کوئلوں والی انگیٹھی خوب اچھی طرح دہکا کر اس کے پلنگ کے قریب کمرے میں رکھ دو، وہ ساس سے انگیٹھی کے بارے میں پوچھنے اس کے کمرے تک آئی۔

''وہ حکیم صاحب کہہ کر گئے ہیں کوئلے خوب دہکانے کے بعد کمرے میں رکھ دو۔'' وہ آج تک اس گھر میں کسی کو بھی رشتے سے پکارنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکی تھی۔ مالک کی ماں کو خالہ یا اماں نہیں کہتی تھی، بس یونہی بات کر لیا کرتی تھی۔

''تو ادھر آ بیٹھ میری دھی، اللہ رکھی انگیٹھی دہکا لے گی۔'' مالک کی ماں بڑی محبت سے کہہ رہی تھی وہ یوں کھڑی رہی جیسے سنا ہی نہیں۔ اماں خود بستر سے اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے اور کہنے لگی۔ ''بڑی خدمت کی ہے تو نے میرے بیٹے کی، جی جان مار دیے اس کے پیچھے، خاوند کی خدمت کرنی چاہیے پر اپنا بھی تو خیال کر، تیرا چھوٹا سا بچہ ہے۔''

وہ ہاتھ چھڑا کر باہر آ گئی۔ صحن میں انگیٹھی دہکتی رہی، کوئلے چٹختے رہے اور وہ مسلسل انہیں دیکھتے ہوئے جانے کس جہاں میں گم رہی۔

''سردی بہت زیادہ ہے بی بی! تم اندر چلو میں کوئلے اچھی طرح دہک جانے پر اندر لے آؤں گی۔'' ملازمہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرنے کے بعد کہا، مگر وہ اندر نہیں گئی، یہاں ہی بیٹھی رہی اور فرش پر ایک چھوٹے سے تنکے سے کچھ لکھتی رہی۔

یہاں کون پڑھنا جانتا تھا۔ لکھ چکی تو خود ہی چونکی۔ اماں، عابد، ساجد، گڈی اس کا جی چاہا زمین کو چوم لے، اس مٹی کو آنکھوں سے لگالے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے اپنے پیاروں کے یہ نام خود ہی مٹا دیے، اور تھکے تھکے قدموں سے اندر چلی آئی۔ کمرے میں بچے کا جھولا خالی تھا، وہ پھر باہر نکل آئی اور اللہ رکھی سے پوچھا۔

''رو رہا تھا جی بہت، میں اماں جی کو دے آئی ہوں۔'' وہ اس کی بات سن کر ساس کے کمرے میں چلی آئی۔

''لاؤ عابد کو مجھے دے دو'' اس نے ساس کے سامنے ہاتھ کرتے ہوئے بچے کو لینا چاہا۔

''اس کا نام عابد نہیں حشمت ہے مالک نے خود یہ نام رکھا ہے اس کا، کیا تمہیں پتا نہیں؟''

اس نے ساس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بچے کو اٹھا کر چلی آئی اور بڑھیا سوچ رہی تھی اس لڑکی کے دماغ میں ضرور گڑبڑ ہے، سارا گھر اس کے سامنے بچے کو حشمت کہہ کر بلاتا ہے اور یہ پھر بھی عابد کہہ رہی ہے۔

حکیم کی دوا سے فرق نہیں پڑا تو ایک شہری ڈاکٹر سے علاج شروع کروایا گیا۔ چوہدری مالک بمشکل گاڑی میں بیٹھ کر شہر تک گیا تھا۔ واپس آیا تو کچھ مطمئن تھا اور بتا رہا تھا۔ ''ڈاکٹر مرض پہچان گیا ہے۔ اب جلد ہی صحت ٹھیک ہو جائے گی۔'' ماں سنتے ہی جلد از جلد صحت یابی کی دعائیں مانگنے لگی۔ میراں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ بچے سے باتیں کرتی رہی۔ چھوٹا سا بچہ جب اس کے چہرے کی جانب ہاتھ بڑھاتا تو وہ زور سے ہنس پڑتی۔

☆......☆......☆

چوہدری مالک کی بڑی بیوی کے میکے میں کسی کی شادی تھی۔ وہ شادی میں جانے کی اجازت لینے اس کے کمرے میں آئی تھی۔ بیماری کے دوران جس طرح اس نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مالک اس سے ناراض تھا۔ ابھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ غصے کے اظہار میں اس پر چڑھ دوڑتا، ناراضی یوں ظاہر کی کہ بات کا جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ لیٹا رہا۔ تیور وہ بھی پہچان گئی تھی۔ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

اگلے روز اس کا چھوٹا بھائی لینے آ پہنچا اس نے بھی چوہدری مالک سے اجازت مانگی اس نے جواب نہیں دیا۔ ''آپا ضرور جائے گی۔''

وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ اور میراں بھاگ کر دروازے میں کھڑی ہوگئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی بہن کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کیسا مضبوط جوان تھا بالکل عابد کی طرح۔

''عابد، ویرا او ویرا۔'' میراں نے سر دروازے سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا جیسے یہ سوکن کا بھائی نہیں تھا، اس کا بھائی تھا اور اسے اس قید خانے سے رہائی دلانے آیا تھا۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ کسی کی اجازت نہیں چاہیے۔ انداز فیصلہ کن تھا وہ کہہ رہا تھا۔ ''میراں ضرور جائے گی۔''

''میرا خیال ہے دوا کا وقت ہو گیا ہے۔''

چوہدری مالک کی آواز پر وہ پھر سے منجمد ہو گئی۔ سارے جذبے دل میں اتار کر دروازہ بند کر کے موٹا سا تالا ڈال دیا۔ اور سپاٹ چہرا لیے اس کے قریب آ گئی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر کی دوا واقعی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ مالک زندگی کی طرف لوٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اب اسے بھوک بھی لگنے لگی تھی اور اماں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔ غریبوں میں خیرات تقسیم کی تھی اور مبارکبادیں وصول کی تھیں، ملنے والیاں ایک بات ضرور کہتیں۔ ''بڑی خدمت کی ہے اس لڑکی نے اپنے شوہر کی۔'' (بوڑھے کا لفظ وہ دل میں کہہ لیتیں ہونٹوں تک نہ لاتیں) اور جب آپس میں بات کرتیں تب ضرور حیرت کا اظہار کرتیں اتنی خوبصورت لڑکی کو، اس بڈھے جلاد سے اتنی محبت کیونکر ہے۔ جو اسے کہیں سے اٹھا کر لایا ہے، ہاں اسے زبردستی لایا گیا ہے جبھی تو چپ لگ گئی تھی اور اتنی لمبی چپ کہ اسے صرف بچے کی آمد ہی توڑ سکی ہے۔ ضرور اس خدمت کے پیچھے کوئی کہانی ہے کوئی سنسنی خیز کہانی۔''

ان عورتوں کے لیے میراں کی ذات ایک معمہ تھی، وہ اس حویلی میں آتیں تو بہت غور سے اس کو دیکھتیں کیسے چلتی ہے کیا کھاتی ہے اور کیا کرتی رہتی ہے، ہنستی کیوں نہیں اسے کبھی روتے بھی نہیں دیکھا۔ چوہدری مالک اسے کہاں سے لایا ہے، کون ہے یہ اور آخر میں ایک دوسرے سے کہتیں ضرور اس کے پیچھے کوئی کہانی ہے۔'' اور یہ جملہ بولتے ہوئے آپ ہی آپ ان کی آنکھیں اور لہجے شکوک وشبہات سے بھر جاتے۔ یوں لگتا جیسے میراں کسی اور دنیا کی مخلوق ہے اور وہ دنیا کون سی ہے اس کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم۔

ڈاکٹر کے علاج سے چوہدری مالک بالکل ٹھیک ہوگیا، دن بھر دیگیں چڑھی رہیں مٹھائی بھی تقسیم ہوئی۔ میراں کمرے میں بیٹھی اپنے بیٹے کو کہانی سناتی رہی۔ ننھا بچہ سمجھتا تو کیا ماں کو قریب پا کر خوشی سے اوں آں کرتا رہا۔ اسے پتا نہیں چلا کب مالک کمرے میں آ گیا۔

''رانی! (اس نے یہی نام دیا تھا اسے) اس کی آواز پر وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''تم نے بہت جان ماری ہے۔ میرے لیے۔ خود کو بھول گئی تھیں تم تو، میں بہت خوش ہوں تم سے تم جو مانگو گی، میں دوں گا۔ بولو کیا چاہتی ہو؟''

''تم، میں جو کہوں گی تم پورا کر دو گے؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں مانگ کر دیکھو'' مالک کی آواز میں آج محبت کا درس بھی شامل تھا۔

''سوچ لو'' میراں جوش کے عالم میں کھڑی ہوئی تھی۔

'ہاں رانی! تم کہو تو'' اس نے جیب میں رکھی نوٹوں کی گڈی کو چھوا اور مسکرا کر کہا۔ میراں نے سر جھکا لیا اور جب کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو چہرا اور آواز دونوں ہی آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے۔

''میری بس اتنی سی خواہش ہے کہ کسی کو میری گاؤں بھیجو، اس کو کہو میرے گھر جائے اور میری ماں کو بتا دے کہ میں نے اس کے بیٹے کے قاتلوں سے رشتہ اس لیے جوڑا کہ اس کے بغیر عزت جاتی تھی، جس عزت پر میرا بھائی قربان ہوا، میں اسے کیسے جانے دیتی۔ میں نے رشتہ جوڑ لیا، اسے بتانا کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام عابد رکھا ہے اور اسے کہنا وہ گوٹے والے کپڑے، مجھے بھیج دے جو اس نے میرے لیے صندوق میں رکھے تھے۔ گڈی اور ساجد کو میرا پیار دینا۔ انہیں بتانا میں روز رات خواب میں انہیں دیکھتی ہوں اور ہاں جو بھی میرے یہ

پیغام لے کر جائے۔ وہ یہ ضرور دیکھ کر آئے کہ آنگن میں لگا آم کا پودا اب کتنا بڑا ہوگیا ہے۔ وہ پودا میں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا اور یہ بھی دیکھے پیپل میں اب بھی جھولا پڑا ہوا ہے اگر نہیں تو اس کے نشان ضرور ہوں گے اور یہ بھی کہ میرے ویروں کے دیس میں ہوائیں کتنی ٹھنڈی ہیں۔ اسے کہنا میرے بابل کے گھر کا دروازہ چوم کر آئے اور میری اماں سے کہنا کہ گاؤں میں سب سے کہہ دے۔ میراں مر گئی تھی۔ وہ عابد کے ساتھ ہی قتل ہوئی تھی۔''

چوہدری مالک نے حیران ہو کر اس عورت کی طرف دیکھا۔ وہ سونے چاندی کے زیورات نہیں مانگ رہی تھی اور اس نے اپنے گاؤں جانے کی بات بھی نہیں کی، صرف پیغام بھجوانا چاہ رہی تھی۔

''تم اگر جانا چاہو ملنے کے لیے تو۔''

''نہیں نہیں اب ڈیڑھ سال کے بعد میں کیسے جا سکتی ہوں۔ وہ میراں جس کی شرافت کی لوگ مثالیں دیتے تھے۔ وہ اب کیسے واپس جا سکتی ہے۔ بس پیغام بھیج دو اور اسے کہنا میرے بابل کے گھر کا دروازہ چوم کر آئے اور مجھے بتائے کہ میرے ویروں کے دیس کی ہوائیں کیسی ہیں۔ مجھے بس یہی چاہیے۔''

اور چوہدری مالک کا سر جھک گیا۔ جیب میں رکھے نوٹ ردی، کاغذ کی طرح لگنے لگے وہ واپسی کے لیے مڑا تو قدم شکستگی کا تاثر لیے ہوئے تھے۔ اور میراں کی ہمیشہ کی طرح آنکھیں ہی نہیں دل بھی رو رہا تھا اور وہ بڑے سوز کے ساتھ گا رہی تھی۔

نیم کی نمکولی پکی ساون کب آئے گا
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلائے گا

گیت میں خواہش، دکھ، اور بے بسی کا تاثر نہیں صرف انتظار تھا، مگر اس کے لہجے میں انتظار نہیں دکھ اور بے بسی تھی روتے روتے ہنس پڑتی اور ہنستے ہنستے رونے لگتی۔

☆......☆......☆